جلد 47 • شمارہ 07 • جولائی 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس: 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من......السلام علیکم......!

رمضان المبارک میں جولائی کا شمارہ بہت سی خوشیوں کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ چند ہی روز میں عید سعید ان خوشیوں کو دوبالا کر رہی ہوگی۔ قارئین کو یہ سب بہت مبارک ہو۔ کرکٹ کے میدانِ اوول میں 22 رمضان کو پاکستان نے بھارت کو جس بھرپور انداز میں شکست سے دوچار کیا... وہ جہاں ہمارے لیے فخر و مسرت کی بات ہے وہاں بھارتیوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ اُن کے غرور اور بد دماغی کا نتیجہ ہے۔ ان کے ماہرین کی ہرزہ سرائیاں سن کر یوں لگتا تھا جیسے غرور کے نشے میں ان کے دماغ چل گئے ہوں۔ کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ ہمارے بلّے بازوں کے ہاتھوں ان کی درگت، بڑا اسکور، ہمارے بالروں کے سامنے ان کی بے بسی، حقیر سا اسکور، صرف 30 اوور میں بے دست و پا ہو جانا اور ایک بہت بڑے مارجن سے عبرت ناک شکست! واقعی غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ سرفراز نے کیا خوب کہا کہ ہمارے پاس ہارنے کے لیے کچھ نہیں تھا، ہم صرف اور صرف جیتنے کے لیے آئے تھے۔ 9 سال کے صبر آزما انتظار کے بعد آخرکار ہم نے یہ فتح حاصل کر ہی لی اور اس قدر بھرپور انداز میں حاصل کی کہ اگلے پچھلے سارے حساب بے باق ہو گئے۔ برطانیہ سے دبئی اور پاکستان بلکہ مقبوضہ کشمیر ہر جگہ بھرپور انداز میں اس جیت کا جشن منایا گیا جبکہ ہمارے حریف ملک میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ ہماری دعا اور دلی آرزو یہی تھی، یہی ہے اور یہی رہے گی کہ ربّ العزت ہمارے وطن کو شاد و آباد اور قائم و دائم رکھے...... اس کے دشمنوں کو ذلت و رسوائی نصیب ہو۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کھیل سے ثقافت اور پھر سیاست تک، افراد اور چہرے بدلتے رہتے ہیں مگر سب کچھ اپنے زور میں اس سمت میں چلتا رہتا ہے جس کا تعین کاتب تقدیر نے کیا ہوتا ہے۔ انشاء اللہ ہم باعزت انداز میں ترقی کی منزل کی جانب سفر کرتے رہیں گے کیونکہ اس ملک کی بنیادوں میں اُن اَن گنت شہیدوں کا خون شامل ہے جنہوں نے ارضِ پاک کی مٹی کو چومنے کی آرزو میں سرحد کے اُس پار درندوں کے ہاتھوں اپنی جانیں گنوا دیں۔ اسی بات سے اپنی نکتہ چینی کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس بار کون کون پار لگ چکا ہے۔

ساہیوال سے عاصم جٹ کا تجزیہ ’’پچھلی بار کی حوصلہ افزائی پر پھر حاضرِ خدمت ہوں۔ نوال اینڈ مشال، رومی انصاری اور طاہرہ گلزار احباب دلنشیں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ احقر کے تبصرے کو کسی قابل جانا اور اپنے قابلِ قدر الفاظ میں یاد رکھا۔ آپ نے پچھلی بار میرے سوالات کو تو قابلِ توجہ جانا اور جوابات بھی دیے پر مشورہ جات پر اس صفائی سے ہماری دشمن قینچی پھیری کہ ہکا بکا ہی رہ گئے۔ مغل صاحب انگارے کو جو بن پر لے آئے ہیں۔ داستانِ خونچکاں پڑھتے کئی بار کرداروں کے دکھ اپنے سے محسوس ہوتے ہیں۔ لاجواب داستان ہے، گوجرانوالہ کے آصف محمود کی تائید کروں گا کہ کہانی کم از کم دس سال چلنی چاہیے۔ ویسے بھی شکاری کے بعد اب تک کوئی کہانی یہ سنگِ میل عبور کرنے سے قاصر رہی ہے۔ بھٹی صاحب کی آوارہ گرد بھی بہتر رہی پر لگتا ہے کہ کہانی اپنی اختتامی ڈگر پر چل پڑی ہے اور اگر نہیں چلی تو اب چلا دیں۔ اگلی قسط وار کے لیے اگر غلام قادر اور سودی صاحبان مصروف ہیں تو اقلیم علیم یا ناصر ملک کو ہی لے آئیں۔ میری دلچسپی کا مرکز ہمیشہ قسط وار کہانیاں ہی ہوتی ہیں پر رنگوں میں زدیا اعجاز کی قیمت نے بے اختیار داد و تحسین پر مجبور کر دیا۔ نوآموز والی خفیف کی تو محسوس ہوئی لیکن زورِ قلم نے سماں باندھے رکھا۔ انجام بخیر ہوتا تو زیادہ پسند آتی کہ قاتل سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ مصنفہ کا عمیق مشاہدہ قابلِ رشک ہے۔ آج سے پچیس برس قبل میں جب بارہ سال کا تھا تب مظلوم عاشق جیسی کہانیوں پر بے ساختہ سر دھنتا تھا پر اب افسوس ہی کرتا ہوں۔ اغلب امکان ہے کہ آپ نے جاسوسی کے ٹین ایج قارئین کے لیے یہ تحریر پیش کی ہوگی جس میں میری دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ایم اے راحت کی تحریر دیکھ کر بے ساختہ آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ اللہ ان کے درجات میں اضافہ فرمائے۔ مرحوم نے مجاہد، طالوت اور صدیوں کا بیٹا جیسے اَن مٹ شاہکار دنیا میں چھوڑے ہیں۔ آپ کی پیشکش پسند آئی۔‘‘

دبئی سے طلعت مسعود کی حاضری ’’ماہ جون کا جاسوسی مل تو مئی کے آخر میں گیا لیکن کچھ مصروفیات کی وجہ سے جون میں جا کر دیکھا۔ سرورق کی آنٹی رمضان کے ذخیرہ اندوزوں کی طرح ذخیرہ کر کے تجوری کی چابی کی نمائش کر رہی ہیں اور عینک والے انکل بھی سوچوں میں گم ہیں کہ اس کا کیا حل کریں۔ اداریے میں مودی سرکار میں ہونے والی جنونیت پر تشویش کا اظہار ہے۔ کاش ان جنونی لوگوں کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ یہ سوچ خود ان کے لیے زہرِ قاتل ہے، ہم تو ان کی ہدایت کے لیے دعا گو ہیں۔ محفل خطوط میں سرِفہرست شفقت محمود اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ براجمان تھے، ان کا تبصرہ اچھا تھا۔ ایمانے زارا کہانیوں کا پوسٹ مارٹم کرتی نظر آئیں لیکن اگر کہانیوں پر تبصرہ ہوتا تو مزید اچھا ہوتا۔ سعدیہ قادری صاحبہ اللہ پاک آپ کی امی کو جلد صحت و تندرستی عطا فرمائے آمین۔ اعتزاز وصلی کے بعد عاقب وصلی کی پہلی آمد اچھی لگی، خوش آمدید برادر! اس کے علاوہ صفدر معاویہ، عبادت کاظمی، عبدالجبار رومی اور طاہرہ گلزار صاحبہ کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں میں ابتدا انگارے سے کی جہاں مغل صاحب انگاروں کو اب جنگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل کر چکے ہیں، یہ قسط بھی جنگ اور خون خرابے سے بھرپور رہی۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس نیلا

دائرہ کے ساتھ موجود تھے۔ امجد صاحب کی کہانیوں کا ہمیں انتظار رہتا ہے۔ وہ مغربی تراجم بہت عمدہ انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ مارکیڈ وفیلی، میکسیکن مافیا سے متعلق سنسنی خیز داستان جس نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ آخر میں بین راب کے انجام اور نتالی کی کامیابی اچھی لگی۔ رنگوں میں فاروق انجم کا مظلوم عاشق ہلکے پھلکے مزاح کے انداز میں لکھی گئی کہانی کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ بادشاہ اینڈ کمپنی کچھ زیادہ ہی بے وقوف نکلے۔ دوسرا رنگ قیمت از زویا اعجاز اس ماہ کا بہترین رہا۔ سنسنی، ایکشن اور تجسس سے بھرپور، گھناؤنے جرائم میں ملوث معاشرے کے ناسوروں کو بے نقاب کرتی خوبصورت کہانی۔ سیٹھ رزاق اور روحی جیسے لوگوں کی اولاد ارحم اور مہک جیسی ہی ہوتی ہے جو اپنے شوق کے لیے نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کے خواب چھینتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ آدمی جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ بدقسمتی سے یہاں قانون بھی موم کی ناک بنا ہوا ہے جس میں طاقت ہو وہی موڑ لیتا ہے لیکن انسپکٹر سکندر جیسے لوگ ہی امید کی کرن ہیں۔ منظر امام کی اجنبی بھی بہترین رہی۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے انشاء اللہ اگلی دفعہ پھر حاضری دینے کی کوشش کریں گے۔'' (یقینا)

انصر علی کی چنیوٹ سے کارکردگی ''سرورق پر ہمیں شروع ہی سے لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں اور انہیں ہم...... اس دفعہ بھی ایک نازنین اپنی یک چشم کے جادو ہم پہ چلا رہی تھی...... پر ہم نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ (رمضان ہے نا) اداریے میں مدیرِ اعلیٰ رمضان المبارک کی مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ ''موذی'' سرکار کے انتہا پسندوں کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے، خدا ان کو ہدایت دے۔ اپنی محفل میں اس دفعہ شفقت صاحب بلاشرکتِ غیرے جمے بیٹھے تھے، مبارکباد۔ آگے بڑھ کر ایمانے زارا کی کھری کھری کھڑے ہو کر سنی بہت اچھے جی...... سعدیہ قادری آپ کی باتوں میں کوئی شک نہیں...... اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ محترمہ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ عبادت کاظمی کا تبصرہ ہمیں پسند آیا۔ ان کی اور ہماری فرمائش سیم ہے۔ پلیز کاشف سر کی کوئی کہانی لگا دیں۔ عاقب وصلی موسٹ ویلکم اور ہم بھی آپ کے دوست ہیں...... بھول نہ جانا۔ طاہرہ صاحبہ کا تبصرہ ہے یا مختصر کہانی بہت خوب۔ بھائی احسان اتنے ہی تنگ ہیں تو نہ پڑھا کریں۔ کہانیوں میں انگارے نے ہمیں ہی انگاروں پر لٹا دیا۔ تبارک اور سیف کی اموات نے رُلا دیا۔ سیفی کا یہ انجام متوقع تھا مگر اتنی جلدی سوچا نہیں تھا، بہت دکھ ہوا۔ ویسے اب سارے خوش ہوا ایسٹرن کو پٹتے دیکھ کر۔ ایسٹرن کنگ نے قبر کی ملکہ کا پہلا وار تو ناکام کر دیا اب دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ آوارہ گرد کافی بہتر ہو گئی ہے، شہزی پھر مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ بھٹی صاحب بچے کو سانس بھی لینے دیں۔ مختصر کہانیوں میں ایم اے راحت صاحب کی وہی خدا ہے بہت پسند آئی۔ اللہ تعالیٰ راحت سر اور تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائے آمین۔ باقی انگلش ترجمے والی کہانیاں کم نہیں ہو سکتیں مہربانی ہو گی۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس نے اس دفعہ نام بڑے اور درشن چھوٹے والا کام کیا۔ نیلا دائرہ کوئی خاص تاثر قائم نہیں کر پائی۔ پہلا رنگ میں انجم صاحب نے ہلکے سے جرم کے تڑکے کے ساتھ بہت اچھا مزاح لکھا۔ اینڈ پر معصوم خان جو کہ معصوم نہیں تھا واقعی معصوم بن گیا۔ اسٹوری آف دا منتھ زویا آپی کی قیمت رہی، بہت خوب جی۔ ہادی کی خود کشی نے رنجیدہ کر دیا۔ مصنفہ دورِ حاضر کے جرائم اور گھناؤنے کرداروں کے چہروں کو بہت اچھے انداز میں بے نقاب کرتی ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد سرورق کے رنگ پڑھنے میں مزہ آیا۔ اور یہ اپنے کبیر بھائی کدھر غائب ہیں، کوئی بتائے گا۔''

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کی عقل مندانہ باتیں ''جاسوسی ڈائجسٹ لینے جب بھی جاتی ہوں کبھی پہلی دفعہ میں یہ نہیں ہوتا کہ مل جائے۔ لگتا ہے سارا اسلام آباد ہی اسے پڑھتا ہے۔ جون جیسا موسم ہو اور اچھا آنکھوں کو بھلا لگنے والا ٹائٹل ہو ایسا کیسے ممکن ہے...... خیر کانی محترمہ پہ سرسری نظر ڈال کر فہرست کی طرف متوجہ ہوئی۔ نکتہ چینی میں اپنا نام دیکھ کے چھلانگیں لگانے کو دل کر رہا تھا مگر دماغ نے بروقت یاد دلایا میں اشرف المخلوقات ہوں ویسے سوچا نہ تھا کبھی ہم بھی شامل ہوا کریں گے۔ شفقت محمود ٹاپ پر براجمان نظر آئے۔ سعدیہ قادری کا تبصرے کا مجھے انتظار ہوتا ہے لیکن یہ کیا فقط دو سطور......! عاقب وصلی اور عبادت کی حاضری بھی اچھی رہی۔ زویا اعجاز کی قیمت نے اس دفعہ کے جاسوسی کی قیمت پوری کر دی، ہمیشہ کی طرح بہترین کہانی تھی۔ مختلف موضوع اوپر سے اندازِ بیان و سسپنس کا تڑکا۔ مزہ آ گیا۔ اب تو زویا اعجاز اور جاسوسی لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ ڈائجسٹ ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے نگاہیں ان کا نام تلاشتی پھرتی ہیں۔ امجد رئیس کی نیلا دائرہ شاندار تحریر، اف اتنا سسپنس! نتالی بے چاری گھن چکر بن گئی اصل باپ، چچا...... ماں اور چچی میں...... شکر آخر پتا چل گیا اسے۔ بہت خوب! فاروق انجم کی مظلوم عاشق تو محسوس ہوا کسی پرائمری کے بچے سے لکھوائی ہے۔ اگر یہ کامیڈی تھی تو بہت ہی غیر معیاری۔ مزاح لکھنا تو آرٹ ہے اور ہر کسی کے بس کی بات نہیں اگر نہیں لکھ سکتے تو کم از کم صفحات تو نہ ضائع کریں......! باقی چھوٹی موٹی کہانیوں میں خطرہ، وہی خدا ہے اور فرض شناس پسند آئیں۔ انگارے اور آوارہ گرد تو سمجھ سے باہر ہیں اس لیے اللہ حافظ۔''

صادق آباد سے مقصود احمد اویسی کا تبصرہ ''السلام علیکم، لوگ تبصرے لکھتے تھے اور ہم حیرت سے دیکھتے تھے کہ کیسے لکھ لیتے ہیں۔ دل میں خواہش نے انگڑائی لی اور ہمیں بھی تبصرہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ سرورق کو بہترین تو نہیں بہتر قرار دے سکتے ہیں گو کہ ٹائٹل کی حسینہ ہمیں پسند نہیں آئی۔ محفلِ گپ شپ کے نامزد صدر شفقت محمود ڈائجسٹ پورا نہ پڑھنے کے باوجود بھی عمدہ تبصرہ لکھ کر اس سیٹ کے حق دار قرار پائے، ایمانے زارا شاہ کے طویل تبصرے سے ذہن میں پیدا ہوتی الجھن کو عاقب سلیم کے معصوم سے تجزیے نے دل و دماغ کو رونق بخش دی، پھر بھی مزید خوش ہونے کے لیے ہم نے مشال نوال کے ساتھ ساتھ عبادت کاظمی اور مرحا گل کی بیانیوں کو پڑھا جو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ شروعات تو ہم ہمیشہ انگارے سے کرتے ہیں پر ایکشن کی بھرمار کی وجہ سے موجودہ قسط کچھ خاص متاثر نہیں کر پائی۔ شاہ زیب کچھ زیادہ ہی سپر مین بنا ہوا ہے۔ آوارہ گرد ایک ٹریک سے نکل کر

دوسرے میں داخل ہوگیا، اتنی قسطوں سے پُراسرار کو کھول دیں ورنہ کہانی جمود کا شکار ہو سکتی ہے۔ عابدہ کا غیاب سامنے لایا جائے۔ اور قیمت تو زویا اعجاز نے کیا زبردست لکھی ہے، ان کی ہر کہانی کے ساتھ تحریریں اپنے جوبن پر آ رہی ہیں۔ مظلوم عاشق، فلمی کہانی گھر میں رہتے رہتے پیار ہوگیا، انتہائی بور کہانی، حالانکہ فاروق انجم بہت اچھا لکھ لیتے ہیں۔ امجد رئیس کی کہانی بہت اچھی لگی۔''

شاہد ذوالفقار کی عجلت ''میں چینی نکتہ چینی میں پہلی بار شرکت کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے شرفِ اشاعت بخشا جائے گا۔ (انشاء اللہ) میں جاسوسی کا طویل عرصے سے قاری ہوں لیکن کبھی بھی ریگولر قاری نہیں رہا۔ کبھی وقت ہوا، ڈائجسٹ پہ نظر پڑ گئی تو خرید لیا یا کسی دوست سے مانگ لیا۔ اس بار رمضان کی وجہ سے مکمل ریسٹ پہ تھا تو ڈائجسٹ بروقت خرید لیا۔ فیس بک پر ایک پوسٹ پر نظر پڑی کہ تبصرہ کریں اگر ہمیں پسند آیا تو طاہر جاوید مغل کی کتاب تحفے میں دی جائے گی، تحفے کے لالچ میں پہلی بار تبصرہ لکھنے بیٹھ تو گیا مگر اب سمجھ نہیں آ رہی کیا لکھوں۔ میں ڈائجسٹ میں پہلی تحریر کے علاوہ بس رنگ پڑھتا ہوں۔ اس بار پہلی تحریر ابھی تک نہیں پڑھ سکا کیونکہ انگریزوں کے مشکل مشکل ناموں کی وجہ سے مجھے انگریزوں کی کہانیاں پڑھ کے الجھن ہونے لگتی ہے۔ روزے میں تو یہ کہانیاں سمجھنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ کسی ہندی فلم کا چربہ لگا۔ مزاح تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا۔ دوسرا رنگ کافی اچھا رہا۔ اس میں بھی کچھ چیزیں عجیب لگیں۔ بہرحال کہانی اچھی تھی۔ سرورق بھی اچھا لگا۔ چینی نکتہ چینی میں تبصرے بھی مزے کے تھے۔''

گوجرہ خان سے نوار گل کی جسارت ''اس بار جاسوسی 3 کو ملا۔ سرِ ورق دیکھا ایک حسینہ زلفیں بکھیرے مجھے گھور رہی تھی اور پیچھے ایک عینک والے چاچا جی کے ہاتھ میں لاک اور کی۔ مجھے یاد آیا کہ انگلش میں چابی کو کی کہتے ہیں۔ کچھ چیزیں نظر انداز کرتے صفحہ پلٹا تو اشتہاروں پر نظر پڑی، پھر فہرست دیکھی تو مزہ آ گیا، پھر پہنچی چینی نکتہ چینی پر جہاں ایڈیٹر صاحب پڑوسی ملک کے حالات بیان کرتے نظر آئے...... محفل میں پہلا تبصرہ دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا یہ کیا، پھر سے آنکھیں مل کر دیکھا تو بیچ میں کمالیہ سے شفقت محمود موجود تھے۔ تبصرہ بہت اچھا تھا، مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ شفقت صاحب اتنا اچھا لکھ لیتے ہیں...... پھر دیکھا تو ایمانے زارا شاہ...... اوہ یہ تو اور بھی کمال ہوگیا ان کا بھی نام سنا ہوا تھا، بہت خوب۔ سعدیہ قادری اللہ پاک آپ کی والدہ کو صحت دے آمین! مرحا گل ویری ویلڈن، نوال اینڈ مشال آپ کو نہ جانتے ہوئے بھی بہت سارا جان لیا، آپ کی انٹری بھی اچھی رہی...... ارے واہ جی اپنے عبادت کاظمی صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ یہ تو پتا ہی نہ تھا کہ کاظمی صاحب حسن کی تعریف کچھ کم ہی کریں تو اچھا ہے ورنہ؟؟ کاظمی صاحب کے ساتھ تھے ان کے دوست عاقب سلیم وصلی، آپ کی پہلی انٹری اتنی اچھی رہی اس لیے ہم نے بھی کوشش کر ہی ڈالی۔ شہر کا نام بھولنے والے آپ کو یاد کیا کیا ہے؟ آصف محمود آپ جتنا میرے پاس وقت ہوتا کاش...... طاہرہ گلزار خیر مبارک رمضان کی...... یہ کیا جی آگے تھے احسان سحر، ان پر بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے...... اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف...... پہلے پڑھی فاروق انجم کی فلمی عاشق بہت بور کر گئی...... زویا اعجاز نے قیمت کی زبردست قیمت ادا کر دی، بہت اچھا لکھا...... انگارے کچھ زیادہ ہی فلمی ایکشن سے بھرپور لگی۔ آوارہ گرد بس گزارہ ہی رہی۔ امجد رئیس کی کہانی نے بہت متاثر کیا اس بار...... بہت زبردست لکھا۔''

بہاولپور سے مومنہ کشف کی کہانی ''بھائی نے جاسوسی اس بار بہت دیر سے لا کر دیا پر شرکت اتنی لازمی ہے کہ ادھورا تبصرہ لے کر پھر سے دھمال ڈالنے آ گئی ہوں۔ ٹائٹل دیکھ کر کڑوے بادام منہ میں گھل گئے۔ ذاکر انکل کیوں خرانٹ آنٹیاں بناتے ہیں، ان کو مجھ جیسی معصوم کیوں نہیں ملتی ہیں؟ پہلے نمبر والا تبصرہ بوریت میں بھی اول آیا۔ شکر ہے ایمانے کے مزیدار تبصرے نے اس بوریت کو بھگا دیا۔ سعدیہ قادری کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں پر اس بار ان کی والدہ کی بیماری کا سن کر افسوس ہوا۔ نوال اینڈ مشال میں مومنہ ہوں صوفیہ نہیں، رمنا اور مرحا کی باتیں پسند آئیں۔ عبادت ابھی تو آپ مسکرائے ہو غور سے پڑھتے تو شاید ہنسی بھی آ جاتی۔ محفل میں اینٹ اٹھائیں تو ایک دو وصلی نکل آتے ہیں، اس بار بھی ایک عدد اپنی بھاری توند کے ساتھ گھسے بیٹھے تھے۔ طاہرہ آنٹی میں ان بڑوں کا ادب ضرور کرتی ہوں جو اس قابل ہوں۔ پتا نہیں کس کے بہکاوے میں آ کر آپ نے مجھ معصوم پر اتنے طعنے تشنے مار دیے۔ آخری خط دکھی آتما کا تھا جو کہ ایک بار پھر نا معلوم آگ میں جل رہے تھے۔ سب سے پہلی کہانی اپنے فیوریٹ رائٹر امجد رئیس کی پڑھی جو کہ اس بار بھی بڑے ہی مزے کی تھی۔ ثنالی بیسٹ تھی۔ مزہ آیا اس ٹرانسلیشن کا۔ انگارے پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ مجھے تو سیف کے مرنے کا بہت افسوس ہوا۔ بہت اچھی قسط تھی۔ آوارہ گرد اس بار مذاقیہ سی تھی پھر بھی اچھی نہیں لگی۔ ایک موٹر بوٹ پر انڈیا سے پاکستان پہنچ جانے والے کراچی سے ملتان نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔ ہونہہ...... بے کار اپی سوڈ۔ انگلش کہانیوں میں ابھی صرف سائے کی گواہی اور خطرہ پڑھی ہیں جو بہت اچھی لگی ہیں۔ باقی کہانیوں پر باتیں اگلے خط میں کروں گی۔''

سرگودھا سے اسد عباس کی باتیں ''خلافِ معمول اس بار 25 مئی کو ہی جاسوسی کے درشن ہو گئے۔ گو کہ ایم اے راحت صاحب کی وفات کی خبر سوشل میڈیا کے ذریعے پہلے ہی مل چکی تھی مگر جاسوسی کے صفحات پر ایک بار پھر پڑھ کر دل غم کی شدت سے بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ ذاکر انکل بھی شاید ایان علی سے متاثر لگتے ہیں۔ حسینہ میں ایان علی کی جھلک واضح نظر آ رہی تھی۔ اشتہارات سے کنی کترا کر خطوط کی محفل میں جھانکی ماری تو اپنے شفقت صاحب کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ نوال اینڈ مشال کا تبصرہ کچھ گھریلو قسم کا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے سے ابتدا کی۔ مغل صاحب اپنی فارم میں واپس آ رہے ہیں۔ اس بار قربانی کی ابتدا سیف کی موت سے ہوئی۔ تشدد اور خون ریزی سے بھرپور قسط نے اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ نیلا دائرہ امجد رئیس کا مخصوص انداز۔ غیر متوقع انجام اور سسپنس سے بھرپور

ناول۔ آسکر مارکیڈو کو آخر تک ولن ہی سمجھتے رہے اور بین راب کو ایک مظلوم۔ جوانجانے میں مافیا کے ہتھے چڑھ گیا۔ مگر راب ہی سب سے بڑا کھلاڑی نکلا۔ راب کی پلاننگ تو کافی جاندار تھی مگر نتالی نے پروڈکشن پروگرام میں نہ جا کر ساری پلاننگ گڑبڑ کر دی۔ نتالی جنہیں ساری عمر ماں باپ سمجھتی رہی وہ چچا اور خالہ نکلے۔ اور جنہیں چچا اور خالہ سمجھتی رہی وہی اس کے حقیقی ماں یا باپ تھے۔ گریگ کا کردار کچھ مختصر سا لگا مگر کہانی کے لحاظ سے مناسب تھا۔ سائے کی گواہی، گریگ اپنے ہی بیان کی وجہ سے پھنس گیا۔ خطرہ، ڈیوڈ صاحب جس خطرے سے ڈر رہے تھے وہ تو ان کے پاس ہی موجود تھا۔ بھلا ہو سارجنٹ کارلوس کا جس نے عین وقت پر آ کر ڈیوڈ کی جان پروفیسر مارتھر سے بچائی۔ پروفیسر مارتھر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بعض اوقات خطرہ انسان کے بالکل قریب ہوتا ہے اور اسے آخری وقت تک احساس نہیں ہوتا۔ وہی خدا ہے، مرحوم ایم اے راحت صاحب کی عمدہ تحریر تھی۔ الیاس کا انتقام لینے کا طریقہ کار غلط تھا۔ تاہم جب اسے احساس ہوا کہ اس سے گناہ کبیرہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے گناہ کی سزا بھگتنا چاہتا ہے تو قدرت نے بھی اس کی غیبی مدد کر دی۔ نہ صرف اس کی بہن زندہ تھی بلکہ سیٹھ احتشام بھی مکافات عمل کا شکار رہا۔“

اعتزاز اینڈ زریاب کی تاندلیانوالہ سے ذرہ نوازی ”ماہِ مبارک کی پُرنور شام کو جاسوسی ہاتھ میں آیا تو دل خوشی سے کھل اٹھا۔ ٹائٹل پر آدھا چہرہ زلفوں میں چھپائے... ایک آنکھ والی حسینہ عاقب وصلی کی بھابی بننے کے لائق تھی (شرماتے ہوئے)۔ حسینہ کے سر میں تالا لگا کر شاید جوئیں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ساتھ میں گورے گورے مکھڑے پہ گورا گورا چشمہ پہنے ایک بھائی صاحب موجود تھے۔ مدیر اعلیٰ ہندوؤں... کی مذہبی انتہا پسندی پر غصے میں دکھائی دیے۔ ہم آپ کی بات سے متفق ہیں۔ محفل کا تاج شفقت محمود کے سر سجا۔ مبارکباد اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ایمانے زارا شاہ نے ویسٹ انڈین ٹیم کی طرح جارحانہ تبصرہ لکھا، ویلڈن۔ سعدیہ قادری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ مرحا گل رمنا گل ویری گل اوہ سوری مطلب ویری گڈ۔ محمد صفدر معاویہ اتنے لمبے تبصرے میں ہمارا نام لکھتے ہوئے روزہ زیادہ تنگ کرتا ہے؟ ادریس احمد خان کا کہانیوں پر تبصرہ پسند آیا۔ نوال اینڈ مشال نے اچھا تبصرہ کیا مگر کزن کی وضاحت کر دیتی تو بہتر تھا۔ سید عبادت کاظمی آپ سے ہونے والی ملاقات یادگار رہی۔ بہت شکریہ آپ ہمارے لیے اتنا لمبا سفر کر کے آئے۔ محفل میں عاقب کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ خوش آمدید وڈے ویر۔ باقی لوگوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ مومنہ کشف آنٹی اس دفعہ نظر نہیں آئی۔ ہمیں ان کی بڑھتی عمر کے بارے میں تشویش لاحق ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی اور رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ سیفی کی موت اور وہ بھی اپنے ہی استاد جی کے ہاتھوں، ایسٹرن نے سیف کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ ہمارا دل توڑ دیا۔ رائے زل کے ہم شکل والی بات عجیب لگی۔ دیکھتے ہیں اب شاہ زیب ہانا دانی کے چنگل سے کیسے بچتا ہے۔ آوارہ گرد کی یہ قسط پچھلی کچھ اقساط سے بہتر رہی۔ شاہنواز اور شہزی کا ٹکراؤ دلچسپ رہے گا۔ امید ہے شہزی ہمیشہ کی طرح یہاں سے بھی اپنے ساتھیوں کو بچا لے جائے گا۔ دوسرا رنگ زویا اعجاز کی کاٹ دار تحریر نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ مصنفہ کا انداز روز بروز پختہ ہوتا جا رہا ہے۔ اپر کلاس کے بخیے ادھیڑتی سبق آموز تحریر نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ارحم، مہک اور روحینہ جیسے کردار ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ ویری ویلڈن زویا اعجاز۔ پہلا رنگ ہلکی پھلکی پر انڈیا کی پرانی مزاحیہ فلموں سے متاثر تحریر ٹھہری۔ ایک جیسے جملوں کی گردان اور اتفاقات کی بھرمار نے بور کیا۔ اینڈ مزے دار تھا۔ اولین صفحات پر امجد رئیس نیلا دائرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ خوبصورت کرداروں سے سجی اور تیزی سے بدلتے واقعات کے ساتھ نیلا دائرہ بلاشبہ اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ ایسی سسپنس سے بھرپور تحریریں جاسوسی کا خاصہ ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں منظر امام کی اجنبی معمول سے ہٹ کر منفرد تحریر تھی۔ اینڈ نے چونکا دیا۔ ایم اے راحت کی تحریر وہی خدا ہے خوبصورت تحریر تھی۔ حالات کی گردش اور ضمیر کی خلش ایک عام آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ سائے کی گواہی میں ایک چھوٹے سے جھوٹ نے قاتل پکڑوا دیا۔ اس کے علاوہ پسِ جہاں اور بے وفائی کا گھاؤ شاندار رہیں۔ مجموعی طور پر جون کا شمارہ زبردست رہا۔“

کراچی سے توصیف علی کی کھری کھری باتیں ”جون کا شمارہ چھبیس تاریخ کو ہی مل گیا۔ خوبصورت اور جاسوسی ڈائجسٹ کے شایانِ شان ٹائٹل دیکھ کے دل میں انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے تو چیں نکتہ چینی کا مطالعہ کیا کہ خطوط میں اپنا نام دیکھنے کی امید جو تھی۔ کافی لوگوں نے میرا ذکر کیا ان کا جواب حاضر ہے۔ نوال اینڈ مشال کو ہماری ماضی کی یاد اچھی لگی، ان کی یہ بات ہمیں بھی اچھی لگی۔ ویسے تو شاعر کہتا ہے کہ یادِ ماضی عذاب ہے یارب لیکن کبھی کبھی ماضی کو یاد کر لینا چاہیے۔ چاہے تلخ ہو یا خوشگوار، ماضی کی یاد انوکھا اثر ہی چھوڑتی ہے۔ عبدالجبار آپ کو ہم سے مل کے خوشی ہوئی ہمیں آپ کے اس خوشی کے اظہار سے خوشی ہوئی۔ کوشش کریں گے کہ آپ کو یہ خوشی ہر ماہ نہیں تو کسی کسی ماہ دیتے رہیں۔ عبادت کاظمی، آپ کو ہمارا تبصرہ طاہرہ گلزار کے مقابلے کا لگا۔ کیسے، یہ سمجھ نہیں آئی۔ اچھا تھا وضاحت کر دیتے۔ عاقب سلیم میں نے اتنا طویل تبصرہ پڑھنے کے لیے بھیجا تھا آنکھیں سکیڑ کے دیکھنے کے لیے تو نہیں۔ طاہرہ گلزار، میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے ملک کے مختلف شہروں کا چکر لگانا پڑتا ہے۔ کام کے سلسلے میں ہی راولپنڈی گیا تھا۔ اگر آپ کی وراثت میں لمبی چوڑی جائیداد یا رقم وغیرہ ہے تو آپ کا جانشین بننا منظور ہوگا ہمیں، ہاہاہاہا۔ لگتا ہے تبصرے میری طرح آپ بھی بہت طویل لکھنے کی عادی ہیں اور آپ کے الفاظ سے خلوص کی خوشبو متاثر کن لگی۔ احسان سحر کا لگتا ہے گرمی سے دماغ چل گیا ہے، یا شاید پیدائشی خرابی ہے جو احمقانہ قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ شفقت محمود، ایمانے زارا، طاہرہ گلزار، عبادت کاظمی، عبدالجبار، صفدر معاویہ سمیت تمام دوستوں کے تبصرے ماسوائے احسان سحر کے بہت اچھے رہے، سب سے یہ ادھوری ملاقات بہت مزے کی رہی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ فہرست کے بغور مطالعے کے بعد نظر جس کہانی پہ جا کے ٹکی وہ فاروق انجم کی مظلوم عاشق تھی۔ یہ نام سے بھی دلچسپ لگ رہی تھی اور ساتھ مزاحیہ کا ٹیگ پڑھ کے تو ہمارے منہ میں پانی آ گیا۔ کہانی پڑھنا تو بہت شوق سے شروع کی مگر معذرت کے ساتھ ابتدا میں ہی بچگانہ اندازِ تحریر نے سارا شوق ہوا

کر دیا۔ کچھ بہتری کی امید میں کہانی کا مطالعہ جاری رکھا۔ ایک نام کی مزاحیہ تحریر جو کہ اصل میں مزاحیہ نہیں تھی جس میں اچھی چیز بس واقعات ہی تھے۔ اگر یہی واقعات کوئی منجھا ہوا مصنف پیش کرتا تو کہانی کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔ دوسرا رنگ زویا اعجاز کے قلم کا اعجاز تھا۔ یہ کہانی جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھی۔ مصنفہ اپنے اندازِ تحریر سے کہنہ مشق لگتی ہیں۔ بس ایک غلطی کر گئیں کہ ایک طرف تو رازاق اور اس کے سسر کو گارمنٹس بزنس کا ستون قرار دیا دوسری طرف رزاق کو ایک چھوٹے سے بوتیک کا مالک قرار دے دیا جو ادھر ہی بیٹھتا بھی تھا۔ اس غلطی سے قطع نظر کہانی شاندار تھی۔ اولین صفحات پہ امجد رئیس نے نیلا دائرہ کے نام سے ترجمہ کر کے ترجمے کا حق ادا کرا دیا اور آپ نے شائع کر کے ابتدائی صفحات کا حق ادا کر دیا۔ مغربی کہانیوں میں عام طور پر فیملی اور اس کے متعلق جذبات کو اتنا اجاگر نہیں کیا جاتا۔ اس کہانی کی سب سے خاص بات ہی یہی لگی۔''

ملتان سے عائشہ الحمیرا کی یادش بخیر رُوداد ''جاسوسی سی شناسائی کتنی پرانی ہے، یہ تو یاد نہیں۔ یاد ہے تو بس اتنا کہ یہ دوستی ہم نہیں توڑیں گے۔ توڑیں گے دم مگر جاسوسی کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ جون کا جاسوسی کب ملا یہ تو یاد نہیں۔ یاد ہے تو بس اتنا کہ اسے پاتے ہی دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ ٹائٹل پر سنیل شیٹی کے نقوش جیسا ہیرو پلاسٹک کا دس روپے والا چشمہ لگائے، سنکی بالوں والی ہیروئن کو ستائشی نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔ ہیروئن کی لپ اسٹک بھی ذرا سستے برانڈ کی ہی لگی۔ سب سے پہلے امجد رئیس کی نیلا دائرہ پڑھی۔ پیچ دار کہانی۔ الجھاؤ نے توجہ کسی اور طرف نہ ہونے دی۔ ایک ہی نشست میں اس کہانی کو ختم کر دیا۔ زبردست پلاٹ۔ مجموعی طور پر اس کہانی نے باندھ کر رکھ دیا۔ سائے کی گواہی جیسا کہ جاسوسی کہانیوں میں اکثر ڈائیلاگ بولا جاتا ہے کہ قاتل کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ گریگ کو بھی اس کی اپنی کہی ہوئی بات نے پکڑوا دیا اور یوں ایک سایہ قاتل کے خلاف گواہی بن گیا۔ خطرہ اچھے ٹوئسٹ کے ساتھ اچھی کہانی تھی۔ کچھ باتیں ہضم نہیں ہوئیں پھر بھی پڑھتے ہوئے مزہ آیا۔ ایم اے راحت کی وہی خدا ہے بہت افسانوی کہانی لگی۔ اتفاقات کی بھرمار کر دی گئی۔ پہلے الیاس سیٹھ کی بیٹی کو مارتا ہے۔ پھر پتا چلتا ہے کہ وہ بیٹی نہیں، سیٹھ کو مارنے عورت آئی تھی۔ یہاں مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ وہ سیٹھ کو کیوں مارنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد جب وہ اقبالِ جرم کرنے جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ سیٹھ بھی مر چکا ہے اور اس کی بہن بھی زندہ ہے۔ واہ واہ۔ تکنیکی اعتبار سے کہانی کمزور لگی۔ محبت کا گھاؤ، عکس فاطمہ کی اچھی کوشش تھی۔ لڑا تے بدلہ لے لیا لیکن عین موقع پر اپنی غلطی کی وجہ سے پکڑی گئی۔ منظر امام کی اجنبی ایک ایک سطر میں تجسس لیے ہوئے تھی۔ زبردست کہانی لگی۔ فاروق انجم کی مظلوم عاشق مزاح کا ہلکا رنگ لیے ہوئے تھی۔ احتشام نے بالآخر یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں بھاگ دوڑ کر کے اپنی محبت کو پالیا۔ سرورق کے رنگ جیسی کوئی خاصیت نہیں تھی۔ تاہم اسے ایک مزاحیہ کہانی کہا جا سکتا ہے۔ سب سے آخر میں زویا اعجاز کو پڑھا۔ آخری کہانی نے اخیر کر دی۔ قیمت میں جاسوسی کہانی کا ہر عنصر موجود تھا۔ پلاننگ، قتل، انوسٹی گیشن، ایکشن، سسپنس، اپر کلاس کا نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا، نچلے طبقے کی بے بسی جب ناقابلِ برداشت ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟ زویا اعجاز نے کمالِ طریقہ سے لکھا۔ ایک مکمل کہانی جو ہر لحاظ سے سرورق کے رنگ ہونے کا حق ادا کر رہی تھی۔ کمال است۔''

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کا مطالعہ ''اس بار جاسوسی کے ٹائٹل پر ایک چالاک حسینہ بال بکھرائے کسی کی منتظر تھی۔ اس کے پیچھے خرانٹ صورت بابا حرام مونچھ قفل کو چابی لگاتے ہوئے دولت سمیٹنے کے چکر میں تھا۔ فہرست میں تصاویر کا انداز خوب تھا۔ 70ء کی دہائی میں جاسوسی ڈائجسٹ نے عوام الناس کی کثیر تعداد کو مطالعہ کے شوق کی طرف راغب کیا۔ جاسوسی کے دامن میں سمٹی رنگا رنگ کہانیوں نے ڈائجسٹ پسندی کا کریز پیدا کیا۔ صدیوں کا بیٹا کے طویل سلسلے سے ایم اے راحت نے بھی خوب حصہ لیا، افسوس وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ سب سے پہلے طبیعت خطرہ کی طرف مائل ہوئی۔ کہانی دلچسپ، سنسنی خیز اور تجسس سے بھرپور تھی لیکن پروفیسر کے اپنے پڑوسی کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ (کیونکہ وقت اسی کام میں گزرتا ہے) قارئین نے بھرپور دلچسپی سے تبصرے قلم بند کیے۔ جن احباب نے میرا تذکرہ تحریر کیا میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔ ادارتی گفتگو فکر انگیز اور جھنجوڑ دینے والی تھی۔ مذہبی جنون خطرناک اور جہالت سے بھرپور ہے۔ انگارے اور آوارہ گرد کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ فرض شناس کا آغاز اچھا تھا آگے چل کر کہانی سپاٹ اور خشک ہو گئی۔ پس جہاں اچھی کاوش ہے۔ شاطرانہ چال بھی سسپنس فل تھی۔ وہی خدا ہے ایم اے راحت کی اچھی تخلیق ہے۔ نیلا دائرہ، مظلوم عاشق، قیمت اور سائے کی گواہی ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

کراچی سے اورلیس احمد خان کی توصیف ''جاسوسی ڈائجسٹ کا دیدار ہوا جو کہ دیدہ زیب رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب کی کاوشوں کا بھی ذکرِ خیر کہ ان کی مہارتوں کا ثبوت ٹائٹل ہوتا ہے۔ اندر کے صفحات پر اداریہ اور چینی نکتہ چینی سے بھی بہرہ مند ہوئے۔ سرِفہرست شفقت محمود صاحب کو مبارک باد۔ رمضان مبارک کی رحمتیں اور برکتیں جاری وساری ہیں۔ ایسے گرم موسم میں الامان الحفیظ لوڈشیڈنگ کا عذاب بھی سروں پر لٹکتی تلوار بنا ہوا ہے جس کا کوئی ٹائم مقرر نہیں ہے۔ ایم اے راحت کا انتقال ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ دوستوں کا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار آپ کا شکریہ آپ کی حاضری بھی کم لگ رہی ہے؟ جاسوسی کے سب ہی دوستوں کو پُرخلوص سلام اور رمضان شریف اور عیدالفطر کی خوشیاں مبارک۔ سرورق کی کہانی نیلا دائرہ خوب صورت کہانی تھی۔ نثالی نے ہمت و بہادری سے کڑے حالات کا مقابلہ کیا پھر محنتوں کا اجر بھی ضرور ملتا ہے۔ سائے کی گواہی اور فرض شناس بھی منفرد کہانیاں تھیں۔ اس سے آگے بڑھے تو طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے تھی جس کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ خطرہ بھی بہتر تھی اور ایم اے راحت کی تحریر وہی خدا ہے خوب صورت تحریر تھی بہت اچھی لگی۔ پس جہاں بھی اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد آوارہ گرد مقبولِ عام تحریر جس نے کائی مہینوں سے سحر پھونک رکھا ہے۔ بے وفائی کا گھاؤ اور شاطرانہ چال بھی

اچھی تحریریں تھیں۔ اجنبی، ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ منظر امام کی تحریر دل موہ لیتی ہے۔ فاروق انجم کی تحریر مظلوم عاشق بہتر انداز میں لکھی ہوئی کہانی تھی۔ زویا اعجاز تسلسل سے لکھ رہی ہیں اور خوب لکھ رہی ہیں۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی خامہ فرسائی ''جون کا جاسوسی مئی 27 کو پشاور صدر بازار سے جا کر خریدا۔ سرورق کو اتنی خوب صورت ماڈل سے سجایا گیا کہ

تیرے جلوے دیکھ کر یوں بکھرا ہوں
آج سالوں بعد بھی ادھورا ہوں میں

ساتھ میں مرد کے کان میں تالا لگا کر جاسوسی کی روایت برقرار رکھی۔ فہرست پر نظر ڈالی بہترین مصنفوں سے باغیچہ سجا ہوا تھا، آپ کا اداریہ پڑھا آپ کو بھی رمضان کی بہت بہت مبارک ہو۔ واقعی موذی کی حرکتیں قابل افسوس ہیں پر باطل جتنا بھی طاقتور ہوا آخر وہ اسلام کے مقابلے میں برباد ہوا ہے۔ اب افغانستان (بے شک آج کل یہ بھی ہمارا مخالف ہے) کشمیر، فلسطین، برما اور دیگر مسلم ممالک میں یہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے ہیں انشاء اللہ آئندہ بھی یہ ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے کیونکہ رب کی لاٹھی بے آواز ہے وہاں دیر ہے اندھیر نہیں بس طلوع سحر ہونے کو ہے کفر کا اندھیرا چھٹنے کو ہے۔ محفل میں آئے تو کمالیہ سے کمال کرتے ہوئے شفقت محمود کو پایا۔ بہترین اور شاندار تبصرہ تھا۔ ایمانے زارا شاہ کا دلکش اور تھوڑا جذباتی تبصرہ اچھا لگا۔ ہم سب کا دل کشمیر کے ساتھ ہے۔ سعدیہ قادری کا خوب صورت انداز میں مختصر پیغام اللہ پاک آپ کی والدہ محترمہ کو صحتِ کاملہ عطا کریں آمین۔ مرحا گل اور رمنا گل بھی چٹ پٹے اور تھوڑا میٹھے تبصرے کے ساتھ محفل کو صحیح مرچ مصالحہ لگا رہی تھیں مطلب چار بلکہ ساڑھے چار چاند لگا رہی تھیں کیونکہ باقی تین صوبوں کی نسبت ادھر چاند ایک دن پہلے نظر آتا ہے اس لیے آدھا بڑھا دیا۔ ادریس احمد خان کی بہترین تبصرہ نگاری۔ ساگر تلوکر صاحب ہو سکتا ہے آپ کے پاس ٹائم نہ ہو یا پھر پین کی سیاہی ختم ہوگئی ہو اور احسان ہم پر لگا گئے۔ دوستوں کے لیے مختصر تبصرہ لکھا کہ جگہ نہ مارلوں۔ نوال اینڈ مشال کی بہترین انٹری۔ رومی بھائی اور شاہ صاحب کی بھی اپنی اپنی کریز پر بہترین بیٹنگ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ عاقب سلیم وصلی اور نامعلوم کو جاسوسی کی محفل میں ویلکم کہتے ہیں۔ کہانیوں میں شروعات کی انگارے سے جہاں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، رائے زل کو صحیح سلامت دیکھ کر ہمارے تو ارمانوں کے کئی خون ہو گئے اور پھر کیپٹن تبارک کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے کیپٹن اور سیفی زندگی ہار گئے پر قسطینا کا پتا نہ بتایا۔ شاہ زیب کا فیصلہ دیکھ کر دل دھک دھک کرنے لگا پر یہ سیفی اور شاہ زیب اینڈ کمپنی دونوں کے لیے بہتر تھا پر سیفی کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ شاہ زیب ابھی تک تو لگتا ہے ہاناونی سے بھی بچ گیا ہے اس کے بھائی کی مدد سے، آگے دیکھیں گے کہ کیا صورتِ حال بنتی ہے۔ پھر آوارہ گرد پڑھی، شہزی اینڈ کمپنی کراچی سے ملتان کے لیے روانہ ہوئے پر راستے میں لاڑکانہ میں جا کر پھنس گئے اور وہ بھی بری طرح۔ کیا ہیرا ایک مرتبہ پھر ہاتھ سے نکلنے والا ہے پر شہزی کے پاس رینجرز والا خصوصی کارڈ تھا وہ تھانے میں اس کو بھی تو استعمال کر سکتا تھا پر کیا کیوں نہیں۔ اولین صفحات پر مغربی کہانی نیلا دائرہ امجد رئیس کے قلم سے آئی۔ پل پل رنگ بدلتی اپنے کئی اتار اوچڑھاؤ کے ساتھ ایسی لازوال اور بہترین تحریر تھی جہاں حیرتیں بھی بے جا نہ تھیں اور سچ کا سامنا بھی مشکل تھا۔ ایسی تحریر جسے پڑھ کے بہت ہی مزہ آیا، ویری نائس امجد صاحب۔ جمال دستی کی فرض شناس بھی اچھی تحریر تھی۔ سلیم انور کی سائے کی گواہی بھی اچھی تھی۔ گریگ کو سائے نے مروا ڈالا۔ شاکر لطیف کی خطرہ میں ڈیوڈ پارکر کو اس کا دوست پروفیسر اس دنیا میں پہنچانے کا پکا انتظام کر چکا تھا اگر سارجنٹ کارلوس بروقت کارروائی نہ کرتا۔ ایم اے راحت مرحوم کی وہی خدا ہے اچھی تحریر تھی، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ تنویر ریاض کی پسِ جہاں، عکس فاطمہ کی بے وفائی کا گھاؤ، تمکین رضا کی شاطرانہ چال بھی اچھی رہیں۔ منظر امام کی اجنبی بھی عمدہ تحریر تھی۔ سرورق کے رنگ جاسوسی کے سنگ کا پہلا رنگ محمد فاروق انجم کی مظلوم عاشق ہنسی مذاق اور چہروں پر مسکراہٹ بکھیرتی تحریر کا اختتام بہت پسند آیا۔ سرورق کا دوسرا رنگ زویا اعجاز کے قلم سے قیمت آیا۔ عبدالباسط نے اپنے بھائی ہادی کی موت کے ذمے داروں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا پر افسوس اسے سچ بولنے پر جیل ہی میں مروا دیا گیا پر انسپکٹر سکندر نے وہ کام پورا کر دیا جو باسط سے ادھورا رہ گیا تھا۔ باقی مراسلوں اور کترنوں نے بھی جاسوسی کا مزہ دوبالا کر دیا اب اجازت۔''

احسان پور ضلع رحیم یار خان سے رانا بشیر احمد ایاز کی مصروفیات ''جون کا شمارہ ماہ صیام کی آمد کے ساتھ موصول ہوا۔ روزے کے سلسلے کے ساتھ شمارے کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے سوچا کہ ٹائٹل پر کچھ لفظ لکھ دیے جائیں۔ سب سے بڑی کمی تو رمضان کی مبارک باد کی محسوس ہوئی۔ سرورق کی حسینہ ماہ جبینہ اپنے بال بکھرائے، ہونٹوں کو سستی سی لپ اسٹک سے رنگین کیے اپنی سبز جھیل سی گہری ایک آنکھ سے ہمیں تکتی نظر آئی۔ لیکن اوپر موجود دس روپے والا چشمہ لگائے انکل پتا نہیں کیوں غصے میں تھے۔ تو اس لیے ہم نے جلدی سے محفل میں قدم رنجہ فرمانا مناسب سمجھا۔ جہاں اس دفعہ ہاٹ سیٹ شفقت محمود صاحب نے کمالِ مہارت سے سنبھالی ہوئی تھی۔ مبارکاں جناب۔ مرحا گل اور رمنا گل، منظر امام سے خفا لگ رہی تھیں۔ آپ نے منظر امام کو پڑھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں ہر مہینے ان کی تحریر کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ اپنے خط کو ڈھونڈا تو محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اس دفعہ مابدولت بلیک لسٹ میں ایک انوکھی وجہ کے ساتھ براجمان تھے بقول شاعر وہ کسی اور کے نصیب کی بارشیں میرے خط پر برس گئیں۔ باقی تبصرہ نگاروں میں عبدالجبار رومی انصاری، بھائی محمد صفدر معاویہ، سید عبادت کاظمی، وصلی برادرز، نوال اینڈ مشال بھی بہت اچھے رہے۔ ہم دو مہینے محفل سے کیا دور ہوئے اہلِ محفل نے تو گویا ہمارا نام ہی یکسر بھلا دیا۔ کسی نے بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے اے اہلِ محفل۔ (واقعی بالکل ٹھیک نہیں!) کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس پر نگاہ پڑی جہاں وہ نیلا دائرہ بنانے میں مصروف تھے۔ میں عام طور پر مغربی کہانیاں چھوڑ دیتا

ہوں لیکن امجد رئیس صاحب کو مغربی کہانیوں کا ترجمہ کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ بہترین کردار نگاری، ڈائیلاگز کا چناؤ، عمدہ پلاٹ اور جاندار منظر نگاری سے مزین کہانی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے پھر اس جون کی چلچلاتی گرمی میں انگارے کی طرف بڑھے۔ قسطینا نے آخر شاہ زیب کی بات مان کر کمانڈر فارس کی محبت کو محسوس کر ہی لیا۔ پکڑے جانے کے خوف سے لانچ کو سمندر میں دھکیلنے کے لیے جانے والے خود ہی اپنے جال بلکہ امریکیوں کے جال میں بری طرح پھنس گئے۔ کیپٹن تبارک گہری کھائی میں گر کر ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ شاہ زیب تبارک کو بچانے کے لیے نکلا تو سیف اپنی بے وقوفی کی وجہ سے ساتھ چلا گیا۔ تبارک اور سیفی نے جان پر کھیل کر بے پناہ تشدد برداشت کیا۔ اپنے ایسٹرن کنگ نے سیفی کو زہر دے کر ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔ راز کھلنے کا خطرہ اور تاجور کے ہاتھ سے نکل جانے کا۔ ایسٹرن نے گُٹ کھانے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ اب دیکھتے ہیں مادام بانا وانی سے کیسے بچتا ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی نے اپنی برق رفتاری کے ریکارڈ قائم کر رکھے ہیں۔ امریکا میں عابدہ کی رہائی کا ایک سہارا آنسہ خالدہ تھی اور وہ بھی پُراسرار طور پر گم ہوگئی ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ منظر امام اپنے ٹریک سے لگتا ہے کہ ہٹ گئے ہیں۔ اس دفعہ یورپی کہانی پر ہی اپنے فینز کو ٹرخا دیا۔ ڈیوسلاٹن کافی پُراسرار کردار ثابت ہوا لیکن کہانی اس دفعہ بس اوسی سی رہی۔ ایم اے راحت مرحوم کی آخری تحریر وہی خدا ہے کافی پُراثر رہی۔ سیٹھ احتشام روایتی سیٹھ ثابت ہوا۔ تو بہن کے لیے ڈاکا ڈال دیا۔ لیکن شاید زندگی میں کوئی نیکی اس کے کام آگئی کہ نہ صرف قتل کے الزام میں پھانسی سے بھی بچ گیا اور بہن کا آپریشن بھی مفت میں ہوگیا۔ سرورق کا پہلا رنگ فاروق انجم کے قلم سے اچھا رہا۔ کہانی میں کردار صرف زیادہ تر ضرب المثال بیان کرتے نظر آئے۔ معصوم خان پہلے صرف نام کا معصوم تھا مگر اینڈ میں بالکل معصوم ہوگیا۔ عارفہ کا کردار ٹھیک رہا۔ احتشام مظلوم عاشق نہیں بے وقوف اور احمق تھا۔ باقی تبصرہ شمارے پر ادھار رہا۔ چھوٹی کہانیاں اور دوسرا رنگ ابھی پڑھنا باقی ہے۔ فی الحال ماہِ صیام کی مصروفیات لکھنے کی اجازت نہیں دے رہی ہیں۔"

لاہور سے اشفاق شاہین کی پسندیدگی "27 کی صبح پہلی مرتبہ حسینہ جاسوسی کا دیدار ہوا۔ اس لیے کہ پہلی مرتبہ ہی خریدا اور محفل میں شامل ہونے کی کوشش بھی پہلی ہی مرتبہ کر رہے ہیں۔ امید ہے جاسوسی ستاروں کے جھرمٹ میں تھوڑی سی جگہ بھی مل ہی جائے گی (کیوں نہیں ملے گی، خوش آمدید) اصل میں تو ہمیں انگارے کی کشش کھینچ لائی۔ شفقت محمود کا تبصرہ بھرپور رہا۔ باقی تمام احباب بھی جانے پہچانے، خوب صورت تبصروں کے ساتھ موجود تھے امید ہے کہ آئندہ آنے والے دنوں میں ہم بھی یہاں جگہ بنا پائیں گے۔ سب سے پہلے انگارے ہی پڑھی، جیسا سنا تھا ویسا پایا، ایڈونچر، سنسنی، سسپنس، سب کچھ لیکن اس بار قسط تو مار دھاڑ سے بھرپور رہی۔ تبارک اور سیف تو جان سے گئے، شاہ زیب ہنوز پریشانیوں میں گھرا ہے۔ داستان کا خلاصہ پڑھا تو ہے امید ہے جلد ہی داستان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں گے، واقعی انگارے بہرحال بہترین ہے۔ پھر آوارہ گرد کو چنا۔ ڈاکٹر صاحب خوب لکھتے ہیں۔ شہزی زمیندار اور پولیس کے شکنجے میں بری طرح جکڑا ہوا، شکیلہ بھی قابو میں آگئی۔ اب ان کے بچ کے جانے کی کیا صورت ہے بہرحال یہ بھی کافی دلچسپ ہے خصوصاً شہزی، کہ پتا بھی ہے کہ آگے خطرات ہیں ڈھیر لیکن پھر بھی کود پڑنا، یہ واقعی ہمت و حوصلے کا ہی کمال ہے۔ فاروق انجم کا مظلوم عاشق پہلا رنگ مزاح کے ٹچ کے ساتھ اچھا رنگ تھا۔ اینڈ بھی عمدہ رہا۔ میرا خیال تھا کہ احتشام کو اپنے چچا سے اپنی زمینوں کا حساب لینا چاہیے تھا، خیر پل پل رنگ بدلتی یہ تحریر بہت دلچسپ اور مزے دار رہی۔ قیمت زویا اعجاز کی، سرورق کی کہانی بہت عمدہ، سبق آموز، ارحم، مہک جیسے کردار آج بھی ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ رزاق، روحینہ دونوں ہی ایک جیسے کردار۔ ہادی قابلِ رحم اور عبدالباسط بہترین لگا۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ منظر امام کی اجنبی پُراسرار تھی، مزہ دے گئی۔ وہی خدا ہے ایم اے راحت کی بہترین تحریر۔ باقی مختصر کہانیاں بھی خوب تھیں۔"

کراچی سے محمد اقبال کی باتیں "جاسوسی ڈائجسٹ مئی کے آخر میں ہاتھ آگیا، رمضان کی شروعات ہیں اور روزے کے ساتھ نماز کی ادائیگی کو باجماعت بنانا جتنا ضروری ہوتا ہے اتنا ہی قرآن پاک کی تلاوت کو بھی معمول بنانا ضروری ہوتا ہے، تاکہ عام روٹین سے ہٹ کر روزمرہ زندگی میں تبدیلی محسوس ہو مگر اس کے باوجود اپنے جاسوسی کے لیے بھی ٹائم نکالا اور روزے کی وجہ سے ٹائٹل پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے فہرست میں پہنچے جہاں ابتدائی صفحات پر امجد رئیس کا نام چمک رہا تھا، جو جاسوسی کے لیے نیلا دائرہ لیے موجود تھے، ہمیں ان کی کہانیوں کا انتظار رہتا ہے۔ یہ مغربی تراجم بہت عمدہ انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ابتدا ان کی کہانی سے کی اور دو نشستوں میں اس سنسنی خیز داستان کو مکمل کیا۔ بہترین اسٹوری تھی جس نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس کے بعد اپنے من پسند رائٹر جاوید مغل کی انگارے شروع کی جس میں انہوں نے انگارے دہکا رکھے تھے۔ تبارک اور سیف کی اموات نے افسردہ کر دیا۔ سیفی کا یہ انجام متوقع تھا مگر اس طرح نہیں، بہت دکھ ہوا۔ ایسٹرن کنگ نے قبرکی ملکہ کا پہلا وار تو ناکام کر دیا اور شاید اپنے لیے نئے مصائب کو آواز دی ہے۔ آوارہ گرد کافی بہتر ہوگئی ہے، شہزی پھر مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ لیکن مصیبتوں میں کس طرح تیر کر اپنی جان بچانی ہے یہ شہزی خوب سیکھ گیا، اس لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب کس طرح اسے نکالتے ہیں یہ دیکھنا ہے۔ رنگوں میں فاروق انجم ہلکی پھلکی تحریر مظلوم عاشق لیے حاضر تھے، کہانی کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ دوسرا رنگ قیمت، زویا اعجاز کی بہترین کاوش تھی۔ مختصر کہانیوں میں ایم اے راحت کی وہی خدا ہے بہت پسند آئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور جو مسلمان دنیا سے رخصت ہوئے ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

سلمان قادری، کراچی۔ سونیا جنید، کوٹری۔ جنید احمد ملک، کراچی۔ انس آفتاب حیدر آباد۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ عادل عباسی بہاولپور

زندگی کے پرخار راستوں پر چلتے چلتے چور ہو جانے والے مجرم کا آخری سفر

پُرخار راستے

ایچ اقبال

بعض اوقات خواہش کی لہریں حقیقت کے ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں اور جھاگ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا... دریا متلاطم رہے اور دستِ ساحل خالی... محبت... شناخت اور انتقام کی تکون کے حامل ایک ایسے ہی نوجوان کی داستانِ حیات... تعمیر اور تخریب کی خرابیاں اسے مسلسل گردش میں رکھے ہوئے تھیں... کبھی یہاں... کبھی وہاں... دنیا کے ہجوم میں اسے اپنے بھی ملے اور پرائے بھی... دوست بھی اور دشمن بھی... بس وہی مل کے نہیں دے رہی تھی... جسے حاصل کرنا اس کی زندگی تھی... اس کا وجود بے وجودی کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ آباد ہونا چاہتا تھا... مگر برباد ہونا شاید اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا تھا...

رات اپنے دوسرے پہر میں داخل ہونے کو تھی۔

تاجو نے لینڈ کروزر مرکزی شاہراہ سے اس طرف موڑی جہاں شیریں کا گھر تھا اور اس طرف مڑتے ہی چونک گیا۔ شیریں کے گھر کے قریب ہی تین افراد دکھائی دیے تھے جن کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ اپنے تجربے کے سبب وہ تینوں تاجو کو مشکوک معلوم ہوئے۔

وہ کھڑے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے، جیسے کہیں قریب ہی رہتے ہوں یا سرِراہ مل گئے ہوں۔ ان میں سے ایک آدمی کا رخ تاجو کی لینڈ کروزر کی طرف تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کیے ہوئے تھے، جیسے کمر پر باندھ لیے ہوں۔ اس طرح کھڑا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن تاجو کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ اس طرح کوئی چیز چھپائی گئی تھی اور وہ چیز کسی قسم کا اسلحہ ہی ہو سکتی تھی۔

سڑک پر اِکا دُکا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ چوکیدار قسم کے کئی افراد مختلف بنگلوں کے پھاٹکوں پر بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔

تینوں مشکوک آدمیوں کو دیکھتے ہی تاجو نے بریک لگائے۔ اس طرف مڑتے ہوئے لینڈ کروزر کی رفتار بہت کم تھی اس لیے بریک لگاتے ہی ایک

ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ تاجو نے ریورس گیئر لگایا اور لینڈ کروزر کو پیچھے کی طرف دوڑا دیا۔ اسی وقت پے در پے دو فائر ہوئے۔ ایک گولی ونڈ اسکرین کا شیشہ توڑتی ہوئی اس کے بائیں بازو کو زخمی کرتی ہوئی، نشست کے عقبی حصے میں دھنس گئی اور دوسری اس کے سینے پر لگی۔

تاجو نے دیکھ لیا کہ فائر کرنے والا وہی شخص تھا جو اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کیے کھڑا ہوا تھا لیکن اب اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل دکھائی دے رہی تھی۔ فائر اسی رائفل سے کیے گئے تھے۔

سینے پر لگنے والی گولی سے تاجو کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچا کیونکہ وہ کوٹ کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ کہیں بھی باہر نکلتے وقت وہ اس وقت سے بلٹ پروف جیکٹ پہننے لگا تھا جب سے حکومت نے اس کے سر کی قیمت پچاس لاکھ روپے لگائی تھی۔ اس کا شمار حد درجہ خطرناک مجرموں میں کیا جانے لگا تھا۔

جب تیسری گولی چلائی گئی، اس وقت لینڈ کروزر مرکزی شاہراہ پر مڑ رہی تھی اس لیے اس گولی کا نشانہ خطا گیا۔

تاجو نے بریک لگا کر فرسٹ گیئر لگایا اور لینڈ کروزر تیزی سے دوڑا دی حالانکہ اس سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔

فوراً ہی پے در پے کئی فائر ہوئے جو لینڈ کروزر کے عقبی حصے میں لگے۔ تاجو نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ اس کے عقب میں ایک پولیس موبائل تھی۔ فائر یقیناً اسی سے کیے گئے ہوں گے۔

مخبری، تاجو نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔

پولیس موبائل اس کے پیچھے لگ چکی تھی۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ اسے گرفتار کرنے یا ختم کرنے کے لیے باقاعدہ تیاری کی گئی تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس کا شیریں کے گھر کی طرف جانا پولیس کے علم میں آچکا تھا۔

گولیاں چلنے کی آوازوں سے اس سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور بھی گھبرا گئے۔ کسی نے اچانک بریک بھی لگائے اور اسی وجہ سے لینڈ کروزر ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ یہ تاجو کی ماہرانہ ڈرائیونگ تھی کہ حادثہ نہ ہو سکا۔

ٹریفک کے باوجود تاجو لینڈ کروزر کو لہراتے ہوئے دوڑا رہا تھا۔

پولیس موبائل اب سائرن بجانا بھی شروع کر چکی تھی تاکہ سڑک پر چلتی ہوئی دوسری گاڑیاں اس کے راستے میں نہ آئیں۔

فائرنگ دوبارہ نہیں کی گئی کیونکہ اس کی زد میں کوئی دوسری کار بھی آسکتی تھی۔

تاجو کو اس وقت زخمی بازو کی تکلیف کا دھیان ہی نہیں رہا تھا کیونکہ معاملہ تو اب زندگی بچانے کا تھا۔ اس کے دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے یقین کے مطابق تعاقب میں آنے والی پولیس کا وائرلیس بھی اب کام کرنے لگا ہوگا۔ دوسری پولیس موبائلوں سے رابطہ کیا جارہا ہوگا تاکہ ان کے ذریعے تاجو کو ہر طرف سے گھیرا جاسکے۔

پولیس کو اس طرح کامیابی ہو سکتی تھی اس لیے ضروری تھا کہ تاجو لینڈ کروزر سے اتر کر کسی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے۔ اس نے گاڑی بائیں جانب کی ایک سڑک پر موڑتے ہوئے زخمی بازو والے ہاتھ ہی سے موبائل بھی نکال لیا تھا۔

پولیس موبائل بھی اس کے تعاقب میں اسی طرف مڑی تھی۔ اس سڑک پر گاڑیاں بھی اِکا دُکا ہی آجارہی تھیں۔ پولیس موبائل سے اس پر پھر فائرنگ کی جاسکتی تھی۔

''بلیک برڈ کالنگ۔'' اس نے ماؤتھ پیس میں تیزی سے کہا۔ ''فیز فور، لائٹ آف۔'' اور موبائل بند کرتے ہوئے اپنی گود ہی میں گرا کر اس ہاتھ سے بھی اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

سائرن کی آواز کے ساتھ فائرنگ پھر شروع کر دی گئی۔ کچھ گولیاں لینڈ کروزر کی باڈی میں پیوست ہو رہی تھیں اور کچھ عقبی شیشہ توڑ کر لینڈ کروزر کے اندر بھی آرہی تھیں۔ اس لیے تاجو نے اپنا سر، اسٹیئرنگ پر جھکا لیا تھا اور آنکھوں کے ڈھیلے اوپر اٹھا کر سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسے سامنے سے آتی ایک پولیس موبائل نظر آگئی۔ یقینی طور پر اسے گھیرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

سامنے سے آنے والی پولیس موبائل سے کی جانے والی فائرنگ اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے اس کا سینہ تو محفوظ تھا لیکن کوئی گولی سر میں بھی لگ سکتی تھی۔

دائیں جانب ایک پتلی سی گلی نظر آئی تو تاجو نے لینڈ کروزر اس طرف موڑ دی اور اسی وقت سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

تاجو نے بریک لگائے۔ لینڈ کروزر ایک دھچکے سے رکی۔ تاجو دروازہ کھول کر باہر کود گیا لیکن کودنے سے پہلے وہ اپنا موبائل جیب میں ڈالنا اور پہلو کی نشست پر رکھا ہوا فور بیرل پسٹل اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

اس نے گلی در گلی بھاگنا شروع کیا۔ اس کے پیروں میں کریپ سول جوتے تھے اس لیے اس کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بائیں بازو سے خون رس رہا تھا جو اس کی جیکٹ اور اس کے نیچے قمیص کی آستین میں جذب ہو رہا تھا۔ خون رسنے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی کہ وہ زمین پر ٹپکنا شروع ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس ٹارچ کی روشنی میں خون کے دھبے دیکھتی ہوئی اس کا تعاقب جاری رکھ سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی خالی لینڈ کروزر دیکھ کر پولیس نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ نکلا ہے۔

گلی در گلی مڑنے کے باعث اسے بڑی حد تک اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ پولیس کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے علاقے میں اندھیرا نہ کروا دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ اسے بھاگ نکلنے میں دشواری پیش آتی۔ یہ بندوبست اس نے کچھ عرصے پہلے کیا تھا کہ پاور ہاؤس اور علاقائی سب اسٹیشن پر اس کے کارندوں میں سے کوئی نہ کوئی ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ انہی کی وجہ سے تاجو نے کئی موقعوں پر اندھیرا کروا کے اس کا فائدہ اٹھایا تھا۔

وہ اس علاقے کے کمرشل ایریا میں پہنچ گیا جہاں سہ منزلہ عمارتوں میں اپارٹمنٹس بنے ہوئے تھے۔ یہ کمرشل ایریا اس علاقے میں نہیں تھا جہاں اس نے اندھیرا کروایا تھا لیکن اس علاقے میں اس وقت لوڈشیڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرا اسے وہاں بھی مل گیا اور وہ جانتا بھی تھا کہ اس وقت اس علاقے میں تاریکی ہوگی۔

اب اس نے دوڑنے کے بجائے عام رفتار سے لیکن قدرے تیزی سے چلنا شروع کر دیا تھا۔

اس علاقے کی ساری دکانیں اس وقت بند نہیں ہوتی تھیں لیکن جب سے لوڈشیڈنگ کے وقت میں تبدیلی کی گئی تھی، لوگ ساڑھے گیارہ بجے دکانیں بند کر جاتے تھے۔ اِکا دُکا صرف وہ دکانیں کھلی رہتی تھیں جنہوں نے جنریٹر کا انتظام کر لیا تھا۔ تاجو نے ایسے راستے اختیار کیے تھے کہ اسے ان دکانوں کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔

بعض اپارٹمنٹس میں بھی جنریٹر یا یو پی ایس کا بندوبست تھا مگر ان کی روشنی اتنی نہیں ہوتی تھی کہ علاقہ روشن ہو سکے۔

تاجو کسی قدر آڑ میں ایک جگہ رکا۔ اس کمرشل ایریا میں آنے کے بعد اس نے خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے اپنا فور بیرل پسٹل پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا تھا۔ اب اس نے اپنی جیب سے ایک پنسل ٹارچ نکال کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد روشنی میں اپنا بازو دیکھا۔ رائفل کی گولی جس جگہ سے اس کے جیکٹ کی آستین پھاڑتے ہوئے اس کا بازو زخمی کر گئی تھی، وہاں سے رستا ہوا خون اب کہنی سے نیچے تک آ چکا تھا۔ یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ خون کے قطرے ٹپکنے لگتے۔ تاجو نے مزید اطمینان کے لیے ٹارچ کی روشنی زمین پر بھی ڈالی۔ اسے اردگرد کوئی ایسا دھبا نظر نہیں آیا جسے خون کا دھبا سمجھا جا سکتا۔ اس نے ٹارچ جیب میں رکھ کر موبائل نکالا اور اسے کھولا۔ بند اس کال کے بعد کر دیا تھا جو اس نے بجلی کے سلسلے میں اپنے ایک کارندے کو کی تھی۔ موبائل کھلا رکھنا اس نے اس لیے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ شیریں پریشان ہو کر اسے فون کر سکتی تھی۔ اس کا پریشان ہونا لازمی امر تھا کیونکہ جس وقت تاجو کو اس کے گھر پہنچنا تھا، اسی وقت اس نے فائرنگ کی آواز سنی ہوگی۔

تاجو اس ہنگامی صورتِ حال میں اس کی کال ریسیو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے موبائل کھولنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ اسے پروین کو فون کرنا تھا۔

پروین نے فوراً اس کی کال ریسیو کی۔

''یس باس!'' اس کی آواز سنائی دی۔

''تم اپنے شوہر کا کوئی کوٹ لے کر نیچے آؤ'' تاجو نے کہا۔ ''اور ہاں، کوٹ کسی چیز میں چھپا کر لانا، چوکیدار کی نظر کوٹ پر نہیں پڑنی چاہیے۔ میں پچھلی گلی میں کھڑا ہوں۔ فوراً آؤ۔''

''میں آ رہی ہوں باس۔'' جلدی سے جواب دیا گیا۔

تاجو نے پھر موبائل بند کر دیا اور محتاط نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ وہاں پھیلا ہوا مکمل سناٹا اس کے لیے اطمینان بخش تھا۔

پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ پروین آتی دکھائی دی۔ اندھیرے میں اسے اس کی چال سے ہی پہچانا جا سکتا تھا۔ وہ تاجو کے قریب آ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں خاصی بڑی باسکٹ تھی۔ اس نے اس میں سے کوٹ نکال کر تاجو کو دیا۔ تاجو نے وہ جیکٹ کے اوپر ہی پہن لیا۔ پروین کا شوہر بھاری جسم کا مالک تھا اس لیے جیکٹ پر اس کا کوٹ آسانی سے آ گیا۔

''آؤ'' تاجو نے کہہ کر قدم بڑھائے۔

پروین کی سمجھ میں نہیں آ سکا ہوگا کہ تاجو نے جیکٹ پر کوٹ کیوں پہنا تھا لیکن وہ اس بارے میں سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

تاجو عمارت کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ پروین اس کے ساتھ تھی۔ چوکیدار نے ان کی طرف دیکھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔

زینے طے کر کے وہ دونوں دوسری منزل پر پہنچے۔ پروین کا اپارٹمنٹ اسی منزل پر تھا۔

''جوزف کیا کر رہا ہے؟'' تاجو نے پروین سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

''بے تحاشا پی رہا ہے۔'' پروین کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے شدید نفرت کرتی ہو۔

دروازہ کھول کر وہ دونوں اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ یو پی ایس کا بندوبست ہونے کی وجہ سے وہاں روشنی تھی۔ تاجو ڈرائنگ روم ہی میں رک گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وہاں پہلی بار نہیں آیا تھا۔

''تمہارے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان تو نہیں ہوگا؟'' تاجو نے پروین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں باس!......وہ تو......''

تاجو نے اس کی بات کاٹی۔ ''ڈیٹول اور کوئی صاف کپڑا ہے؟''

''یہ چیزیں تو ہیں باس۔''

''لے آؤ۔'' تاجو نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

پروین تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف گئی۔

جب وہ ڈیٹول کی شیشی اور ایک صاف کپڑا لے کر آئی تو چونک پڑی۔ تاجو کا اوپری جسم برہنہ تھا۔ اس کے بازو کی کہنی سے خون اب ٹپکنے لگا تھا لیکن وہ سرخ دھبے اس نے فرش پر نہیں آنے دیے تھے۔ اپنی جیکٹ اس نے جس طرف ڈالی تھی، کہنی اسی طرف کیے ہوئے تھا۔

''یہ کیا باس؟'' پروین چونک گئی۔

''گولی لگی ہے۔ پولیس نے گھیر لیا تھا۔ کسی نے مخبری کی ہے۔ پتا لگا لوں گا اس کا۔'' تاجو نے سرسری لہجے میں کہا، پھر رکے بغیر بولا۔ ''تم اس کپڑے کو پھاڑ کر اس کی پٹیاں بناؤ۔'' اس نے پروین کے ہاتھ سے ڈیٹول کی شیشی لے لی تھی۔

پروین جلدی جلدی کپڑا پھاڑ پھاڑ کر پٹیاں بنانے لگی۔ تاجو اس دوران میں ایک پٹی کو ڈیٹول سے بھگو کر اپنے بازو کا زخم صاف کرنے لگا۔

پروین کے چہرے پر تشویش اور فکرمندی تھی جس کا سبب شاید تاجو کے بازو کا زخم ہی ہو۔ وہ پٹیاں بناتے ہوئے تاجو کے جسم کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اتنا خوب صورت مردانہ جسم اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خصوصاً بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ کر تو اس کو جھرجھری سی آنے لگی تھی۔

''بس کافی ہے۔'' تاجو نے پٹیاں دیکھ کر کہا۔ ''کیا تم یہ میرے زخم پر باندھ سکو گی؟ میں خود ایک ہاتھ سے کس کر نہیں باندھ سکوں گا اور خون روکنے کے لیے کس کر باندھنا ضروری ہے۔''

''خون کافی بہہ گیا ہے۔'' پروین بولی۔

''کچھ خاص نہیں۔'' تاجو نے بے پروائی سے کہا۔ اس کے چہرے سے بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ تکلیف محسوس کر رہا ہوگا۔

پروین اس کے بازو پر پٹیاں باندھنے لگی۔

''اور کس کے۔'' تاجو بولا۔

پروین کو پٹی باندھنے کے لیے تاجو کا بازو پکڑنا بھی پڑا تھا اور اس لمس سے اس کے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ بازو پر پٹی باندھنا اس کے لیے ایک امتحان تھا جس سے وہ کسی نہ کسی طرح گزر رہی تھی۔

''یہ سب جلا دینا۔'' تاجو نے فرش کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی خون آلود جیکٹ، قمیص، بنیان اور جوزف کا کوٹ پڑا تھا۔

بلٹ پروف جیکٹ اس کے پہلو ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ پسٹل بھی! ''لیکن پہلے جوزف کا ایک کوٹ اور لے آؤ۔'' تاجو نے بات مکمل کی۔

پروین پھر تیزی سے چلی گئی۔ تاجو بلٹ پروف جیکٹ پہننے لگا۔ اسی وقت اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی چیز گری ہو، پھر پروین کی آواز۔ ''غدار، احسان فراموش، ذلیل......'' ایسا معلوم ہوا جیسے کسی وجہ سے اس کی آواز گھٹ گئی ہو۔

تاجو لپک کر اندر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ جوزف، پروین کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ پروین کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔

''جوزف!'' تاجو ان دونوں کی طرف لپکا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ پروین کو جوزف کی گرفت سے چھڑاتا، پروین نے خود ہی اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس نے اپنا گھٹنا جوزف کے جسم کے کسی ایسے حصے پر مارا تھا کہ نہ صرف پروین کی گردن سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم ہوئی بلکہ وہ کراہ کے ساتھ الٹ کر گرا۔

''باس!'' پروین ہانپتی ہوئی بولی۔ ''یہی ہے غدار!...... اسی نے مخبری کی ہوگی۔ ابھی یہ موبائل فون پر بھی کسی کو بتا رہا تھا کہ آپ یہاں آ گئے ہیں۔ میں نے موبائل اس

سے چھین کر فرش پر پٹخ دیا۔''

موبائل فون کے کئی حصے فرش پر اِدھر اُدھر پڑے تھے۔

جوزف اب کھڑا ہوگیا تھا۔ تاجو کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں، سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

تاجو نے تیزی سے اس کے قریب جا کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور پھر اپنی ایک ٹانگ جوزف کی ٹانگوں پر اس طرح ماری کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ فرش پر گرا تو تاجو اس کے اوپر تھا۔

''کسے بتا رہا تھا میرے بارے میں؟'' تاجو نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔

جوزف خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنی گردن سے تاجو کی گرفت ختم کر سکتا۔

''اس نے...... پولیس ہی کو اطلاع دی ہوگی باس۔''

پروین کی سانس اب بھی پھولی ہوئی تھی۔ ''آپ کو یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے۔ ختم کر دیں اس غدار کو۔''

تاجو کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی اور پھر اس نے جوزف کی گردن کو ایسا جھٹکا دیا کہ ہڈی ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جوزف بے حس و حرکت ہوگیا۔

''یہ آپ نے اچھا کیا۔'' پروین پھر بولی۔ ''غدار کی سزا موت ہی ہونا چاہیے۔''

تاجو اب سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔

پروین جھپٹ کر ایک الماری تک گئی۔ اس میں سے ایک کوٹ نکال کر تاجو کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ''یہ پہنیں اور نکلیں یہاں سے۔''

''تمہارا شوہر تھا یہ۔'' تاجو نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

''نفرت ہوگئی تھی مجھے اس سے، برداشت کر رہی تھی۔''

''تم بھی اب یہاں نہیں رک سکتیں۔ میرے ساتھ ہی نکل چلو۔''

پروین اگر وہاں رکتی تو پولیس اسے ہرگز نہیں چھوڑتی۔

تاجو لپک کر اس کمرے کی بالکونی میں گیا جو سڑک کی طرف تھی۔ نیچے ایک پولیس موبائل رکتی نظر آئی۔ تاجو تیزی سے مڑا۔

''پولیس آگئی ہے۔ جلدی نکلو میرے ساتھ۔''

فائر اسکیپ ان کے کام آیا ورنہ انہیں پولیس کا سامنا کرنا پڑتا۔

''پارکنگ لاٹ اسی طرف ہے۔'' فائر اسکیپ سے اترتے ہوئے پروین نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔''

''گاڑی کی چابی بھی لے لی ہے میں نے۔''

''گڈ!''

☆☆☆

شیریں بے چینی سے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی وضع قطع سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی الٹرا ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بنیان، چست پتلون اور اونچی ایڑی کے سینڈل اسی کی علامت تھے۔ وہ دس دس پندرہ منٹ کے بعد اپنے موبائل فون پر تاجو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ ہر مرتبہ اسے تاجو کا موبائل بند ملا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی بڑھتی رہی تھی۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ تاجو گرفتار نہیں ہوا ہوگا۔ گرفتار ہوتا تو اس کا موبائل فون پولیس یقینی طور پر استعمال کرتی، اس پر آنے والی کال ضرور ریسیو کی جاتی۔ اسی لیے وہ کوئی اندازہ ہی نہیں لگا پا رہی تھی کہ تاجو سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ اس وقت چونکی جب کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں۔'' باہر سے اس کے باپ شیخ جواد کی آواز آئی۔

شیریں کی نظر فوراً گھڑی پر گئی، پھر وہ تیزی سے بستر کے قریب راکنگ چیئر پر جا بیٹھی۔ وہ باپ پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت ٹہل رہی تھی۔

''آجایئے ڈیڈی۔'' اس نے کہتے ہوئے قریب کی تپائی پر رکھی ہوئی ایک کتاب اٹھالی۔

اس نے خواب گاہ کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

شیخ جواد دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وہ شب خوابی کے لباس پر نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔

باپ کو دکھانے کے لیے شیریں اب کتاب تپائی پر رکھتے ہوئے اٹھی۔

''خیریت ڈیڈی؟'' وہ بولی۔ ''اس وقت؟ آپ جاگ رہے ہیں؟''

''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔'' شیخ جواد

اسے گھورتا ہوا آگے آیا۔ ''تم بھی جاگ ہی رہی ہو۔ لباس تک ایسا پہنے ہوئے ہو جیسے کہیں جانا ہے۔''

''وہ بس یہ کتاب پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔'' شیریں نے کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کی دلچسپی میں ایسی کھوئی کہ لباس بدلنے کا بھی خیال نہیں رہا۔''

''خوب!'' شیخ جواد کی سنجیدگی میں غصے کی رمق بھی تھی۔ ''اس دلچسپی کی وجہ سے تم فائرنگ کی آواز بھی نہیں سن سکی ہوگی؟''

''وہ تو سنی تھی ڈیڈی! خاصی دیر ہوگئی، اب یہ کوئی خاص بات تو رہی نہیں ہے۔ کہیں بھی، کسی وقت بھی گولیاں چلنے کے واقعات ہونے لگے ہیں۔''

''یعنی تمہیں یہ نہیں معلوم کہ فائر کیوں ہوئے تھے، کس نے کیے تھے، کس پر کیے تھے؟'' شیخ جواد کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

شیریں جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے باپ کی طرف دیکھتی رہی، جیسے چاہتی ہو کہ وہی مزید کچھ کہے۔

''جس پر فائر کیے گئے تھے، وہ بچ نکلا۔'' شیخ جواد ہی بولا۔ ''اور وہ بچ نکلنے والا تاجو تھا۔''

''اوہ!'' شیریں نے جان بوجھ کر کچھ اور کہنے سے گریز کیا۔

''آج اُس سے ملنے کا پروگرام تھا نا تمہارا؟'' شیخ جواد نے تیز لہجے میں کہا۔ ''وہ گھر کے قریب کسی جگہ گاڑی روک کر تمہیں فون کرتا۔ تم گھر سے نکل کر اس کی گاڑی میں جا بیٹھتیں۔''

شیریں اب بھی خاموش رہی۔ اس نے نظریں جھکالی تھیں۔

شیخ جواد نے جو قیاس کیا تھا، وہ کم ہی کیا تھا۔ شیریں تو اس رات کچھ اور ہی فیصلہ کر چکی تھی۔

''اب تو میں تمہاری منگنی بھی کر چکا ہوں۔'' شیخ جواد بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ اس کے بعد تو تم صورتِ حال سے سمجھوتا کر ہی لوگی۔'' شیریں نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''بولتی کیوں نہیں ہو؟'' شیخ جواد چیخ پڑا۔

شیریں چونک پڑی لیکن فوراً ہی اس کا چہرہ سپاٹ ہوگیا۔

''کیا بولوں ڈیڈی؟'' اس کا لہجہ بھی سپاٹ ہی تھا۔

''چھ دن بعد تمہاری شادی ہونا ہے۔ اگر تمہارے منگیتر کو یہ سب کچھ معلوم ہوگیا تو کیا ہوگا؟''

''میں یہ شادی نہیں کروں گی ڈیڈی!'' شیریں نے پھر نظریں جھکالیں۔ ''اگر شادی کروں گی تو صرف تاج ور سے۔''

''تاجو ہے اب وہ۔'' شیخ جواد نے زور دے کر کہا۔

''پہلے تو تاج ور ہی تھا ڈیڈی......! تاجو تو اسے ہمارے آج کے معاشرے نے بنایا ہے۔''

''فلسفہ بولوگی؟'' شیخ جواد کے لہجے میں تلخی تھی۔

''فلسفہ میں نے کبھی پڑھا بھی نہیں ڈیڈی...... بس سیدھی سادی بات کہی ہے۔ وہ تو ایک غریب لیکن شریف گھر کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ بی اے کرنے کے بعد بھی ملازمت کے لیے ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ ملازمت تو اسے کیا ملتی، حوالات نصیب ہوگئی اُسے۔ اس پر جو الزام لگایا گیا، وہ بھی جھوٹ تھا۔ اس پر تشدد بھی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بتا چکی ہوں میں آپ کو۔ اس کے والدین ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسے لیکن وہ ان کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوسکا۔ مرنے سے پہلے اس کے باپ کو بھی پولیس نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ آخر وہ......''

شیریں جذبات میں بہتی چلی جارہی تھی کہ شیخ جواد بول پڑا۔ ''کیوں دہرا رہی ہو یہ سب کچھ۔'' لہجے میں تندی تھی۔ ''میں نے پہلے بھی فرض کرلیا تھا کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ بھی ٹھیک ہوگا لیکن تم اس باپ کی بیٹی ہو جس کا شمار ملک کے پچیس امرا میں ہوتا ہے۔ میں تمہیں ایسے گھر کی بہو کیسے بنا سکتا ہوں جہاں تمہیں ڈھنگ کا ایک بیڈروم بھی نصیب نہیں ہوگا۔ میرے حلقے کے لوگ کیا سوچیں گے، کیا باتیں بنائی جائیں گی۔''

''لوگ جو کچھ سوچیں گے غلط سوچیں گے۔'' شیریں نے سکون سے کہا۔ ''انہیں اس صورت میں یہ سوچنا چاہیے کہ میری شادی جس گھر میں ہوئی ہے، اس گھر کے لوگوں نے ناجائز طریقے سے دولت نہیں جمع کی ہے اور نہ انہوں نے منی لانڈرنگ کی ہے، وہ قوم کے مجرم نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی ایسا امیر ہو جس کی دولت مندی کا سبب ناجائز طریقے نہ ہوں۔''

''تم مجھے قوم کا مجرم کہہ رہی ہو؟'' شیخ جواد نے تلملا کر شیریں کے گال پر اتنی زور کا طمانچہ رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے گال پر پہنچ گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''شکریہ ڈیڈی!'' شیریں کی آواز میں لرزش تھی۔ ''زندگی میں مجھے آپ سے بہت کچھ ملتا رہا ہے۔ جو نہیں ملا تھا، وہ آج مل گیا۔ یہ کمی بھی پوری ہوگئی۔ اب کوئی گلہ نہیں

رہے گا مجھے آپ سے۔''

شیخ جواد کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ شیریں اپنے گال پر ہاتھ رکھے، نظریں جھکائے کھڑی رہی۔ اس وقت نہ جانے کیوں اسے اپنی مرحوم ماں کی یاد آ گئی تھی۔

''تم۔'' شیخ جواد نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر شیریں کی طرف دیکھا اور پھر کچھ رک کر بولا۔ ''تمہیں آج میری وجہ سے اور کیا ملا ہے، یہ بھی تم کو بتا دوں۔ اس وقت تم قانون کے سامنے جواب دہ ہوتیں کہ ایک مجرم سے تمہارے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ محض میری وجہ سے ایس پی نادر نے تمہارے خلاف اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اسے کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ آج اتنی رات کو تاجو تم سے ملنے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ اسی لیے سادہ لباس میں پولیس کے لوگ موجود تھے۔ تاجو کسی سے چھینی ہوئی لینڈ کروزر میں یہاں آیا تھا۔ پولیس کے لوگوں کو اس نے نہ جانے کیسے پہچان لیا اور بھاگ نکلا۔ گیا بھی وہ اسی شخص کے گھر جس نے اس کے خلاف مخبری کی تھی۔ ابھی نادر نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ اس نے مخبر کو قتل کر دیا اور اس کی کرسچن بیوی کو بھگا لے گیا۔''

شیریں نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ اس پر تو یقین کر سکتی تھی کہ تاجو نے کسی کو قتل کیا ہو گا لیکن یہ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ وہ کسی عورت کو بھگا لے گیا ہو۔

شیخ جواد کہتا رہا۔ ''کیونکہ مخبر کی یہ اطلاع سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی کہ تاجو اس وقت یہاں آئے گا اس لیے اسے یہ بھی یقین ہے کہ تم سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ نادر نے مجھ سے فون پر کہا ہے کہ میں تم سے تاجو کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اُسے بتاؤں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے موبائل میں تاجو کا موبائل نمبر ضرور فیڈ ہو گا۔ کیا یہ غلط ہے؟''

شیریں چپ رہی۔

''جواب دو۔'' شیخ جواد تیزی سے اس کے قریب آیا۔

''میں آپ کا دوسرا طمانچہ کھانے کے لیے تیار ہوں ڈیڈی۔''

''لیکن جواب نہیں دو گی؟'' شیخ جواد نے غصے سے کہا۔

''مجھے قتل ہو جانا گوارا ہو گا لیکن میں تاج ور کا نمبر نہیں بتاؤں گی۔''

''اچھا۔'' شیخ جواد نے کہا۔ ''تو پھر اس وقت کا انتظار کرنا جب قانون تم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجبور ہو جائے۔'' پھر وہ شیریں کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شیریں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے بستر کے قریب گئی۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل نکالا۔ تاجو کا نمبر اس نے ڈیلیٹ کر دیا تھا مگر نمبر اسے ذہن نشین ہو چکا تھا۔

نمبر ڈیلیٹ کرنے کے بعد اس نے پھر تاجو سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اس وقت بھی ناکام رہی۔

''تم کہاں ہو تاجور!'' وہ جذباتی انداز میں بڑبڑائی۔

جھنجلاہٹ میں ایک بار تو اس کا جی چاہا تھا کہ موبائل فون دیوار پر دے مارے لیکن یہ اقدام احمقانہ ہی ہوتا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے اب بھی کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے، بس سینڈلیں اتار دی تھیں۔

لگ بھگ پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ موبائل کی اسکرین پر تاجو کا نمبر دکھائی دیا تو اس نے بے تابی سے کال ریسیو کی اور بول پڑی۔ ''تم کہاں ہو تاج ور؟''

''میں اپنے علاقے میں ہوں۔ میں آیا تھا شیریں لیکن وہاں پولیس......''

''وہ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے مجھے۔'' شیریں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں اس دوران میں مسلسل کوشش کرتی رہی ہوں تم سے رابطہ کرنے کی لیکن......''

تاجو نے بھی اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے اپنا فون بند کر رکھا تھا۔ میں کچھ ایسے حالات سے گزرا ہوں کہ اس وقت فون بند رکھنا ہی میں نے مناسب سمجھا تھا۔ اب میں اپنے علاقے میں ہوں جہاں مجھ پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں تمہیں لینے پہنچا تھا۔ جلد ہی میں تمہیں کسی جگہ بلوا لوں گا۔''

''کوئی ایس پی نادر ہے۔'' شیریں نے بتایا۔ ''اسے کسی نے تمہارے یہاں آنے کے علاوہ میرے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ نادر نے ڈیڈی سے کسی تعلق کے باعث ابھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے لیکن ڈیڈی سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ وہ ابھی گئے ہیں میرے پاس سے۔''

''کیا باتیں ہوئیں؟'' تاجو نے پوچھا۔

شیریں نے خاص خاص باتیں بتا دیں، طمانچہ کھانے کا ذکر نہیں کیا، پھر بولی۔ ''میں یہ تو مان سکتی ہوں تاج ور کہ تم نے کسی کو قتل کیا ہو گا۔ قتل تو تم نے اتنے کیے ہیں کہ...... خیر

چھوڑو! اس بات پر مجھے یقین نہیں کہ تم اس شخص کی کرسچن بیوی کو بھگا لے گئے ہو۔''

''اس میں آدھا سچ ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا تعلق میرے ہی گروہ سے ہے۔ میں اُسے وہاں سے اس لیے نکال لے گیا کہ قتل کا الزام اسی پر لگتا۔ پولیس اسے گرفتار کرلیتی۔ میرے گروہ میں ایسی اور بھی کئی عورتیں ہیں۔''

''خیر چھوڑو۔'' شیریں نے بے تابی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''بتاؤں گا۔ کل تک انتظار کرو۔''

''اچھا۔'' شیریں نے کہا۔ ''اب شاید نیند آجائے مجھے، میرے تو اعصاب ٹوٹنے لگے تھے تم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے۔''

''سو جاؤ۔ میں فون بند کرتا ہوں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

☆☆☆

رابطہ منقطع کرتے وقت تاجو بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف پتلون اور بنیان تھی۔ اس کے بازو پر باقاعدہ ڈریسنگ بھی ہوچکی تھی۔

''ہوں۔'' تاجو نے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ، یہاں پہنچتے ہی..... تم نے دیکھا ہی ہے، میں اپنے لوگوں سے کچھ ضروری باتوں میں اُلجھ گیا تھا۔ شیریں سے بھی اب بات کرچکا ہوں۔ جوزف کو شیریں کے بارے میں کیسے معلوم ہوگیا تھا۔''

''میری غلطی تھی باس۔'' پروین نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''کیسے؟''

''کچھ دن سے اُسے شبہ ہونے لگا تھا مجھ پر؟''

''کیسا شبہ؟ پوری بات بتاؤ۔''

''وہ سمجھنے لگا تھا کہ..... کہ..... آپ سے..... میرے..... میرا مطلب ہے.....''

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا، آگے کہو۔''

''نشے میں وہ اس قسم کی باتیں بہت کرنے لگا تھا۔ دو مرتبہ تو اس نے مجھے مارا بھی۔ میں برداشت کرگئی۔ پھر میں ایک مرتبہ اسے بتا بیٹھی کہ آپ شیریں سے محبت کرتے ہیں جو مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے اور گیارھویں اسٹریٹ پر رہتی ہے جہاں بہت دولت مند لوگوں کے گھر ہیں۔''

''ہوں۔'' تاجو نے طویل سانس لی۔ ''تو پھر..... پہلی غلطی تو میں نے ہی کی۔ میں نے ہی تمہیں شیریں کے بارے میں بتایا تھا اور اس لیے بتایا تھا کہ.....'' تاجو نے پروین کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ ''تم میرے بارے میں اپنے جذبات ختم کردو تو بہتر ہے۔''

پروین نے نظریں جھکالیں۔ وہ واقعی شیریں سے زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر کم از کم اس شہر کی اینگلو انڈین کرسچن لڑکیوں یا عورتوں میں وہ سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ نہایت متناسب جسم کی مالک بھی!

''لیکن.....'' تاجو بولا۔ ''اسے یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میں آج شیریں کے پاس جارہا ہوں؟''

''میں اس بارے میں صرف قیاس ہی کرسکتی ہوں۔ لینڈ کروزر کی چوری آپ نے مجھ سے ہی کروائی تھی اور جب آپ اس کی چابی لینے گھر آئے تھے تو میں آپ سے پوچھ بیٹھی تھی کہ اس لینڈ کروزر سے آپ کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ اسی لینڈ کروزر پر آپ شیریں سے ملنے جائیں گے۔ اس وقت بھی جوزف برابر کے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔''

تاجو نے سر ہلایا۔ ''یہی ہوسکتا ہے۔ تم پر تو مجھے پورا بھروسا ہے۔ اسی لیے وہاں پولیس کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا تھا کہ مخبری ہوئی ہے لیکن میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مخبری کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔''

شیریں چپ رہی۔

تاجو پھر بولا۔ ''میں نے تمہارے سامنے جوزف کو مار ڈالا۔ وہ بہرحال تمہارا شوہر تھا۔ تم اسے برداشت بھی کرتی رہیں۔ پھر جب میں نے اس کا گلا گھونٹا تو تمہارے کیا احساسات تھے؟''

''شاید اس وقت آپ نے میری بات سنی نہ ہو۔ میں نے کہا تھا کہ غداری کرنے والے کی سزا موت ہی ہونا چاہیے۔''

''ہوں۔ اچھا، اب تم آرام کرو۔ ایکس نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ تمہیں کہاں رہنا ہے۔''

تاجو کے گروہ میں اس کے نائب کو ''ایکس'' ہی کہا جاتا تھا۔

پروین کے جانے کے بعد تاجو نے آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ سوچتے سوچتے اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور شیریں سے رابطہ کیا۔

''ہاں تاج ور! خیریت؟'' شیریں کی بھرائی ہوئی

آواز میں تشویش بھی تھی۔

''میں نے تمہاری نیند خراب کر دی۔ اب خیال آرہا ہے کہ میں کل صبح بھی فون کر سکتا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی جو کل نہ کی جا سکتی۔''

''کیا بات ہے؟''

''معلوم کرنا تھا۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے ایس پی نادر سے اقرار کر لیا ہے کہ تم سے میرا کوئی تعلق ہے؟''

''ان کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوا تھا۔ وہ سب میں نے تمہیں بھی بتائی تھیں۔''

''ذہن منتشر سا تھا۔ مجھے سب باتیں یاد نہیں رہیں، اسی لیے بس تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ بس اب سو جاؤ۔''

''ایک بات اس وقت پھر دہراؤں گی۔ جلد از جلد کچھ کرنا ہوگا تاج ور! چھ دن باقی ہیں میری شادی میں۔''

''میں نے کہا تھا نا، کل تک انتظار کرو۔''

''جب تک تمہارا فون نہیں آئے گا، بے چین رہوں گی۔''

''زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا ڈیئر۔''

تاجو نے جواب دے کر رابطہ منقطع کیا اور پھر دوسرا موبائل اٹھایا۔ اس کے پاس دو موبائل تھے اور ہر موبائل میں چار چار ''سم'' تھیں۔ ایک ''سم'' کا نمبر وہ تھا جو اس نے صرف شیریں سے بات کرنے کے لیے مخصوص کی تھی۔

دوسرے موبائل کی سم میں شہر کے تمام پولیس آفیسروں کے نام، ان کا عہدہ اور موبائل فون نمبر فیڈ تھے۔ اس نے ایس پی نادر کا نمبر نکالا اور اس سے رابطہ کیا۔

''کون ہے؟'' ایس پی نادر کی آواز جھنجلائی ہوئی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں کے بعد نیند سے جاگا تھا۔

''ایس پی نادر؟''

''بول رہا ہوں۔'' جھٹکے سے کہا گیا۔

''تم تاجو کا فون نمبر معلوم کرنا چاہتے ہو نا؟''

''ہاں۔'' ایس پی نے جلدی سے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

''جس نمبر سے میں بات کر رہا ہوں، یہی نمبر ہے تاجو کا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں تاجو ہی بول رہا ہوں ایس پی۔''

دوسری طرف سکوت چھا گیا۔ ایس پی نادر کے ذہن کو خاصا جھٹکا لگا ہوگا۔ یہ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ تاجو اسے فون کرے گا۔

''ہیلو!'' تاجو سکون سے بولا۔

''اس کا یقین میں کیسے کرلوں کہ تم تاجو ہو؟''

''میں نے جو کچھ کہنے کے لیے فون کیا ہے، وہ سن کر تمہیں یقین آجائے گا۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں ایس پی...... شیریں کے لیے کسی قسم کی پریشانی مت کھڑی کرنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہارا تبادلہ کسی ایسے علاقے میں کروا دوں گا جہاں تمہیں رشوت کے نام پر ایک دھیلا نہ مل سکے۔ اس علاقے میں تو تم خوب کما رہے ہو گے، مجھے اندازہ ہے۔''

ایس پی نادر نے سب کچھ خاموشی سے سن لیا، پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''میں دھمکیاں نہیں دیتا۔ جو کر سکتا ہوں، وہی کہتا ہوں۔'' تاجو کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی خوشگوار گفتگو کر رہا ہو۔

''میں جانتا ہوں کہ تم میرا تبادلہ کرا سکتے ہو۔'' ایس پی نادر نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن اگر تم نے ایسا کیا تو میں اپنی جگہ آنے والے دوسرے ایس پی کو تمہارے اور شیریں کے بارے میں بتا دوں گا۔''

''اس صورت میں یہ زمین تمہارا بوجھ برداشت نہیں کرے گی۔''

''تم مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟''

''تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے ایس پی، ابھی کہا تھا میں نے کہ میں دھمکیاں دینے کا عادی نہیں۔ جو کر سکتا ہوں، وہی کہتا ہوں۔''

''میں اُن پولیس افسروں میں سے نہیں ہوں جو تم سے ڈرتے ہیں۔''

''میں مان لیتا ہوں کہ تم بہت بہادر ہو گے۔ میں چاہتا بھی نہیں ہوں کہ تمہاری زندگی ختم کروں۔ تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ جن سے دشمنی تھی، ان میں سے تو اب دو ایک ہی زندہ ہیں۔ انہیں ختم کرنے کے بعد میرا وہ مشن ختم ہو جائے گا جس پر میں کام کر رہا ہوں۔ فی الحال میرا مسئلہ یہ ہے کہ تم شیریں کے لیے پریشانی کا سبب نہ بنو۔''

''تم اُس کے عاشق ہو؟'' ایس پی نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں۔'' تاجو نے کہا۔ ''یہ کہہ سکتے ہو تم، وہ مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

''اور وہ بھی تمہیں......''

''فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو ایس پی، میں

جو کہہ رہا ہوں، بس اس پر عمل کرنا ہے تمہیں۔''

''میں کل شام سے پہلے پہلے ایسا بندوبست کرلوں گا کہ اسے پولیس اسٹیشن طلب کرلوں۔ میں نے یہ گفتگو ریکارڈ کرلی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا ہے کہ شیریں کا تعلق ایک ایسے مجرم سے ہے جس کے سر کی قیمت لگی ہوئی ہے۔''

''یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے مجھے اپنے ارادے سے باخبر کردیا۔ تم کل شام سے پہلے اس علاقے کے ایس پی نہیں رہو گے، اور جیسا میں کہہ چکا ہوں، اگر تم نے اپنی جگہ آنے والے ایس پی کو کچھ بتایا تو میں اس سے بھی بات کرلوں گا لیکن تم پھر اس دنیا میں نہیں رہو گے۔ تم نے میری باتیں بھی ریکارڈ کرلی ہیں اور میرا فون نمبر بھی تمہیں معلوم ہوگیا ہے۔ میرے خلاف جو کچھ کرسکتے ہو، کرلینا۔''

پھر تاجو نے جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کیا اور ایک ایم این اے خواجہ صدیق کا نمبر ملایا۔ اس مرتبہ اس نے اپنے موبائل کی دوسری سم استعمال کی تھی۔

کئی گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ ''ہیلو! کیا بات ہے تاجو؟ اتنی رات کو؟''

''کام کچھ ایسا ہی ہے۔'' تاجو نے کہا۔ ''تمہیں کل صبح ہی حرکت میں آنا ہوگا۔ کوئی ایس پی نادر ہے گیارھویں اسٹریٹ کے علاقے کا۔ دوپہر تک اس کا تبادلہ کسی ایسے علاقے میں کروادو جہاں رشوت کا بازار کچھ ٹھنڈا رہتا ہو۔ یہ مت پوچھنا کہ میں یہ کام کیوں کروانا چاہتا ہوں۔''

''ارے یہ چھوٹا سا کام تو تم انوار سے بھی کرواسکتے تھے۔''

''وہ ایم پی اے ہے۔ کام تو اس کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے لیکن اس میں دیر لگ سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں، یہ کام کل دوپہر تک ہوجائے، اور ایسا تم آسانی سے یوں کروا سکتے ہو کہ وزیر داخلہ تمہارے گھر کا آدمی ہے۔''

''لیکن میں بتاؤں کیا کہ اس آفیسر کا تبادلہ کیوں کروانا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں تمہارا نام نہیں لے سکتا۔''

''یہ تمہارا دردِسر ہے کہ تم اسے کیا بتاؤ گے۔ کل دوپہر تک اس کا تبادلہ ہوجانا چاہیے۔'' دوسرا جملہ تاجو نے زور دے کر کہا تھا اور پھر جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

جنید نے حیرت سے راجن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بک رہے ہو تم؟''

''ہاں صاحب!'' راجن نے کہا۔ ''یہ بات غلط نہیں ہو سکتی۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ایک پولیس افسر ہے صاحب! اسے معلوم تھا کہ میں آپ کا خادم ہوں۔ اس نے مجھے اسی لیے بتایا کہ آپ کو خبر دے دوں۔''

''وہ پولیس آفیسر کیوں چاہتا تھا کہ مجھے پتا چل جائے؟''

''جانے کیسے اسے معلوم ہوگیا کہ آپ کی اس سے شادی ہونے والی ہے۔''

''لیکن اس نے یہ کیوں ضروری سمجھا کہ مجھے اس کا علم ہوجائے؟...... میں تو کسی پولیس آفیسر کو جانتا بھی نہیں۔''

''اگر وہ آپ کو جانتا ہوتا تو آپ ہی کو بتاتا۔''

''لیکن اس نے یہ کیوں چاہا؟ اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے؟''

''آپ سے ہمدردی کی بات نہیں صاحب! ہوا یہ ہے کہ آج اس کا تبادلہ کردیا گیا ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ تو نہیں بتایا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس میں شیریں ہی کا ہاتھ ہے۔''

''کیا شیریں اتنی بااختیار ہوسکتی ہے؟'' جنید کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اب یہ تو مجھے نہیں پتا۔ بس جو میرے دماغ میں آئی، وہ کہہ دی میں نے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود بھی کچھ معلوم کروں گا۔ تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔''

اسی گفتگو کی روشنی میں جنید نے اپنے باپ سیٹھ ابراہیم سے بات کی۔

''ہوں۔'' سیٹھ ابراہیم نے سر ہلایا۔ ''یہ شبہ مجھے بھی آج ہوا تھا کہ کوئی بات ہے۔ شیخ جواد نے فون کیا تھا کہ شادی کی تاریخ کسی وجہ سے آگے بڑھادی جائے لیکن میں یہ کہہ کر ٹال گیا کہ پھر میں دو ماہ کے لیے انگلینڈ چلا جاؤں گا لیکن تم یہ سب کچھ اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟''

''مجھے جس نے بتایا ہے، میں اسے جھوٹا نہیں سمجھتا۔''

''یہ تو بڑی تشویش کی بات ہوگی بیٹا!...... اگر شیخ جواد کا سہارا نہ ملا تو بہت خراب صورتِ حال ہوجائے گی۔ میں چند مہینے میں دیوالیا ہونے والا ہوں۔ شیخ جواد کی مدد حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔''

''آپ نے بتایا تھا مجھے۔ اسی لیے میں بھی پریشان

ہو گیا ہوں۔"

"وہ کون ہے جس سے شیریں شادی کرنا چاہتی ہے اور اگر اُس نے اپنے باپ کا دباؤ تسلیم نہیں کیا تو وہ اس شخص کے ساتھ بھاگ جائے گی یا اس سے سول میرج کر لے گی۔"

"اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔"

"اگر نام وغیرہ معلوم ہو جاتا تو اس شخص کو راستے سے ہٹایا جا سکتا تھا۔" سیٹھ ابراہیم نے کہا۔ اس کے علم میں تھا کہ اس کے بیٹے کے تعلقات کچھ جرائم پیشہ افراد سے بھی ہیں۔

"کوشش کروں گا اس کے بارے میں معلوم کرنے کی لیکن اگر کچھ پتا نہ چل سکا تو پھر ایک دوسرا کام بھی ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"شیریں کو اس قابل نہ رہنے دیا جائے کہ وہ اس شخص سے شادی کر سکے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ مجھ سے شادی کے لیے مجبور ہو جائے۔"

سیٹھ ابراہیم نے اس طرح جنید کی طرف دیکھا جیسے اس کی اشاروں میں کہی ہوئی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کچھ بھی کرو، ہاتھ پیر بچا کے کرنا۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔"

سیٹھ ابراہیم نے پھر سر ہلانے پر اکتفا کی۔ اس مرتبہ اس کا انداز متفکرانہ تھا۔

پانچ منٹ بعد ہی جنید اپنے کمرے سے راجن کو فون کر رہا تھا۔

"میں اس شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں جس سے شیریں شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"میں اس پولیس آفیسر سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ بتائے۔ اگر بتانا ہوتا تو اسی وقت بتا دیتا۔ مجھے لگا تھا کہ وہ جان بوجھ کر نام بتانے سے بچا تھا۔"

"اگر اس نے جان بوجھ کر نام بتانے سے گریز کیا ہے تو پھر اب بھی نہیں بتائے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے صاحب۔"

"تو پھر کچھ اور کرنا پڑے گا۔ اگر شیریں سے میری شادی نہ ہو سکی تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔" جنید اصل بات راجن کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔

"اور کیا کیا جا سکتا ہے صاحب؟"

"میں اُسے اس قابل نہ رہنے دوں کہ وہ میرے علاوہ کسی سے شادی کر سکے۔"

"یہ کس طرح؟"

"اسے اغوا کرنا پڑے گا۔"

"یہ تو کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے صاحب لیکن اس میں وقت لگے گا۔"

"وقت ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔ شادی کی تاریخ میں اب صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے۔ اس کے لیے تم اپنے دو ایک ساتھیوں سے بھی کام لے سکتے ہو۔ اس سلسلے میں اخراجات کی پروا نہ کرنا۔"

"ایک بندہ ہے اس کام کا ماہر لیکن وہ تین لاکھ سے کم نہیں مانگے گا۔"

"اس کے لیے تم مجھ سے آج ہی چیک لے سکتے ہو۔"

"آپ جانتے ہیں صاحب! اس قسم کے کاموں میں کوئی بھی چیک نہیں لیتا۔"

جنید نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پھر بولا۔ "ڈھائی بجے بینک کھل جائیں گے۔ تم مجھ سے وہیں ملو۔ میں کیش دے دوں گا لیکن پہلے اس آدمی سے بات کر لو۔ میں چاہتا تو یہ ہوں کہ یہ کام آج ہی ہو جائے۔ چڑیا کسی وقت بھی ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔"

"اس سے تو میں ابھی فون پر بات کر لیتا ہوں۔ پندرہ منٹ میں ہی آپ کو بتا دوں گا۔" راجن بولا۔ "لیکن صاحب! میں نے ابھی جو نئی گاڑی خریدی ہے تو بالکل قلاش ہو چکا ہوں۔"

"دو لاکھ تمہیں بھی دے دوں گا لیکن کام ہونے کے بعد۔"

"کئی دن بعد دے دیجیے گا صاحب! آپ بات کے پکے ہیں، یہ تو میں جانتا ہوں۔"

"اپنے ساتھی سے بات کر کے مجھے ابھی بتاؤ۔"

"ابھی کہا تھا نا میں نے۔ بس پندرہ منٹ میں فون کرتا ہوں آپ کو۔"

"میں بہت بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

رابطہ منقطع کرنے کے بعد جنید کمرے میں ٹہلنے لگا۔ فکر مند وہ بھی تھا۔ باپ کے دیوالیا ہونے کی صورت میں خود اس کا مستقبل بھی تاریک ہو سکتا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ ایک بار وہ خود بھی شیریں کو فون کرے اور اس کے اندازِ گفتگو سے کچھ اندازہ لگائے۔

''ڈیڈی!'' اس نے اسی وقت سیٹھ ابراہیم کو فون کیا۔ ''یہ ممکن ہے کہ مجھے شیریں کا موبائل نمبر مل جائے۔''

''اس کا نمبر تو ہے میرے پاس۔ کسی وجہ سے ایک مرتبہ بات کی تھی میں نے اس سے۔''

''وہ نمبر آپ مجھے دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں آپ کے کمرے میں۔''

''میں اب گھر پر نہیں ہوں۔ دفتر جا رہا ہوں۔ راستے میں ہوں۔''

''تو اس کا نمبر مجھے میسج کر دیجیے۔''

''وہ میں ابھی کر دیتا ہوں لیکن تم کو اس کے نمبر کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''میں خود اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے رویے سے بھی کچھ اندازہ تو ہو جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہیں جو اطلاع ملی ہے، اس پر تمہیں مکمل یقین نہیں ہے؟''

''مجھے جس ذریعے سے اطلاع ملی ہے، اس پر تو مجھے مکمل بھروسا ہے۔ ہاں اگر اس سے کسی نے جھوٹ بولا ہو تو دوسری بات ہے لیکن یہ بھی سوچ چکا ہوں کہ کسی پولیس آفیسر کو اس قسم کا جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے۔ اگر اس کا سبب انتقام ہے تو بھی تعجب کی بات ہے۔ شیریں اتنی بارسوخ کیسے ہوگئی کہ کسی پولیس آفیسر کا تبادلہ کرا سکے اور اسے تبادلہ کروانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔''

''یعنی تذبذب میں تم بہرحال ہو۔''

ہاں کچھ تذبذب تو ہے۔ اسی لیے میں خود بھی اس سے بات کر کے......''

سیٹھ ابراہیم نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اس کا نمبر تمہیں ابھی میسج کیے دیتا ہوں۔ دیکھ لو بات کر کے۔''

تین منٹ بعد ہی سیٹھ ابراہیم کا میسج آ گیا۔

جنید نے میسج سے ملا ہوا نمبر اپنے موبائل سے ملایا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد بھی دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی تو جنید نے سمجھ لیا کہ شیریں اجنبی نمبروں کی کال ریسیو نہیں کرتی ہوگی چنانچہ اس نے میسج کیا۔

''آپ شاید اجنبی نمبر کی کال ریسیو نہیں کرتیں۔ یہ اچھی بات ہے، بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ میری ہونے والی بیوی محتاط مزاج رکھتی ہے۔ میں جنید ہوں۔ اسی نمبر سے آپ کو پھر فون کروں گا۔''

میسج بھیجنے کے تین منٹ بعد جنید نے پھر شیریں کا نمبر ملایا۔ اس مرتبہ کال ریسیو کر لی گئی۔

''جی! کہیے!'' شیریں کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''بس یوں ہی دل چاہا کہ آپ سے بات کروں۔ ایک ہی ملاقات ہوئی ہے آپ سے جب آپ کے والد نے مجھے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں اپنے والد کے ساتھ آیا تھا۔ آپ سے وہی ایک ملاقات ہوئی ہے لیکن فون پر میں آپ کی آواز پہچان گیا۔ کیسی ہیں آپ۔'' جنید ہنسا۔ ''ابھی تو ذرا تکلف ہی سے بات کرنی پڑے گی۔''

''اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے فون کر لیا۔ اگر میرے پاس آپ کا نمبر ہوتا تو میں خود آپ سے رابطہ کرتی۔ ڈیڈی سے میں نے آپ کا نمبر پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آپ کو میرا نمبر غالباً اپنے والد سے ملا ہوگا۔''

''جی ہاں، اور یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں۔''

''آپ کی خوشی ختم ہو جائے گی۔'' شیریں کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔ ''میں آپ کو فون کر کے یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے شادی نہ کیجیے، انکار کر دیں۔''

''تو ٹھیک ہی اطلاع ملی ہے۔' جنید نے سوچا۔

''ہیلو!'' شیریں کی آواز پھر آئی۔

''جی!'' جنید نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''یقیناً آپ نے میری خوشی ختم کر دی۔ آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں شادی سے انکار کر دوں؟''

''وجہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتی۔''

''کیا آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں؟''

جنید کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

جنید نے موبائل کان سے ہٹا کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا اور اسے گھورتا ہوا زیرلب بڑبڑایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ مجھے صحیح اطلاع ملی ہے۔ تو ٹھیک ہے شیریں! میں تمہیں اس قابل نہیں رہنے دوں گا کہ تم میرے علاوہ کسی کی ہو سکو۔''

جنید پھر ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے راجن کی کال ریسیو کی۔

''بات ہوگئی ہے صاحب!...... شیریں کا پتا بتا دیجیے...... اس کی تصویر بھی چاہیے ہوگی۔''

''تصویر ہے میرے پاس۔'' جنید نے کہا۔ ''ڈھائی سے تین کے درمیان مجھ سے بینک کے پاس ملو۔ میری کار کے پاس رکنا۔ تمہیں رقم بھی دے دوں گا، تصویر بھی اور پتا بھی۔''

''ٹھیک ہے صاحب! آتا ہوں میں۔''

جنید نے پہلا کام یہ کیا کہ شیریں کی تصویر اسکین کر کے اپنے کمپیوٹر میں ڈالی، پھر اس کا ایک پرنٹ بھی نکال لیا۔

وہی پرنٹ اس نے راجن کو دیا جو پونے تین بجے اس کے بینک کے باہر اس کی کار کے پاس موجود تھا۔ اسے رقم اور شیریں کا پتا بھی دے دیا۔

''ایک بات اور کہہ دینا اپنے ساتھی سے۔'' جنید نے راجن سے کہا۔ ''اگر وہ آج ہی شیریں کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو میں اسے ایک لاکھ روپیا اور دے دوں گا۔''

''موقع ملنے کی بات ہے صاحب! اگر آج موقع ملا تو آج ہی کام ہو جائے گا۔ بس یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنے گھر سے کب کہیں جاتی ہے، کیا کرتی ہے، وغیرہ وغیرہ!''

''سارا دن وہ گھر پر تو نہیں رہتی ہوگی۔''

''اسے لے جانا کہاں ہوگا؟''

''اپنے گھر لے جانا اور مجھے اطلاع دے دینا۔''

وہ دونوں اس وقت کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جنید اسے بہت کم رفتار سے چلا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے صاحب!'' راجن نے کہا۔ ''اب گاڑی واپس موڑ لیں۔ مجھے بینک پر ہی اتار دیں۔ میری گاڑی وہیں کھڑی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، لیکن یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ہم کار میں وہیں رکتے۔'' جنید نے راجن کو بینک پر لے جا کر ہی اپنی کار سے اتارا۔

☆☆☆

شہر کے سب سے بڑے میموریل ہال میں ایک بڑے آرٹسٹ کی یاد میں تقریب تھی جو دس بجے رات کو شروع ہوئی تھی اور قیاس کیا جا رہا تھا کہ وہ ایک بجے سے پہلے ختم نہیں ہو سکے گی۔

اس ہال میں صرف بڑی بڑی تقریبات منعقد ہوتی تھیں اور ہال میں گنجائش بھی بہت زیادہ لوگوں کی رکھی گئی تھی۔ اسی لیے پارکنگ لاٹ بھی بہت بڑا تھا جو انڈر گراؤنڈ بنایا گیا تھا جہاں ڈیڑھ سو کاریں بھی پارک کی جا سکتی تھیں۔

شیریں بھی وہاں پہنچی تھی لیکن اس تقریب کی وجہ سے نہیں بلکہ تاجو کے کہنے پر! اس نے فون پر کہا تھا۔

''امکان ہے کہ گیارہ بجے تک لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ تقریب ایسی ہے کہ اختتام تک شاید ہی کوئی وہاں سے اٹھے۔ تم وہاں سے ساڑھے گیارہ بجے اٹھ جانا۔ پارکنگ لاٹ میں اس وقت یقینی طور پر سناٹا ہوگا۔ تم اپنی کار تک پہنچو گی تو میں تمہیں وہیں مل جاؤں گا۔ تم جو قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکی ہو، وہ قدم آج تو نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ہم اس کے صرف نتائج کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ ڈرائیونگ تم ہی کرو گی۔ کسی ویران سڑک کی طرف نکل چلنا۔ گفتگو کے بعد میں کہیں بھی تمہاری کار سے اتر جاؤں گا۔ تم اپنے گھر چلی جانا۔ گفتگو ہی میں ہم فیصلہ کریں گے کہ وہ فیصلہ کن قدم کب اٹھایا جائے۔''

فون پر باتیں تو خاصی ہوئی تھیں لیکن بنیادی بات یہی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات اس طرح ہوگی چنانچہ شیریں ساڑھے گیارہ بجے ہال سے اٹھ گئی۔

تاجو کے خیال کے مطابق پارکنگ لاٹ میں سناٹا تھا۔ شیریں بے چینی سے اس طرف بڑھنے لگی جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔

کاروں کی قطاروں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ کوئی بھی کار وہاں سے بہ آسانی نکل سکتی تھی۔ شیریں اپنی کار تک پہنچنے کے لیے اسی راستے پر چل رہی تھی۔ تاجو کی طرف سے تاخیر پر وہ کسی قدر جھنجلاہٹ میں مبتلا تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ تاخیر بالکل نہ ہو لیکن تاجو فیصلہ کن اقدام سے پہلے اس کے نتائج پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

جو بھی نتائج ہوں، شیریں کو اس کی بالکل پروا نہیں تھی۔ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ تاجو کو فوری طور پر قدم اٹھانے کے لیے مجبور کرے گی۔

دفعتاً ایک کار کا انجن اس وقت اسٹارٹ ہوا جب شیریں اس کے عقب میں تھی۔ کار کا انجن نہ صرف اسٹارٹ ہوا بلکہ وہ تیزی سے پیچھے بھی آئی۔ شیریں نے تقریباً دوڑ کر خود کو اس کی زد پر آنے سے بچایا اور پھر رک کر غصے سے کار کی طرف دیکھنے لگی جو رک گئی تھی۔

''آئی ایم سوری محترمہ!'' کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے بہ سرعت اتر کر ایک شخص نے شیریں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں بے حد معافی چاہتا ہوں۔ بس پیر پھسل گیا میرا ایکسیلریٹر سے۔''

''میری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی، تب بھی آپ سوری کرتے۔'' شیریں نے بگڑ کر کہا۔

''پلیز!'' اس شخص نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ ''میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ سے مزید کچھ کہہ سکوں۔''

شیریں اس شخص کو خاصا آڑے ہاتھوں لیتی لیکن اسے اپنی کار تک پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے اس نے بات

بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔

''آئندہ احتیاط برتیے گا۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے۔'' شیریں نے کہا اور مڑ کر اس طرف قدم بڑھایا جدھر وہ جارہی تھی۔

لیکن وہ دوسرا قدم نہیں اٹھا سکی تھی کہ عقب سے اس شخص نے اسے نہ صرف دبوچ لیا بلکہ اپنا ایک ہاتھ بھی اس کے منہ پر اتنی سختی سے رکھا کہ وہ چیخ نہ سکے۔ وہ اتنا طاقتور بھی تھا کہ اس نے شیریں کو اٹھا بھی لیا اور تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھا۔

سب کچھ نہایت سرعت سے اور اتنا اچانک ہوا تھا کہ شیریں کا دماغ شل ہو کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا تھا۔

کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر اب کوئی دوسرا شخص تھا جس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے انجن دوبارہ اسٹارٹ کیا تھا۔

شیریں کو کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالتے ہوئے اس شخص نے ایک ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''ذرا بھی آواز نکالی تو گولی ماردوں گا۔'' بڑا اسفاک لہجہ تھا۔

پھر وہ خود بھی اسی نشست پر آبیٹھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''بس نکل چلو راجن!''

کار فوراً حرکت میں آکر ٹرن لینے کے بعد سیدھی ہوئی اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

شیریں کار کی نشست پر کروٹ سے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو غرا کر کہا گیا۔ ''لیٹی رہو۔''

شیریں جانتی تھی کہ اس طرح اغوا کی جانے والی لڑکیوں کی آبروریزی تو یقینی طور پر کی جاتی ہے اور اسے اس طرح برباد ہو جانا گوارا نہیں تھا۔ وہ اس وقت یقیناً مدد کے لیے چیخ پڑتی جب کار نکاسی کے راستے سے باہر نکل رہی تھی۔ وہاں موجود پہرے دار یقیناً اس کی آواز سن لیتے۔ چیخنے کی صورت میں قوی امکان تھا کہ اس پر گولی چلا دی جاتی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے شیریں اپنی جان دینے کو تیار ہو جاتی لیکن اسے یقین تھا کہ تاجو اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں رہا ہوگا۔ وہ یقیناً اسے ان لوگوں سے بچالے گا۔

کار جب نکاسی کے راستے سے نکل رہی تھی تو وہ شخص شیریں پر چھا گیا تھا اور اس نے ایک چادر بھی اوڑھ لی تھی۔ اگر پہرے داروں کی نظر کار کی پچھلی نشست پر پڑی بھی ہو گی تو وہ یہ نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ اس چادر کے نیچے جو ڈھیر تھا، وہ دو انسانوں کا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے راجن نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا۔

شیریں نے اس کی آواز سنی۔ وہ کسی کو اطلاع دے رہا تھا۔ ''ہم نے اسے اٹھا لیا ہے صاحب...... جی ہاں صاحب!......بس مل گیا موقع، ہم تو انتظار کر رہے تھے کہ وہ تقریب ختم ہونے پر کہاں جائے گی۔ ہم اس کا تعاقب کرتے اور موقع ملنے پر کوئی قدم اٹھاتے لیکن اتفاق سے پارکنگ لاٹ میں ہی موقع مل گیا۔ ہم کار میں ہی بیٹھے اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ تقریب ختم ہونے پر ہی باہر آئے گی لیکن جانے کیوں وہ جلدی اٹھ آئی۔ وہ اپنی کار کی طرف جانے کے لیے جب ہماری کار کے پیچھے سے نکل رہی تھی تو جبران کو ایک تدبیر سوجھ گئی۔''

اس نے کسی کو وضاحت سے بتایا کہ شیریں کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ سنتے ہوئے شیریں نے یہ تو سمجھ لیا کہ یہ دونوں آدمی صرف آلۂ کار ہیں، اسے اغوا کسی اور نے کروایا ہے لیکن یہ بات اس کے ذہن میں نہیں آسکی کہ اسے اغوا کروانے والا جنید تھا۔

شیریں نے راجن کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا۔ ''آپ کب آئیں گے صاحب!'' اور پھر اس نے قدرے رک کر کہا۔ ''ٹھیک ہے صاحب۔''

کار کس سڑک پر دوڑ رہی تھی؟ اس کا شیریں کو بالکل اندازہ نہیں تھا کیونکہ اسے اٹھنے نہیں دیا گیا تھا لیکن اب وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''اس کے ساتھ کوئی اور زیادتی نہ کر بیٹھنا جبران۔'' راجن بولا۔ ''صاحب نے مجھے تاکید کی تھی۔''

''بتا چکے ہو تم مجھے۔'' جبران نے جواب دیا۔ ''لیکن جتنی زیادتی کی جا چکی ہے، وہ تو ضروری تھی۔''

''تم لوگ بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتو گے۔'' شیریں نے بڑے سکون سے کہا۔

''خاموش پڑی رہو۔'' جبران غرایا۔

شیریں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ کیوں ان شہدوں کی بکواس سنتی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کرائے کے غنڈے تھے۔ تاجو کے سامنے ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، تاہم یہ سوال اس کے ذہن میں چکراتا رہا کہ تاجو اسے اس مصیبت سے کب اور کس طرح چھڑائے گا؟

پون گھنٹے بعد کار کی رفتار سست ہونے لگی۔

''میں اسے تمہارے گھر پر چھوڑ کر فوراً چلا جاؤں گا۔'' جبران بولا۔ ''کام بہت جلدی ہو گیا ہے۔ مجھے مزید رقم کب ملے گی؟''

''کل ہی مل جائے گی۔'' راجن نے جواب دیا۔ ''صاحب کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔''

کار رک گئی۔ راجن نے انجن بند نہیں کیا اور دروازہ کھول کر کار سے اتر گیا۔ جبران کار میں ہی بیٹھا رہا۔ شیریں نے ایسی آواز سنی جیسے پھاٹک کھولا گیا ہو۔ چند لمحے بعد راجن پھر کار میں آبیٹھا۔ کار حرکت میں آئی اور آہستگی سے کچھ آگے بڑھ کر رک گئی۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ اب راجن نے کار کا انجن بند کیا اور کار سے اترتا ہوا بولا۔

''ایک منٹ! میں پھاٹک بند کر دوں۔''

شیریں نے قدرے توقف سے پھاٹک کی آواز سنی جو بند ہونے ہی کی ہو سکتی تھی۔ راجن یہی کہہ کر کار سے اترا تھا۔

''اب لے آؤ اِسے جبران۔'' راجن نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جبران نے ریوالور کا رخ بدستور شیریں کی طرف رکھا اور ایک ٹانگ کار سے باہر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم بھی خاموشی سے نیچے اتر آؤ۔''

یہ حکم شیریں کے لیے تھا۔ جبران کے بعد وہ کار سے نکلی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں پھاٹک کے بعد اتنی ہی گنجائش تھی کہ ایک کار کھڑی کی جا سکے۔

برآمدے میں چڑھنے کے لیے دو سیڑھیاں تھیں۔ وہاں راجن نے کوئی دروازہ کھولا۔

جبران نے اب ریوالور کی نال شیریں کی کمر سے لگا رکھی تھی۔

''چلو آگے بڑھو!'' اس نے شیریں سے کہا۔

جب آگے پیچھے وہ تینوں اندر داخل ہو گئے تو شیریں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہاں بھی مکمل تاریکی تھی لیکن دروازہ بند ہونے کے بعد ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بٹن دبایا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہاں روشنی ہو گئی۔ شیریں نے دیکھا کہ وہ نشست کا کمرا تھا۔

''بس اب تم سنبھالو اسے۔'' جبران نے کہا۔ ''میں اب جاتا ہوں۔''

''اسے میرے بیڈ روم تک تو پہنچا دو۔'' راجن نے کہا۔ ''تم اپنی کار بھی تو لے جاؤ گے! پھاٹک بند کرنا ہو گا مجھے۔''

''اچھا!'' جبران نے ایک طویل سانس لی۔

شیریں کو راجن کے بیڈ روم میں لے جایا گیا۔ وہاں کی تاریکی بھی راجن نے ختم کی تھی۔

''اب تم چاہو تو فی الحال میرے بستر پر لیٹ کر آرام کر سکتی ہو۔'' راجن نے شیریں کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب مجھے اُلجھن ہو رہی ہے راجن!'' جبران بولا۔ ''یہ لڑکی بہت مطمئن نظر آ رہی ہے۔''

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔'' شیریں بولی۔ ''تم دونوں کو بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

اب راجن کے چہرے پر پہلی مرتبہ تشویش نظر آئی۔

''ہاں۔'' وہ جبران کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے اب غور کیا ہے۔''

''ڈرائیونگ تم کر رہے تھے۔'' جبران کچھ غصے سے بولا۔ ''کسی نے ہمارا تعاقب تو نہیں کیا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''میں اب فوراً جاؤں گا یہاں سے۔'' جبران نے کہا۔ ''پھاٹک بند کر لو تم۔'' وہ جانے کے لیے تیزی سے مڑا۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو، تو خاموش رہنا۔ شور مچاؤ گی تو یہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہو گا۔'' راجن نے شیریں کو گھورتے ہوئے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ جبران اس سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

شیریں نے باہر سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اغوا کروانے والا کون ہو سکتا ہے۔

دفعتاً وہ چونکی۔ اس نے دروازے پر بہت ہلکی سی ''کھٹ کھٹ'' سنی تھی۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کی نچلی درز سے ایک چھوٹا سا پرچہ اندر آ گیا تھا۔ شیریں نے بے اختیار لپک کر وہ پرچہ اٹھایا اور ایک سطری تحریر پڑھ کر ایک طویل سانس لی جو اطمینان کی سانس تھی۔

''میں قریب ہوں، گھبرانا مت۔ مجھے کچھ انتظار ہے۔ تاج ور۔''

یہ سطر شیریں کے لیے ''ریسکیو لائن'' تھی۔ اسے شروع ہی سے یقین تھا کہ تاجور اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہو گا۔

باہر سے کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور

دور ہوتی چلی گئی۔

جلد ہی راجن لوٹ آیا۔ اس نے اطمینان سے بیٹھی ہوئی شیریں کو گھور کر دیکھا، پھر بولا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کوئی یہاں بچانے آجائے گا؟''

''دیکھتے رہو، کیا ہوتا ہے۔'' شیریں نے جواب دیا۔

راجن اُسے گھورتا رہا، پھر اپنا موبائل نکال کر اس نے کسی سے رابطہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، باہر سے ہارن کی مدھم سی آواز تین مرتبہ آئی۔ راجن نے جلدی سے فون بند کیا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ باہر سے بند کرنا وہ اس وقت بھی نہیں بھولا تھا۔

ہارن کا تین مرتبہ مدھم آواز میں بجنا، اشارہ ہی ہوسکتا تھا۔ اس سے شیریں نے یہی سمجھا کہ وہ شخص آگیا تھا جس نے اسے اغوا کروایا تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ تاجو یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس نے اغوا کروایا ہے۔

جلد ہی باہر سے قدموں کی آواز آئی۔ وہ دو آدمیوں کے چلنے کی تھی۔ پھر باہر سے دروازہ کھولا گیا۔

''تم باہر ہی رکو۔'' راجن سے دھیمی آواز میں کہا گیا تھا لیکن شیریں نے آواز پہچان لی۔ وہ جنید کی آواز تھی۔

کمرے میں داخل ہونے والا جنید ہی تھا۔ اس نے دروازہ بھیڑ دیا لیکن اندر سے بند کرنا ضروری نہیں سمجھا اور مسکراتا ہوا شیریں کی طرف بڑھا۔ شیریں بستر سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''امید ہے کہ تمہیں ان دونوں نے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہو گی۔'' جنید بولا۔ ''میں نے ہدایت کر دی تھی کہ......''

شیریں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''مقصد کیا ہے تمہارا؟''

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم شادی سے پہلے ہی کہیں چلی جاؤ گی۔ مجھے تم نے آگاہ کر دیا تھا کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ میں اس بستر پر تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا جس کے بعد تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔ امید ہے کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد پھر تم مجھ سے ہی شادی کر و گی۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری کہ تم میرے ساتھ کوئی زیادتی کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔''

جنید اس کے بالکل قریب آکر رک چکا تھا۔ ''تم اتنی طاقت ور نہیں ہو کہ میرے مضبوط بازو تمہیں بے بس نہ کر سکیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری ہونے والی بیوی حالات سے سمجھوتا کر لے اور ہم ایک گھنٹا خوش گوار انداز میں گزار لیں۔''

شیریں کا دایاں ہاتھ بڑی تیزی سے گھوما۔ جنید کے گال پر تڑاخ سے ایک طمانچہ پڑا۔

جنید کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر شیریں کو دبوچ لیا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور تاجو اندر آگیا۔ جنید کے بازوؤں میں مچلتی ہوئی شیریں نے اسے دیکھا۔ دروازے کی طرف جنید کی پشت تھی۔

''کسے دیکھ رہی ہو؟'' جنید ہنسا۔ ''دھوکا دہی کا یہ طریقہ اب بہت گھس پٹ چکا ہے۔''

اسی وقت تاجو نے اس کی گردن پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کی کمر پر اتنی زور سے گھٹنا مارا کہ وہ کراہ کر ایک طرف گرا۔

''کون ہو تم؟'' جنید نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے تاجو کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہاری شامت۔'' تاجو نے کہا اور جنید کے قریب پہنچ گیا جو کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو قطعی نہیں ہوگا کہ اس کے مقابل کون ہے۔

تاجو نے گھونسوں اور لاتوں سے اس کی پٹائی اس طرح شروع کی کہ اسے کوئی جوابی حملہ کرنا تو در کنار، اپنے بچاؤ کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ پھر دفعتاً وہ چیخا۔ ''راجن!''

''باہر اُس کی لاش پڑی ہے بے وقوف!'' تاجو نے کہا۔ ''یہاں تیری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔'' جملہ ختم کرتے ہی اس نے لڑکھڑاتے ہوئے جنید کے جبڑے پر اتنی زور کا گھونسا مارا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔

''ختم کر دو اِسے بھی۔'' شیریں دانت پیستے ہوئے بولی۔

''نہیں۔'' تاجو نے کہا۔ ''اسے بس ادھ مرا کر کے چھوڑنا ہے۔ یہ زندگی بھر یاد تو رکھے کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہا تھا جس کی اِسے یہ سزا ملی۔''

اس وقت تک جنید لہولہان ہو چکا تھا۔ چہرے پر نیل پڑ گئے تھے اور پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ سر کے بال بکھر گئے تھے۔ وہ بدستور تاجو کے گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں کی زد پر تھا اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر گرتا پڑتا پٹے جا رہا تھا لیکن آخر کار ایسا ڈھیر ہوا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ تاجو

نے جھک کر اسے دیکھا، پھر بڑبڑایا۔ ''بے ہوش ہو گیا ہے لیکن اسے کچھ زیادہ دیر بے ہوش رکھنا ضروری ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی جس سے جنید کی ناک پر ہلکا سا اسپرے کر دیا۔ ''اب یہ گھنٹا بھر سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔'' تاجو سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ اس نے شیشی جیب میں رکھ لی تھی۔ وہ شیریں کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر کے قریب لے گیا۔

''بیٹھو!'' اس نے کہا۔ ''ہم یہیں وہ باتیں کر لیں گے جو آج کرنی ہیں۔''

''ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تاج ور۔'' شیریں نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ یہ اب ہمارے لیے بہت محفوظ جگہ ہے۔ باہر اس کے ساتھی کی لاش پڑی ہے۔ اس کی گردن کی ہڈی توڑنی پڑی تھی۔ جنید کو میں اس لیے بھی زندہ چھوڑنا چاہتا ہوں کہ اگر قتل کر دیا تو پولیس اس معاملے میں تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنے گی اور اگر اس کو مار کر لاش کو غائب کروا دوں تو بھی تمہیں پولیس کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''میں واپس گھر جانا ہی نہیں چاہتی۔'' شیریں نے کہا۔

''جنید اب تم سے شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔''

''اس صورت میں بھی ڈیڈی میرا رشتہ کسی اور سے کریں گے۔''

''اس میں ابھی کچھ دن اور لگیں گے۔ انتظار کے لیے اب خاصا وقت ہو گا۔ چار دن میں تو تمہارا رشتہ کسی اور سے نہیں ہو گا۔''

''مہینا بھی لگ جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ میری شادی تو کریں گے، ہر صورت میں، ہر قیمت پر!''

''ایک مہینا بھی بہت ہوتا ہے کچھ تیاری کرنے کے لیے۔''

''تیاری سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''بس کچھ ہے۔ میرا کام بھی بیس پچیس دن میں مکمل ہو جائے گا۔''

''کیا کام کرنا ہے تمہیں؟''

''کچھ ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ میں کسی فلمی ہیرو کی طرح یہ ہرگز نہیں سوچ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ غائب ہو گئیں تو تمہارے خاندان کی بدنامی ہو گی یا تمہارے والد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''یہ نہیں سوچ رہے ہو تو پھر کیا سوچ کر دیر لگا رہے ہو۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلی جانا چاہتی ہوں۔''

''یہ بالکل مناسب نہیں ہو گا مائی ڈیئر!'' تاجو نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔ ''ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی ہیں۔'' شیریں کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔ ''میں تمہارے بغیر ایک سانس بھی نہیں لے سکتی تاج ور۔''

''ایک مہینے کی سانسیں تم سے کوئی نہیں چھینے گا اور ایک ماہ بعد تمہاری ہر سانس میری سانس کے ساتھ ہو گی۔''

شیریں کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے مگر اس سے پہلے کہ وہ ٹپک جاتے، تاجو نے انہیں اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔

''زیادہ رات گزرنے سے پہلے تمہیں اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ وہ تقریب اب ختم ہونے والی ہو گی جہاں تم گئی تھیں۔ تم اپنے ڈیڈی سے کہہ سکتی ہو کہ تقریب ختم ہونے کے بعد سیدھی گھر آ گئی ہو۔ چلو اٹھو، میں تمہیں اس جگہ تک پہنچا دوں گا جہاں تمہاری کار ہے۔''

''کار تو وہیں ہے جہاں......''

''وہاں اب نہیں ہے۔'' تاجو نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہ میرے ایک آدمی نے کسی اور جگہ لے جا کر کھڑی کر دی ہے، چلو اٹھو۔'' تاجو نے نہ صرف کہا بلکہ شیریں کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا بھی کر دیا۔

''تم مجھے بہت مایوسی کی حالت میں واپس بھیج رہے ہو مگر یقین کر لو کہ اب میں کوئی ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ تم بے بس ہو جاؤ گے۔''

''ایسا کیا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ بیٹھی ہو؟'' تاجو اس کا ہاتھ پکڑے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''یہ بتانا میں ابھی مناسب نہیں سمجھتی۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔''

تاجو ہنس پڑا۔ ''میرے ہی الفاظ مجھ پر لوٹا رہی ہو۔''

شیریں کچھ نہیں بولی۔ تاجو نے بھی دوبارہ سوال نہیں کیا۔ وہ دونوں راجن کے گھر سے نکل آئے۔

''میری کار قریب کی گلی میں ہے۔'' تاجو نے اس وقت کہا جب وہ دونوں پھاٹک سے نکلے تھے۔

شیریں اب چپ رہی۔

''کیا سوچنے لگیں؟'' تاجو نے تاریکی میں ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''جو سوچ رہی ہوں، وہ بتانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔''

''کوئی بے وقوفی مت کر بیٹھنا میری جان۔''

وہ دونوں گلی میں داخل ہو چکے تھے جہاں ایک کار کھڑی تھی۔

کار اسٹارٹ ہونے کے بعد بھی شیریں خاموش رہی تھی۔ ڈرائیونگ تاجو خود کر رہا تھا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''یہ کار میں نے کل ہی منگائی ہے۔'' تاجو نے کہا۔ ''میری پہلی کار تو شہر کی پولیس کی نظر میں آ چکی ہے۔''

''شہر کی پولیس؟ کیا مطلب؟''

''تم جانتی ہو۔ میرا علاقہ شہری حدود میں شمار نہیں کیا جاتا۔''

''ہوں۔''

''تم نے کیا سوچنا شروع کر دیا ہے؟''

''کہا نا کہ مناسب وقت پر بتاؤں گی اب میں بھی۔''

''کچھ غصہ آ گیا ہے تمہیں۔'' تاجو ہنسا۔ ''اور میں بھی پھر کہوں گا کہ کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھنا۔''

شیریں کچھ نہیں بولی۔ اس کے اس انداز سے تاجو کچھ متفکر ہو گیا لیکن پھر اس نے اپنی کوئی بات نہیں دہرائی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیریں بھی اب وہ بات نہیں بتائے گی جو اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔

ایک قدرے ویران سڑک پر تاجو نے کار اس جگہ روکی جہاں شیریں کی کار کھڑی تھی۔

''جاؤ!'' تاجو نے کہا۔ ''چابی کار میں ہی لگی ہے۔''

''اوہ...... تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ شہر میں کار چوری کی وارداتیں آج کل خاصی بڑھی ہوئی ہیں۔''

''یہ مت سمجھو کہ یہاں سناٹا ہے۔ اس سناٹے میں کہیں میرے دو آدمی بھی موجود ہیں۔ اگر کوئی تمہاری کار اُڑا لے جانے کے لیے تمہاری کار کے قریب جاتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی جاتی۔''

شیریں تاجو کی کار سے اتر کر اپنی کار کی طرف بڑھی۔ تاجو نے اس کی روانگی کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔

شیریں نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا تو اُس کے ذہن میں وہ منظر ابھر آیا جب تاجو جنید کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ تاجو کے اس روپ کے بارے میں وہ خبریں سنتی اور پڑھتی تو رہی تھی لیکن وہ روپ اپنی آنکھوں سے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچی تو اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا کہ پولیس کو راجن کی لاش کب ملے گی اور پھر اس کے بارے میں پولیس کی تفتیش کا انداز کیا ہوگا۔ اس کا تو اسے یقین تھا کہ جنید ہوش میں آنے کے بعد وہاں سے فوراً ہی اپنے گھر کا رخ کرے گا۔ اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ راجن کی لاش کہیں ٹھکانے لگانے کے بارے میں کچھ کرتا۔

☆☆☆

تاجو اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو رات خاصی گزر جانے کے باوجود اسے جلدی نیند نہیں آ سکی۔ وجہ اس کا احساسِ بے بسی تھا اور اس کی وجہ وہ نظامِ حکومت جس نے اسے ایسی جگہ پہنچا دیا تھا جہاں کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن اس ملک میں غریب کا شرافت سے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو چکا تھا۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے شدت سے روزگار کی تلاش تھی کیونکہ گھر میں غربت سسک رہی تھی۔ اس کے والد اس دن بستر پر ڈھیر ہو گئے تھے جب اسے بی اے کی ڈگری ملی تھی۔ اس سے پہلے وہ بیٹے کی تعلیم مکمل کرانے کے لیے اتنی ہی زیادہ محنت کرتے رہے تھے کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد ان کی ہمت فوراً ہی جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی حالت گرتی ہی چلی گئی تھی۔

حصولِ تعلیم کے دوران تاجو کو والد کی بے انتہا محنت کا احساس بھی تھا لیکن کوششوں کے باوجود اسے کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی نہیں مل سکی تھی۔

پھر گھر کے خرچ اور والد کے علاج کے لیے گھر کا سامان بکنا شروع ہوا۔ مکان کرائے کا تھا جو عدم ادائیگی کے سبب کرایہ بڑھتا چلا گیا۔ تین چار ماہ اسی طرح گزر گئے۔ شیریں نے اس دوران میں اس کی مالی مدد کرنی چاہی تھی لیکن تاج ور کی حمیت نے اسے گوارا نہیں کیا تھا۔

ایک روز وہ کہیں سے گھر لوٹ رہا تھا کہ اُس نے دیکھا ایک شہدا نوجوان اس کے محلے کی ایک لڑکی کو چھیڑ رہا تھا جو اپنے اسکول سے گھر لوٹ رہی تھی۔ چھیڑے جانے پر وہ بدحواس ہوئی تو تاج ور اُس شہدے کے قریب گیا اور

اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو شہدے نے اس پر طنز کیا۔
''تو یار ہے کیا اس لونڈیا کا؟''
اس پر تاج ور کو اس پر غصہ آگیا۔ وہ اس شہدے پر ہاتھ چھوڑ بیٹھا۔ ان کے مابین باقاعدہ ہاتھا پائی ہوجاتی لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔
اس شہدے کا تعلق کسی مال دار گھرانے سے تھا۔ وہ لڑکی اپنے اسکول سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جارہی تھی تو ایک کار اس کے قریب آکر رکی۔ اسے وہی شہدا ڈرائیو کررہا تھا۔ اس نے لڑکی کو ''لفٹ'' دینا چاہی لیکن وہ نظرانداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد بھی شہدے کی کار اس کے پیچھے لگی رہی۔ اس نے اس بس کا بھی تعاقب کیا جس میں وہ لڑکی سوار ہوئی تھی۔ پھر جب وہ بس سے اتری تو بھی وہ اس کے پیچھے لگا رہا۔ لڑکی جب اپنے محلے کی گلی میں داخل ہوئی تو اس شہدے نے اپنی کار چھوڑ کر اس کا پیچھا کیا کیونکہ گلی میں کار داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے لڑکی کے قریب جا کر اس سے یہ تک کہہ دیا کہ اگر وہ بہ رضا و رغبت اس کی بات نہیں مانے گی تو وہ اسے اس کے گھر سے بھی اٹھوا سکتا ہے۔
اس بات پر لڑکی بہت زیادہ بوکھلائی تھی اور اس نے بھاگنے کی حد تک تیز چلنا شروع کردیا تھا۔ اس منظر پر تاج ور کی نظر بھی پڑی تھی اور تبھی وہ اس شہدے کے قریب بھی گیا تھا۔
یہ ساری باتیں تاج ور کو اس لڑکی کی ماں سے معلوم ہوئی تھیں جو اسے یہ سمجھانے اس کے گھر آئی تھی کہ بڑے گھر کے ان لوفروں کو نظرانداز کردینا ہی اچھا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر کچھ بھی کرسکتے ہیں اور اب وہ لوفر کسی وقت تاج ور کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتا ہے۔
ماں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اب وہ اپنی بیٹی کو اسکول نہیں بھیجے گی۔
تاج ور کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل نے بھی اس لوفر کی حرکت دیکھی تھی لیکن ایسا بن گیا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔
''پہچانتا ہوگا وہ کہ وہ لوفر کس بڑے باپ کا بیٹا ہے۔'' لڑکی کی ماں نے کہا۔ ''یہاں پولیس ہم غریبوں کو تو پریشان کرسکتی ہے، بڑے لوگوں سے نہیں الجھتی۔''
''ہاں بیٹا!'' خود تاج ور کی ماں نے اسے سمجھایا۔ ''ان لوگوں سے مت الجھا کرو۔''
جھگڑے کے وقت تاج ور کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ شہدا کس باپ کا بیٹا ہے لیکن اگر اسے معلوم ہوتا تو بھی وہ وہی کرتا جو اس نے کیا تھا۔
پھر دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ چند افراد نے کسی جگہ اس شہدے کو گھیر لیا اور کسی پرانی دشمنی کی وجہ سے اس کو قتل کردیا۔
اسی شام پولیس تاج ور کے گھر آئی اور اسے شہدے کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ لاکھ چیخا کہ اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس کے پاس وارنٹ ہونا چاہیے لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔
مقتول شہدے سے تاج ور کے جھگڑے کی بات پولیس کانسٹیبل ہی نے تفتیش کرنے والے پولیس افسر کو بتائی تھی جسے بنیاد بنا کر اسے گرفتار کیا گیا تھا کیونکہ اصل قاتلوں کو گرفتار کیا ہی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ وہ بھی وڈیرا اور جاگیردار قسم کے لوگوں کے بیٹے تھے، بلکہ ان میں سے ایک لڑکا واقعی کسی جاگیردار کا بیٹا تھا۔
یہ باتیں تاج ور کو بہت دن بعد معلوم ہوئیں۔
تھانے میں تو اسے شدید تشدد کا شکار ہونا پڑا تھا۔ پولیس نے گرفتاری کے دوسرے ہی دن اسے عدالت میں پیش کر کے ایک ہفتے کا جسمانی ریمانڈ لے لیا تھا۔ وہ تشدد کر کے اس سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ قتل کی واردات میں اس کے ساتھ اور کون کون تھا؟
خود تاج ور ہی اس قتل کا ذمّے دار نہیں تھا تو وہ کیسے بتاتا کہ اس کے ساتھ اور کون کون تھا۔ ایک ہفتے میں تشدد سہہ سہہ کر اس کی حالت خراب ہوگئی۔ چھٹے دن اس سے یہ بیان لینے کی کوشش کی گئی کہ کچھ نامعلوم لڑکوں نے خود ہی اسے پیشکش کی تھی کہ وہ اس کا ساتھ دے سکتے ہیں اور اس نے ان کی پیشکش قبول کرلی تھی۔
تاج ور نے یہ بیان دے دیا کیونکہ اسے حوالات ہی کے ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ تشدد سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پولیس اگر پچاس افراد کے قتل کا اعتراف کرانا چاہے تو وہ بھی کرلیا جائے کیونکہ بعدازاں عدالت میں مقدمہ چلنے پر عدالت سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ بیان اس سے تشدد کر کے لیا گیا ہے۔ سمجھانے والے نے ایسی کئی مثالیں دی تھیں جن میں لوگوں نے تشدد سے بچنے کے لیے سو سو آدمیوں کے قتل کا فوراً اعتراف کرلیا تھا۔
اگر تاج ور وہ اعتراف نہ کرتا تو اس رات اس پر اتنا تشدد کیا جاتا جو گزرے ہوئے چند دنوں میں نہیں کیا گیا تھا۔
تھانے پہنچنے کے بعد وہ تاج ور کی پہلی رات تھی جب

اس پر تشدد نہیں کیا گیا۔

اگلے دن جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو عدالت کے احاطے میں اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ کرنے والے اسے پولیس سے چھڑا لے گئے۔

وہ ''بلیک برڈ گروہ'' کے لوگ تھے جن کا علاقہ پولیس کے لیے ''نوگو ایریا'' بن چکا تھا۔

وہاں اس کی اندرونی چوٹوں کا علاج کیا گیا۔ وہ اس دوران میں بالکل بے خبر رہا تھا کہ اس کے والدین کس حالت میں تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے ہر قیمت پر اپنے گھر جانے کے لیے تیار تھا لیکن اسے نہیں جانے دیا گیا اور جب دس بارہ دن میں اس کا مکمل علاج ہو گیا تب بلیک برڈ نے اس سے کہا۔

''تم جانتے ہو، ہم لوگ کون ہیں؟''

''کبھی کبھی اخبارات میں تم لوگوں کے بارے میں پڑھا ہے۔''

''میں اور میرے گروہ کا ہر آدمی اس معاشرے اور یہاں کی پولیس کی لاقانونیت کا ستایا ہوا ہے اور ہم نے تمہیں بھی اسی لیے چھڑایا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی۔ اب تم ٹھیک ہو لیکن گھر جاؤ گے تو پھر گرفتار کیے جاؤ گے اور پھر اب گھر پر تمہارے لیے دھرا ہی کیا ہے۔''

''کچھ نہیں، لیکن ماں باپ تو ہیں۔''

''تمہاری ماں اور تمہارے محلے کے کچھ لوگوں نے تمہاری گرفتاری پر تھانے کے باہر احتجاج بھی کیا تھا مگر ان کو لاٹھی چارج کر کے منتشر کر دیا گیا۔ تمہاری ماں کو بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں جو دو دن میں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ رو رو کر ان کا برا حال تھا۔ ہم نے انہیں مالی مدد بھی پہنچانی چاہی تھی لیکن اس لیے قبول نہیں کی گئی کہ ہم جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ اس کے دو دن بعد تمہارے والد کی حالت بہت زیادہ خراب ہوئی تو تمہاری ماں کسی نہ کسی طرح انہیں سرکاری اسپتال لے گئیں لیکن ان کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔''

''کیا؟'' تاج ور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''میرے والد.....'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''میں جانتا تھا کہ تمہیں اس اطلاع سے بہت صدمہ ہو گا لیکن حالات کیسے بھی ہوں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری والدہ بھی اپنے شوہر کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی تھیں۔ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔''

یہ جاننے پر تاج ور کی کیا حالت ہوئی ہو گی، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے اچانک معلوم ہو کہ اس کے محبوب والدین اچانک یہ دنیا ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکے ہیں۔

بلیک برڈ نے کہا تھا۔ ''میں تمہارا ہمدرد ہوں، تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا اور پھر ایک ایسی بات جو تمہارے لیے بہت کرب ناک ثابت ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اگر تم میری باتوں کی تصدیق کرنا چاہو تو محلے کے کسی آدمی کو فون کر کے پوچھ لو۔'' اس نے اپنا موبائل تاج ور کی طرف بڑھایا تھا۔ ''تمہیں اپنے محلے کے کسی آدمی کا موبائل نمبر تو معلوم ہو گا۔''

اتنی باتوں کے بعد تاج ور کو تصدیق کے لیے فون کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر روتا اور سسکیاں لیتا رہا۔ بلیک برڈ نے اسے رونے سے نہیں روکا۔ وہ چاہتا ہو گا کہ تاج ور کا دل ہلکا ہو جائے۔

اس کے اگلے دن تاج ور ساکت و صامت بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا کہ بلیک برڈ پھر اس کے کمرے میں آیا۔

''اب تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔'' اس نے تاج ور سے کہا۔ ''واپس اپنے گھر جا کر پھر پولیس کی گرفت میں جانا ہے یا ہمارے ساتھ رہ کر اس دنیا سے اپنا انتقام لینا ہے؟''

''انتقام لینا چاہتا ہوں میں۔'' تاج ور کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''جرم بے گناہی میں میری ہڈی پسلی ایک کر دی گئی اور میں اپنے ماں باپ کے جنازوں کو کندھا بھی نہیں دے سکا۔ درندے پولیس والوں نے مجھے اپنے ماں باپ کے مرنے کی خبر بھی نہیں ہونے دی۔ اس کا انتقام تو میں لینا چاہتا ہوں لیکن یہ شاید میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

''سب کچھ تمہارے اختیار میں ہو جائے گا اگر تم میرے گروپ میں شامل ہو جاؤ۔'' بلیک برڈ نے پیشکش کی۔

''مجھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو تمہارے گروپ کے لوگوں میں ہو گی۔''

''یہ میری ذمے داری ہو گی کہ تم میں وہ صلاحیت پیدا کی جائے لیکن میں اس معاملے میں تم پر دباؤ نہیں ڈالوں گا۔ میرے گروپ میں شامل ہونے والے ہر شخص کو یقین رکھنا چاہیے کہ ہم جو دوسروں پر گولیاں برساتے ہیں، کسی دن کوئی گولی ہمارے سینے میں بھی اتر سکتی ہے۔''

''مجھے اب اپنی زندگی سے پیار نہیں رہ گیا۔ کون ہے اب جس کے لیے میں جینا چاہوں۔'' یہ کہتے وقت تاج ور کو شیریں کا خیال آیا تھا جو اس نے اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی محبوب شیریں کو بھی بیوگی کا داغ سہنا پڑے۔ بلیک برڈ اسے اس کی طرف سے خبردار کر

چکا تھا۔

بلیک برڈ بولا۔ ''زندگی سے پیار نہیں رہا تو اب تم سب کچھ کر سکو گے۔ کل سے تمہاری ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔''

''میں نے سنا ہے کہ تمہارا علاقہ پولیس کے لیے نوگو ایریا ہے۔''

''ٹھیک سنا ہے تم نے۔''

''لیکن کیسے؟''

''ہمارے ساتھ رہو گے تو دھیرے دھیرے سب سمجھ لو گے۔''

☆☆☆

دوسرے دن سے تاج ور کی عسکری تربیت شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے اسے ریوالور اور رائفل چلانا سکھائی گئی، پھر نشانہ بازی کی مشق کا آغاز ہوا جس کے بعد اس کی کمانڈو ٹریننگ بھی شروع ہوئی۔ اور آخر ایک دن اس سے کہہ دیا گیا کہ اب وہ خود کو گروپ کا فعال رکن سمجھ سکتا ہے۔

اس طرح وہ تاج ور سے تاجو بن گیا۔ گروہ کے سبھی افراد نے اسے تاجو کہنا شروع کر دیا تھا۔

اسی دوران میں تاجو کو یہ معلومات حاصل ہو گئی تھیں کہ اس گروپ کی سرپرستی کرنے والے کئی ایم این اے اور ایم پی اے تھے۔ ان میں سے بعض کی پہنچ وزیر داخلہ تک تھی۔ وہ اس گروہ کے سرپرست اس لیے بنے تھے کہ الیکشن کے وقت یہ گروپ انہیں جتوانے کے لیے بہت کچھ کرتا تھا۔

اس گروپ کی داغ بیل بلیک برڈ نے ہی ڈالی تھی جس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ اس گروپ کی مدد کے لیے ایک دشمن ملک کے جاسوس بھی حرکت میں آ گئے تھے۔ ان کے تعاون سے گروپ کو بے پناہ اسلحہ مل گیا تھا، یہاں تک کہ ایک اینٹی کرافٹ گن بھی مل گئی تھی۔

اس گروپ کا ایک ٹارگٹ تو پولیس ہی تھی، دوسرے وہ اپنی مالی قوت بڑھانے کے لیے ان مال دار لوگوں کو بھی نشانہ بناتے تھے جن کی دولت مندی کے بنیادی اسباب ناجائز طریقے تھے۔ انہیں یا ان کے کسی قریبی عزیز کو اغوا کر کے بے پناہ تاوان لیا جاتا تھا اور تاوان نہ ملنے کی صورت میں انہیں مار بھی ڈالا جاتا تھا۔

تاجو کو صرف یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ یہ گروپ ایک دشمن ملک سے بھی مدد لے رہا تھا لیکن اسے نظرانداز کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس گروپ میں رہے بغیر تاجو اپنا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔

اس دوران میں موبائل فون پر شیریں سے اس کی بات ہوتی رہتی تھی جب اس نے پہلا فون کیا تھا تو شیریں بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔

''کہاں ہو تم؟'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''میں جہاں بھی ہوں ٹھیک ہوں شیریں! اب پولیس میری ہڈیاں نہیں توڑ سکتی۔''

''تمہارے والد اور والدہ......''

''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔''

''اخبارات میں آیا ہے کہ تمہارا تعلق بلیک برڈ گروپ سے تھا اور انہی لوگوں نے تمہیں عدالت سے فرار کرایا تھا۔''

''اخبارات کو یہ اطلاع فراہم کرنا پولیس کی کمینگی ہے کہ میرا تعلق بلیک برڈ سے تھا لیکن اب یقیناً میرا تعلق بلیک برڈ گروپ سے ہے۔''

''اس کا کیا نتیجہ نکلے گا تاج ور؟''

''یہ فیصلہ تو وقت ہی کرے گا کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔''

''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تاج ور!'' شیریں ہیجانی لہجے میں بولی تھی۔

''تو پھر۔'' تاجو نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مرنا ہو گا میرے ساتھ۔''

''میرا جینا مرنا سب تمہارے ساتھ ہے۔ کتنے دن سے تمہیں دیکھا تک نہیں۔ نیندیں حرام ہو گئی ہیں میری۔ کسی طرح بھی مجھ سے ملو۔''

''کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا شیریں۔'' تاجو نے کہا تھا۔ ''موقع محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں کوئی تدبیر سوچوں گا تم سے ملنے کی لیکن اب تم تاج ور سے نہیں، تاجو سے ملو گی۔ اب میں تاجو ہوں، صرف تاجو۔''

''تم جو کچھ بھی ہو، میرے ہو، بس۔ اور میں تمہارے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔''

''دیکھو اب حالات کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ انتظار کرو۔ میں تمہیں وقتاً فوقتاً فون کرتا رہوں گا۔''

''روز فون کرو۔'' شیریں کے انداز میں بے تابی تھی۔ ''تمہاری آواز ہی سن کر کچھ سکون ملتا رہے گا مجھے۔''

''کوشش کروں گا۔''

''کوشش کی بات نہ کرو۔ وعدہ کرو۔''

''تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہو سکتا شیریں کہ مجھے اب کن حالات سے گزرنا ہے۔ مجھ سے کوئی ایسا وعدہ نہ لو جو اگر کبھی ٹوٹا تو مجھے صدمہ ہو گا۔''

''اچھا'' شیریں کے لہجے میں مردنی آگئی تھی۔
''لیکن جب بھی موقع ملے، مجھے فون ضرور کرنا۔ تمہارا نمبر تو میرے پاس آگیا ہے، کسی وقت میں فون کرلیا کروں گی۔''
''نہیں کرسکو گی۔ تمہیں فون بند ملے گا۔ اب میری زندگی بہت سی احتیاطوں کے ساتھ گزرے گی شیریں!...... اچھا اب بس، باقی باتیں پھر کسی دن۔''
''میں بے چینی سے انتظار کیا کروں گی۔''
تاجو نے محبت سے ماؤتھ پیس کو چوم کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔
پھر وہ دن بھی آگیا جب پولیس اسٹیشن کے وہ پولیس والے چن چن کر مارے گئے جنہوں نے اس پر تشدد کیا تھا۔ اس کانسٹیبل نے بھی اپنے سینے پر گولی کھائی جس نے اس کے خلاف بیان دے کر اسے گرفتار کرایا تھا۔ ٹارگٹ کلنگ کی ان وارداتوں میں تاجو تو پیش پیش تھا ہی، گروپ کے لوگ بھی اس سے تعاون کرتے رہے تھے کیونکہ گروپ کی دوسری وارداتوں میں تاجو ان کے ساتھ ہوتا تھا۔
تاجو کی منصوبہ بندیاں بھی گروپ کے لیے حرف آخر کا درجہ حاصل کر گئیں۔ کئی وارداتوں میں ایسا بھی ہوا کہ وہ لوگ اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتے اگر تاجو کی حاضر دماغی کام نہ آتی۔ اپنی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے بلیک برڈ نے اسے اپنا نائب مقرر کرلیا۔ اس کے بعد وہ سب کچھ بھی تاجو کے علم میں آتا چلا گیا جو گروپ کے باقی لوگ نہیں جانتے تھے۔ حکومت کے ان لوگوں کے نمبر جو اس گروپ کے سرپرست تھے اور جن کی وجہ سے گروپ کے علاقے کے خلاف کوئی فیصلہ کن پولیس کارروائی نہیں ہوتی تھی اور جو تھوڑی بہت کارروائیاں ہوتی تھیں، وہ صرف دکھاوے کے لیے ہوتی تھیں۔ مشہور یہ کیا گیا تھا کہ کوئی بڑی کارروائی اس لیے نہیں ہو پاتی کہ اس علاقے میں رہنے والے عام لوگوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جاتیں جسے گروپ نے اپنا یرغمال بنالیا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ ساری آبادی غریبوں کی تھی جن کے دکھ درد اور پریشانی میں گروپ کا ہر فرد سرگرم رہتا تھا۔ اسی لیے سب لوگ اس گروپ سے خوش تھے۔ وہ جب اپنے اپنے کاموں کی وجہ سے علاقے کے باہر جاتے تھے تو دوسروں پر یہی ظاہر کرتے تھے کہ اس گروپ کی وجہ سے وہ بہت تنگ ہیں، حکومت اس گروپ کو ختم کرنے میں آخر کب کامیاب ہوگی؟
اسی طرح بیرونی امداد کے ذرائع بھی تاجو کے علم میں آگئے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ وقتاً فوقتاً شیریں کو فون بھی کرتا رہا۔ مناسب موقع محل کے اعتبار سے ان کی کئی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ ہر ملاقات میں شیریں پوچھتی تھی کہ تاجو ان حالات سے کب اور کس طرح نکل سکے گا؟
تاجو ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا۔ ''انتظار کرو۔ وقت آنے پر سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
لیکن خود وہ جانتا تھا کہ سب کچھ اس طرح کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا جس طرح شیریں چاہتی تھی۔
اب اخبارات میں یہ بات بھی آچکی تھی کہ تاجو اس گروپ کا سب سے زیادہ خطرناک شخص ہے۔ اسی لیے اس کے سر کی قیمت بھی مقرر کر دی گئی تھی لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ گروپ کا کوئی فرد اس کے بارے میں مخبری کر دیتا۔ وہ سب ایک دوسرے سے مخلص تھے جنہیں اب دولت کی ذرا بھی طمع نہیں رہی تھی۔ گردشِ حالات نے انہیں ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے الگ کر دیا تھا جو کبھی ان کی دنیا تھی۔
وہ سب تاجو سے اس کی صلاحیتوں اور ذہانت سے خاصے مرعوب ہوگئے تھے۔ یہ احساس بھی سب کو ہوگیا تھا کہ بلیک برڈ کے بعد اب تاجو ہی اس گروپ کا ''بڑا'' ہے۔ ان لوگوں نے اسے ''استاد تاجو'' کہنا شروع کیا تھا لیکن تاجو نے انہیں سختی سے منع کر دیا۔
گروپ میں شامل ہوئے اسے خاصا عرصہ گزر چکا تھا جب ایک بڑی واردات کرتے ہوئے پولیس سے ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔ فائرنگ کا بے تحاشا تبادلہ ہوا۔ فائرنگ میں گروپ کے ایک آدمی کے علاوہ خود بلیک برڈ بھی مارا گیا لیکن باقی لوگ پولیس کے نرغے سے نکل کر اپنے علاقے تک پہنچ گئے۔
بلیک برڈ سے ان سبھی کو بہت لگاؤ ہوگیا تھا اس لیے دو دن تک علاقے میں ایسا سکوت رہا جیسے کسی گھر میں موت ہو گئی ہو۔ سبھی افسردہ تھے۔ تیسرے دن ان سب نے مشاورت کی اور متفقہ طور پر تاجو کو اپنا سربراہ مان لیا۔ اسی دن کے بعد سے تاجو نے بھی اپنا خفیہ نام بلیک برڈ رکھ لیا۔
گروپ کا سربراہ بننے کے بعد اس نے دو اہم کام کیے۔ ایک تو یہ کہ بجلی کے محکمے کے تمام سب اسٹیشنز پر علاقے کے عام لوگوں کو ملازم کرا دیا تاکہ جب بھی واردات کے وقت روشنی ان کے لیے خطرناک ثابت ہوتی نظر آئے، اس علاقے کی بجلی اُڑا دی جائے۔ ان لوگوں کا گروپ کے دوسرے کاموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بس اسی لیے تھے کہ جب انہیں بلیک برڈ کی طرف سے حکم ملے، وہ اس

علاقے کی بجلی اُڑا دیں جس کی نشاندہی کی گئی ہو۔ اس اقدام سے گروپ کو تین مرتبہ فائدہ پہنچ چکا تھا۔ تیسرا موقع تو وہی تھا جب شیریں کے گھر کے پاس سے فرار ہوتے وقت تاجو نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی اور خطرے میں پڑے بغیر پروین کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ ''بیرونی ذرائع'' سے امداد لینا ہی نہیں چھوڑی بلکہ ان سے ترکِ تعلق بھی کر لیا۔ یہ تعلق اسے شروع ہی سے پسند نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ بعض اوقات گروپ کو اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس طرح تاجو نے یہ ''داغ'' دھو لیا کہ وہ لوگ کسی بیرونی طاقت کے ایجنٹ بھی تھے۔

تاجو کے خیال کے مطابق گروپ کو اب ان لوگوں کی امداد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گروپ کے پاس اسلحے کا انبار لگ چکا تھا۔ اس کے باوجود اگر کبھی اسلحے کی ضرورت پڑتی تو وہ اسمگلروں سے خریدا جا سکتا تھا۔ پیسے کی ان کے پاس اب کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک آہنی والٹ میں ان کے پاس کروڑوں ڈالرز موجود تھے اور مقامی کرنسی بھی بڑی تعداد میں موجود تھی جو تاوان کی صورت میں ملتی رہتی تھی۔

پولیس کی ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ بھی اس نے رکوا دیا کیونکہ گروپ کے جس شخص کو بھی پولیس کے بعض لوگوں سے انتقام لینا تھا، وہ لے چکا تھا۔ خود تاجو بھی ان سب کو ختم کر چکا تھا جو اس پر تشدد کے ذمے دار تھے۔ ان میں سے اب صرف ایس پی نادر... زندہ تھا جو یہ جانتا تھا کہ اس پر تشدد کیا جا رہا ہے لیکن اس نے اس معاملے میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی جبکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔

''پولیس کا بس ایک آدمی باقی ہے اب۔'' اس نے گروپ کے لوگوں سے کہا تھا۔ ''اس کے بعد میرا کام بھی مکمل ہو جائے گا۔''

اور اس کام کی تکمیل کے بعد کیا کرنا ہوگا؟ تاجو یہ بات اکثر سوچا کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اب وہ اس گروپ کو چھوڑ دے اور خود ہی ان میں سے کسی باصلاحیت شخص کو بلیک برڈ کا ''منصب'' دے دے لیکن اس کے بعد وہ خود قانون کی گرفت سے کس طرح بچ سکے گا؟ اس بارے میں بھی دو ایک خیالات اس کے ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی سے کچھ بات چیت کر بھی چکا تھا۔

ایک مسئلہ اس کے لیے شیریں بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، خودکشی کر لے گی اور خود وہ بھی شیریں کے بغیر جو زندگی گزارتا، وہ وحشت زدہ ہی ہوتی۔ یہ انسان کے لیے بہت بڑا کرب ہوتا ہے کہ اس سے محبت کرنے والا ایک فرد بھی نہ ہو۔ اب اس سے محبت کرنے والی واحد فرد صرف شیریں ہی تھی۔ ماں باپ مر ہی چکے تھے۔ دوسرے اعزہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اور جو باقی رہ گئے تھے، انہوں نے تاجو کے گھر کی غربت کی وجہ سے کسی نہ کسی بات کو جواز بنا کر ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ تاجو کو ان سے اس کی شکایت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اندھیرے میں سائے کا جدا ہو جانا ایک قدرتی عمل ہے۔ بس شیریں؟ یہ اس کے لیے بہت بڑا سوال تھا۔ فی الحال اس نے شیریں کے سر سے یہ خطرہ تو ٹال ہی دیا تھا کہ اس کی شادی جنید سے ہونے والی تھی اور اس نے کیا ٹالا تھا، خود جنید ہی نے ایسی حرکت کی تھی۔ اب وہ خود ہی شیریں سے شادی نہ کرتا۔

☆☆☆

جنید کو جب راجن کے گھر میں ہوش آیا تو اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ چہرے پر سوجن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ہونٹ اور گال کی اندرونی سطح کے زخموں سے بہنے والے خون کے دھبے بھی اس کے کپڑوں پر موجود تھے۔

کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا جس کی جنید کو توقع بھی تھی۔ اس کا یہ یقین بھی بے جا نہیں تھا کہ اس کی پٹائی کرنے والا شیریں کا وہی عاشق ہوگا جس کی وجہ سے شیریں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہی عاشق شیریں کو اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ یہ بہرحال جنید کے لیے ایک معما تھا کہ وہ شخص وہاں پہنچ کیسے گیا، اور شیریں بھی جانتی تھی کہ وہ اسے بچانے آ جائے گا۔ اسی لیے وہ خوف زدہ بھی نہیں تھی۔

جنید لڑکھڑاتا ہوا اس کمرے سے نکلا تو اسے راجن کی لاش بھی نظر آ گئی۔ لاش کا ملنا اس کے لیے حیران کن نہیں تھا۔ اپنے حملہ آور سے اس نے سن ہی لیا تھا کہ وہ راجن کو ختم کر چکا ہے۔

اپنی کار اسے وہیں ملی جہاں اس نے چھوڑی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ کار حرکت میں لانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ بازوؤں میں ہونے والی تکلیف کے باعث اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ ضروری تھا کہ وہ زیادہ رفتار سے کار نہ چلاتا۔

اس کا دماغ غصے کی آگ کا ایندھن بنا ہوا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ شیریں سے اپنا انتقام لے۔ یہ خیال تو اس نے اپنے ذہن سے نکال ہی دیا تھا کہ وہ اب بھی شیریں

سے شادی کے لیے کوشش جاری رکھے گا۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ کی مسافت طے کرتے کرتے اس کے دماغ میں ایک منصوبہ آگیا جس پر عمل کر کے وہ شیریں سے انتقام لے سکتا تھا۔ اس نے کار روک دی اور اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ جلد ہی اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے اپنے منصوبے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ اس نے موبائل فون جیب سے نکالا اور شیریں سے رابطہ قائم کیا۔

''اوہ!'' شیریں کی آواز سنائی دی۔ ''اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی ؟''

جنید طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر کہاں گئی ہو؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم، میں اپنے گھر پر ہوں۔''

''تمہارے عاشق نے ایک شخص کا قتل بھی کیا ہے اس گھر میں جہاں تم نے مجھے بلایا تھا؟''

''شٹ اپ۔'' دوسری طرف سے شیریں نے غصیلی آواز میں کہا اور لائن ڈس کنکٹ کردی۔

جنید کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنا موبائل بند کرتے ہوئے سوچا کہ یہ گفتگو کسی حد تک تسلی بخش ہی رہی ہے۔ اس نے وہ سب کچھ اپنے موبائل میں ریکارڈ کرلیا تھا۔

کار دوبارہ حرکت میں آئی۔ اب اس کا رخ قریبی پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ جب اس کی کار پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جا کر رکی اور وہ کار سے اترا تو اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے سپاہیوں کے مختلف تاثرات تھے۔ کوئی مسکرایا تھا اور کسی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جنید کی طرف اشارہ کیا تھا اگر وہ کار سے نہ اترا ہوتا تو شاید اس پر فقرے بھی کس دیے جاتے۔

''کسی سے جھگڑا ہوگیا صاحب؟'' ایک کانسٹیبل نے اس کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔ ''پرچہ کٹانا ہے؟''

''ہاں۔'' جنید نے جواب دیا۔ ''لیکن پہلے میں تمہارے ایس ایچ او سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''خوش قسمت ہیں آپ۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''صاحب راؤنڈ پر نکلے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی آئے ہیں۔ چلیں میں آپ کو اُن کے کمرے تک پہنچادوں۔''

جنید پہلے ہی تھانے کی عمارت کی طرف بڑھ چکا تھا۔ کانسٹیبل اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے امید ہوگی کہ اس کے خوشامد پسندانہ انداز پر اس کی جیب کچھ گرم ہو جائے گی۔

اس کی یہ توقع اس طرح پوری ہوئی کہ ایس ایچ او کے کمرے کی چق اٹھانے سے پہلے جنید نے پچاس کا ایک نوٹ کانسٹیبل کی جیب میں ڈال دیا۔

توقع تو درست ثابت ہوئی لیکن اس کا منہ کچھ بن گیا تھا۔ اسے ایک قیمتی کار سے اترنے والے سے سو روپے کے نوٹ کی امید ہوگی۔

ایس ایچ او نے بھی اس کی طرف کچھ تعجب سے دیکھا۔

''مجھے رپورٹ تو درج کرانی ہے۔'' جنید نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''رپورٹ کس کے خلاف درج کرانی ہے؟ کس سے جھگڑا ہوا ہے آپ کا؟''

''میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مجھے کسی جگہ بلا کر مارا پیٹا گیا ہے۔ مجھے ایک لڑکی کے خلاف رپورٹ درج کرانی ہے۔''

''لڑکی نے مارا پیٹا ہے آپ کو؟'' ایس ایچ او تعجب سے بولا۔

''لڑکی نے مجھے فون کر کے بلایا تھا ایک گھر میں جہاں میری یہ حالت بنانے والا اس کا عاشق ہی ہوگا۔''

''وضاحت سے بتائیں۔ بیٹھ جائیے۔''

جنید اس وقت تک کھڑا ہوا ہی تھا۔

''لڑکی کا نام شیریں ہے۔'' جنید نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے میری شادی طے ہوگئی تھی لیکن مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے مجھے تعجب ہوا جب اس کا فون آیا۔ اس نے مجھے ایک پتا بتایا اور مجھ سے وہاں آنے کے لیے کہا۔ میں اس توقع پر چلا گیا کہ شاید کچھ بات بن جائے۔ مجھے اس سے شادی کی خواہش تو تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں تھی لیکن اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جس نے اچانک مجھ پر حملہ کردیا۔ مجھے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ ایسی کوئی بات سان گمان میں بھی نہیں تھی ورنہ میری صحت ایسی خراب نہیں ہے کہ وہ میرا یہ حال کردیتا۔ سر پر لگنے والی ایک ضرب سے میں بے ہوش ہوگیا پھر جب مجھے ہوش آیا تو وہاں نہ شیریں تھی اور نہ وہ شخص۔ میں اس کمرے سے نکلا تو میں نے وہاں ایک لاش پڑی ہوئی دیکھی۔''

ایس ایچ او خاموشی اور توجہ سے سب کچھ سنتا رہا تھا لیکن آخری جملے پر وہ اس طرح چونکا کہ اپنی کرسی سے ذرا

ساتھ بھی گیا۔ ''لاش؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں۔'' جنید نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ میں نے اس کی گردن ایک طرف اس طرح لٹکی دیکھی ہے جیسے اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو، اور گردن کی ہڈی خود بہ خود تو ٹوٹ نہیں سکتی۔''

''یہ بات تو آپ کو سب سے پہلے بتانی چاہیے تھی۔'' ایس ایچ او نے تیزی سے کہا اور پھر فوراً ہی بلند آواز میں کسی کو پکارا۔

جنید نے اس کمرے میں آتے وقت ایک کانسٹیبل کو دروازے کے پاس کھڑا دیکھا تھا۔ ایس ایچ او کی پکار پر وہی اندر آیا۔

''حیدر کو بلاؤ۔'' ایس ایچ او نے اس سے کہا پھر جنید سے بولا۔ ''اس گھر کا پتا بتایئے۔'' اس نے قلم سنبھال لیا تھا۔

جنید نے پتا بتایا جو ایس ایچ او نے لکھ لیا۔

''آپ کو اسپتال جا کر اپنا چیک اپ کروانا چاہیے۔'' اس نے جنید سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، آپ کو کوئی اندرونی چوٹ بھی آئی ہو۔''

''میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کر رہا ہوں۔'' جنید نے کہا۔ ''جو چوٹیں آئی ہیں، وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں جلد از جلد یہاں کی کارروائی مکمل کرانا چاہتا ہوں۔''

اسی وقت ایک سب انسپکٹر اندر آیا۔ وہ حیدر ہی ہوگا۔

''اس گھر پر جایئے۔'' ایس ایچ او نے اسے وہ پرچہ دیا جس پر اس نے جنید کا بتایا ہوا پتا لکھا تھا۔ ''وہاں آپ کو ایک لاش ملے گی۔ غالباً اسے قتل کیا گیا ہے۔ ایمبولینس بھی ساتھ لے جایئے۔ فنگر پرنٹ سیکشن کے لوگوں کو بھی۔ قوی امکان ہے کہ وہاں کچھ افراد کی انگلیوں کے نشانات بھی ملیں گے۔''

''شیریں کے تو ضرور ملیں گے۔'' جنید پُرجوش ہو گیا۔

سب انسپکٹر حیدر نے جنید پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''آپ نے مجھے تو ساری تفصیل بتا دی۔'' ایس ایچ او نے جنید سے کہا۔ ''اب پرچہ کٹوا دیں جا کر۔''

جنید پرچہ کٹوانے کے لیے جاتے وقت بہت مطمئن تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ شیریں کو ایک بڑی مشکل میں پھنسوانے جا رہا تھا۔ اسے پولیس کے سامنے قتل کے بارے میں جواب دہی کرنی پڑ سکتی تھی۔

پرچہ کاٹنے والے نے جب شیریں کا نام لکھنے کے بعد اس کے باپ کا نام پوچھا تو جواب سن کر اس کا قلم فوراً رک گیا۔ اس نے جنید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''شیخ جواد؟...... یعنی وہ جو......''

''جی ہاں وہی۔'' جنید نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس شہر میں اس نام کا ایک ہی شخص مشہور ہے۔''

''ایک منٹ۔'' محرر نے کہا اور پھر تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

جنید نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ محرر ایس ایچ او کو بتانے گیا ہوگا۔ بڑے لوگوں کے خلاف پرچہ کاٹتے ہوئے پولیس کی جان نکلتی ہے، اس نے بڑی تلخی سے سوچا تھا۔

محرر جلد ہی واپس لوٹا اور جنید سے بولا۔ ''صاحب بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''بڑے لوگوں کا نام لکھتے ہوئے تم لوگ بہت گھبراتے ہو۔'' جنید نے اس سے خشک لہجے میں کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے اٹھ کر ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا۔

''آپ شیخ جواد کی بیٹی کے خلاف پرچہ کٹوا رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ اسی کے خلاف کٹواؤں گا جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔''

''آپ نے بتایا تھا کہ اس سے آپ کی شادی طے ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔''

''آپ کا تعلق بھی کسی ایسے ہی بڑے گھرانے سے ہوگا۔''

''میں سیٹھ ابراہیم کا بیٹا ہوں۔ یقیناً آپ سیٹھ ابراہیم کے نام سے بھی واقف ہوں گے۔''

''یقیناً۔ وہ بھی ایک مشہور بزنس مین ہیں۔ اس کے باوجود...... میرا مطلب ہے کہ...... آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے لوگوں کے خلاف کارروائی پولیس کے لیے اکثر اوقات پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ کیا آپ شیریں کے خلاف کوئی چھوٹا موٹا ثبوت دے سکتے ہیں؟''

''چھوٹا موٹا ثبوت تو دے ہی سکتا ہوں۔'' جنید نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ ایسی کوئی نوبت آئے۔ اس نے شیریں سے اپنی جو مختصر بات چیت ریکارڈ کی تھی، وہ اس نے ایس ایچ او کو سنا

دی۔

ایس ایچ او کچھ سوچنے لگا۔

”کیا شیریں کا پہلا جملہ قابلِ گرفت نہیں ہے؟“ جنید بولا۔”اس نے پوچھا تھا کہ اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی۔“

ایس ایچ او نے متفکر انداز میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ”ریکارڈنگ مجھے پھر سنوایئے۔“

جنید نے ریکارڈنگ اسے دوبارہ سنا دی پھر بولا۔ ”اس پر بھی غور کیجیے کہ جب میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہارے عاشق نے اس گھر میں ایک قتل بھی کیا ہے جہاں تم نے مجھے بلایا تھا۔ میری اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور شٹ اپ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔“

ایس ایچ او نے پھر فکرمندی سے سر ہلایا اور کچھ سوچ کر بولا۔”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ شیریں ہی کی آواز ہے؟“

”میں اپنا بیان دے چکا۔“ جنید نے تلخی سے کہا۔ ”اب ثبوت حاصل کرنا میرا نہیں بلکہ پولیس کا کام ہے، یہ آپ کا کام ہے۔“

جنید اب کچھ دبنگ اس لیے ہو گیا تھا کہ وہ ایس ایچ او کو اپنے باپ کا نام بتا چکا تھا۔ اس نام کو سننے کے بعد ایس ایچ او کی سطح کا کوئی پولیس آفیسر اسے ٹیڑھے انداز میں جواب نہیں دے سکتا تھا۔

”شیریں کا فون نمبر بتائیں گے آپ مجھے؟“ ایس ایچ او بولا۔

جنید نے اسے نمبر بتا دیا۔ ایس ایچ او نے اپنا موبائل نکال کر وہ نمبر ملایا۔ فون کان سے لگائے ہوئے وہ جنید کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں محترمہ!...... میں نے آپ کو دوبارہ فون نہیں کیا ہے۔ میں ایک پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں۔“

اب جنید بھی غور سے ایس ایچ او کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”فون میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہاں ایک شخص آپ کے خلاف یہ رپورٹ درج کروانا چاہتا ہے کہ آپ نے اسے کسی سے پٹوایا ہے...... جی ہاں، یہی نام ہے ان کا...... جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، ثبوت تو دینا ہوگا انہیں...... سوری، میں نے آپ کی نیند خراب کی...... بس ایک سوال کا جواب اور دے دیجیے، کیا وہ صاحب ایک بار پہلے بھی...... یعنی ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کر چکے ہیں؟...... دراصل یہ سوال میں آپ کی پہلی بات کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا تھا کہ تم اب کسی نئے نمبر سے مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو۔“

جنید نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی شیریں کے جوابات سنے۔

”آپ کے اس بیان کے مطابق آپ نے فون بند کر دیا لیکن جنید صاحب نے مجھے اپنے موبائل سے ایک ریکارڈنگ سنوائی ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔”ان کا بیان ہے کہ وہ آپ کی اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ ہے۔ اس میں آپ نے ان سے کہا ہے کہ اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی۔“

پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد ایس ایچ او نے کہا۔”شکریہ! مجھے آپ سے بس یہی معلومات درکار تھیں۔“ پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”کیا کہہ رہی تھی وہ؟“ جنید نے بے چینی سے پوچھا۔

”ریکارڈ میں نے بھی کی ہے یہ گفتگو۔ یہ بہت کام آئے گی۔ آپ پرچہ کٹوایئے۔“

”آپ کے محرر صاحب کاٹیں گے؟“ جنید نے تلخی سے پوچھا۔

”وہ آپ کے پیچھے پیچھے آیا ہوگا۔ دروازے ہی پر کھڑا ہوگا۔“ ایس ایچ او نے کہا، پھر قدرے بلند آواز میں پکارا۔”قادر!“

محرر فوراً ہی اندر آ گیا۔

”پرچہ کاٹ دو۔“ ایس ایچ او نے اس سے کہا۔”جو کچھ بھی یہ بتائیں، لکھو۔“

”آیئے صاحب۔“ محرر نے جنید سے کہا۔

”ایک منٹ۔“ جنید نے اسے جواب دیا، پھر ایس ایچ او سے بولا۔”کیا میں وہ باتیں سن سکتا ہوں جو شیریں نے آپ سے کہی تھیں؟ آپ بتا چکے ہیں کہ ریکارڈنگ آپ نے بھی کی ہے۔“

ایس ایچ او نے کچھ سوچا، پھر کہا۔”سن لیجیے!“ پھر اس نے محرر سے کہا۔”تم جاؤ، یہ ابھی آتے ہیں تمہارے پاس۔“

محرر کے جانے کے بعد ایس ایچ او نے جنید کو ریکارڈنگ سنوائی۔ ریکارڈنگ کی ابتدا میں تین مرتبہ گھنٹی

بجنے کی آواز سنائی دی، پھر کال ریسیو کی گئی۔ ''تم اب مجھے کسی اور نمبر سے پریشان کرنا چاہتے ہو؟'' شیریں کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں محترمہ!'' یہ ایس ایچ او کی آواز تھی۔ ''میں نے آپ کو دوبارہ فون نہیں کیا ہے۔ میں ایک پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں۔''

''اوہ۔'' شیریں کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ''لیکن کیوں؟ پولیس اسٹیشن سے مجھے فون کیوں کیا گیا ہے؟''

''فون میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہاں ایک شخص آپ کے خلاف یہ رپورٹ درج کروانا چاہتا ہے کہ آپ نے کسی سے اسے پٹوایا ہے۔''

''اوہ! کیا وہ جنید ہے؟''

''جی ہاں، یہی نام ہے ان کا۔''

''بکواس کر رہا ہے وہ۔ اس سے میری منگنی تو ہو چکی ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ میں اس سے بھی کہہ چکی ہوں۔ اب وہ انتقاماً میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوانا چاہتا ہے۔ تو بنائے۔ مجھے پروا نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت ہے اس کا کہ میں نے اسے پٹوایا ہے؟ ثبوت تو دینا ہوگا اُسے۔''

''جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ثبوت تو دینا ہوگا انہیں۔''

''تو ثبوت لیجیے اُس سے۔ آپ نے خوامخواہ میری نیند خراب کی ہے۔''

''سوری! میں نے آپ کی نیند خراب کی۔ بس ایک سوال کا جواب اور دے دیجیے! کیا وہ صاحب آپ کو پہلے بھی...... یعنی ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کر چکے ہیں؟ دراصل یہ سوال میں آپ کی پہلی بات کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ آپ نے چھوٹتے ہی کہا تھا کہ تم اب کسی نئے نمبر سے مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو۔''

دوسری طرف سے کچھ توقف کے بعد کہا گیا۔ ''ہاں، اس نے مجھے فون کیا تھا لیکن میں نے اس کی الٹی سیدھی باتوں کا کوئی جواب ہی نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔''

''آپ کے اس بیان کے مطابق آپ نے فون بند کر دیا لیکن جنید صاحب نے مجھے اپنے موبائل سے ایک ریکارڈنگ سنوائی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ آپ کی اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ ہے۔ اس میں آپ نے ان سے کہا ہے کہ اتنی پٹائی کے باوجود تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آئی۔''

''بکواس ہے یہ اُس کی۔ کسی اور سے بات کر کے اس نے یہ ریکارڈنگ کی ہوگی۔ کسی لڑکی سے کہہ دیا ہوگا کہ وہ اس کی باتوں میں یہ جوابات دے۔''

''شکریہ۔ مجھے آپ سے بس یہی معلومات درکار تھیں۔''

اس آخری بات کے بعد ایس ایچ او نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''تو سنی آپ نے اس کی آواز؟'' جنید پُرجوش انداز میں بولا۔ ''اس کی اور میرے موبائل کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ بظاہر تو فرق نظر نہیں آتا لیکن یہ فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔ ایکسپرٹ ہی ان دونوں آوازوں کو سن کر فیصلہ دے سکتا ہے۔ کیا آپ اپنا موبائل مجھے عنایت کریں گے؟ میں اپنا اور آپ کا موبائل ایکسپرٹ کو بھجوا دوں گا۔''

''شوق سے لے لیجیے آپ۔'' جنید نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا موبائل اس کے حوالے کر دیا۔ ''میں ہر قیمت پر شیریں کے خلاف قانون کی کارروائی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے شادی کرنے کا خیال تو اب میں اپنے ذہن سے جھٹک چکا ہوں۔ وہ لڑکی جو کسی لوفر کو چاہتی ہو، میں اُس سے شادی کیسے کر سکتا ہوں؟''

''اگر ایکسپرٹ کی رپورٹ یہی ہوئی کہ دونوں آوازیں ایک ہی لڑکی کی ہیں تو ہمیں کارروائی کا جواز مل جائے گا۔ دو جھوٹ بھی ثابت ہو جائیں گے۔ ایک تو یہ کہ آپ کے فون پر اس نے آپ سے بات نہیں کی۔ دوسرے جب میں نے کہا کہ یہاں کوئی شخص ان کے خلاف رپورٹ کرنا چاہتا ہے تو چھوٹتے ہی آپ کا نام کیوں لیا گیا۔''

''آپ فوری طور پر اسے طلب کر کے پوچھ گچھ کیوں نہیں کرتے؟''

''وہ کسی معمولی گھر کی لڑکی ہوتی تو ایسا کیا جا سکتا تھا۔ بڑے لوگوں کے معاملات میں پولیس کو احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

''یہ دہرا قانون ہی تو ہمارے ملک کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔'' جنید نے تلخی سے کہا۔

ایس ایچ او کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ جا کے پرچہ کٹوائیں اور پھر کسی اسپتال جا کر......''

''ان چوٹوں کے لیے مجھے کسی اسپتال جانے کی

ضرورت نہیں۔ گھر پر چند دن آرام کروں گا تو یہ خود ہی ٹھیک ہوجائیں گی۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ایس ایچ او نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!'' پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد کہا۔ ''انگلیوں کے نشانات مل جانا تو اچھی علامت ہے۔ ٹھیک ہے۔ کام مکمل کر کے لوٹو۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' جنید نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کس کی انگلیوں کے نشانات مل گئے ہیں؟''

''حیدر کا فون تھا۔ جب آپ پرچہ کٹوانے گئے تھے تو بھی اس کا فون آیا تھا۔ اسے وہاں لاش بھی مل گئی تھی اور ایک کمرے میں ایسے آثار بھی ملے تھے کہ وہاں کچھ جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہاں انگلیوں کے نشانات ملنے چاہئیں۔ اب اس نے رپورٹ دی ہے کہ خاصے نشانات ملے ہیں۔''

''اس میں شیریں کی انگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے۔'' جنید خوش ہوا۔

''ایسی صورت میں یہ کیس بہت مضبوط ہوجائے گا۔ میرا آپ سے رابطہ رہنا ضروری ہے۔ اپنا موبائل تو آپ چھوڑے جارہے ہیں۔ کوئی اور نمبر؟''

''ایک موبائل گھر پر ہے۔ اس کا نمبر لکھ لیجیے آپ۔'' جنید نے نمبر بتایا اور کہا۔ ''میں کسی وقت بھی آپ سے کسی اچھی خبر کا منتظر رہوں گا۔''

ایس ایچ او نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

جنید جب پرچہ کٹوا کر پولیس اسٹیشن سے اپنے گھر کی طرف لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اس کے خیال کے مطابق شیریں، راجن کے قتل کے معاملے میں بھی پھنس سکتی تھی۔

اپنی چوٹوں کے بارے میں بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ باپ کو وہی سب کچھ بتائے گا جو اس نے پولیس کو بتایا تھا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن سے فون آنے کے بعد شیریں کی نیند اُڑ گئی تھی اور اس نے پریشانی کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ اسے اس کی ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ جنید اس کے خلاف رپورٹ درج کرانے پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گا۔ وہ ان حالات سے تاج ور کو آگاہ کرنا چاہتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ تاج ور صرف ضرورت کے وقت اپنا موبائل استعمال کرتا تھا ورنہ بند رکھتا تھا۔

فی الحال اسے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ پولیس اتنی رات گئے آکر اسے پریشان اس لیے نہیں کرسکتی تھی کہ جنید اپنی درج کرائی ہوئی رپورٹ کے سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں دے سکتا تھا۔

پھر اچانک اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ یہ تو یقینی امر تھا کہ جنید نے پولیس کو اس مکان کا پتا ضرور بتایا ہوگا جہاں اس کی پٹائی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں یہ بھی یقینی تھا کہ پولیس کو وہاں راجن کی لاش مل گئی ہوگی۔ وہاں وہ لوگ اس کمرے کا جائزہ بھی لے سکتے تھے جہاں جنید کی پٹائی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں جھگڑا ضرور ہوا ہے۔ پولیس وہاں انگلیوں کے نشانات بھی ڈھونڈ سکتی تھی۔ یہ خطرے کی بات تھی۔ وہاں پولیس کو نہ صرف اس کے بلکہ تاجو کی انگلیوں کے نشانات بھی مل سکتے تھے۔ اس طرح معاملہ یقیناً سنگین ہو جاتا۔

بے چین ہو کر اس نے اپنے موبائل پر تاجو کا نمبر ملایا۔ اسے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ رابطہ ہوجائے گا لیکن اس وقت اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑک گیا جب دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔

''خیریت تو ہے شیریں!'' تاجو کی آواز آئی۔ ''اتنی رات کو کیا ہوگیا؟''

''شکر ہے کہ تم نے کال ریسیو کر لی۔''

''اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔ دراصل ابھی میں نے کسی سے فون پر بات کی تھی۔ پھر میں موبائل بند کرنے ہی والا تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر تمہارا نام دیکھ کر میں نے کال ریسیو بھی کر لی ورنہ ڈس کنکٹ کر دیتا۔ میں اس نمبر سے فون کرتا تو ہوں لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کرتا۔ خیر چھوڑو۔ تمہیں اس وقت فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ کیا جنید نے کوئی حرکت کی ہے؟''

''ہاں، اور ایسی حرکت جس کی توقع مجھے بالکل نہیں تھی۔'' شیریں نے کہا اور پھر پولیس اسٹیشن کا فون آنے سے لے کر اپنے دماغ میں آنے والے خیال تک، سبھی کچھ بیان کر ڈالا۔ تاجو نے وہ سب کچھ بالکل خاموشی سے سنا تھا۔ شاید وہ سب کچھ سنتے ہوئے وہ کچھ سوچتا بھی رہا ہو۔

''ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''جنید کو اس کی سزا تو ملے گی۔ ایک بڑا ڈوز اور دینا پڑے گا۔ تم بہرحال پریشان نہ ہو۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہاں سے نشاناتِ انگشت صاف کر دیں۔ انہیں بتا دیا تھا کہ نشانات کہاں کہاں ہوسکتے ہیں۔ امکان نہیں کہ کوئی نشان

پولیس کو مل جائے۔''

''یہ تو تمہیں بھی نہیں معلوم کہ میری انگلیوں کے نشانات کہاں کہاں ہوں گے؟''

''اندازے سے بتایا تھا۔ خیر، اس معاملے میں تمہیں پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ میں اب اسی وقت سے وہاں کی خبر لینا شروع کر دوں گا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ میں اس کا کچھ سدِ باب کرلوں گا۔''

''تمہیں لاش وہاں سے غائب کروا دینی چاہیے تھی۔''

''ضروری نہیں سمجھا تھا۔ خیر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں تمہارے حالات سے بھی باخبر رہوں گا۔ اب تم سو جاؤ اطمینان سے۔''

لیکن اس گفتگو کے بعد بھی شیریں کو کُلی اطمینان حاصل نہیں ہوسکا۔ وہ اس کے بعد بھی کچھ دیر تک ٹہلتی رہی تھی۔ پھر بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اسے فوری طور پر نیند نہیں آسکی۔ دماغ میں خیالات گردش کرتے رہے تھے۔ پھر یکایک اسے ایک ایسا خیال آیا کہ وہ ایک بار پھر بے چین ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ وہ پریشان کن خیال یہ تھا کہ شاید ایس ایچ او نے اس سے کی جانے والی باتیں بھی ریکارڈ کر لی ہوں۔ ایسی صورت میں اس کی اور جنید کے موبائل کی آوازوں کا موازنہ کیا جا سکتا تھا۔ دونوں موبائلوں میں یکساں آواز اس کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ اس پر یہ الزام لگ جاتا کہ اس نے پولیس سے غلط بیانی کی تھی۔

شیریں نے یہ بات بتانے کے لیے تاجو کا نمبر ملایا لیکن بے سود۔ تاجو کا موبائل بند تھا۔

شیریں ایک بار پھر ٹہلنے لگی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ اب اسے نیند نہیں آئے گی۔ اسے خود پر بھی غصہ آیا۔ تاجو سے رابطہ ہونے پر اسے اپنے اس خدشے کا اظہار بھی کر دینا چاہیے تھا۔ وہ پُریقین تو نہیں تھی لیکن اسے خیال تھا کہ عدالتیں اس قسم کی ریکارڈنگ کو ''ثبوت'' نہیں سمجھتیں، البتہ آواز کی اس یکسانی کی وجہ سے پولیس کو یہ موقع بہرحال ملتا کہ وہ اس کے لیے پریشانی کا سبب بنے، اسے سوال و جواب میں الجھایا جائے۔

بہرحال جو کچھ شیریں نے پہلے ہی ایک فیصلہ کیا تھا، اس کی وجہ سے عدالت کی تو خیر نوبت ہی نہیں آتی لیکن پولیس کی پریشانی سے بچنے کے لیے اس نے فیصلہ کیا کہ جو قدم اسے ایک آدھ دن اور سوچ کر اٹھانا تھا، وہ قدم اب فوری طور پر اٹھایا جائے۔ وہ پولیس کے جھمیلے میں پڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

فجر کے وقت اس نے ایک ملازمہ کو ہدایت کی کہ اس کے لیے ناشتا تیار کیا جائے۔

ملازمہ کو اس پر تعجب ہوا کیونکہ اس گھر میں ناشتا نو بجے کے لگ بھگ کیا جاتا تھا۔ شیخ جواد اٹھتا ہی آٹھ بجے کے بعد تھا لیکن ملازمہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شیریں سے اس بارے میں استفسار کر سکتی۔

ناشتا تیار ہونے تک شیریں نے ہلکا سا شاور لے کر کپڑے تبدیل کر لیے۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے وہ تازہ دم ہونا چاہتی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد اس نے اپنا ضروری سامان ایک اٹیچی کیس میں بھرا اور ایک ملازم کو بلا کر اس سے کہا کہ وہ اٹیچی کیس لے جا کر اس کی کار کی ڈکی میں رکھ دے۔

یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ ملازمہ کی طرح ملازم کو بھی تعجب ہوا۔ شیریں کو خیال تھا کہ اس غیر معمولی بات کی اطلاع کوئی ملازم اس کے والد جواد تک پہنچا سکتا تھا، خواہ اسے شیخ جواد کو جگانے کی جسارت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اسی لیے شیریں نے اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے ملازم کے ساتھ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایک فلائٹ پکڑنی ہے۔ بیرونِ شہر جا رہی ہوں۔ رات کو اطلاع ملی تھی کہ میری ایک دوست کی حالت بہت خراب ہے۔ اسی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ رات ہی میں نے ڈیڈی کو بتا دیا تھا۔''

اس کے خیال کے مطابق اب کوئی ملازم شیخ جواد کو اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ شیریں یہی چاہتی تھی کہ باپ کو اطلاع ملنے سے پہلے وہ اس گھر سے دور جا چکی ہو۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ صبح ہوتے ہی شاید پولیس بھی آدھمکتی جس کا سامنا کرنا اس کے لیے پریشانی کا سبب بنتا۔

کار میں بیٹھ کر جب وہ گھر سے روانہ ہوئی تو پو پھٹنے میں دو چار ہی منٹ باقی تھے۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہی تھی پھر بھی جب وہ اس علاقے کے قریب پہنچی جسے ''نوگو ایریا'' کہا جاتا تھا، دھوپ اچھی خاصی پھیل چکی تھی اور گاڑیوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

''نوگو ایریا'' کی حد شروع ہونے سے ذرا پہلے شیریں نے دو پولیس چوکیاں بھی دیکھیں اور یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں موجود پولیس والوں نے اس کی کار کی طرف حیرت سے دیکھا تھا جو نوگو ایریا میں داخل ہو رہی تھی۔

یہ غریبوں اور متوسط طبقے کی بستی تھی جہاں رہنے

والے کار رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ دو چار کے پاس کاریں بھی ہوتیں لیکن وہ پرانی اور بہت معمولی ہوتیں جبکہ شیریں کی کار نہایت قیمتی تھی۔

علاقے میں کچھ دکانیں کھل چکی تھیں۔ وہاں شیریں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو پہلے بھی صرف فلموں میں دیکھا تھا۔ بعض مکانات کی چھتوں پر یا کسی بلند مقام پر موجود ہر شخص کے ہاتھ میں اسلحہ موجود تھا۔ کسی کے پاس کلاشنکوف، کسی کے پاس آٹومیٹک رائفل بلکہ ایک مقام پر ہلکی مشین گن بھی دکھائی دی۔

اس علاقے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی کار کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ یہاں بھی اس نے محسوس کیا کہ راہ گیر اور دکانوں پر موجود لوگ اس کی کار کی طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

یکا یک کسی طرف سے دو موٹر سائیکلیں آئیں اور انہوں نے شیریں کی کار کا راستہ روک لیا۔ شیریں کو کار روکنی پڑی تھی لیکن وہ اس صورتِ حال سے بالکل نہیں گھبرائی۔ اسے ایسی صورتِ حال کی توقع تھی بلکہ اسے ایسی کسی بات کا انتظار تھا۔

موٹر سائیکلوں پر دو دو آدمی بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اتر کر تیزی سے کار کے قریب آئے۔

”کدھر جا رہی ہو میم صاحب!“ ان میں سے ایک نے کھڑکی پر جھک کر اس سے پوچھا۔ ”کیا اس شہر میں نئی ہو؟ کوئی پرانا شہری تو ادھر سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

”کیونکہ یہ نو گو ایریا ہے۔“ شیریں خفیف سا مسکرائی۔

ان دونوں آدمیوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”میں تاجو سے ملنے آئی ہوں۔“ شیریں سنجیدہ ہو گئی۔

اب ان دونوں آدمیوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں جلد از جلد تاجو سے ملنا چاہتی ہوں۔“ شیریں نے کہا۔

”کیوں ملنا چاہتی ہو؟“ ایک نے پوچھا۔

”تم اپنے چیف کو اطلاع دو کہ شیریں آئی ہے۔“

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”باس کو اطلاع دو۔“ ایک دھیمی آواز میں بولا۔

دوسرے نے اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ رابطہ قائم کرنے کے بعد اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”باس!...... ایک نئی کار ہمارے علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ اطلاع ملتے ہی ہم نے اسے روک لیا۔ ڈرائیونگ کرنے والی نے کہا ہے کہ اسے آپ سے ملنا ہے۔ اپنا نام شیریں بتایا ہے۔“

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے ”جی“ کہا اور پھر موبائل فون شیریں کی طرف بڑھا دیا۔

شیریں نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو!“

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر تاجو کی آواز آئی۔ ”یہ کیا حرکت کی ہے تم نے۔ یہاں ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔ فوراً واپس جاؤ۔“

”میں واپس جا کے مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”کسی مصیبت میں نہیں پڑو گی تم۔“

”تمہیں علم نہیں ہے سب باتوں کا۔“

”مجھے سب معلوم ہے اور میں اس کا بندوبست بھی کر چکا ہوں۔“

”بعض باتیں تمہیں معلوم نہیں ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ......“ شیریں نے جھوٹ بولا۔ ”میں ڈیڈی کے نام پرچہ چھوڑ آئی ہوں کہ اب وہ میرا انتظار نہ کریں۔“

”اوہ گاڈ!...... یہ کیا کر بیٹھی ہو تم۔“

”اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو بھی میں یہاں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے کل رات ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے اس لیے اب میں کوئی ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ تم بے بس ہو جاؤ گے۔“

”ہوں۔“ طویل سانس لے کر کہا گیا۔ ”لیکن یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔“

”ساری باتیں فون پر ہی کرو گے کیا؟“

”اچھا!“ ایک بار پھر طویل سانس لی گئی۔ ”اس آدمی کو اپنی گاڑی میں بٹھا لو جس نے تمہیں موبائل فون دیا ہے۔ یہ تمہیں لے آئے گا میرے پاس۔ موبائل اُسے واپس دو۔ میں اسے ہدایت کر دوں۔“

شیریں نے موبائل اس شخص کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”لو بات کرو۔“

اس نے موبائل اپنے کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا، پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد موبائل بند کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔ ”باس کا حکم ہے کہ انہیں پورے احترام کے ساتھ ان تک پہنچا دیا جائے۔ تم اب جاؤ۔ میں ان کے ساتھ گاڑی میں جاؤں گا۔“

دوسرے آدمی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنا شانہ اچکایا اور کار کے آگے کھڑی ہوئی موٹر سائیکلوں کی طرف چلا گیا۔

موبائل فون والے نے کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولنا چاہا۔

''آگے ہی آجاؤ۔'' شیریں نے اس سے کہا۔ ''راستہ بتانے میں بھی آسانی ہوگی۔''

''میں آگے، آپ کے برابر میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں میڈم! باس نے حکم دیا ہے کہ آپ کو پورے احترام کے ساتھ ان تک پہنچایا جائے۔''

شیریں ہنس پڑی۔ اب وہ بالکل مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم میرے برابر میں بیٹھو گے تو میرا احترام کم نہیں ہوجائے گا۔ چلو آؤ، جلدی کرو، شاباش!''

وہ ہچکچاتا ہوا بونٹ کے آگے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کے دروازے تک آیا اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

شیریں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار کو حرکت میں لاتے ہوئے بولی۔ ''کدھر چلنا ہے؟''

''ابھی تو سیدھی چلیے! آگے ایک چوراہا ہے، وہاں سے بائیں ہاتھ کو مڑنا ہوگا۔''

یہ نو گوایریا کئی مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔

شیریں کی کار جہاں رکوائی گئی، وہاں دو منزلہ بنے ہوئے ایک مکان کے قریب کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔

شیریں کو مکان میں لے جانے کے لیے تاجو خود باہر آچکا تھا۔ اس نے اس آدمی کو جانے کا اشارہ کیا جو شیریں کو لے کر آیا تھا۔ وہ آدمی جب واپس جارہا تھا تو اس کے چہرے سے الجھن ظاہر ہورہی تھی۔ وہ بھی سوچ رہا ہوگا کہ اس خوب صورت لڑکی سے اس کے باس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

مکان کے اندر آنے کے بعد تاجو نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''یہ تم نے کیا حرکت کی ہے پاگل؟''

''مجھے تاجو سے مل کر ایک مطالبے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔'' شیریں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تاجو سے مطالبہ؟'' وہ مسکرایا۔ ''کیا مطالبہ ہے؟''

''میرے تاج ور کو یرغمال بنالیا ہے تم نے! میں اس کی رہائی چاہتی ہوں۔ تاوان میں جو کچھ بھی مانگو گے، وہ مل جائے گا۔''

''تاج ور کسی مناسب وقت پر ہی تمہیں مل سکتا ہے۔

یہ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ ابھی تم سنجیدگی سے یہ بتاؤ کہ تمہیں آج ہی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرنے کی ایسی کیا مجبوری پیش آگئی؟''

''رات میں نے دوبارہ بھی فون کیا تھا لیکن تمہارا موبائل بند ملا۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''نشانِ انگشت کے بارے میں تو تم نے مجھے مطمئن کر دیا تھا لیکن اس کے بعد مجھے ایک پریشان کن خیال یہ آیا کہ پولیس اسٹیشن سے جو فون آیا تھا، ممکن ہے کہ میری وہ گفتگو بھی ریکارڈ کی گئی ہو۔ ایسی صورت میں وہ گفتگو اور جنید کے موبائل کی گفتگو کا موازنہ کیا جاتا تو کس نتیجے پر پہنچا جاتا؟''

''اسی نتیجے پر کہ دونوں آوازیں کسی ایک ہی لڑکی کی ہیں۔'' تاجو نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے اس بارے میں بات نہیں کی تھی لیکن میں نے تو اس بارے میں فوراً سوچ لیا تھا۔''

''اس کے باوجود تم نے سمجھ لیا تھا کہ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں؟''

''ہاں۔'' تاجو نے کہا۔ ''پولیس اپنے طور پر یہ سمجھ تو سکتی ہے کہ وہ آوازیں تمہاری ہی ہیں لیکن اس بنیاد پر تمہیں پریشان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پولیس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس بارے میں ایکسپرٹ سے رپورٹ لے۔ رپورٹ پازیٹو ہونے کی صورت میں پولیس تمہارے خلاف ایکشن لے سکتی ہے لیکن رپورٹ پازیٹو آئے گی ہی نہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''رات کو تمہارا فون آنے کے بعد میں سو نہیں گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ رپورٹ کس تھانے میں درج کرائی گئی ہے۔ میرے خیال میں امکان یہی تھا کہ رپورٹ اسی علاقے کے تھانے میں درج کرائی گئی ہوگی، اسی لیے وہیں کی پولیس راجن کے مکان تک پہنچ سکی ہوگی۔ میں نے جو سوچا تھا، وہی ہوا بھی۔ یعنی مجھے معلوم ہوگیا کہ رپورٹ اسی تھانے میں درج کرائی گئی ہے۔ میں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ ایس ایچ او نے اس کیس کی تفتیش سب انسپکٹر اکرم کو سونپی ہے۔''

''کیا کیا معلوم کرلیتے ہو تم؟'' شیریں حیرت سے بولی۔ ''یہ تو ایسا ہے جیسے تم کسی خفیہ ایجنسی کے سربراہ ہو۔''

تاجو مسکرایا۔ ''ایسا جال میں نے ہی پھیلایا ہے کہ ہر بات سے باخبر ہوسکوں۔ ایس ایچ او نے سب انسپکٹر اکرم کو یہ ہدایت بھی کردی تھی کہ سب سے پہلے تو وہ ان دونوں موبائل کی ریکارڈنگ کے بارے میں ایکسپرٹ کی رپورٹ

حاصل کرے چنانچہ آج دو تین گھنٹے بعد اسے پورٹ مل جائے گی۔"

"اور وہ پازیٹو نہیں ہوگی۔ ابھی تم نے یہی کہا ہے نا؟"

"ہاں، اسی کا تو بندوبست کیا ہے میں نے۔ اگر اس بے وقوف شخص نے پازیٹو رپورٹ بھیجی تو اس سے کہا جا چکا ہے کہ آج ہی اس کی لاش پر اس کے گھر والے ماتم کر رہے ہوں گے۔"

"اوہ۔" شیریں نے سکون کی سانس لی اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ نڈھال ہوگئی ہو۔

"تم لیٹ جاؤ۔" تاجو نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم رات کو سو نہیں سکی ہو۔ میں تو سب بندوبست کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ ابھی اس وقت جاگا ہوں جب اس علاقے میں تمہاری آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔"

باتیں کرتے ہوئے تاجو شیریں کو اپنی خواب گاہ تک لے آیا تھا۔

"میری حالت واقعی بہت غیر ہو چکی ہے۔" شیریں نے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تو آوازوں کی شناخت کے ایکسپرٹ کو تم دھمکی دلوا چکے ہو؟"

"یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ اگر اس نے حماقت کی تو مارا جائے گا۔"

"بہت سفاک ہوگئے ہو تم تاج ور۔"

"میں اب ایسی ہی دنیا کا باسی ہوں کہ اگر ایسا نہ بنوں تو میری گرفتاری یا موت مجھ سے بہت قریب ہو جائے۔"

"لیکن میری خاطر تمہیں اس دنیا سے نکلنا ہے۔"

"پھر وہی باتیں جن کا جواب میں تمہیں دے چکا ہوں۔"

"لیکن اب میں یہاں آگئی ہوں۔ تمہیں جلد کچھ کرنا ہوگا۔"

"ابھی تو تم سو جاؤ۔ رات بھر کے رت جگے نے تمہیں بہت تھکا دیا ہوگا۔"

"تم کہاں سوؤ گے؟ تم بھی تو پوری نیند نہیں لے سکے ہو۔"

"میں اب اس کا عادی ہو چکا ہوں۔ اکثر پوری نیند نہیں لے پاتا۔ اس وقت بھی مجھے ایک کام ہے۔ جا رہا ہوں ایک گھنٹے کے لیے۔"

"مجھے بہت باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

"تم پوری نیند لے لو۔ باتیں بھی ہو جائیں گی۔ مجھے آنا تو ایک ہی گھنٹے میں ہے لیکن شاید دیر ہو جائے۔ اس سے کوئی فرق بہرحال نہیں پڑے گا۔ پروین تمہارا خیال رکھے گی۔ میں اس سے کہہ جاتا ہوں۔"

پروین کا نام تاجو کی زبان پر آتے ہی شیریں چونکی تھی، تاجو کے خاموش ہونے پر بولی۔ "یہ نام شاید میں نے ڈیڈی سے سنا تھا۔"

"سنا ہوگا۔ میں تم سے ملنے آیا تھا تو پولیس کی وجہ سے فرار ہو کر وہیں گیا تھا۔ اس کے شوہر نے مخبری کی تھی اس لیے میں نے اسے ختم کر دیا۔ پروین کو اپنے ساتھ نہ لے آتا تو وہ مشکل میں پڑ جاتی۔ پہلے میں نے اس کے رہنے کا بندوبست کہیں اور کیا تھا لیکن پھر یہیں رکھ لیا۔ وہ میرے کھانے پینے کا اور گھر کی صفائی وغیرہ کا خیال رکھتی ہے۔"

"اب میں خیال رکھوں گی اپنے گھر کا۔" شیریں مسکرائی۔

"اپنے گھر کا۔" کے الفاظ پر تاجو مسکرایا اور پھر گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ "مجھے اب جانا چاہیے ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

وہ چلا گیا تو شیریں نے سونے کے ارادے سے فوراً آنکھیں بند نہیں کیں۔ وہ پروین کے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ وہ کیسی ہوگی۔ تاجو اور پروین کی نسبت سے کوئی منفی خیال اس کے دماغ میں نہیں آیا تھا۔

دو ڈھائی منٹ بعد اس نے اپنا موبائل نکالا اور اپنے والد کے نمبر ڈائل کیے۔ اسے توقع تھی کہ شیخ جواد ابھی سو ہی رہا ہوگا۔ اس کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد شیخ جواد کی آواز سنائی دی جو شاید نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کیوں جگا دیا؟ تمہیں معلوم ہے کہ میں آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔"

"میں رات بھر جاگی ہوں ڈیڈی! اب سونے جا رہی ہوں۔ سوچا سونے سے پہلے آپ کو ایک اطلاع دے دوں۔"

"کوئی اطلاع ایسی ہے کہ تم میرے اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں؟" شیخ جواد کا لہجہ بہت خشک تھا۔

"میں نے بتایا نا ڈیڈی کہ رات بھر جاگنے کے بعد اب سونا چاہتی ہوں اس لیے آپ کو یہ اطلاع دینی ضروری تھی کہ جب آپ جاگیں گے تو مجھے گھر پر نہیں پائیں گے۔"

"کیا مطلب؟ اتنی صبح کہاں جانا پڑ گیا؟"

''مجھے آپ نے مجبور کر دیا تھا ڈیڈی! میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ چکی ہوں۔''

''کیا؟'' شیخ جواد جیسے چیخ پڑا تھا۔

''میں نے کہا نا کہ آپ نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں تاج ور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ...... آپ میرا مطلب سمجھ ہی گئے ہوں گے۔''

پھر شیریں نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کیا اور جلدی سے موبائل کھول کر اس میں سے دونوں ''سم'' نکال لیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شیخ جواد کی کال ریسیو کرے۔ وہ یقیناً اس سے دوبارہ بات کرنا چاہ سکتا تھا۔

اس کے علاوہ شیریں اب اپنے وہ نمبر استعمال بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تاجو اس کے لیے دوسری ''سم'' کا بندوبست کر ہی دیتا۔

☆☆☆

دو بجے تھے جب شیریں کی آنکھ کھلی۔ وہ بہت سکون کی نیند سوئی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ اپنا جو اٹیچی کیس اس نے اپنی کار ہی میں چھوڑ دیا تھا، وہ اب وہیں موجود تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ گروپ کا کوئی آدمی تو یہاں نہیں لایا ہوگا کیونکہ یہاں وہ سو رہی تھی۔ اٹیچی کیس لانے والا خود تاجو ہی ہو سکتا تھا، اور ہاں، پروین بھی تو تھی اس گھر میں۔

شیریں نے اٹھ کر اٹیچی کیس کھولا۔ اس میں سے اپنے لیے ایک سادہ لباس منتخب کیا اور وہ ہاتھ میں لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

باتھ روم سادہ ضرور تھا لیکن وہاں ہر آسائش موجود تھی۔ شیریں پوری طرح تیار ہو کر باتھ روم سے نکلی تو پہلا قدم باہر رکھتے ہی چونک گئی۔ اس نے جس لڑکی کو وہاں دیکھا، وہ اس کے خیال کے مطابق پروین ہی ہو سکتی تھی۔ تاج ور سے اس نے سن بھی لیا تھا کہ وہ اسی گھر میں تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ لڑکی ہی نظر آتی تھی لیکن چہرے سے پختگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ نقش و نگار اچھے تھے۔ جسمانی طور پر متناسب بھی تھی۔

''آپ ناشتا کرنا پسند کریں گی یا کھانا کھائیں گی؟''

شیریں نے ٹرالی کی طرف دیکھا جو بستر کے قریب تھی۔

''ٹرالی تو شاید کھانے ہی کی ہے۔'' وہ بولی۔

''ناشتے کا سامان بھی ہے۔''

''تم پروین ہو نا؟''

''جی۔'' وہ بولی۔ ''میں آپ کے اٹھنے کی منتظر تھی۔ باس کہہ گئے تھے کہ آپ کا خیال رکھوں۔ میں تھوڑی دیر بعد آ کر کمرے میں جھانک لیا کرتی تھی۔''

''ہوں۔'' شیریں بستر کی طرف بڑھی۔

''آپ کو دیکھنے کا اشتیاق تھا مجھے...... باس سے آپ کا ذکر تو سن چکی تھی۔''

''تاج ور کہاں ہے؟''

''وہ آپ کے سامنے ہی گئے تھے۔ واپس نہیں لوٹے ابھی۔''

''اتنی دیر؟''

''ان کی واپسی کا کچھ طے نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ابھی آجائیں، ممکن ہے رات تک آئیں۔''

''کہاں جانا ہوتا ہے؟''

''یہ تو وہ کسی کو بھی نہیں بتاتے۔''

شیریں بستر پر ٹرالی کے قریب بیٹھ گئی۔

''آؤ، تم بھی کھالو۔'' وہ بولی۔

''میں کھا چکی ہوں میڈم۔''

''بیٹھ تو جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟''

پروین اس کرسی پر بیٹھ گئی جو بستر کے قریب ہی تھی۔

''تاج ور سے میں بھی تمہارا ذکر سن چکی ہوں۔''

شیریں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی جوان ہو، آئندہ کے لیے کیا ارادہ ہے؟''

''میں اب شادی نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟''

''جی۔'' پروین نے نظریں جھکا لیں۔

''وجہ بتانا پسند کرو گی؟''

''گستاخی ہوگی اگر میں آپ کے سوال کا جواب نہ دوں لیکن معذرت کے ساتھ آپ سے درخواست کروں گی کہ وجہ نہ پوچھیے۔''

شیریں نے سر ہلا دیا اور یہ بات آگے نہیں بڑھائی لیکن اس کے دل میں ایک شک کلبلا گیا تھا جس کا اس نے اظہار نہیں کیا۔

''شب و روز یہیں رہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر گروپ کے کسی کام سے نہ جانا پڑے تو یہیں رہتی ہوں۔''

''تم بھی گروپ کے لیے کام کرتی ہو؟'' شیریں کو قدرے تعجب ہوا تھا۔

''میں ہر وہ کام کر سکتی ہوں جو اس گروپ کا کوئی بھی

مدد کر سکتا ہے۔'' پروین خفیف سا مسکرائی۔
''رائفل، ریوالور وغیرہ چلا لیتی ہو؟'' شیریں نے حیرت سے پوچھا۔
''جی۔'' پروین نے جواب دیا۔ ''ڈرائیونگ تو میں بہت ہی تیز کرتی ہوں۔''
شیریں کا تعجب برقرار رہا۔ اس سیدھی سادی نظر آنے والی لڑکی کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسے خطرناک کام بھی کر لیتی ہوگی۔
''اس گروپ میں کیسے شامل ہوئیں؟'' اس نے پوچھا۔
پروین کے جواب سے پہلے ہی خوفناک دھماکے سنائی دینے لگے۔ شیریں کے ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ ''یہ کیا؟'' اس کے منہ سے نکلا۔
''رائفل، کلاشنکوف، گرینیڈ۔'' پروین بالکل پُرسکون تھی۔ ''پولیس نے آپریشن شروع کیا ہے۔ ہمارے ساتھی جواب دے رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پولیس پسپا ہو جائے گی۔ دو ایک گرفتار ہوں گے جنہیں چند دن میں بے قصور قرار دے کر چھوڑ دیا جائے گا۔''
''اس حالت میں تمہارا سکون مجھے حیرت میں ڈال رہا ہے۔''
''آپ بھی اس کی عادی ہو جائیں گی، اگر یہاں زیادہ دن رہیں۔'' پروین نے جواب دیا۔ ''دس پندرہ دن میں پولیس آپریشن ہوتا ہی رہتا ہے، اور اس وقت کے آپریشن کی تو ہمیں اطلاع بھی تھی۔ باس نے کہیں سے فون کر کے جمال خاں کو بتا دیا تھا کہ پولیس آپریشن کرنے والی ہے۔''
دھماکوں سے فضا بدستور لرز رہی تھی۔
''آپ کھانا کھایئے میڈم!'' پروین نے کہا۔ ''اس آپریشن کے اثرات یہاں تک نہیں پہنچیں گے۔''
''اب اگر بھوک لگی تو بعد میں کھا لوں گی۔'' شیریں نے ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ذہن منتشر ہو گیا ہے۔''
''چائے بنا دوں؟'' پروین کرسی سے اٹھ کر ٹرالی کے قریب آئی۔
''ہاں، چائے پی لوں گی۔'' شیریں کا ذہن بدستور دھماکوں کی طرف تھا۔
پروین چائے بنانے لگی۔
''یہ جمال خاں کون ہے؟'' اس نے پروین سے پوچھا۔
''باس کا نائب ہے۔''
ان دونوں کی گفتگو مزید آگے نہیں چل سکی۔ تاجو کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسا تاثر نہیں تھا کہ علاقے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی کوئی اہمیت تھی۔
پروین نے چائے کی پیالی شیریں کو دی اور ٹرالی لے کر کمرے سے چلی گئی۔ ممکن ہے اسے تاجو نے اشارہ کیا ہو جو شیریں نہیں دیکھ سکی تھی۔
''ان دھماکوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہوگا؟'' تاجو اس کے قریب آتے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''شاید کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا ہو۔''
''تم جس دنیا میں زندگی گزار رہے ہو، وہ میرے لیے اجنبی تو ہے۔''
''پروین سے تمہیں سب کچھ معلوم تو ہو چکا ہوگا۔''
''ہاں۔''
''لیکن یہ وہ بھی نہیں جانتی کہ اس وقت کا آپریشن تمہاری بازیابی کے سلسلے میں ہے۔''
''کیا مطلب؟'' شیریں چونکی اور چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رہ گئی۔
تاجو نے جواب دیا۔ ''تمہارے والد محترم نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ میں تمہیں اغوا کر کے اپنے علاقے میں لے گیا ہوں۔ انہوں نے اس سلسلے میں آئی جی سے بھی رابطہ کیا تھا۔ آئی جی کے احکام یہاں کے ایس پی تک پہنچے اور......'' تاجو ہنسا۔ ''آپریشن شروع ہو گیا۔''
''تمہیں کیسے معلوم کہ یہ میرے والد کی رپورٹ کے سبب ہوا ہے؟''
''مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ ہر وہ بات جس کا کوئی تعلق مجھ سے ہو۔ میں نے ایسا ہی جال پھیلایا ہے۔'' تاجو نے جواب دیا۔ ''جلد ہی اس کی تصدیق بھی ہو جائے گی کہ میں نے تمہیں اغوا نہیں کیا بلکہ تم خود یہاں آئی ہو۔ علاقے کے باہر کی دو پولیس چوکیوں نے تمہاری کار اس طرف آتے دیکھی تھی اور اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ جب ان کی یہ رپورٹ ایس پی کے ذریعے آئی جی تک پہنچے گی تو وہ تمہارے والد کو بتا دے گا کہ تم خود یہاں آئی ہو۔''
''مجھ پر شدید غصہ آ رہا ہوگا انہیں۔'' شیریں سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو خیر انہیں معلوم ہی تھا کہ میں نے خود گھر چھوڑا ہے۔ انہوں نے تم پر الزام اس لیے لگایا ہوگا کہ پولیس

یہاں کارروائی کرے۔ یہ بات اخبارات میں بھی آجائے گی کہ میں یہاں خود آئی ہوں۔ اس سے وہ اور چراغ پا ہوں گے۔"

"کیا اس سے تمہیں دکھ ہوگا؟"

"وہ بہرحال میرے باپ ہیں۔ افسوس تو مجھے ہونا ہی چاہیے کہ اب وہ اپنے احباب و دوست وغیرہ سے نظر کیسے ملائیں گے لیکن ایسے حالات خود انہوں نے پیدا کیے۔ اگر وہ میری شادی کے معاملے میں عجلت سے کام نہ لیتے تو میں ابھی یہ قدم نہیں اٹھاتی اور اس وقت کا انتظار کرتی کہ جب میرا تاج ور تم مجھے کب لوٹاتے۔"

"اس سے پہلے کیا تم ایک خوش خبری سنا پسند نہیں کرو گی؟" تاجو مسکرایا۔

"خوش خبری؟"

"ہاں۔" تاجو نے کہا۔ "جنید نے اپنا موبائل ایس ایچ او کو دے کر اپنے گلے میں پھندا خود ہی ڈالا ہے۔ سب انسپکٹر اکرم کو آج ساڑھے دس بجے رپورٹ مل گئی تھی کہ دونوں آوازیں مختلف لڑکیوں کی ہیں۔ جنید کے موبائل میں جس لڑکی کی آواز ہے، اس نے تمہاری آواز کی نقل کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہے لیکن سو فیصد نہیں۔"

"یعنی جنید پولیس کی نظر میں جھوٹا بن گیا ہے؟" شیریں تیزی سے بولی۔

"نہ صرف جھوٹا بن گیا ہے بلکہ پولیس نے یہ بھی جان لیا ہے کہ اسی نے تمہیں اغوا کروایا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"جب رپورٹ کی وجہ سے جنید جھوٹا ثابت ہوا تو پولیس نے سیلولر کمپنی سے اس کے موبائل کا ریکارڈ حاصل کر لیا۔ وہ موبائل پر راجن سے جو باتیں کرتا رہا تھا، وہ پولیس کے علم میں آگئیں۔ مجھے ملنے والی آخری اطلاع ایک گھنٹے پہلے کی ہے۔ جنید کو پولیس اسٹیشن بلایا گیا ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا چکا ہے یا کیا سلوک کیا جائے گا، اس کی اطلاع بھی مجھے جلد ہی مل جائے گی۔"

"یہ بہت اچھا ہوا کہ اس کی گردن پھنس گئی۔"

"ایک اطلاع اور سن لو۔" تاجو نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس مکان سے ہماری انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے گئے ہیں لیکن تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی۔ دو جگہ تمہاری اور ایک جگہ میری انگلیوں کے نشانات پولیس کو مل ہی گئے۔"

"تو پھر؟" شیریں بولی۔ "یہ کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ یہ پولیس نے سمجھ لیا ہوگا کہ تم نے ہی جنید کو مارا پیٹا، راجن کو قتل کیا اور مجھے وہاں سے نکلوا دیا۔ تم سے میرا تعلق تو اب راز رہا ہی نہیں۔ یہ بات اخبارات تک میں آجائے گی اور شاید ٹی وی چینلز پر بھی کہ میں خود تمہارے پاس گئی ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ سب معاملہ پولیس کی نظر میں صاف ہو چکا ہے اور ہاں! اس مکان سے پولیس کو ایک جرائم پیشہ شخص جبران کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ وہ ایک بار کا سزا یافتہ ہے۔ پولیس نے سمجھ لیا ہے کہ راجن اور جبران نے مل کر ہی تمہیں اغوا کیا تھا پھر تمہیں اس مکان میں پہنچانے کے بعد جبران وہاں سے چلا گیا اور راجن میرے ہاتھوں مارا گیا۔ پولیس یقیناً جبران کو گرفتار کرے گی۔ اس کا بیان جنید کی گردن پر لگنے والے پھندے کو اور کس دے گا۔"

"یہ بہت اچھا ہوگا اس ذلیل شخص کے ساتھ۔ میں نے اس سے درخواست تک کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی سے انکار کر دے لیکن اس ذلیل نے مجھے بے آبرو کرنے کے لیے اغوا ہی کروا ڈالا..... یہ دھماکے؟...... یہ کب ختم ہوں گے۔ میرے دل کی دھڑکنیں مسلسل بڑھی ہوئی ہیں۔"

"یہ سلسلہ ابھی کچھ دیر اور باقی رہے گا۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور پروین کی آواز بھی آئی۔ "باس!"

"آجاؤ پروین!" تاجو نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

پروین جاتے وقت دروازہ بھیڑ گئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔

"میں یہ اطلاع دینے آئی ہوں باس کہ میڈم کا بیڈ روم مکمل کر دیا گیا ہے۔"

"گڈ!..... چلو دکھاؤ۔" تاجو کھڑا ہوا۔ "تم بھی آؤ۔" اس نے شیریں سے کہا۔ "تم بھی دیکھ لو اپنا بیڈروم۔"

اس وقت شیریں کی زبان پر ایک سوال آتے آتے رہ گیا۔ پروین کے سامنے تاجو سے وہ سوال کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شیریں جب ان دونوں کے ساتھ اس کمرے میں پہنچی تو دنگ رہ گئی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس بستی کے اس معمولی گھر میں اتنا پرآسائش اور سجا ہوا بیڈروم ہو سکتا ہے۔

"یہ..... یہ کیسے..... ہو گیا؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

پروین جلدی سے بولی۔ ''کیا کوئی کمی رہ گئی؟''

''نہیں، میں حیران ہوں کہ اتنا آراستہ پیراستہ بیڈ روم؟''

تاجو مسکرایا۔ ''تمہارے شایانِ شان تو ہونا چاہیے تھا۔'' پھر اس نے پروین کو جانے کا اشارہ کیا، اور شیریں سے بولا۔ ''میرا کمرا تو بس کام چلانے کے لیے ہے۔ ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کہ پُرتعیش زندگی گزاروں۔''

''تو اب یہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔'' شیریں نے کہا۔

''ہاں بیٹھو۔''

دفعتاً شیریں چونکی۔ ''اوہ! باتوں میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ دھماکے رک چکے ہیں۔''

''میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ دیر کی بات ہے۔''

''ہاں!'' شیریں بولی۔ ''سب باتیں ہو چکیں۔ اب میرے بنیادی سوال کا جواب دو۔''

''یعنی میں تمہارا تاج ور کب تمہیں واپس کروں گا۔''

''ہاں۔''

''اور اس کے لیے تم تاوان دینے کے لیے بھی تیار ہو؟''

''ہاں۔''

''تم سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہو شیریں...... تاوان دینا بہت مشکل ہوگا تمہارے لیے۔ کیا تم میرے ساتھ ایسی زندگی گزار سکو گی جس میں تمہیں یہ سب تعیشات تو کیا، کسی بھی قسم کا تعیش حاصل نہیں ہوگا۔''

''تمہارا ساتھ ہوگا تو میں ہر قسم کی زندگی گزار لوں گی لیکن مجھے بتاؤ تو سہی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟''

''سچی بات تو یہ ہے شیریں کہ اس گروپ میں آنے کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں جب لوگوں پر گولیاں برسا رہا ہوں تو کبھی نہ کبھی کوئی گولی میرے سینے میں بھی نہ جانے کتنے سوراخ کر ڈالے لیکن تمہاری باتوں کی وجہ سے مجھے سوچنا پڑا کہ میں زندہ کیسے رہ سکتا ہوں، تمہارے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتا ہوں۔ تم یہ بھی یقین کر لو کہ اپنا انتقام مکمل کر لینے کے بعد میں خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دینا چاہتا تھا۔''

''تمہارا انتقام تو اب پورا ہو چکا ہوگا۔''

''نہیں۔'' تاجو نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ابھی ایس پی نادر زندہ ہے۔ پولیس والوں کی ہلاکتوں سے خوف زدہ ہو کر وہ طویل رخصت پر بیرونِ ملک چلا گیا ہے۔ اب میری اطلاع کے مطابق وہ دو ایک دن میں واپس آنے والا ہے۔ اسے ختم کر کے ہی میرا انتقام مکمل ہوگا۔ اس کے بعد تمہاری خاطر میں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ہم دونوں اس ملک سے کہیں دور چلے جائیں گے۔''

''مگر کیسے؟''

''قانونی طور پر تو یہ ممکن نہیں۔ ہم اسمگل ہی ہو سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسلحے وغیرہ کے سلسلے میں کچھ اسمگلروں سے رابطہ قائم ہوا تھا اس گروپ کا۔ اب میں نے اسلحہ لینا تو چھوڑ دیا ہے لیکن ان لوگوں سے جان پہچان تو بہرحال باقی ہے۔ انہی میں سے ایک سے میں نے بات کی تھی کہ دو افراد کو اس ملک سے باہر لے جانا ہے۔ اس نے میرا رابطہ انسانوں کو اسمگل کرنے والے ایک گروہ سے کرا دیا تھا۔ کل جو میری واپسی میں تاخیر ہوئی تو اس کا سبب یہی تھا کہ مجھے کل ان کے سرغنہ سے تمام معاملات طے کرنے پڑے تھے۔ وہ اس وقت موجود نہیں تھا۔ مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ اس کی لانچیں لوگوں کو مختلف ملکوں میں پہنچاتی ہیں۔ ملکوں ہی کے حساب سے فی شخص معاوضہ طے کیا جاتا ہے۔ میں نے اس سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ نصف رقم ایڈوانس میں بھی دے دی ہے کیونکہ میں اسے فوراً نہیں بتا سکتا تھا کہ ان دو افراد کو کب اسمگل کرنا ہے، اس لیے مجھے اس نے اپنا شیڈول دے دیا ہے۔ یعنی اس کی لانچ کس ملک کے لیے کب روانہ ہوتی ہے۔''

''تو ہم کہاں جائیں گے؟''

''کسی بڑے ملک میں جا کر تو ہماری روپوشی مشکل ہو سکتی ہے اس لیے میں نے ایک چھوٹے سے ملک پرتگال جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اس بارے میں بھی سوچ رہا ہوں کہ ہم پرتگال کے کسی بڑے شہر کے بجائے کسی چھوٹے سے جزیرے پر اتر جائیں۔ وہاں ہماری روپوشی آسان ہوگی۔ بس یہ ہے کہ مجھے وہاں محنت مزدوری کرنی پڑے گی۔ وہ پیسا تو میں یہاں سے لے کر نہیں جاؤں گا جو غیر قانونی طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ کیا تم وہاں ایک مزدور کے ساتھ زندگی گزار سکو گی؟ یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم اپنا تاج ور حاصل کرنے کے لیے یہ تاوان دے سکو گی؟''

''میں اپنے تاج ور کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔'' شیریں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تمہارے ساتھ میں بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

مزدوری کرلوں گی۔''

''اچھا اب اس معاملے کے دو پہلو اور بھی ہیں۔ وہ بھی جان لو۔ یہ اسمگلر تو یقین دلاتے ہیں کہ وہ کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی لانچیں بعض اوقات راہ میں پڑنے والے کسی ملک کی بحری پولیس کی نظر میں بھی آجاتی ہیں۔ وہ لانچ کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔ اسمگلر مدافعت کرتے ہیں تو فائرنگ میں مارے جاتے ہیں۔ اسمگل ہونے والے لوگوں سے ان کے ملک کا نام معلوم کرکے اس ملک سے رابطہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو واپس لے لے اور ان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہے، وہ کرے۔ ہم اگر واپس آتے ہیں تو تمہارے ساتھ تو حکومت کا رویہ کچھ اور ہوگا لیکن میں یقیناً پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''اگر ہم اپنے ملک کا نام ہی نہ بتائیں؟''

''تو ہمیں اس ملک کی جیل میں رہنا پڑے گا، غالباً۔''

''میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات بحری قزاق بھی لانچ کو اور تمام لوگوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور پھر ان کے ملک سے ان لوگوں کو چھوڑنے کے لیے تاوان مانگتے ہیں۔''

''انہیں بھی اگر ہم اپنے ملک کا نام نہ بتائیں تو؟''

''وہ ہم پر تشدد بھی کرسکتے ہیں اور ہلاک بھی کرسکتے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ مرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''اچھی طرح سوچ لو شیریں! میں نے ساری صورتِ احوال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔''

''اور میں بھی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے تاج ور کے لیے ہر قسم کا تاوان دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''تو پھر کچھ دن انتظار کرو۔ ایس پی نادر کو ختم کرنے کے بعد میں اس گروپ کی سربراہی جمال خاں کو سونپ دوں گا اور ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''جمال خاں کا نام میں نے پروین سے بھی سنا تھا۔''

''ہاں، وہ گروپ میں میرا نائب ہے۔''

''پروین سے میری خاصی باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتی۔ اس نے جواب دیا کہ اب وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔ میں نے سوال کیا کہ اس کی کوئی خاص وجہ ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا لیکن اس وجہ کی وضاحت نہیں کی بس میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے لیکن جس سے وہ محبت کرتی ہے، وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔''

''ٹھیک محسوس کیا ہے تم نے۔ یہی بات ہے۔''

''میں نے یہ اندازہ بھی لگایا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

تاجو نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے نظریں جھکالی تھیں۔

شیریں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک جانب دیکھتے ہوئے نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی۔

تاجو اب وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا کہ شیریں یکایک پوچھ بیٹھی۔

''اس بستی کے لوگ کیسی زندگی گزار رہے ہیں؟''

''معمول کے مطابق، جیسے اس ملک کے تمام شہری۔'' جواب دیتے ہوئے تاجو کے چہرے پر استعجاب تھا۔ ''یہ عجب سوال کیا تم نے، شاید میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ بستی کے لوگوں کو ہمارے گروپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہاں کی کئی غریب لڑکیوں کی شادیاں بھی کروائی ہیں گروپ نے۔ ان کی ہر پریشانی میں ہم ان کے کام آتے ہیں۔''

''شادیاں بھی ہوجاتی ہیں؟ یعنی نکاح خواں بھی ہیں۔''

''سب کچھ ہے یہاں۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ سب لوگ معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ عید، بقرعید، محرم، رمضان، سب کچھ ہوتا ہے یہاں لیکن اچانک تمہیں یہ سب پوچھنے کا خیال کیوں آیا؟ ابھی تم کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں، پھر اچانک یہ سوال کر بیٹھیں۔''

''ہاں تاج ور! میں سوچنے لگی تھی کہ جب ہم یہاں سے فرار ہو رہے ہوں گے تو شاید ہماری لانچ کسی ملک کی بحری پولیس پکڑ لے یا ہمیں قزاق پکڑلیں۔ ایسی صورت میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔''

''یہ سب کچھ میں نے ہی تمہیں بتایا ہے۔ تم سوچ لو کہ اپنے تاج ور کو حاصل کرنے کے لیے یہ تاوان دے سکتی ہو یا نہیں۔ ابھی وقت ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔''

''میں کہہ چکی ہوں کہ میں ہر قسم کا تاوان دینے کے لیے تیار ہوں۔ بس ایک خواہش ہے میری۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو مرتے وقت یہ صدمہ میرے ساتھ نہ جائے کہ تاج ور میرا نہ ہوسکا۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو تم؟ تاج ور بھی تمہارا ہے۔''

''میں...... دراصل...... میں چاہتی ہوں۔'' شیریں کی نظریں جھک گئیں۔ ''میں سہاگن مرنا چاہتی ہوں۔''

''اوہ!'' تاجو مسکرا دیا۔ ''تم چاہتی ہو کہ ہم شادی کر لیں؟''

شیریں کی نظریں جھکی رہیں۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

تین دن بعد تاجو نے اپنے نائب جمال خاں کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''مجھے ان دنوں دو اطلاعات ملی ہیں۔ ایک اطلاع تو مجھے تم نے ہی دی تھی کہ ایس پی نادر واپس آ گیا ہے۔ تمہیں کچھ ہدایات دی تھیں اور یہ بھی کہا تھا کہ ایس پی نادر کو ختم کرنے کے بعد میں یہ گروپ چھوڑ دوں گا۔ میرے بعد اس کے سربراہ تم ہی ہو گے۔ میں شیریں کے ساتھ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اصولی طور پر میرا کام ایس پی نادر کی ہلاکت کے بعد ختم ہو جائے گا اور میرا خیال ہے کہ گروپ کے سبھی لوگ اپنا انتقام لے چکے ہیں اور اب اس زندگی میں صرف اس لیے پھنسے ہوئے ہیں کہ دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ کوئی اپنی سابقہ زندگی کی طرف واپس لوٹے گا تو قانون کے شکنجے میں جکڑا جائے گا۔ پھانسی یا عمر قید اس کا مقدر ہو گی۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں باس! اب ہماری یہ زندگی، مجبوری بن چکی ہے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ جا رہے ہیں۔ میں آپ سے یہ سوال نہیں کر سکا تھا کہ آپ کیسے واپس جا سکیں گے یا قانون آپ کو معاف کر دے گا؟''

''میں نے یہ ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے جمال خاں!'' تاجو نے جواب دیا اور پھر وضاحت سے بتا دیا کہ اس کا اور شیریں کا کیا پروگرام ہے۔''

سب کچھ سننے کے بعد جمال خاں نے کہا۔ ''کیا اسی طرح ہم لوگ ملک سے نہیں نکل سکتے؟''

''یقیناً نکل سکتے ہیں لیکن سارا گروپ ایک ساتھ نہیں جا سکتا۔ ایک لانچ اتنے لوگوں کو نہیں لے جا سکتی۔ میں تمہیں اس اسمگلر سے ملوا دوں گا۔ تم خود اس سے طے کر لینا کہ وہ سارے گروپ کو یہاں سے کتنی قسطوں میں نکال سکتا ہے۔ باقی لوگوں سے بھی پوچھ لینا کہ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں؟''

''میں بات کر لوں گا۔ آپ کسی دوسری اطلاع کی بھی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں۔'' تاجو نے کہا۔ ''یہ اطلاع مجھے آج ہی ملی ہے۔ حکومت کی دو بہت بڑی شخصیتیں کل رات ہی فوج سے

بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہوں کل سے
کسی کے ساتھ ڈیٹ پر نکلی ہوئی ہے

رابطہ کر چکی ہیں۔ پولیس کی ناکامی کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے گروپ کو ختم کروانے کے لیے فوجی آپریشن کروایا جائے۔''

''اوہ!''

''حکومت کے جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں، وہ اب اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ مجھ سے کہا ہے کہ اگر فوج آپریشن کے لیے تیار ہو گئی تو وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ فوج کو وہ آپریشن سے روک نہیں سکتے۔ اب اس کے لیے بھی تیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپریشن میری موجودگی میں ہوا تو میرا فیصلہ ہے کہ ہم مقابلہ نہیں کریں گے۔ اگر آپریشن میرے بعد ہوا تو فیصلے کی ذمے داری تم پر ہو گی لیکن تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ فوج سے مقابلہ نہ کرنا۔ یہ تو ہے کہ ہمارا گروپ فوجیوں کو بھی خاصا نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن آخرکار غلبہ تو فوج ہی پائے گی۔ مقابلے کرنے والے گرفتار ہوں گے یا مارے جائیں گے لیکن یہ کوئی مناسب بات نہیں ہو گی۔ یہ ہمارے ملک کی فوج ہے، ہماری محافظ ہے اور پھر ان سے ہماری کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ ہر چند کہ کچھ کالی بھیڑیں اس میں بھی ہیں لیکن ساری فوج تو بری نہیں ہے۔ ہمارے ملک کا صرف یہی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے لیے میرے دل میں احترام ہے لیکن میرے بعد سربراہ کی حیثیت سے تم جو چاہو، فیصلہ کرنا۔ میں نے بس مشورہ دیا ہے۔''

''مناسب مشورہ ہے آپ کا باس! لیکن مجھے یہ سب کچھ باقی ساتھیوں کو بھی بتانا ہو گا۔ شاید وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں کہ مقابلہ کیے بغیر خود کو فوج کے حوالے کر دیں۔''

''تم آج ہی سب کا عندیہ لینا شروع کر دو۔ فوج اگر آپریشن کے لیے تیار ہوئی تو بھی اس میں ابھی چند دن تو لگیں گے۔ ان دنوں میں جو لوگ اسمگل ہو کر یہاں سے باہر جانا چاہیں، وہ باہر چلے جائیں اور جو مقابلہ کرنے کو ترجیح دیں، وہ یہاں رکیں۔''

''آپ کی طرح میں بھی فوج سے مقابلہ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ کے بعد میں بھی یہاں سے نکلنے ہی کی کوشش کروں گا اور گروپ کی سربراہی ان میں سے کسی کو سونپ دوں گا جو مقابلہ کرنا چاہیں گے۔''

''اگر میں آپریشن سے پہلے چلا گیا تو یہ فیصلے تمہیں ہی کرنے ہوں گے۔ میں یہاں بس اس وقت تک ہوں جب تک ایس پی نادر کو ختم نہ کر دوں۔ اب تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس کی ریکی کرواؤ۔ مجھے اس کی نقل و حرکت کی مکمل رپورٹ چاہیے۔''

''اگر آپ نہ بلاتے تو میں خود آپ کو بتانے کے لیے آنے والا تھا۔ وہ بہت محتاط ہے۔ اس کی حفاظت کا بہت سخت بندوبست کیا گیا ہے۔ گھر سے دفتر تک اس کے ساتھ محافظوں کی چار گاڑیاں ہوتی ہیں۔ ان تین دن میں وہ مختلف راستوں سے اپنے دفتر گیا ہے اور واپسی میں بھی مختلف راستے استعمال کیے ہیں۔ اگر راہ میں کسی طرح اس پر حملہ کیا بھی جائے تو ہمیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صحیح منصوبہ بندی کی جائے تو کامیابی تو ہو جائے گی لیکن ہمارے کافی ساتھی بھی اپنی جان سے جائیں گے۔''

''میں اس معاملے میں اپنے زیادہ ساتھیوں کی قربانی دینا ہرگز پسند نہیں کروں گا؟ مجھے کوئی ایسا منصوبہ بنانا پڑے گا کہ تنہا یہ کام کر سکوں۔ کیا کسی طرح اس کے گھر میں داخل ہوا جا سکتا ہے؟''

''جن دنوں وہ باہر رہا، اس کے بنگلے کی چار دیواری خاصی اونچی کروا دی گئی ہے۔ پھاٹک اور عقبی دروازے پر بھی اس کے محافظوں کی دو گاڑیاں اس وقت ضرور ہوتی ہیں جب وہ گھر میں ہو اور گھر کے اندر حفاظت کا الیکٹرانک نظام لگوایا گیا ہے۔''

تاجو ہنس پڑا۔ ''کتنا بزدل ہے یہ شخص۔''

جمال خاں خاموش رہا۔

''ٹھیک ہے۔'' تاجو نے اس سے کہا۔ ''میں سوچوں گا کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔''

جمال خاں سوچ میں ڈوبا ہوا رخصت ہو گیا۔

اس وقت تاجو گھر کے ایک ایسے کمرے میں تھا جسے وہ لائبریری کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ ایک الماری میں خاصی کتابیں بھری ہوئی تھیں جن میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

جمال خاں کے جانے کے بعد کمپیوٹر کھولا۔ ''گوگل سرچ'' کے ذریعے شہر کا نقشہ نکالا۔ اسے ڈاؤن لوڈ کیا، پھر اس کا ایک بڑا پرنٹ نکال کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔ ایس پی نادر کے گھر سے اس کے دفتر تک کے علاقے کے گرد ایک سرخ دائرہ بنایا اور اس پر غور کرنے لگا۔ اس کے خیال کے مطابق چار راستے ایسے تھے جنہیں ایس پی نادر استعمال کر سکتا تھا۔ اگر وہ بہت زیادہ گھوم پھر کر جاتا تو دو راستے اور بھی ممکن تھے۔ تاجو نے ان پر بھی نشان لگایا۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے وہ دوبارہ جمال خاں کو بلاتا لیکن اسی وقت پیچھے سے شیریں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ تاجو اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اندرونی کمرے سے اس کمرے میں آنے والے دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی گئی تھی، نہ شیریں کے قدموں کی چاپ!

''کیا ہو رہا ہے سرکار میری؟'' شیریں نے پوچھا۔

''یہ نقشہ کیسا ہے؟''

''اپنے شہر ہی کا ہے۔''

''اور اس پر بنا ہوا یہ سرخ دائرہ؟''

''اس علاقے میں ایس پی نادر کا گھر اور اس کا دفتر ہے اور یہ نشانات ان راستوں کے ہیں جن سے وہ آتا جاتا ہے۔''

شیریں کے چہرے سے خوش گوار تاثرات یک لخت ختم ہو گئے اور وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ اس نے تاجو کے گلے سے بانہیں نکالیں اور اس کے سامنے آ کر اسی کرسی پر بیٹھ گئی جہاں سے جمال خاں اٹھ کر گیا تھا۔

''ابھی اس سلسلے میں شاید اسمارٹ موبائل فون سے بھی فائدہ اٹھانا پڑے۔ ضروری ہے کہ ایک ایک سڑک کے بارے میں علم ہو۔''

''گویا فیصلہ کن وقت قریب آچکا ہے۔'' شیریں بہت سنجیدہ تھی۔

''ہاں جانِ من!''

''اس پر راستے ہی میں حملہ کرو گے؟''

''ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس کے گھر میں گھس کر بھی اسے مارا جا سکتا ہے۔ اس کے گھر کا نقشہ اس بلڈر سے معلوم کرنا پڑے گا جس نے وہ بنگلا بنوایا ہے۔''

''بتا دے گا وہ؟''

''ریوالور کی نال کنپٹی سے لگی ہو تو انسان سب کچھ اُگل دیتا ہے۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی کچھ فیصلہ کروں گا میں۔''

''بہت احتیاط سے منصوبہ بنانا تاج ور۔'' شیریں کی آواز بھرا گئی۔ ''اگر میں نے تم سے وعدہ نہ کیا ہوتا کہ میں تمہارے کسی معاملے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تو میں تم سے کہتی کہ معاف کردو ایس پی نادر کو۔''

''وہ کسی قیمت پر بھی قابلِ معافی نہیں ہے۔''

''اس کے گھر والوں پر کیا گزرے گی؟''

''میرے اندر انسانیت جگانے کی کوشش مت کرو شیریں۔'' اب تاجو بھی بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ ''کیا نادر نے سوچا ہوگا کہ جب مجھ پر حوالات میں تشدد کیا جارہا تھا تو میرے والدین کے دلوں پر کیسی قیامت ٹوٹ رہی ہوگی۔ حادثے میں ان کا انتقال تو بعد میں ہوا تھا اور مجھے اس کی خبر تک نہیں دی گئی تھی۔ میں جب بھی وہ سب کچھ یاد کرتا ہوں یا وہ مجھے یاد آجاتا ہے تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

''ہاں۔'' شیریں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے اندازہ ہے تمہارے کرب کا۔''

''جمال خاں کو میں ابھی پھر بلاؤں گا۔ نقشہ میرے سامنے ہے۔ اب مجھے اس سے کچھ اور معلومات بھی حاصل کرنا ہوں گی یا وہ مطلوبہ معلومات حاصل کر کے مجھے بتائے گا۔ سارے کام جلد از جلد کرنا ہوں گے۔ چار دن بعد ایک لانچ جانے والی ہے۔ اگر وہ مس ہوگئی تو پھر بیس دن انتظار کرنا ہوگا اور یہ انتظار اب ممکن اس لیے نہیں ہے کہ فوج کسی دن بھی ہمارے علاقے پر آپریشن کر سکتی ہے۔''

''فوج؟'' شیریں چونکی۔

''ہاں، ابھی بتاتا ہوں۔ ذرا جمال کو فون کردوں۔'' تاجو نے اپنے موبائل پر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ''اسے ابھی بلاؤں گا۔''

شیریں چپ رہی۔ اس کے چہرے پر تفکرات اور گہرے ہوگئے تھے۔

جمال خاں کو فون کرنے کے بعد تاجو نے اسے فوجی آپریشن کے بارے میں وہ سب کچھ بتانا شروع کیا جو وہ جمال خاں کو بتا چکا تھا۔

اس کے بعد بھی ان دونوں میں اس وقت تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا جب تک جمال خاں نہیں آگیا۔ اس کی آمد پر شیریں اٹھ کر اس کمرے سے چلی گئی۔

☆☆☆

کار چھینی گئی تھی۔ کئی دن کی تلاش کے بعد بلیک برڈ گروپ کے آدمی ایک ایسے شخص کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے جس کی شکل تاجو سے کسی حد تک ملتی جلتی تھی۔ اس کا تعلق بھی خاصے آسودہ گھرانے سے تھا۔ کچھ ہی دن پہلے اس نے لینڈ کروزر خریدی تھی۔ وہ ڈرائیور ملازم رکھ سکتا تھا لیکن اس نے نہیں رکھا تھا۔ ڈرائیونگ اس کا شوق تھی۔ یہی سب باتیں تاجو کے حق میں تھیں چنانچہ گروپ ہی کی ایک لڑکی نے اسے ایک ہی دن میں اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ دوسری ہی رات اس نے نو بجے فون کر کے اسے کسی جگہ بلایا۔ وہ بڑے اشتیاق سے وہاں پہنچا اور وہیں گروپ کے لوگوں نے اسے اغوا کرلیا۔

''اب آپ روانہ ہوسکتے ہیں سر۔'' تاجو نے اپنے علاقے میں کال ریسیو کی۔ ''ہم اسے اغوا کر کے اپنے علاقے میں لارہے ہیں۔''

تاجو اس وقت اپنی کار ہی میں بیٹھا ہوا تھا لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر پروین تھی۔

''چل دو فوراً۔'' تاجو نے پروین سے کہا، پھر ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''اس کی گاڑی مجھے کہاں ملے گی؟''

''وہ سلویا کے گھر کے سامنے ہی کھڑی ہے۔ اشفاق بھی آپ کو وہیں ملے گا۔''

سلویا ہی نے اس شخص کو اپنے جال میں پھنسایا تھا اور اشفاق کا تعلق بھی گروپ ہی سے تھا۔

پروین انجن اسٹارٹ کر کے کار تیزی سے حرکت میں لے آئی۔

''ٹھیک ہے۔'' تاجو نے اپنے موبائل میں کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

''سلویا کا گھر تمہیں معلوم ہی ہے۔'' اس نے پروین سے کہا۔

''جی باس!''

دس منٹ بعد ہی کار تاجو کے مخصوص علاقے کے باہر دو پولیس چوکیوں کے درمیان سے گزری۔

''کار دیکھ تو لی گئی ہوگی۔'' پروین بولی۔ ''کیا پولیس والے اس کی اطلاع ہیڈ کوارٹر کو نہیں دیں گے کہ آپ علاقے سے نکلے ہیں؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں خاصی رشوت پہنچائی جاتی ہے۔''

''لیکن جب شیریں یہاں آئی تھیں تو پولیس ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی گئی تھی۔''

''وہ تو ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی اجنبی کار اس علاقے میں داخل ہوگی، اس کی اطلاع وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کو ضرور دیں گے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔''

''آپ نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ سلویا کے گھر کے بعد ہماری منزل کہاں ہوگی؟''

''میں نے تمہیں ایس پی نادر کے گھر کا نقشہ بھی دیا تھا اور ان راستوں کے نقشے بھی جو نادر اپنے دفتر سے گھر آنے جانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ آخر مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کے گھر میں داخل ہونا زیادہ خطرناک ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے کسی راستے ہی میں ختم کیا جائے۔ نادر کو کل کا سورج نہیں دیکھنا چاہیے۔''

''نادر اس وقت اپنے گھر سے کیوں نکل رہا ہے؟ یہی اطلاع ملی ہوگی نا؟''

''نہیں۔ وہ ساڑھے دس گیارہ کے درمیان اپنے دفتر سے نکلے گا۔ میں نے ایک ایسا کیس کروا دیا تھا کہ نادر کو زیادہ رات تک دفتر میں رکنا پڑے۔''

''تو اس پر راستے ہی میں حملہ کرنا ہے؟''

''اتنی باتوں کے بعد تمہیں اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیے تھا۔''

''جی باس۔'' پروین نے سر ہلایا، پھر بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ اس مہم میں آپ نے مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند کیا۔''

''میں اس خطرناک اور اپنے ذاتی معاملے میں گروپ کے کسی آدمی کو بھی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن تمہیں ساتھ لینا میری مجبوری ہے۔ تم ہر قسم کی گاڑی بہت مہارت سے چلا سکتی ہو اور یہ ضروری تھا کہ میرے ساتھ ڈرائیونگ کرنے والا کوئی اور ہو۔ مجھے تو اس دوران میں مسلسل اپنے اسمارٹ موبائل پر نظر رکھنی ہوگی۔ شہر کی تمام سڑکوں کے نقشے گوگل پر ہوتے ہیں لیکن مجھے صرف ان راستوں کے نقشے دیکھنے ہوں گے جو میں نے تمہیں دیے تھے۔ میں نے ان پر نشانات بھی لگائے تھے۔ تم نے وہ نقشے ذہن نشین کر لیے ہیں نا؟''

''انسانی ذہن جس حد تک کر سکتا ہے باس، وہ میں نے کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کوئی کمپیوٹر نہیں ہو۔ خود میں نے بھی وہ نقشے ذہن نشین کیے ہیں، اس کے باوجود مجھے اسمارٹ موبائل سے بھی مدد لینی پڑے گی۔ جہاں بھی تمہیں کچھ سمجھنے میں پریشانی ہوگی، میں تمہیں بتا دوں گا۔''

انہی باتوں میں ان کی گاڑی سلویا کے گھر کے سامنے جا رکی جہاں ایک لینڈ کروزر کے پاس اشفاق کھڑا تھا۔

''انجن اسٹارٹ ہی چھوڑ کر اترو۔'' تاجو نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''تم یہ گاڑی لے کر اپنے علاقے میں جاؤ۔'' تاجو نے کار سے اتر کر اشفاق سے کہا۔

''او کے باس۔'' اشفاق نے کہا پھر لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چابی اسی میں لگی ہوئی ہے۔''

اس کے بعد پروین اور تاجو کا سفر لینڈ کروزر میں شروع ہوا۔ تاجو کے ہاتھ ایک چھوٹا سا بریف کیس اور ایک تھیلے کے علاوہ فور بیرل پستول بھی تھا جس کی لمبائی عام پستولوں سے خاصی زیادہ تھی۔ فی الحال وہ اپنے باکس میں تھا۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' تاجو نے موبائل پر اپنے کسی آدمی سے پوچھا۔

''ابھی وہ اپنے دفتر سے نہیں نکلا ہے باس۔''

''جب نکلے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔'' تاجو نے کہہ کر موبائل بند کر دیا۔

''اب ہمیں کدھر جانا ہے باس؟'' پروین نے پوچھا۔

''ہماری گاڑی ان چھ راستوں کے درمیان کسی جگہ پہنچنا چاہیے۔'' تاجو نے بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گئی۔ اندازہ ہے مجھے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہم اس راستے کا رخ کر سکتے ہیں جہاں سے نادر گزرے گا۔''

''ہاں۔''

اس چھوٹے سے بریف کیس میں میک اَپ کا سامان تھا۔ تاجو نے میک اَپ کرنے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی لیکن اس وقت اسے کچھ زیادہ کام نہیں کرنا تھا۔ صرف فرنچ کٹ داڑھی لگائی تھی۔ اس کام سے وہ جلد ہی فارغ ہو گیا۔ پھر اس نے آنکھوں پر جو عینک لگائی وہ بظاہر نظر کی عینک تھی لیکن اس میں پلین شیشے لگے ہوئے تھے جس شخص کی یہ لینڈ کروزر تھی، وہ نظر کا چشمہ استعمال کرتا تھا۔

لینڈ کروزر کے شیشے تاریک تھے باہر سے صرف ونڈ اسکرین کی طرف سے دیکھا جا سکتا تھا اس لیے تاجو نے سارا کام خاصا آگے جھک کر کیا تھا۔

''تمہیں ساتھ لے کر میں نے ایک رسک یقیناً لیا ہے۔'' تاجو بولا۔ ''کم از کم میں نے کسی عورت کو لینڈ کروزر

ڈرائیو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لوگ اسی لیے تمہیں تعجب سے دیکھ رہے ہیں۔''

گاڑی کسی ویران سڑک پر نہیں دوڑ رہی تھی۔

''میں نے بھی محسوس کیا ہے باس۔'' پروین بولی۔

''لیکن یہ مجبوری تھی۔ اس شخص کے پاس یہ لینڈ کروزر ہی تھی جسے اغوا کیا گیا ہے۔''

''پچھلے چوراہے پر کھڑے ہوئے ایک سپاہی نے بھی مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔''

''لینڈ کروزر کے باعث کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔ ہمیں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

''میں بیک مرر پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے، تم اتنی ہوشیار تو ہو۔ ہمیں اپنے اردگرد کے ماحول سے پوری طرح باخبر تو رہنا ہوگا۔''

''ایک سارجنٹ کی موٹر سائیکل ہمارے پیچھے آرہی ہے باس۔'' پروین کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اوہ!'' تاجو نے تیزی سے سوچا، پھر بولا۔ ''اب بائیں جانب جو موڑ آگیا ہے، اسی طرف مڑ جاؤ۔ وہاں برائے نام ٹریفک ہوگا۔''

''کرنا کیا ہے باس؟'' پروین نے لینڈ کروزر کو بائیں جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ رکنے کا اشارہ کرے تو روک دینا۔''

اسی وقت سیٹی کی آواز سنائی دی۔

''وہ ہمیں روکنا چاہتا ہے۔'' تاجو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''رفتار کم کرتی چلی جاؤ۔ گاڑی روکنا ہی بہتر ہے۔''

''جب وہ قریب آئے گا تو کیا اسے ختم کریں گے؟''

پروین نے رفتار تیزی سے کم کرنا شروع کی تھی اس لیے اسی وقت موٹر سائیکل آگے آگئی اور سارجنٹ نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ بھی کیا۔

''روک دو گاڑی۔'' تاجو نے کہا۔

پروین نے گاڑی ایک کنارے کر کے روک دی۔ موٹر سائیکل بھی اس کے آگے رکی۔ سارجنٹ اسے سائڈ اسٹینڈ پر کھڑی کر کے لینڈ کروزر کی طرف آیا۔ تاجو نے شیشہ کھول دیا۔

''اتنی تیز رفتاری سے چلائی جارہی ہے گاڑی۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''اور ڈرائیونگ بھی ایک خاتون کر رہی ہیں۔''

''ارے میری محبوبہ کو بڑی مہارت ہے ڈرائیونگ میں۔'' تاجو ایسے لکنت آمیز لہجے میں بولا۔ جیسے شراب پیے ہوئے ہو۔ ''جانے دو آفیسر! کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہو۔''

اس وقت پروین نے بھی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اس طرح مسکرا کر سارجنٹ کی طرف دیکھا جیسے ذرا بھی پریشان نہ ہو۔

''کاغذات دکھائیے گاڑی کے۔'' سارجنٹ کا لہجہ بہ دستور درشت رہا۔

''وہ آپ ضرور دیکھیں، میرا ڈرائیونگ لائسنس بھی دیکھیں۔'' تاجو نے ڈیش بورڈ سے فائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''میری محبوبہ کے پاس بھی ڈرائیونگ لائسنس ہے لیکن ذرا جلدی دیکھ لیں دوست! اس وقت موڈ بڑا اچھا ہے۔'' اس نے جب فائل سارجنٹ کی طرف بڑھائی تو اس پر پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ بھی تھے۔

''اچھا ٹھیک ہے، جائیے!'' نوٹوں کی مقناطیسیت نے سارجنٹ کے لہجے کی ساری سختی نچوڑ لی۔ ''لیکن اتنی تیز ڈرائیونگ مت کیجیے محترمہ۔'' اس نے دیکھے بغیر فائل واپس کرتے ہوئے کہا لیکن دونوں نوٹ فائل کے اوپر سے غائب ہو چکے تھے۔

''ہاں جانِ من!'' تاجو نے پروین کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''رفتار اتنی تیز مت رکھو۔''

سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل کی طرف واپس جانے لگا۔

پروین سکون کی سانس لیتے ہوئے گاڑی حرکت میں لائی۔ ''اچھی خاصی رشوت دے ڈالی آپ نے۔''

''وہ کم بخت تو یہی سمجھا ہوگا کہ مجھے نشے میں نوٹوں کی شناخت بھی نہیں رہی۔'' تاجو نے ہنس کر کہا۔ ''اس نے مجھے کوئی عیاش آدمی اور تمہیں کال گرل سمجھا ہوگا۔''

ان کا سفر پھر شروع ہوگیا۔ سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل پر واپس جا رہا تھا۔

''اب ہمیں دائیں جانب مڑ کر پھر دائیں جانب مڑنا ہوگا تاکہ اپنے صحیح راستے پر جاسکیں۔'' پروین بولی۔

''گڈ!'' تاجو نے کہا۔ ''یقیناً تم نے اس علاقے کے اردگرد کے نقشے بھی دیکھ ڈالے ہیں اور گوگل پر ہی دیکھے ہوں گے۔''

''جی باس!''

''تمہارا انتخاب کر کے میں نے قطعی غلطی نہیں کی ہے۔''

''اس وقت تو ہم کسی ہنگامے سے شاید بال بال بچے

ہیں۔“

”عین وقت پر یہی تدبیر سوجھی تھی مجھے۔اس کو مارنے سے تو ہنگامی صورتِ حال شروع ہوسکتی تھی۔“

اس وقت تاجو کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”وہ دفتر سے نکل رہا ہے باس!“ دوسری طرف سے بتایا گیا۔

”راستہ کون سا اختیار کرے گا؟“

”اس کا اندازہ تو چند منٹ بعد ہی ہوگا۔“

”میں ہولڈ کرتا ہوں۔“ تاجو نے جواب دیتے ہوئے اپنی جیب سے دوسرا اسمارٹ فون نکالا اور اسے آن کردیا۔

”وہ چار نمبر سے نکلنا چاہتا ہے باس۔“ ذرا دیر بعد اطلاع ملی۔

اس دوران میں تاجو اسمارٹ موبائل پر ”گوگل میپ“ کے ذریعے اس علاقے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے نادر روانہ ہوا تھا۔ پھر اس نے وہ نقشہ نکال لیا جو چار نمبر راستے کی نشاندہی کررہا تھا۔

”شاباش! تم بہت ٹھیک جارہی ہو۔“ تاجو نے پروین سے کہا اور پھر موبائل پر اپنے آدمی سے بولا۔ ”تم مسلسل رابطے میں رہو۔ بہت دور رہ کر تعاقب جاری رکھو اور مجھے ایک ایک منٹ کی صورتِ حال سے آگاہ رکھو۔“

”ٹھیک ہے باس۔“

”ابھی رفتار دھیمی رکھو۔“ تاجو نے کہا۔ ”پہلے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔“

پروین نے رفتار کچھ کم کردی۔

ایک منٹ بعد ہی تاجو کو اطلاع ملی کہ ایس پی نادر نے تین نمبر کا راستہ اختیار کیا ہے اور رفتار ساٹھ میل کے لگ بھگ ہے۔

تاجو نے نادر کے استعمال میں آنے والے راستوں کو ”نمبروں“ کے کوڈ ورڈز دیے تھے۔

”کے ایف سی کے چوراہے کی طرف چلو۔“ تاجو نے پروین سے کہا۔ ”بیس منٹ بعد اسے وہاں سے گزرنا چاہیے۔ ستر میل کی رفتار سے چلو۔ ہم بروقت پہنچ جائیں گے۔“

پروین نے ایکسلیریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

”ہم بالکل ٹھیک جارہے ہیں۔“ تاجو کی نظر موبائل کی اسکرین پر دکھائی دینے والے نقشے پر جمی ہوئی تھی۔

چند منٹ بعد تاجو نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کہا جارہا تھا۔ ”اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا ہے باس! اس کا قافلہ نیلم بیکری کے برابر کی گلی میں مڑ گیا ہے۔“ بولنے والے کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہورہی تھی۔ ”غالباً مجھے چیک کرلیا گیا ہے۔ دو موبائلیں نہ جانے کس طرف سے آکر میرے پیچھے لگ گئی ہیں۔“

”تو پھر تم تیز رفتاری سے نکل جاؤ۔“ تاجو نے سرعت سے کہا۔ ”اپنی جان بچانے کی کوشش.....کرو۔“

”کرو۔“ تاجو نے اس وقت کہا تھا جب ایک دھماکا سنائی دے چکا تھا اور وہ دھماکا کسی رائفل کے فائر کا تھا۔

اس کے بعد پے در پے دھماکے سنائی دینے لگے، پھر یکا یک سناٹا چھا گیا۔ رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔

موبائل کا اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے پروین بھی کچھ سن رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اچانک ذہنی طور پر کچھ منتشر ہوجانے کے باوجود اس نے لینڈ کروزر کا راستہ تبدیل کیا تھا۔

”دو دھماکے یقیناً کار کے ٹائر پھٹنے کے تھے۔“ تاجو نے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا۔ ”یقیناً اس کی کار الٹ گئی ہوگی۔“ اس کے چہرے سے غصہ ظاہر ہوا تھا۔ ”اس سؤر نادر کی وجہ سے ہمارا ایک آدمی اور گیا۔“

”میں نے راستہ تبدیل کیا ہے باس۔“ پروین نے کہا۔ ”وہ گلی خاصی لمبی ہے۔ وہ جس سڑک پر ختم ہوگی، ہم وہیں پہنچیں گے۔“

پروین نے رفتار بہت بڑھا دی تھی۔

”مجھے امید نہیں کہ ہم بروقت پہنچ سکیں گے۔“ تاجو کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”اور اگر آج وہ بچ گیا تو میرے لیے......“ وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ گلی سے ایک موٹر سائیکل نکلی، پھر دو موٹر سائیکلیں ساتھ ساتھ، اس کے بعد ایک موبائل، پھر ایک کار جو ایس پی نادر کی تھی۔ اس کے بعد ایک اور پولیس موبائل۔

پروین نے یک لخت رفتار میں بہت زیادہ اضافہ اسی وقت کردیا تھا جب گلی سے پولیس گارڈ کی پہلی موٹر سائیکل نکلی تھی لیکن رفتار اتنی بڑھانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایس پی نادر کا قافلہ گلی سے نکل کر بائیں جانب مڑ چکا تھا۔ تاجو کی لینڈ کروزر اسی طرف بڑھ رہی تھی۔

”نکل گیا۔“ تاجو نے دانت پیسے۔ ”رفتار کم کرو اور دائیں جانب مڑ جاؤ۔ تعاقب کرکے ہم اس کے قریب نہیں پہنچ سکیں گے۔“

پرخاور اسنے

پروین نے رفتار تیزی سے کم کی تھی تاکہ اسے دائیں جانب کے راستے پر موڑا جاسکے۔

تاجو کی بات جاری رہی تھی۔ ''پولیس موبائل ہمیں نادر کی کار کے قریب نہیں ہونے دیتی۔''

پروین لینڈ کروزر دائیں جانب موڑ چکی تھی۔

''اب بائیں جانب موڑو۔'' تاجو نے کہا۔ ''وہ راستہ زیادہ چوڑا نہیں ہے لیکن ہمیں اسی پر تیز رفتاری سے چلنا ہوگا۔ بہت تیز رفتاری سے۔''

''میں سمجھ رہی ہوں باس۔'' پروین نے گاڑی بائیں جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ سڑک ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف ہے جس پر نادر کا قافلہ جارہا ہے۔''

''اب ہمارے راستے میں دو چوراہے پڑ رہے ہیں۔'' تاجو موبائل پر نظر آنے والے نقشے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ ''ان دونوں کے بعد جو تیسرا چوراہا ہے، وہیں سے نادر کا قافلہ سڑک کراس کرے گا۔''

''یعنی وہ دائیں جانب مڑ کر اس چوراہے کی طرف آئے گا؟''

''ہاں، یہ اندازہ میرا اس لیے ہے کہ اسی چوراہے سے گزر کر وہ اپنے گھر کے بہت قریب ہوجائے گا لیکن......''

تاجو کی نظر گھڑی پر بھی تھی۔ ''ہم بروقت وہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔'' اس کے دماغ نے کیلکولیٹر کی طرح فاصلے اور وقت کا حساب لگا لیا تھا۔

اس وقت لینڈ کروزر پہلے چوراہے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ سگنل کی بتی زرد ہوچکی تھی۔ دوسری گاڑیاں تیزی سے اپنی رفتار میں کمی لائی تھیں لیکن پروین نے رفتار میں اضافہ کردیا۔ سگنل کی بتی سرخ ہوچکی تھی جب لینڈ کروزر نے چوراہا پار کیا۔ دائیں بائیں جانب سے آنے والی جو گاڑیاں حرکت میں آچکی تھیں، انہیں اچانک بریک لگا کر حادثے سے بچنا پڑا۔

''ٹھیک کیا تم نے۔'' تاجو بولا۔ ''وہ لوگ ہمیں گالیاں تو دے رہے ہوں گے لیکن اس وقت گالیاں کھانا ضروری تھا۔''

''یس باس!''

لینڈ کروزر فراٹے بھر رہی تھی اور تاجو کا دماغ وقت اور فاصلے میں الجھا ہوا تھا۔ اسے اس کا بھی افسوس تھا کہ اس کے ذاتی معاملے میں گروپ کا ایک آدمی کام آگیا۔ ٹائروں کے پھٹ جانے کے باعث یہ امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ وہ پولیس سے بچ کر نکل سکا ہوگا۔

موبائل کی گھنٹی نے تاجو کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے کال ریسیو کی جو اس کے نائب جمال خاں کی تھی۔ کال ریسیو کرتے ہی تاجو چونک گیا۔ دوسری طرف سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے گولیاں چل رہی ہوں۔

''ہیلو جمال!'' تاجو تیزی سے بولا۔

''فوج نے آپریشن شروع کردیا ہے باس!'' جمال خاں نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ ''سب ساتھی مقابلہ کررہے ہیں۔''

''بہت غیر متوقع ہے یہ آپریشن۔'' تاجو نے کہا۔ ''خیر! بہتر ہے جمال خاں کے ہتھیار ڈال دو۔ سب لوگ خود کو فوج کے حوالے کردیں۔ مقابلے میں جانیں جائیں گی اور کچھ نہیں ہوگا۔''

''باس!'' پروین تیزی سے بولی۔ ''وہ نکل رہا ہے شاید۔''

لینڈ کروزر اس وقت دوسرے چوراہے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ سگنل سے پہلے اس کے آگے ایک کار تھی جس نے بریک لگائے تھے۔ موٹر سائیکل راہ کے بیچ میں کھڑی کر کے سارجنٹ ٹریفک کو رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔

پروین نے بھی بریک لگائے تھے۔

''بائیں طرف کاٹو!'' تاجو نے تیزی سے کہا۔ ''آگے والی کار کے برابر میں رکو۔''

پروین نے تیزی سے ایسا ہی کیا اور آگے والی کار کے برابر میں جاکر رکی۔ اسی وقت بائیں جانب سے نادر کے دو موٹر سائیکل سوار گارڈ نکلے اور بائیں جانب مڑ گئے۔ اس کے بعد پولیس موبائل نکلی۔

اسی اثنا میں تاجو، جمال خاں سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد لینڈ کروزر کی چھت کی کھڑکی (روف ٹاپ) کھولتے ہوئے اپنی سیٹ پر کھڑا ہو چکا تھا۔

بیچ سڑک پر اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ کھڑا ہوا گارڈ، تاجو کو اس طرح کھڑے دیکھ کر چونکا۔ فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر پر گیا تھا لیکن اسے ریوالور نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ تاجو کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پسٹل تھا جس کی گولی نے گارڈ کی کھوپڑی اُڑادی۔ اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ میں دبا ہوا گرینیڈ سنسناتا ہوا ایس پی نادر کی کار کی طرف گیا جو اسی وقت سامنے آئی تھی۔ گرینیڈ اس کے بونٹ پر پھٹا۔ تاجو نے بائیں ہاتھ میں دبا ہوا پسٹل فوراً ہی ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا جو نیچے سیٹ پر جاگرا۔ اسی ہاتھ سے ایک اور گرینیڈ نکال کے دائیں ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہ عمل اتنی تیزی سے مکمل ہوا تھا کہ جب بونٹ پر گرینیڈ پھٹا تو دوسرا گرینیڈ تاجو کے دائیں ہاتھ میں تھا جو اس نے نادر کی کار پر پھینکا۔

نیچے سے پروین نے ہدایت کے مطابق فور بیرل لمبا پسٹل تاجو کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔

دوسرے گرینیڈ نے ایس پی کی پوری کار اُڑادی تھی۔

پروین ہدایت کے مطابق لینڈ کروزر حرکت میں لاچکی تھی اسی وقت تاجو نے فور بیرل سے گولیاں برسائیں اور پھر جلدی سے اسی وقت بیٹھ گیا جب پولیس کی طرف سے بے شمار گولیوں کی باڑھ آئی۔ وہ گولیاں اسے بھی چھلنی کرتیں اور ونڈ اسکرین کو بھی لیکن اس وقت پروین لینڈ کروزر کو بہت تیزی سے دائیں جانب موڑ چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گولیاں لینڈ کروزر کی چھت اور بائیں جانب کی کھڑکی کے شیشے کے علاوہ دروازے کو بھی چھلنی کرگئیں۔ انہی میں سے کچھ گولیاں تاجو کے جسم کے مختلف حصوں میں پیوست ہوئیں اور وہ کراہ کے ساتھ آگے کی طرف گرا اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا تھا۔

معجزانہ طور پر کسی گولی نے پروین کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچائی۔ اس کا پیر بھی ایکسلیریٹر پر بھرپور دباؤ ڈال چکا تھا اور لینڈ کروزر فراٹے بھرنے لگی تھی۔

''باس!'' پروین چیخ پڑی لیکن اس نے تاجو کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہتا دیکھ لیا تھا۔

جواب میں تاجو کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اگر لینڈ کروزر کی تیز رفتاری سے اس کا جسم متاثر نہ ہورہا ہوتا تو غالباً وہ بالکل ساکت ہوتا۔

''مائی گاڈ!'' پروین کچھ روہانسی ہوگئی۔

عقب سے گولیوں کی بارش ہورہی تھی لیکن لینڈ کروزر ان گولیوں کی پہنچ سے دور نکل چکی تھی۔

پولیس کی دونوں موبائلیں تعاقب میں لگ چکی ہوں گی، یہ خیال پروین کے ذہن میں آیا تو لیکن اسے بیک مرر پر نظر ڈالنے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ یہی بہت غیر معمولی بات تھی کہ وہ لینڈ کروزر کو انتہائی تیز رفتاری سے دوڑاتی رہی تھی۔

اسپتال، اسپتال، اس کے دماغ میں گونج سی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تاجو شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اس صورت میں اسپتال ہی کا رخ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد گرفتاری بھی یقینی تھی لیکن اس وقت پروین کی شدید ترین خواہش یہی تھی کہ تاجو کی زندگی بچائی جائے۔ اس کی نظر سامنے سڑک پر بھی تھی اور تاجو پر بھی نظر ڈال رہی تھی۔

چند فرلانگ کے فاصلے پر دائیں بائیں جانب کے راستے سے دو پولیس موبائل نکلیں اور انہوں نے لینڈ کروزر کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی لینڈ کروزر پر گولیاں بھی برسائیں لیکن ونڈ اسکرین محفوظ رہا۔ پروین نے دانت پر

ڈانت جما کر ایکسیلریٹر پر دباؤ بڑھایا۔ ایک پولیس موبائل لینڈ کروزر کا دھکا کھا کر ایک طرف لڑھکتی چلی گئی اور لینڈ کروزر کے لیے آگے نکلنے کا راستہ بن گیا۔ دھکا لینڈ کروزر کو بھی لگا تھا جس سے تاجو اپنی نشست پر اس طرح لڑھکا کہ اس کا سر پروین کی گود میں گرا۔

''تاجو!'' پروین ایک بار پھر چیخ پڑی۔ وہ اس وقت ''باس'' کہنا بھول گئی تھی۔ اس کے دل سے ''تاجو'' ہی ابھرا تھا اور اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

راستے میں قریب ہی ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ وہاں موجود پولیس بھی وائرلیس کے ذریعے الرٹ کی جا چکی ہوگی۔

☆☆☆

جب فوج نے ''نوگو ایریا'' پر اچانک آپریشن شروع کیا تھا تو جمال خاں نے تاجو سے بات کرنے کے بعد شیریں کو بھی ساری بات بتا دی تھی۔

''وہی کرنا چاہیے تمہیں، جو تمہارے باس نے کہا ہے۔'' شیریں جواب میں بولی تھی۔ ''فوج سے مقابلہ چند دن بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

جمال خاں سر ہلا کر فوراً اس کے پاس سے چلا گیا تھا اور وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلتی رہی تھی۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا جس کا نیا نمبر صرف تاجو ہی جانتا تھا۔ شیریں اتنی پریشان تھی کہ اس کے جانے کے بعد سے اب تک کئی مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ جمال خاں کے جانے کے بعد بھی اس نے ایک بار کوشش کی اور ناکام رہی، تاجو کا فون بند تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلتی رہی۔

گولیاں چلنے کے دھماکے برابر سنائی دے رہے تھے۔

گرفتار تو وہ بھی ہوگی، وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں وہ کوئی اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی۔ یہ فیصلہ اس نے کر لیا تھا کہ وہ تاجو سے اپنی شادی کی بات ہرگز نہیں چھپائے گی۔ اس نے کہیں رکھا ہوا نکاح نامہ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ وہ جمال خاں سے تاجو کا وہ نمبر معلوم کر سکتی تھی جس پر گروہ کے لوگوں کا رابطہ رہتا تھا۔ اس نے جلدی سے جمال خاں کا نمبر ملایا لیکن وہ اس سے بھی بات نہیں کر سکی۔ جمال خاں کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ یہ شیریں کو بعد میں معلوم ہوا کہ جمال خاں فوج کے کسی افسر سے بات کر رہا تھا۔

پھر دس منٹ بعد ہی گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔ گروپ نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

جس رجمنٹ نے یہ آپریشن کیا تھا، اس کی کمانڈ لیفٹیننٹ کرنل اسلم کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اپنے ماتحت کو ہدایت کر دی تھی کہ قیدیوں کو فی الحال پولیس کی کسٹڈی میں نہیں دیا جائے گا، فوج اس کی تحقیقات خود کرے گی۔

کرنل اسلم ہی کی ہدایت پر قیدیوں کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کیا جا رہا تھا جب ایک کیپٹن نے اس سے فون پر کہا۔ ''سر! آپ نے کہا تھا کہ یہاں شیخ جواد صاحب کی بیٹی شیریں صاحبہ بھی ہوں گی جن کے ساتھ ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے۔''

''ہاں، کہا تھا میں نے۔''

''ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی ہے۔ تمام قیدیوں کو منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان کو بھی.....''

''نہیں۔'' کرنل نے بات کاٹ دی۔ ''انہیں تم خود میرے پاس لاؤ۔''

''یس سر۔'' دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

کرنل ٹہلنے لگا۔ شیخ جواد سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ جس وقت آپریشن کیا جا رہا تھا، کرنل نے فون پر اس کی اطلاع شیخ جواد کو دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہاں سے آپ کی بیٹی بھی مل جانا چاہیے۔''

''جہنم میں جائے وہ۔'' شیخ جواد نے غصے سے کہا۔ ''میرے منہ پر کالک مل دی ہے اس نے۔ اب میں نہیں چاہوں گا کہ وہ میری نظروں کے سامنے آئے۔'' اور پھر شیخ جواد نے کرنل کی کوئی اور بات سنے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔

کرنل نے اس وقت ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ وہ بھی محبت کا مارا ہوا شخص تھا۔ ایک بہت بڑے گھر کی لڑکی اس سے محبت کرنے لگی تھی اور وہ بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔ ان کی شادی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ لڑکی کا باپ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بیٹی کی شادی کہیں اور کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ لڑکی نے خودکشی کر لی تھی اور کرنل بھی برسوں اس کے لیے تڑپتا رہا تھا۔ اسی باعث اسے تاجو سے تو نہیں لیکن شیریں سے ہمدردی تھی۔ اسے بس یہ قلق تھا کہ شیریں نے ایک جرائم پیشہ سے محبت کی تھی جس سے اس کا ملاپ کرانا قانون کے بس کی بات نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی کیپٹن نے شیریں کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔

شیریں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔
کرنل نے کیپٹن کو جانے کا اشارہ کیا اور اس کے جانے کے بعد شیریں سے بولا۔ ''آپ کے والد سے میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ کسی باعث مجھے آپ سے ہمدردی بھی ہے۔ لیکن میں آپ کو اس وقت تک رہا نہیں کرسکتا جب تک تفتیش سے یہ بات سامنے نہ آجائے کہ آپ تاجو کے جرائم میں اس کی شریک نہیں تھیں۔ میں تفتیش سے پہلے آپ کی زبان سے اس کا جواب سننا چاہتا ہوں۔''
''میں تاج ور کے کسی جرم میں اس کی شریک نہیں ہوں۔''
''تاج ور؟''
''اس کا نام یہی ہے۔ وہ اس گروپ میں آنے کے بعد تاجو بنا ہے۔''
''اچھا۔ خیر، میں آپ کے چہرے کے تاثرات کی بنا پر آپ کا جواب درست سمجھ رہا ہوں۔ یقیناً تفتیش کے بعد آپ کو رہائی مل جائے گی۔ صرف میرا مطمئن ہونا کافی نہیں ہے۔''
''میں اپنے بارے میں نہیں، تاجو کے بارے میں پریشان ہوں۔''
''وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگا ہے۔ مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ وہ آپریشن سے پہلے اس علاقے سے کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے ڈی آئی جی کو اس کی اطلاع دے دی ہے۔ پولیس اسے تلاش کررہی ہوگی۔ اب میں آپ سے ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ رہائی کے بعد آپ کہاں جائیں گی۔ آپ کے والد سے ابھی میری بات ہوچکی ہے۔ وہ تو اب آپ کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔''
''میں اپنا گھر چھوڑ چکی ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ وہ کس بات کے روادار ہیں اور کس بات کے نہیں ہیں۔ مجھے اب وہیں جینا ہے، جہاں تاجو ہوگا۔ زندگی ہو یا موت، میں ہر صورت میں اس کے ساتھ ہوں۔ اب تو اس سے میری شادی بھی ہوچکی ہے۔''
کرنل چونکا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ردِعمل الفاظ میں ڈھلتا، اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے جو کچھ بتایا گیا، وہ تاجو کے بارے میں تھا۔ کرنل نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔
''اچھا ہوا آپ نے مجھے یہ اطلاع دے دی۔ شکریہ۔''
بات ختم کرنے کے بعد کرنل نے شیریں سے کہا۔ ''رہا ہونے کی صورت میں اگر تاجو تمہیں فوری طور پر نہ مل سکے تو تم میرے گھر میں آکر رہ سکتی ہو بیٹی!...... میں تمہیں بیٹی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری عمر تم سے بہت زیادہ ہے اور میری بڑی بیٹی تم سے چار پانچ سال ہی چھوٹی ہوگی۔''
''آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ، لیکن میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ملازمت کرسکتی ہوں۔''
''لیکن کسی چھت کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے۔'' کرنل نے کہا۔ ''خیر! اس پر بعد میں بعد کریں گے۔ فی الحال تمہیں دوسرے قیدیوں کے ساتھ کہیں اور منتقل کردیا جائے گا۔''
کرنل نے خاموش ہوکر کیپٹن کو آواز دی۔
شیریں بولی۔ ''اگر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے تو جیسے ہی تاجو کے بارے میں کچھ معلوم ہو، مجھے اطلاع دے دیجیے گا۔''
شیریں نے اسے اپنا موبائل نمبر بھی بتا دیا۔
کیپٹن اندر آگیا تھا۔ وہ شیریں کو لے کر چلا گیا۔
ٹی وی چینلز سے بتایا جارہا تھا کہ فوجی آپریشن کامیاب رہا لیکن ایک خفیہ ایجنسی کی اطلاع یہ تھی کہ گروپ کے کچھ افراد نے بستی کے بعض گھروں میں روپوشی اختیار کی ہے۔ ان افراد کی وجہ سے بستی کے گھروں کی تلاشی اس وقت تک لی جائے گی جب تک تمام روپوش افراد گرفتار کرلیے جائیں۔ یہ کہا جارہا تھا کہ تلاشی کا یہ کام شاید اس علاقے میں کرفیو لگا کر کیا جائے۔
شیریں ان تمام باتوں سے بے خبر تھی۔ اسے کسی نامعلوم مقام پر کسی عمارت کے کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا لیکن دروازے کے باہر ایک مسلح سنتری موجود تھا۔
شیریں اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ گروپ کے باقی لوگوں کو بھی اسی عمارت میں رکھا گیا ہے یا کہیں اور پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ یہ جاننے کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں صرف یہ سوال گونج رہا تھا کہ تاج ور اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا یا نہیں، اور یہ کہ اب وہ کہاں تھا۔ وہ رات شیریں پر قیامت کی طرح گزری۔ صبح تک وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوسکی تھی۔ اس کا موبائل اس سے نہیں لیا گیا تھا لیکن اسے ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اپنے باپ سے رابطہ کرے اور اسے بتائے کہ وہ کن حالات سے گزر کر کہاں پہنچ گئی تھی۔
صبح ہونے پر اس کے کمرے میں ناشتا بھی پہنچا دیا

گیا۔

''تاج ور...... میرا مطلب ہے...... تاجو...... اس گروپ کے لیڈر کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟'' وہ اضطراب کے عالم میں ناشتا لانے والے سے پوچھ بیٹھی تھی۔

لیکن اسے جواب نہیں ملا تھا۔ ناشتا پہنچانے والا خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب دو فوجی افسر اس کے کمرے میں آئے۔ انہوں نے شیریں پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ تاجو کے گروہ میں کس حد تک فعال تھی۔

شیریں فعال تھی ہی نہیں تو انہیں کیا بتاتی۔ شائستگی سے کیے جانے والے سوالات کا وہ شائستگی ہی سے جواب دیتی رہی۔ یہ سلسلہ آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر جب دونوں افسر جانے لگے تو شیریں ان سے بھی پوچھ بیٹھی۔ ''اس گروپ کے لیڈر کا کیا ہوا؟''

دونوں افسروں نے جواب دینے کے بجائے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر اُن میں سے ایک نے شیریں کے ہاتھ میں دبے ہوئے موبائل پر نظر ڈالی، اس کی دیکھا دیکھی دوسرے افسر نے بھی یہی کیا۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرے سے نظریں ملائیں۔ ان میں سے ایک نے اس طرح اپنے شانے اچکائے جیسے بات سمجھ میں نہ آئی ہو، اس کے بعد وہ دروازے کی طرف مڑ گئے۔

''پلیز!'' شیریں چیخ پڑی۔ ''اتنا بھی نہیں بتا سکتے؟''

دونوں افسر باہر نکل گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔

بے بسی کے احساس سے شیریں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا تھا کہ دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھاڑ لے۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ تاجو اپنا موبائل نمبر بند رکھتا ہے۔ اسی لیے اس سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ خود تو اسے فون کر سکتا ہے۔

گھنٹے بھر کے بعد پھر دو فوجی افسر آئے۔ انہوں نے بھی شیریں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ صرف الفاظ کا الٹ پھیر تھا لیکن جاننا وہ بھی چاہتے تھے کہ گروپ میں شیریں فعال تھی یا نہیں اور اگر تھی تو کس حد تک تھی۔

کچھ دیر پوچھ گچھ کے بعد وہ دونوں بھی چلے گئے۔ شیریں کو ان سے بھی تاجو کے بارے میں اپنے سوال کا جواب نہیں مل سکا تھا۔

شیریں سے دو مرتبہ پوچھ گچھ کی جانے والی رپورٹس اس افسر کو ملیں جو تمام گرفتار شدگان سے پوچھ گچھ کا نگراں تھا۔ اس نے وہ دونوں رپورٹس پڑھ کر چند منٹ غور کیا، پھر اس پر اپنا نوٹ لکھا۔

شیریں اس گروپ کی کارکن نہیں رہی۔ اسے رہا کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ رپورٹ شام کے وقت کرنل اسلم کے سامنے تھی۔ شیریں کو رہا کرنے کا فیصلہ وہی کر سکتا تھا۔

رپورٹ میں ایک خاص بات یہ بھی لکھی گئی تھی کہ شیریں شدید ذہنی پراگندگی کا شکار ہے۔ وہ بار بار تاجو کے بارے میں پوچھتی رہی تھی جبکہ اس کے پاس اسمارٹ موبائل موجود ہے جس پر وہ کسی بھی ٹی وی چینل سے خبریں سن سکتی تھی۔

ٹی وی چینلز اس بارے میں یہ خبریں مستقل نشر کر رہے تھے کہ جس لینڈ کروزر سے گرینیڈ پھینک کر ایس پی نادر کی کار تباہ کی گئی تھی، وہ لینڈ کروزر وہی لڑکی پروین چلا رہی تھی جس کے شوہر کو تاجو نے قتل کیا تھا۔ گرینیڈ خود تاجو نے مارے تھے اور اس کی فائرنگ سے کئی کانسٹیبل زخمی اور دو ہلاک ہوئے تھے۔ پروین تیزی سے لینڈ کروزر کو وہاں سے بھگا لینا چاہتی تھی۔ اس وقت پولیس کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ نے لینڈ کروزر کو چھلنی کیا تھا اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ دونوں اس سے کم از کم زخمی ضرور ہوئے ہوں گے لیکن اس کے بعد یہ بات سامنے آئی تھی کہ تاجو کے جسم میں پانچ گولیاں لگی تھیں اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہ اس وقت معلوم ہوا تھا جب پروین نے فرار ہونے کی کوشش کے بجائے لینڈ کروزر ایک پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل کر دی تھی۔ اس طرح وہ دونوں پولیس کی حراست میں آئے تھے۔

پروین کو حوالات میں بند کرنے کے ساتھ ہی بے ہوش تاجو کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ آپریشن کر کے اس کے جسم سے گولیاں نکال لی گئی تھیں لیکن دو گولیوں سے اسے بہت خطرناک زخم لگے تھے جن کا اندمال کرنے کی سر توڑ کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اسپتال کا اعلامیہ یہ تھا کہ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زندگی جیتے گی یا موت!

کرنل اسلم نے رپورٹ پڑھنے کے بعد شیریں کی رہائی کا حکم جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی متعلقہ افسر کو یہ ہدایت بھی کی کہ شیریں کو رات آٹھ بجے تک اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔

وہ چاہتا تھا کہ شیریں کم از کم اس وقت تک اس کے گھر میں رہے جب تک اسے اس کا باپ شیخ جواد قبول نہ کر لے۔

وہ ایک ایسا فوجی آفیسر تھا جو محبت کرنے والوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اسے شیریں سے ہمدردی تھی جو

محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تاجور کے پاس چلی گئی تھی۔ اگر تاجو بہت سے لوگوں کا قاتل نہ ہوتا اور سرکاری طور پر اس کے سر کی قیمت نہ رکھی گئی ہوتی تو کرنل کو اس سے بھی ہمدردی ہوتی۔

دوسرے قیدیوں سے پوچھ گچھ کی رپورٹس بھی کرنل کو مل چکی تھیں۔ ان رپورٹس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے کن حالات کی وجہ سے یہ گروہ بنایا تھا۔ رپورٹس میں یہ بات بھی تھی کہ بستی کے لوگ ان سے بہت خوش تھے۔ ان میں کئی کو بستی کے کچھ لوگوں نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ ان کے گھروں میں روپوش ہو جائیں مگر انہیں خطرے میں نہ ڈالنے کے لیے انہوں نے یہ پیشکش قبول نہیں کی تھی اور تاجو کی ہدایت پر جمال خاں نے خود کو اور پورے گروپ کو فوج کے حوالے اس لیے کیا تھا کہ فوج ان کے وطن کی محافظ تھی جس سے انہیں کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔

ان سب نے اپنے ہاتھوں سے کیے گئے ہر اُس کام کا اعتراف کرلیا تھا جو قانون کی نظر میں جرم تھا۔

خفیہ ایجنسی کی رپورٹ کے پیشِ نظر جب اس بستی میں کرفیو لگا کر گھروں کی تلاشی کا حکم جاری کیا ہی جانے والا تھا کہ خفیہ ایجنسی کی دوسری رپورٹ آگئی تھی کہ مزید چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ پہلی رپورٹ غلط تھی۔

غلط فہمی کا سبب یہ ہو سکتا تھا کہ بستی کے کچھ لوگوں نے گروپ کے بعض افراد کو اپنے گھر میں روپوش ہونے کی پیشکش بہرحال کی تھی۔ اسی دوسری رپورٹ کے باعث کرفیو لگا کر تلاشی کا حکم جاری نہیں کیا گیا۔

شیریں کی رہائی کا حکم جاری کرنے کے بعد کرنل نے شیخ جواد کو فون کیا اور اس سے کہا۔ ''آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ کوشش کیجیے گا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک آجائیں۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں خود حاضر ہو جاتا لیکن کسی وجہ سے ضروری ہے کہ آپ تشریف لائیں۔''

شیخ جواد نے آمادگی ظاہر کردی۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ گفتگو شیریں ہی کے بارے میں ہوگی۔ اگرچہ وہ اپنی بیٹی کے معاملے میں بہت برہم تھا لیکن بہرحال ایک باپ تھا جسے فطری طور پر یہ فکر لاحق تھی کہ جو حالات سامنے آچکے تھے، اس کی روشنی میں اس کی بیٹی کا کیا ہوگا۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے شیریں کو کرنل اسلم کے گھر پہنچا دیا گیا۔

''اپنی رہائی کے سلسلے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' شیریں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''لیکن میں آپ کے گھر میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کرنل صاحب! میں اس کے لیے بھی آپ کی ممنون ہوں کہ آپ مجھے بیٹی کہہ چکے ہیں لیکن میں وہیں جیوں اور مروں گی جہاں میرا تاجور ہوگا، پلیز...... آپ ہی بتا دیجیے مجھے اس کے بارے میں۔''

''چند گھنٹے تو میرے گھر میں گزار لو، پھر میں تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔''

''چند گھنٹے۔'' شیریں روہانسی ہوگئی۔ ''میرا ایک ایک لمحہ کرب میں گزر رہا ہے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ اس سے تمہاری شادی ہوچکی ہے۔''

''جی ہاں، میرے پاس ثبوت موجود ہے۔'' شیریں نے پرس سے نکاح نامہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

کرنل نے نکاح نامہ لے کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر وہ شیریں کو واپس کردیا۔ اسی وقت ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ انہیں اس کی ہدایت پہلے ہی کرنل سے مل چکی تھی۔

''یہ شیریں ہے۔'' کرنل نے تعارف کرایا۔ ''اور یہ دونوں میری بیوی اور بیٹی ہیں۔''

کرنل کی بیوی نے قریب آکر شیریں کو اپنے سینے سے لگالیا اور لڑکی نے بھی قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

''تم دونوں شیریں کو اپنے ساتھ اندر لے جاؤ'' کرنل نے کہا۔ ''کوشش کرنا کہ یہ کچھ کھالیں۔ یہ کل سے بھوکی ہیں۔''

شیریں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے کرنل کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو یہ رپورٹ بھی مل گئی ہے؟''

''ہاں۔'' کرنل نے کہا۔ ''تمہیں جس کمرے میں رکھا گیا تھا، اس میں ایک خفیہ کیمرا ہے۔ کلوز سرکٹ، اس سے تمہاری نگرانی ہوتی رہی ہے۔'' پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''شیریں کو لے جائیے نا، مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔''

رنج و الم کی تصویر بنی شیریں ان ماں بیٹی کے ساتھ چلی گئی۔

ڈرائنگ روم ہی میں ایک تپائی پر ایک فائل پڑی ہوئی تھی۔ کرنل اسے کھول کر بعض کاغذات پر نظر دوڑانے لگا۔ پھر اس نے فائل بند کر کے موبائل پر کور کمانڈر سے رابطہ کیا۔ دس منٹ تک حالات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر شیخ جواد آگیا۔

گفتگو کا آغاز کرنل نے ہی کیا۔ ''ایک خاص وجہ ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔''

''شیریں ہی کی بات ہوگی۔'' شیخ جواد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیا حشر ہوگا اب اس کا؟ خبروں میں تو سن چکا

ہوں کہ وہ بھی گرفتار ہوئی ہے۔''

''ان سبھی سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے لیکن شیریں کو پوچھ گچھ کے بعد آج ایک گھنٹے پہلے رہا کر دیا گیا ہے۔''

''اوہ!''

''نہ جانے کیوں، میں اس کا سبب تو نہیں بتا سکتا۔ میں نے اسے بیٹی کہہ دیا ہے۔ اب میں اس رشتے کی لاج بھی رکھوں گا۔ میں نے اسے یہیں بلا لیا ہے۔''

شیخ جواد کچھ چونک سا گیا۔

''میری بیوی اور میری نوجوان بیٹی بھی ہیں گھر میں۔''

کرنل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''شیریں ان کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کر سکتی ہے لیکن وہ میرے گھر میں رہنے پر آمادہ نہیں۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔''

''تو گزارنے دیں۔'' شیخ جواد کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔

کرنل چند لمحے رک کر بولا۔ ''کہا جاتا ہے کہ فوجیوں کے دل بہت سخت ہوتے ہیں لیکن میں شاید پیدائشی فوجی نہیں ہوں اس لیے مجھے شیریں سے بہت ہمدردی ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ اسے قبول کر لیں۔ جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ وہ تاجو سے شادی کر چکی ہے لیکن......''

''کیا!'' شیخ جواد اس طرح چونکا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''جی ہاں۔'' کرنل نے کہا۔ ''لیکن حالات اب یکسر بدل چکے ہیں۔ تاجو اسپتال میں زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ شاید وہ بچ نہ سکے۔ ڈاکٹرز سے میری بات ہو چکی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی معجزہ ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ ایسی صورت میں، شادی کے باوجود وہ شیریں کی زندگی سے نکلا ہوا ہوگا۔''

اسی وقت کرنل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال اس کے ایک ماتحت کی تھی جسے تاجو کی خبر داری پر لگایا گیا تھا۔

''ہوں۔'' کرنل نے کال ریسیو کی۔ ''کوئی اطلاع؟''

''جی سر! تاجو اب نہیں رہا۔ ایکسپائر۔''

دو تین لمحوں کے لیے کرنل چپ رہ گیا پھر اس نے پوچھا۔ ''کنفرم؟''

''ہنڈریڈ پرسنٹ سر!''

کرنل نے رابطہ منقطع کر دیا اور اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے شیخ جواد سے بولا۔ ''وہی اطلاع ملی ہے جو میں ابھی کہہ رہا تھا۔''

''مر گیا وہ؟'' شیخ جواد کے منہ سے نکلا۔ ''جان چھوٹ گئی شیریں کی۔''

کرنل کو اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا لیکن اس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ ''شیریں کو یہ بتانا تو پڑے گا۔ اتنی بڑی بات چھپی تو رہ بھی نہیں سکتی۔ بہتر ہوگا کہ اسے یہ بات تنہائی میں نہ معلوم ہو نہ جانے کیا ردِعمل ہوگا اس کا۔ وہ بہت شدت سے چاہتی ہے تاجو کو۔ جب سے گرفتار ہوئی ہے، اس کے دماغ میں صرف یہ سوال گونج رہا ہے کہ تاجو کہاں ہے۔ تفتیشی افسروں کے علاوہ اس نے مجھ سے بھی یہ سوال کیا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل اسی میں الجھا ہوا ہے۔ اسے خیال ہی نہیں آسکا کہ اپنے موبائل پر وہ کسی بھی چینل کی خبریں سن سکتی ہے۔''

شیخ جواد سوچ میں ڈوبا ہوا کسی جانب دیکھتا رہا۔

''میری بیوی بہت سمجھ دار ہے۔'' کرنل نے کہا۔

''اسے بلا کر بتاتا ہوں کہ وہی یہ اطلاع شیریں کو دے۔ پھر جو بھی ردِعمل ہو، میری بیوی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ شیریں کو سنبھال لے گی۔''

لیکن آدھے گھنٹے بعد یہ ہوا کہ جب کرنل کی بیوی نے شیریں کو ایک بری خبر سنانے کے لیے تمہید باندھ کر اسے ذہنی طور پر ہر بات کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تو شیریں کا چہرہ بتدریج پھیکا پڑتا چلا گیا۔ اس نے تمہید ہی سے سمجھ لیا تھا کہ آخر کار اسے کیا سننا تھا۔

اور جب اصل خبر کرنل کی بیوی کی زبان پر آئی تو شیریں کا سارا جسم لرز رہا تھا، رنگت بالکل پھیکی پڑ گئی تھی اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

''تاااجوووو!''

اور اس کا جسم ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ وہ شدید صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

کرنل کی بیوی اور بیٹی بہ یک وقت چیخ پڑی تھیں۔

بیوی نے اپنے شوہر کو اور بیٹی نے باپ کو پکارا تھا۔

اس وقت کرنل اور شیخ جواد کمرے کے باہر، قریب ہی موجود تھے۔ کرنل، شیخ جواد کا ہاتھ پکڑے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت کرنل کی بیوی شیریں پر جھکی اُسے جھنجوڑ رہی تھی۔

''پانی لاؤ!'' اس نے اپنی بیٹی سے کہا اور کرنل کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائی آواز میں بولی۔ ''کسی ڈاکٹر کو فون کیجیے۔''

اس کے آخری دو لفظ سننے سے پہلے ہی کرنل اپنا موبائل نکال چکا تھا۔

''اسپتال لے جانا پڑے گا۔'' اس نے کہا اور موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ شیخ جواد اس وقت دم بخود کھڑا اپنی بے

ہوش بیٹی کو تکے جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ایمبولینس آگئی۔

کرنل نے اس وقت اپنے اختیارات سے کام لیا تھا۔ شیریں کو فوری طور پر ملٹری اسپتال پہنچا دیا گیا۔

توقع کی جارہی تھی کہ ڈاکٹر جلد ہی شیریں کو ہوش میں لے آئیں گے لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد انہیں یہ خبر سننے کو ملی کہ شیریں ''کوما'' میں چلی گئی تھی اور فوری طور پر یہ نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ وہ کب تک نارمل ہو سکے گی۔

شیخ جواد بہرحال باپ تھا۔ بیٹی سے لاکھ برہم سہی لیکن اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ کرنل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''ہمت رکھیے شیخ صاحب!'' اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر نے 'فی الحال' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے چند گھنٹوں میں یا کل تک وہ کچھ بتا سکیں۔''

''مجھے ترکی کا ڈکٹیٹر یاد آ گیا ہے۔'' شیخ جواد کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''جمال گرسل۔''

شیخ جواد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ برسوں کوما میں رہا تھا اور شاید اسی حالت میں مر گیا تھا۔''

''اتنا مایوس کیوں ہو رہے ہیں آپ؟''

شیخ جواد کچھ نہیں بولا لیکن اس کی مایوسی درست ثابت ہوئی۔ پھر ایک دن نہیں، کئی دن نہیں، کئی ہفتے گزر گئے لیکن شیریں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

اس سارے عرصے میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کرنل اسلم اپنے فرائض سے غافل ہو کر صرف اسپتال کا ہو کر رہ جاتا۔ بلیک برڈ گروپ کے گرفتار شدگان سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ اس پوچھ گچھ سے کئی ایم این ایز اور ایم پی ایز کے بارے میں بھی تحقیقات شروع کی جا چکی تھی۔ دو کے خلاف جلد ہی ثبوت بھی مل گئے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے وہ سارا معاملہ فوج پر ہی چھوڑ دیا تھا، پولیس کو منتقل نہیں کروایا تھا۔

لیکن اس ساری مصروفیت کے باوجود وہ شیریں کی طرف سے بالکل بے خبر نہیں رہا اور پھر ایک دن اسے ڈاکٹر ہی نے بتایا کہ شیریں حاملہ تھی۔

شیریں کے معاملے میں وہ شروع ہی سے جذباتی رہا تھا۔ یہ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا۔

''یہ کیا ہو گیا کرنل!'' ملاقات ہونے پر شیخ جواد نے پریشان لہجے میں اس سے کہا۔

''جو قدرت کو منظور ہے، وہی ہوا۔'' کرنل نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ خیال دل میں مت لائیے گا کہ شیریں پر کوئی تہمت لگائی جاسکتی ہے۔ بچہ اگر پیدا ہوا تو وہ ناجائز نہیں ہو گا۔ شیریں نے تاجو سے شادی کر لی تھی۔''

شیخ جواد چپ رہا۔

وقت کے پر پھڑپھڑاتے رہے۔ بلیک برڈ کے لوگوں کو عدالتوں سے مختلف سزائیں ملتی رہیں۔ اسی دوران میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ پروین کو جیل ہی میں نہ جانے کیا مل گیا جسے کھا کر اس نے خودکشی کر لی۔

اس نے خودکشی کیوں کی؟

اس بارے میں قیاس آرائیاں تو ہوئیں مگر کوئی نہ جان سکا کہ وہ بھی تاجو کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب شیریں نے ایک بچے کو جنم دیا لیکن کوما سے باہر نہیں آئی اور بچہ جب چند ماہ کا تھا تو وہ کوما ہی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔

بچے کی پیدائش کے وقت ہی اس کی پرورش کی ذمّے داری شیخ جواد نے قبول کر لی تھی۔

''ایک وجہ سے یہ کوئی معمولی ذمّے داری نہیں ہے شیخ صاحب!'' شیریں کی موت کے چند دن بعد کرنل نے شیخ جواد سے کہا تھا۔ ''اپنے ذہن میں یہ خیال ضرور رکھیے گا کہ بچے کا ڈی این اے وہی ہو گا جو اس کے باپ کا تھا۔ اگر آپ نے پرورش میں احتیاط نہ برتی تو معاشرے کو ایک اور تاجو بھی مل سکتا ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہر دور میں تاجو تو ملتے ہی رہیں گے، اگر ہم اپنے معاشرے میں توازن نہ لا سکے، اگر طاقت کے ارتکاز کو روکا نہیں جاسکا، غربت اور بے روزگاری ختم نہیں کی جاسکی، ظلم کا احتساب نہیں کیا جاسکا تو..... تاجو پیدا ہوتے ہی رہیں گے۔ یہ جو آج کل دو دو چار چار ہزار روپوں کے لیے ڈاکے پڑنے لگے ہیں تو اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ڈاکا مارنے والے پیشہ ور مجرم نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے بچوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے ڈاکے مار رہا ہے تو کوئی اپنے ماں باپ کے علاج کے لیے ایسی راہوں پر چل نکلا ہے۔ اگر آج کے معاشرے کی زہریلی بنیادیں ختم نہیں کی گئیں تو ایسے ہی درخت پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے رہیں گے۔''

شیخ جواد اس وقت کرنل کا منہ تکنے لگا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہ آسکا ہو کہ وہ سب کچھ ایک فوجی نے کہا تھا یا کسی سوشل ایکٹیوسٹ نے؟

☆☆☆

گمشدہ

جمال دستی

طویل عرصہ گزر جائے تو وقت کی گرد تلے بہت کچھ پوشیدہ ہو جاتا ہے... مگر چالیس سال گزرنے کے باوجود ایک واقعہ ذہنوں میں تروتازہ تھا... ایک خاموش طبع... ذہین عورت کی گمشدگی... جو معمے کی صورت اختیار کرتی چلی گئی... تلاش کا سلسلہ جاری رہا... مگر کوئی سرا کوئی نشاں نہ مل سکا...

اس شہر کی کہانی جہاں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے

میرے چھوٹے سے شہر میں چھوٹے موٹے جرائم ہوتے رہتے ہیں جن میں چند بینک ڈکیتیاں اور شراب کی دکانوں کو لوٹنے کے واقعات شامل ہیں۔ یہاں تک کہ دو قتل بھی ہو چکے ہیں جو فوری اشتعال کا نتیجہ تھے اور ان میں کسی کے ارادے کو دخل نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی بھی جرم نے مقامی آبادی کو ہیلن ہارپر کی گمشدگی والے کیس کی طرح اپنی گرفت میں نہیں لیا۔ یہ اس وقت اور کئی سال بعد بھی ناقابلِ توجیہہ لگتا تھا اور اس کے بارے میں لوگوں نے اپنے

طور پر کہانیاں گھڑلی تھیں۔ ان میں سے کچھ عقل سے قریب تھیں لیکن پیچیدہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ پوری کہانی اس طرح لکھی جاتی تھی کہ وہ ہر ملنے والے ثبوت میں فٹ ہوجاتی۔ کچھ کہانیوں نے بہت سے مفروضوں کو جنم دیا اور بعد میں انہیں حقائق کا نام دے دیا گیا جو صرف کہانی بیان کرنے والے کے ذہن کی اختراع تھی۔ دوسری وضاحتیں سیدھے سیدھے پاگل پن کے زمرے میں آتی تھیں۔ اس جرم نے اگر واقعی یہ کوئی جرم تھا، صرف مقامی نہیں بلکہ ملک کے دوسرے حصوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین جرم کو بھی دلچسپی لینے پر مجبور کردیا تھا۔ کئی سالوں تک اس طرح کی کہانیاں اخبار کی سرخیوں کی زینت بنتی رہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ خبر کے معیار پر پوری اترتی تھیں یا نہیں تاہم اس معمے کو اس کے حصے کی جگہ ملتی رہی اور کچھ عرصے سے سالم کراسنگ ہر خبر کے لیے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

اسی لیے چند سال قبل میں اس وقت بہت پُرجوش ہو گیا جب ایڈیٹر نے میرے ساتھ ایک میٹنگ رکھی۔ اس نے مجھے ہیلن ہارپر کی گمشدگی کے بارے میں ایک اسٹوری لکھنے کے لیے کہا۔ میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ چالیس سال قبل پیش آیا تھا لہٰذا میں فطری طور پر یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ ضرور اس بارے میں کوئی نیا ثبوت سامنے آیا ہے۔

سالم کراسنگ سینٹی نیل مقامی ہفت روزہ اخبار تھا جس کے کسی زمانے میں بہت زیادہ قارئین تھے۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا۔ 'شہر کی آواز'، اور اس دور میں وہ کسی بھی معیاری اخبار سے کم نہیں تھا۔ اس کے مقابلے پر کئی اخبار آئے اور چلے گئے۔ ان میں ایک پرانا اخبار ڈیلی اسٹینڈرڈ بھی تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ شہر اور اردگرد کی وادیوں کی 1851ء سے خدمت کررہا ہے لیکن جب اس نے جدید طریقے اختیار کرنے سے انکار کیا تو اس کی اشاعت گرنے لگی۔ یہ افواہ بھی سننے میں آئی کہ وہ ابھی تک ہاتھ سے ٹائپ کررہے تھے۔ میرے خیال میں یہ مبالغہ آرائی تھی لیکن دیکھنے میں ایسا ہی لگتا تھا۔ ایک اور اخبار 'دی ریکارڈ' بھی میدان میں تھا۔ یہ روزانہ ایک معیاری سائز کے نصف صفحات کا اخبار دیا کرتا جس میں چھوٹی سے چھوٹی سنسنی خیز خبر بھی ہوتی تھی۔ میں اسے روزنامہ کہتا تھا لیکن یہ کبھی شائع ہوتا اور کبھی نہیں پھر سال بہ سال صفحات کی تعداد اور اشاعت کے اعتبار سے سکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے سارے گاہک اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور ایک دن یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔

آج کل حریف اخبارات میں مقابلہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ہماری پوزیشن سب سے بہتر ہے۔ اصل مسئلہ ٹیلی وژن، ریڈیو، انٹرنیٹ اور اخبار بینوں کی سکڑتی ہوئی تعداد ہے گوکہ پہلے ہمارا اخبار ہفتے کے ساتوں دن شائع ہوتا تھا پھر ہفتے میں پانچ دن اور اب صرف جمعرات کو شائع ہوتا ہے۔ پھر بھی ہماری پوزیشن بہت بہتر ہے لیکن پچپن سال کی عمر میں مجھے یہ فکر ستا رہی ہے کہ پہلے کیا ہوگا۔ میری ریٹائرمنٹ یا کمپنی کی موت۔

میری زندگی کا بڑا حصہ اس اخبار میں کام کرتے ہوئے گزرا ہے۔ جب ہیلن کی گمشدگی کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا اور گھروں میں اخبار پہنچاتا تھا پھر میں نے ترقی کے مختلف مراحل طے کیے۔ کاپی بوائے، اسسٹنٹ ڈلیوری منیجر، ڈلیوری منیجر، منیجر رائٹر، منیجر ایڈیٹر اور جب اخبار سکڑنا شروع ہوا تو پورا منیجر ڈپارٹمنٹ مجھ میں سما گیا۔ میں نے بھی کرائم رپورٹر بننے کا خواب دیکھا تھا لیکن اس شہر میں اتنے جرائم نہیں ہوتے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ لکھا جاتا۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے مجھے کسی بڑے شہر جانا پڑتا جو میرے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔

میں بے قراری کے عالم میں ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس جگہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسے دیکھ کر پچاس کی دہائی میں بنی ہوئی ایڈونچرز آف سپر مین یاد آجاتی تھی لیکن پیری وائٹ اس کمرے میں اپنے آپ کو بہت آرام دہ محسوس کرتا ہوگا۔ صرف اس کی میز ہی کاغذات کا ڈھیر نظر نہیں آرہی تھی بلکہ الماریاں بھی پوری طرح بھری ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ فرش اور کرسیوں پر بھی کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بیٹھ جانے کے لیے کہا تو پہلے مجھے کرسی پر سے ایک فولڈر ہٹانا پڑا جس پر 'غیر استعمال شدہ کہانیاں' کا لیبل لگا ہوا تھا۔

اس نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم ہارپر کیس کے سلسلے میں پولیس چیف سے ملاقات کرو۔''

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ مجھے ایک حقیقی نیوز اسٹوری پر کام کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک پیشہ ور صحافی کے انداز میں کہا۔ ''کیا کوئی نیا ثبوت سامنے آیا ہے باس؟''

وہ بولا۔ ''نہیں، نہیں۔ میرا مطلب موجودہ چیف سے نہیں۔ میں چیف ویزا کی بات کررہا ہوں۔''

بین ویزا کی عمر بانوے برس تھی اور وہ بائیس سال قبل پولیس سے ریٹائر ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ چیف ہی کہلاتا تھا۔ ''اس واقعے کو چالیس سال ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے بھی اس بارے میں دس سال سے کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''یہی تو نکتہ ہے۔ اس واقعے کی چالیسویں سالگرہ ہالووین کے موقع پر آرہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سال ماضی کی یادیں تازہ کی جائیں۔ پھر غیر متوقع طور پر چیف نے فون کر کے مجھے کہا کہ وہ اس کیس پر دوبارہ بات کرنا چاہتا ہے۔''

بین ویزا غالباً کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ اس کیس کو اپنے اوپر مسلط کیے ہوئے تھا۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے موقع پر اس نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ کیس ہے جو مجھ سے بچ نکلا، اس نے اپنے کیریئر کا بڑا حصہ ان معاملات کو حل کرنے میں گزارا جو اس کے سپرد کیے گئے۔ یہاں تک کہ کام چھوڑنے کے بعد بھی وہ اس کیس پر لگا رہا اور اس بارے میں شائع ہونے والی خبروں پر اپنا ردِعمل ظاہر کرتا رہا پھر ایک دن تنگ آکر اس نے کہہ دیا کہ بہت ہو گیا۔ اب وہ اس کیس پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ مجھے یہ سوچ کر مایوسی ہو رہی تھی کہ ایک چالیس سال پرانے کیس میں سر کھپانا پڑے گا جو آج تک معما بنا ہوا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اس شخص کے ذہن کو اچھی طرح کھنگالنا چاہتا تھا جو اس شہر کے سب سے پُراسرار واقعے کی آخری کڑی تھی۔ میں نے باس کو بتا دیا کہ یہ ایک اچھا پروجیکٹ معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے لیے مجھے ہیلن ہارپر کے بارے میں حقائق اور فرضی داستانوں کے سمندر میں چھلانگ لگانا ہو گی۔

مجھے اس کہانی کا بڑا حصہ کم از کم سطحی طور پر یاد تھا۔ نوعمر ہونے کے باوجود میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اس میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والدین اور خاندان کے دیگر افراد اس پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ ہر ایک کی اپنی رائے تھی۔ مرد عام طور پر محسوس کرتے تھے کہ پینتیس سالہ خاتون نے خود ہی اپنی گمشدگی کا منصوبہ بنایا ہے۔ ''ممکن ہے کہ اس کا کوئی محبوب ہو یا پھر اس نے بہتر زندگی گزارنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہو۔ وہ یہاں آنے سے پہلے نیویارک سٹی کے باہر ایک تحقیقاتی رپورٹر تھی۔ جب وہ اپنے نئے نویلے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تو اس نے جزوقتی رئیل اسٹیٹ ایجنٹ کا کام شروع کر دیا۔''

جبکہ عورتوں کی رائے اس سے مختلف تھی۔ ان میں سے بیشتر کا خیال تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے یا وہ قتل کر دی گئی ہے۔ میری ایک ڈاکٹر کزن نے کہا کہ غالباً سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا اور وہ اسی حالت میں کہیں نکل گئی لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کئی سال گزر جانے کے باوجود اسے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی لاش ملی۔ اگر وہ اغوا ہوئی تھی تو کسی نے تاوان کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ کبھی واپس آئی۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اب بھی کہیں روپوشی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی ہو گی۔

میں یادداشت پر انحصار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے حقائق تک پہنچنا تھا۔ اس کہانی کا آخری اہم ترین کردار اب نوے کے پیٹے میں تھا اور لگ رہا تھا کہ اب میں اس کا آخری حصہ لکھنے جا رہا ہوں۔ اس لیے میں اسے درست انداز میں لکھنا چاہتا تھا۔

میرا پہلا پڑاؤ سلیم کراسنگ پبلک لائبریری تھا۔ جہاں میں اخبارات کی مائیکروفلمیں بغور پڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ صرف میرے اخبار نے ہی اس کیس کے بارے میں خبریں شائع نہیں کیں بلکہ اس میں دوسرے اخبارات کا بھی حصہ تھا۔ اس کے علاوہ میں نے لائبریرین سے پوچھا کہ کیا لائبریری میں اس کیس کی خصوصی فائلیں موجود ہیں۔ اس کا جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے بھی اس واقعے کے بارے میں نہیں سنا تھا جبکہ وہ زمانۂ طالب علمی یعنی مڈل اسکول سے اسی قصبے میں رہائش پذیر تھی۔ وہ لگ بھگ پینتیس برس کی تھی لیکن اپنے آپ کو اتنا کم عمر ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ اس واقعے کے بارے میں پہلی بار سن رہی ہے اور میرے لیے یہی بات حیران کن تھی۔ میں اس قصبے میں جتنے لوگوں کو جانتا تھا، چاہے ان کا تعلق کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو۔ دوست، دکاندار، استاد، وہ سب اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے اور غالباً انہوں نے اس بارے میں ایک رائے بھی قائم کر رکھی تھی گو کہ کافی وقت گزر گیا تھا لیکن قصبے کے لوگ اسے ابھی تک نہیں بھولے تھے۔

جب میں نے لائبریرین کو اس کیس کے بارے میں حقائق بتائے جو مجھے یاد تھے تو اس کے دل میں بھی تجسس پیدا ہوا۔ اس نے میرے لیے آرکائیو روم سے ایک کلپنگ فائل تلاش کی جس پر باکس تیئس کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ میرے لیے سونے کی کان ثابت ہوئی۔ اس میں جائے وقوعہ کی تصویریں، دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے

اخبارات کے مضامین اور ایک نیشنل میگزین کی کور اسٹوری بھی موجود تھی۔ اس کے سرورق پر بین ویزا کی جوانی کی تصویر تھی جس میں وہ اپنے گھر کے باہر کھڑا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان دنوں مشہور شخصیت بن گیا تھا۔

میں نے اپنے بریف کیس سے ایک پیڈ نکالا اور اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک پرانا طریقہ ہے جس پر ہم اسکول کے زمانے میں عمل کرتے تھے لیکن مجھے اس کی عادت ہوگئی تھی اور میں ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ بعد میں اس تحریر کو اپنے لیپ ٹاپ پر نقل کر لیتا۔

شروع کے چند مضامین سے مجھے کچھ بنیادی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں کچھ نیا نہیں تھا۔ وہ ہالووین کی سہ پہر لاپتا ہوئی تھی۔ اس کا شوہر اندرونِ شہر ایک انشورنس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ کام پر گیا ہوا تھا۔ اس کا دفتر ان کے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ کبھی کبھار دوپہر کے کھانے کے لیے گھر آیا کرتا تھا لیکن اس روز نہیں آیا۔ ہیلن رئیل اسٹیٹ بروکر تھی۔ وہ بھی اندرونِ شہر واقع ایک ایجنسی کے لیے کام کرتی تھی لیکن وہ دفتر سے باہر کے امور سرانجام دیتی اور اس کا زیادہ وقت لوگوں کو مکان دکھانے میں گزرتا۔ وہ بہت کم دفتر جاتی تھی۔

وہ جمعے کا دن تھا اور ہیلن نے اس روز چھٹی کی تھی۔ اس قصبے میں آنے کے بعد وہ مقامی سرگرمیوں میں پوری طرح ملوث ہو چکی تھی۔ وہ ایک اہم پروگرام وچز بال کی نگراں بنا دی گئی تھی۔ یہ ایک امدادی پروگرام تھا جس کا مقصد خوراک کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا تھا، یہ ہمیشہ اکتیس تاریخ کے بعد آنے والے سنیچر کو منعقد ہوتا تھا۔ ہالووین اب بچوں کے لیے مخصوص ہوگیا تھا جبکہ اس پروگرام میں بالغان کو بھی موقع دیا جاتا تا کہ وہ اپنی مرضی کا لباس پہنیں۔

اس جمعے کے روز ہیلن ہار پر بہت مصروف تھی اور اگلی شب ہونے والے امدادی پروگرام کی تیاریوں کو آخری شکل دے رہی تھی۔ دوپہر دو بجے اس کے گھر پر انتظامی کمیٹی کا اجلاس ہونا تھا۔ وہ قصبے کے سرے پر واقع ایک دور افتادہ علاقے وکر ڈرائیو میں رہتی تھی جہاں اس کے علاوہ چار مکان اور بھی تھے۔ کسی زمانے میں اس کے قریب ہی وکر فرنیچر فیکٹری ہوا کرتی تھی جس کی مناسبت سے اس علاقے کا یہ نام پڑ گیا۔ یہ چھوٹا سا محلہ ساٹھ کی دہائی میں تعمیر ہوا تھا جو دلدلی علاقے سے گھرا ہوا تھا۔ بہار اور موسم گرما میں یہاں کی سڑک جزیرے کا منظر پیش کرتی لیکن اکتوبر میں یہ جگہ قدرے خشک ہو جاتی تھی۔ اس سڑک کے اختتام اور

ویسٹ اسٹریٹ کی مخالف سمت پانی کا ایک تالاب ہینکس پونڈ کے نام سے مشہور تھا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ہینک کون تھا۔ وہاں کوئی بورڈ نہیں لگا ہوا تھا اور نہ ہی وہ تالاب اس نام سے نقشے میں موجود تھا لیکن ہر کوئی اسے اسی نام سے پکارتا۔ جنگل میں ہونے کے باوجود یہ مرکزی سڑک سے نظر آتا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک کچی سڑک تھی۔ کچھ لوگ اسے مچھلیاں پکڑنے کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن اس کا پانی گدلا ہونے کی وجہ سے پیراکی کے لیے مناسب نہیں تھا۔ ایک طرح سے یہ ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے تفریحی مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک بجے کے قریب ہیلن اور وائس چیئر پرسن ملی بڈسن ڈائننگ روم میں بیٹھی کاموں کی فہرست پر نظر ڈال رہی تھیں تب اسے خیال آیا کہ سہ پہر میں ہونے والی میٹنگ کے لیے اس کے پاس کافی نہیں ہے۔ ملی نے کہا کہ ابھی میٹنگ شروع ہونے میں کافی دیر ہے۔ وہ بازار سے جا کر کافی لے آتی ہے۔ جب وہ ویسٹ اسٹریٹ جانے کے لیے چھوٹی سڑک پر آئی تو اس نے اپنی گاڑی کے بیک مرر میں دیکھا کہ ہیلن ہار پر مرکزی دروازے سے باہر آئی ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ کوئی اور چیز بھی منگوانا چاہ رہی ہے سو اس نے گاڑی روک دی۔ لیکن ہار پر نے اس کے پاس آنے کے بجائے مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا جہاں وکر ڈرائیو ختم ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر اسے کسی نے نہیں دیکھا۔

ملی کافی لے کر پونے دو بجے واپس آگئی۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے وہ کچن میں چلی آئی۔ اس نے کافی کا ڈبا کاؤنٹر پر رکھا اور ہیلن کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا لہٰذا اس نے دوبارہ اسے پکارا پھر وہ چلتی ہوئی ڈائننگ روم میں گئی اور وہاں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے چکرا دینے کے لیے کافی تھا، جسے وہ چوبیس سال بعد اپنے مرنے تک بھی نہیں بھلا سکی۔ ڈائننگ ٹیبل فرش کے وسط میں الٹی پڑی ہوئی تھی اور ایک کرسی پر میٹنگ کے تمام کاغذات سلیقے سے ڈھیری کی شکل میں رکھے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر ایک کاغذ پر بڑے حروف میں ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا اور دیوار پر ایک خون آلود ہاتھ کا نشان نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ تمام چیزیں اپنی جگہ ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

ملی یہ منظر دیکھ کر پریشان ہوگئی اور پورے گھر میں پھر کر ہیلن کو آوازیں دینے لگی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ

دوڑتی ہوئی عقبی صحن میں گئی۔ہیلن وہاں بھی نہیں تھی۔وہ گھر سے باہر نکل کر چلتی ہوئی اس سڑک کے آخر تک گئی جہاں اس نے آخری بار ہیلن کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہاں بھی اس کی موجودگی کا کوئی نشان نہیں ملا۔بالآخر اس نے پولیس کو فون کر دیا۔

ایک یا دو منٹ بعد ہی آفیسر بین ویزا پہنچ گیا۔اس کی عمر باون سال تھی اور وہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ہی پولیس میں آگیا تھا۔اس کی بہت اچھی شہرت تھی۔قصبے کا ہر فرد اسے جانتا تھا اور وہ بھی ہر ایک سے واقف تھا چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔نو وارد ہو یا قصبے کا پرانا باسی۔اس نے پورے گھر کا بغور معائنہ کیا لیکن الٹی ہوئی میز اور خون کے دھبے کے سوا اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔

ہیلن کے شوہر کو فون کیا گیا اور وہ فوراً ہی گھر واپس آگیا۔ویزا نے فون کر کے سیلیم کراسنگ پولیس اور اسٹیٹ پولیس کے دوسرے لوگوں کو بھی بلالیا۔مقامی اسپتالوں سے رابطہ کیا گیا لیکن کسی بھی جگہ اس کی موجودگی کی اطلاع نہیں ملی۔پولیس نے دلدلی علاقہ چھان مارا۔شکاری کتوں کی مدد سے اس کی بو سونگھنے کی کوشش کی گئی۔اس کے گھر کے چاروں طرف طاقتور لائٹس نصب کی گئیں تاکہ رات میں بھی اس کی تلاش کا کام جاری رہ سکے۔وکر ڈرائیو کو عام لوگوں کے لیے بند کر کے اسے جائے واردات کا درجہ دے دیا گیا۔

دوسری صبح بین ویزا کو ایک گمنام اشارہ ملا۔کسی نے ایک عورت کو جو ہیلن پارپر کے حلیے سے مطابقت رکھتی تھی۔اپنا اسکرٹ اٹھائے ٹینکس پونڈ کے کنارے پر پانی میں چلتے ہوئے دیکھا۔یہ تقریباً تین بجے کا وقت تھا۔ویزا نے فوراً غوطہ خوروں کو تالاب کی تلاشی لینے کے لیے کہا لیکن انہیں وہاں کچھ نہیں ملا۔

اسی روز ایک سات سالہ لڑکی نے جو وکر ڈرائیو کے ہی ایک دوسرے مکان میں رہتی تھی۔اطلاع دی کہ اس نے ایک بجے کے تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ اور سفید رنگ کی کار کو ڈرائیو وے میں دیکھا ہے۔اس روز اسکول میں جلدی چھٹی ہوگئی تھی اور وہ اپنے گھر جا رہی تھی۔اس لڑکی نے بتایا کہ گاڑی کا نمبر 666 سے شروع ہوتا تھا۔ویزا نے اس بارے میں مختصر تحقیقات کی اور بعد میں اسے مسترد کر دیا۔اس کا کہنا تھا۔''وہ لڑکی میری کار کے بارے میں بتا رہی تھی جس پر پولیس کا نشان نہیں ہے۔اس کا نمبر بھی انہی ہندسوں سے شروع ہوتا ہے۔بہرحال یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے۔''

باخبری

قدرت نے اپنی رحمت سے صفائی کا کچھ ایسا انتظام رکھا ہے کہ ہر ایک چارپائی کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کھولتے پانی سے دھارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔جو نفاست پسند حضرات جان لینے کا طریقہ جائز نہیں سمجھتے وہ چارپائی کو الٹا کر کے چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے ہیں۔پھر دن بھر گھر والے کھٹمل اور محلے والے عبرت پکڑتے ہیں۔اہل نظر چارپائی کی چولوں میں رہنے والی مخلوق کی جسامت اور رنگت پر ہی سونے والوں کی صحت اور حسب نسب کا قیاس کرتے ہیں (واضح رہے کہ یورپ میں گھوڑوں اور کتوں کے سوا، کوئی کسی کا حسب نسب نہیں پوچھتا) الٹی چارپائی کو قرنطینہ کی علامت جان کر راہ گیر راستہ بدل دیں تو تعجب نہیں۔حد یہ ہے کہ فقیر بھی ایسے گھروں کے سامنے صدا لگانا بند کر دیتے ہیں۔

چارپائی سے جو پراسرار آوازیں نکلتی ہیں، ان کا مرکز دریافت کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ برسات کی اندھری رات میں یہ کھوج لگانا کہ مینڈک کے ٹرانے کی آواز کدھر سے آئی یا یہ تشخیص کرنا کہ آدھی رات کو بلبلاتے ہوئے شیر خوار بچے کے درد کہاں اٹھ رہا ہے۔چرچراتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں، نہ پردہ ساز، اور نہ اپنی شکست کی آواز! درحقیقت یہ آواز چارپائی کا اعلان صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ بند ہو جاتی ہے۔علاوہ ازیں ایک خودکار الارم کی حیثیت سے یہ شب بیداری اور سحر خیزی میں مدد دیتی ہے۔بعض چارپائیاں اس قدر چغل خور ہوتی ہیں کہ ذرا کروٹ بدلیں تو دوسری چارپائی والا کلمہ پڑھتا ہوا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔اگر پاؤں بھی سکیڑیں تو کتے اتنی زور سے بھونکتے ہیں کہ چوکیدار تک جاگ اٹھتے ہیں۔اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ رات بھر نہ صرف ایک دوسرے کی جان و مال بلکہ چال چلن کی بھی چوکیداری کرتے رہتے ہیں۔اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتایئے کہ رات کو آنکھ کھلتے ہی نظر سب سے پہلے پاس والی چارپائی پر کیوں جاتی ہے؟

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس

اگلے چند ہفتوں تک اس طرح کی اطلاعات آتی رہیں جن میں لوگوں نے اسے مشرقی ساحلی علاقوں میں دیکھنے کا دعویٰ کیا لیکن کوئی بھی اسے سچ ثابت نہ کرسکا۔ ایک سال بعد ویزا نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ پہلے اس کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے پھر اسے قتل کا شبہ ہوا۔ اس وقت عام خیال یہی تھا کہ اس معاملے میں اس کا شوہر کسی نہ کسی طرح ملوث ہے لیکن جلد ہی اس نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ارل کے جوابات اور اندازِ گفتگو سے وہ بے گناہ نظر آتا ہے۔ کئی لوگوں نے جائے وقوعہ سے اس کی غیر موجودگی کی گواہی دی تھی۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان رقم کے لین دین کا بھی کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ اسی طرح انشورنس اور وراثت کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کبھی کسی نے ان دونوں کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ اسٹیٹ پولیس اور ایف بی آئی کے تفتیش کنندگان بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ہیلن کے لاپتا ہوجانے کے بعد ارل نے شادی نہیں کی اور نہ ہی کسی عورت سے تعلقات استوار کیے۔ وہ اسی گھر میں 2007ء تک اکیلا ہی رہا جب اس کی موت واقع ہوئی۔

ایک بات جو مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ کچھ اخبارات کی رپورٹوں میں ویزا کو پٹرول مین لکھا گیا جبکہ دوسرے اخبارات اسے چیف کا لقب دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ چیف بننے سے پہلے ہی اسے یہ لقب دے دیا گیا۔ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ ملاقات ہونے پر اس سے یہ بات ضرور پوچھوں گا۔

ایک اور بات جو میں اس کیس کے حوالے سے نہیں جان سکا یا یاد نہیں رہی۔ وہ انگلیوں کے نشانات تھے جن کی کبھی شناخت نہیں ہوسکی۔ اس کے علاوہ کمرے کی ہر چیز گرد آلود تھی جن پر نشانات موجود تھے جو توقع کے مطابق اس کے شوہر، ملی اور ویزا کے ثابت ہوئے۔

میں نے ایک اور فائل میں اس لڑکی کے بارے میں ایک مختصر نوٹ پڑھا جس نے وہ پُراسرار کار دیکھی تھی۔ یہ مضمون کئی سال بعد لکھا گیا جب وہ لڑکی جوان ہو چکی تھی۔ اس نے رپورٹر کو بتایا کہ اس دن کے بارے میں اسے کچھ زیادہ یاد نہیں ہے۔ اس نے ڈرائیو وے میں ایک کار دیکھی تھی لیکن غالباً چیف کا کہنا صحیح تھا کہ وہ کار اس کی تھی۔ اس لڑکی نے کہا کہ وہ اس وقت ہر کوئی مدد دینے کے لیے تیار تھا اور کوئی اہم ثبوت مہیا کر کے اس کہانی کا حصہ بننا چاہتا تھا جو اس کیس کو حل کرنے میں مدد دے سکے۔ میں نے مزید تفصیلات جاننے کے لیے اس سے ملنے کے بارے میں سوچا لیکن فوراً ہی یہ منصوبہ اپنے دردناک انجام کو پہنچ گیا کیونکہ بعد کی فائلوں سے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا 1998ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ وہ کینسر کی مریضہ تھی۔

میں نے اخبار کی مائیکرو فلم پر بھی نظر دوڑائی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ جان سکا جو مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ مجھے یہ بہت مشکل لگ رہا تھا کہ پرانے اخبارات کی مدد سے کچھ ریسرچ کرسکوں۔ اس لیے میں نے لائبریری میں مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اب میری اگلی منزل وکر ڈرائیو تھی۔ یہ علاقہ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا اور 1969ء کے بعد اس میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ دلدلی ہونے کی وجہ سے یہاں تعمیرات نہ ہوسکیں۔ تعمیراتی کمپنیوں نے کئی منصوبے بنائے لیکن کسی ایک پر بھی عمل نہ ہوسکا۔ سڑک کے اختتام پر اب بھی دلدلی جگہ موجود تھی اور ہینکس پونڈ بھی ویسٹ اسٹریٹ کے پار نظر آرہا تھا گو کہ اب یہ تھوڑا سا گندہ ہو چکا تھا اور یہاں متروکہ کریٹ اور ٹائروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اسی طرح 1969ء کی تصویروں میں جو سڑک بالکل نئی نظر آتی تھی۔ اب جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی اور اس کے گڑھے بھر کر کام چلایا جارہا تھا۔ البتہ اس سڑک کے ساتھ بنے ہوئے مکانات اچھی حالت میں تھے جبکہ دو مکانوں میں گیراج کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک پرانے مکان کو توڑ کر اس کی جگہ ایک بڑا اور عالی شان مکان تعمیر کیا گیا تھا جو دیکھنے میں تو اچھا لگتا تھا لیکن اس علاقے کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔

دوسری جانب ہارپر کا مکان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہوگیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ارل ہارپر کو اس کی مرمت اور دیکھ بھال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی یا وہ اپنے آخری ایام میں بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس میں اتنی ہمت و طاقت نہیں تھی کہ مکان پر توجہ دے سکتا۔ یہ مکان پہلے جیسا ہی نظر آرہا تھا لیکن اس میں رنگ و روغن کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ گھاس بلکہ جنگلی گھاس بہت لمبی ہو چکی تھی۔ ارل نے اپنی جانب جو باڑ لگائی تھی، وہ بھی گر چکی تھی جبکہ میں نے لائبریری میں جو تصویریں دیکھی تھیں، ان میں یہ بالکل نئی لگ رہی تھی۔ میں بیرونی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ یہ مکان ارل کے مرنے کے بعد سے ہی خالی ہے۔ سیڑھیاں بوسیدہ ہو چکی تھیں اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ کئی سالوں سے مکان کی مرمت نہیں ہوئی ہے البتہ تھوڑی بہت لیپا پوتی ہوتی رہی ہے۔ لوہے کی ریلنگ کئی جگہوں سے مکمل طور پر زنگ آلود ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ

مکان کے باہر ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے اندر جھانکا۔ مکان میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں مکان کے عقبی حصے میں لکڑی کی سیڑھیوں کے ذریعے ایک چھوٹے سے صحن تک پہنچا جو مجھے محفوظ نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں بھی کچھ بوسیدہ حصے تھے۔ میں نے ایک خیال کے تحت کچن میں جانے کے لیے سلائڈنگ گلاس ڈور کو کھسکانے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا۔ جانتا تھا کہ گھر میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن وہاں کی صورتِ حال دیکھتے ہوئے یہ اطمینان تھا کہ میرے دیکھے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ کچن کسی بھی قسم کے آلات اور ساز و سامان سے محروم تھا۔ کیبنٹ کے تمام دروازے کھلے ہوئے اور الماریاں خالی تھیں۔ فرش جگہ جگہ سے چٹخا ہوا اور گندہ نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ چوہے بلیوں کو اندر آنے کا راستہ مل گیا اور وہ گندگی پھیلا کر چلے گئے۔ میں چلتا ہوا ڈائننگ روم میں گیا اور میرے پورے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اسی جگہ وہ واقعہ پیش آیا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوا تھا؟ سوائے ہیلن ہارپر کے بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔ وہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا اور مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ میز کہاں چلی گئی کیونکہ وہ تو اس کہانی کا لازمی جزو تھی۔ ممکن ہے کہ وہ ٹوٹ گئی ہو اور اسے کچرے میں پھینک دیا گیا یا کسی کباڑی کو فروخت کر دی گئی ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا نیا مالک اس کی بدنام زمانہ تاریخ سے واقف ہوگا۔

میں نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ وہاں اس خون آلود نشان کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میرے اندر ایک تجسس ابھرا کہ وہ کون سی دیوار تھی جس پر یہ نشان دیکھا گیا تھا کیونکہ اخبارات میں اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں ہال میں گیا اور بیڈروم پر ایک نظر ڈالی جہاں ارل ہارپر نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا بسترِ مرگ پر بھی اسے اپنی بیوی کے واپس آنے کی امید ہوگی۔

یہ سب بہت افسوس ناک تھا۔ اس گھر میں جا کر میری طبیعت بھی مکدر ہو گئی اور میں سوچنے لگا کہ یہاں آ کر غلطی کی۔ ویسے بھی وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے ہیلن کی گمشدگی کا کوئی سراغ مل سکتا۔ میں واپس کچن میں آیا اور شیشے والے دروازے سے گزرتا ہوا باہر آ گیا۔ مجھے رہ رہ کر اپنا وقت ضائع ہونے کا افسوس ہو رہا تھا۔ تاہم یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ اگر نہ آتا تو دل میں ایک خلش باقی رہ جاتی۔ اب میرے قدم چیف کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے جو اس پُراسرار کہانی کا آخری زندہ کردار تھا۔

''جانتے ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟'' وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، تم مجھ سے ہیلن ہارپر کی گمشدگی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو۔ کیا کوئی نئی بات سامنے آئی ہے؟''

''نہیں۔'' چیف نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھے اس کی گمشدگی کے بارے میں اپنا نظریہ بتاؤ گے اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں چند مشورے دے دوں۔''

''نہیں۔ میں یہاں تمہیں سننے کے لیے آیا ہوں۔ میرے ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ تم ہیلن ہارپر کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو۔''

چیف بین ویزا کا قد و قامت اور ڈیل ڈول ایسا تھا کہ وہ مجھے ہمیشہ پولیس چیف ہی نظر آیا۔ اس کا قد لمبا، جسم مضبوط، فوجیوں کی طرح کٹے ہوئے بال، پتھر جیسا سخت چہرہ اور تحکمانہ آواز گو کہ اس کی جسمانی حالت تبدیل ہو چکی تھی لیکن آواز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور پہلی نظر میں دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے اپنی تمام صلاحیتوں پر کنٹرول حاصل ہے۔ وہ اپنے مختصر وجود کے ساتھ ٹانگوں پر کمبل ڈالے ہوئے ویل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے بولنا شروع کیا۔ ''تم اوکیم ریزر کی بات کر رہے تھے۔ یہ کیا ہے؟''

ویزا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک نظریہ ہے جو کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کو صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے کم سے کم تر مفروضوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سادہ ترین جواب ہی عام طور پر درست ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا یہ کامیاب ہے؟''

''ہمیشہ نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ بے وقوف بہت زیادہ غیر روایتی کام کرتے ہیں لیکن عموماً یہ نظریہ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ کم از کم میں نے تو اپنی ملازمت کے دوران یہی دیکھا۔ ٹھیک ہے، تم بتاؤ، کیا جاننا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اب کیوں؟ اتنے سالوں بعد تم کیوں اس موضوع پر بات کرنا چاہتے ہو؟ مجھے تو لگتا ہے کہ تم دس سال پہلے ہی اس پر بات کرتے کرتے تھک چکے تھے۔''

ویزا نے کہا۔ ''یہ وہ کیس تھا جو مجھ سے بچ نکلا۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی سنا ہوگا کہ میں نے کبھی یہ بات کہی

تھی۔ دراصل میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میری ریٹائرمنٹ پارٹی کے موقع پر ایک رپورٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اس کیس کے بارے میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اس پر میں نے سر ہلایا تھا یا شاید مسکرا دیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی یہ بات مجھ سے منسوب کر دی گئی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ میری ملازمت کے دوران یہ کیس حل نہیں ہوسکا۔''

میں نے اپنی بات دہرائی۔ ''پھر تم کیوں اس پر بات کرنا چاہ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''اوہ ہاں، اب کیوں؟ دراصل میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا۔ ایک ماہ قبل میرے ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ میرے پاس صرف ایک مہینا رہ گیا ہے۔ آج میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں، اسے دیکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ میں اس کہانی کا آخری زندہ کردار ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کسی کو اپنے حتمی خیالات سے آگاہ کر دوں اور وہ خوش قسمت تم ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اس وقت یہ تنقید بھی کی گئی تھی کہ پولیس نے اس خون آلود نشان کی شناخت کرنے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید کچھ معلومات ظاہر نہیں کی گئیں۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ ہم نے کوئی چیز نہیں چھپائی۔ کیونکہ یہ ایک معما ہے اس لیے ہر کوئی سازش کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ جہاں تک اس نشان کی شناخت کا تعلق ہے تو یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ کوئی ٹیلی وژن ڈراما نہیں ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ واقعہ 1969ء میں پیش آیا تھا۔ اس وقت فارنسک سائنس آج کی طرح ترقی یافتہ نہیں تھی۔ یہ دیکھنے میں کسی عورت کا ہاتھ لگتا تھا لیکن ہیلن کی انگلیوں کے نشانات کا ریکارڈ کہیں بھی نہیں ہے۔ ہمیں اس کی لاش بھی نہیں ملی پھر ہم کیسے جان سکتے تھے۔ بالکل سیدھی سی بات ہے، اگلا سوال۔''

''ہیلن ہار پر کی دوست نے اپنی رپورٹ میں بتایا تھا کہ وہ سڑک کے سرے کی جانب دوڑتی ہوئی دیکھی گئی لیکن وہاں اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور نہ ہی وہاں دلدل کے کنارے کوئی موجود تھا؟''

ویزا نے جواب دیا۔ ''یہ ایک فریب ہے۔ یقیناً شکاری کتوں نے سڑک کے کنارے اس کا سراغ لگایا تھا لیکن مت بھولو کہ وہ اس کا علاقہ ہے اور وہ کسی وقت وہاں گئی ہوگی۔ ہم نے دلدل میں بھی اس کا کھوج لگایا لیکن وہاں بھی کچھ نہیں ملا۔ اس کے علاوہ کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''چیف کا خطاب۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں الجھن ہے۔ کچھ اخبارات نے تمہیں آفیسر ویزا اور کچھ نے چیف لکھا ہے۔ اصل کہانی کیا ہے؟''

''اچھا سوال ہے۔ اس وقت میں باضابطہ طور پر چیف نہیں بنا تھا۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو کیونکہ اس وقت تم بہت چھوٹے تھے۔ مجھ سے پہلے نیلسن چیف تھا۔ اس نے طویل عرصہ تک یہ ذمے داری نبھائی لیکن ملازمت کے آخری سال میں وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی طویل خدمات کے پیش نظر کوئی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے جانے کے لیے کہے۔ سب اس کے ریٹائر ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ البتہ کام چلانے کے لیے ہم چار افسروں کو باری باری ایک ماہ کے لیے قائم مقام چیف کی ذمے داری سونپی گئی۔ میری باری نومبر میں آئی لیکن ہیلن کی گمشدگی کا واقعہ اکتوبر کے آخری دن پیش آیا۔ اس وقت جو انچارج تھا، مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا۔ وہ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے باوجود بھی اسے لاپتا فرد کا کیس تسلیم نہیں کرسکا کیونکہ میں اس کا تفتیشی افسر تھا۔ اس لیے میں نے یہ کیس لے لیا۔ اگلے چند ہفتوں میں کافی مشہور ہوگیا۔ باوجود اس کے کہ میں اس کیس کو حل نہ کرسکا لیکن میں اس سے جڑا رہا۔ چند ماہ بعد نیلسن کی موت واقع ہوگئی اور مجھے اس کی جگہ چیف مقرر کر دیا گیا۔ لیکن ہر کوئی مجھے ہار پر والے واقعے سے ہی چیف سمجھتا ہے۔''

''اگلا سوال۔'' میں نے کہا۔ ''اخباری اطلاعات کے مطابق تم جائے وقوعہ پر ایک یا دو منٹ میں ہی پہنچ گئے تھے۔ تم نے اتنی تیزی کس طرح دکھائی؟''

''میں گشت پر تھا اور اسی علاقے میں پہلے سے موجود تھا۔''

اس وقت کے اخبارات میں اس کیس کے بارے میں چار بنیادی تصورات کا ذکر کیا گیا تھا چنانچہ میں نے سوچا کہ ہر ایک کے موافق اور مخالف دلائل پر بھی بات کرلوں۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اسے گھر میں قتل کیا گیا؟''

وہ بولا۔ ''ایسا لگتا نہیں ہے کیونکہ وہاں ہمیں کسی جدوجہد کے آثار نظر نہیں آئے۔ صرف ایک الٹی ہوئی میز ہی دیکھی۔ کوئی آلۂ قتل نہیں ملا۔ بس تھوڑا سا خون اور دیوار پر ہاتھ کا نشان۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اس کی لاش کہاں گئی۔ قاتل نے لاش کو وہاں سے لے جانے کا خطرہ کیوں مول لیا ہوگا۔ وہ ایک چھوٹا سا محلہ ہے

اور یہاں کوئی بھی قاتل نظروں میں آسکتا ہے۔ ہم نے اس کے امکانات پر غور کیا تھا لیکن ایسا لگتا نہیں ہے۔''

''کیا اسے اغوا کیا ہوگا؟''

''قتل کے مقابلے میں اس کا امکان زیادہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور نہ ہی تاوان کی ادائیگی کے لیے کوئی خط آیا۔ گو کہ وہ پھر نظر نہیں آئی لیکن ایسی کوئی حقیقی شہادت نہیں ملتی جو اس جانب اشارہ کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی۔''

''سوال نمبر تین۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے خود ہی غائب ہوجانے کی منصوبہ بندی کی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے کسی پرانے بوائے فرینڈ کے ساتھ چلی گئی ہو؟''

''ایسا بہت سے لوگ سوچتے ہیں۔'' چیف نے کہا۔ ''اگر وہ ایسا کرتی تو اسے کسی مدد کی ضرورت پڑتی۔ اس کی کار ڈرائیو وے میں کھڑی تھی اور قرب و جوار میں کوئی سواری دستیاب نہیں تھی۔ ہم نے ٹیکسی سروس کو بھی چیک کیا۔ اس نام اور حلیے کی کسی عورت نے انہیں فون نہیں کیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیدل اتنی دور چلی گئی ہو کہ ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکیں۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی پرانا بوائے فرینڈ ہو لیکن جب ہم نے اس کے دوستوں سے یہاں اور نیویارک میں بات کی تو کوئی مشتبہ نام سامنے نہیں آیا۔''

''ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ دوبارہ تحقیقاتی رپورٹر کی ولولہ انگیز زندگی کی طرف لوٹ جانا چاہتی تھی، کیا یہ ممکن ہے؟''

ویزا نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا جو اتنا شدید تھا کہ مجھے لگا، وہ موقع پر ہی مر جائے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ٹھیک تو ہے تو وہ بولا۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔ میں مر رہا ہوں لیکن ایک منٹ میں بات کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔'' میں نے اسے پانی پلایا تو وہ کچھ پُرسکون نظر آنے لگا۔

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم کیا بات کررہے تھے؟ اوہ ہاں، ایک پُرجوش اور ہنگامہ خیز زندگی۔ ہم نے ملک کے تمام اخبارات چیک کیے۔ ان سے پوچھا کہ کوئی ان کے پاس ملازمت کے سلسلے میں تو نہیں آیا لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ درحقیقت تحقیقاتی رپورٹر نہیں تھی بلکہ مالیاتی صفحے پر کام کرتی تھی۔ اس نے ایک کمپنی کے مالی امور کی تحقیقات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے در پردہ معاملات طے کیے اور ایک اسٹوری لکھ دی۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غلط جگہ پر بھونک رہی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی اسٹوری غلط تھی یا وہ ان لوگوں سے ڈر کر بھاگ آئی جن کے خلاف نہیں لڑ سکتی تھی۔ اس کمپنی نے اخبار پر مقدمہ کرنے کی دھمکی دی۔ اس کے شوہر کا کہنا ہے کہ اس پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا لیکن اس واقعے کے بعد اس کا دل کھٹا ہوگیا، وہ یہاں چلے آئے اور ہیلن نے رئیل اسٹیٹ کا کام شروع کردیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اخباری دنیا میں واپس جانا چاہتی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ کمپنی اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آسکتی تھی؟''

''مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ

جیت چکے تھے اور انہوں نے اس کا منہ بند کر دیا تھا پھر وہ یہاں آنے کا خطرہ کیوں مول لیتے۔''

''آخری بات۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ بیماری کے مسائل تھے۔ شاید اسے بھول جانے کا مرض تھا۔''

''بہت سے لوگ اس سے متفق ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ سے وہاں کے رہائشی بھی آرام محسوس کرتے ہوں گے کہ یہ کوئی قابل نفرت چیز نہیں ہے۔''

''کیا تمہارا بھی کوئی نظریہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تھوڑی دیر کے لیے ثبوت کو بھول جاؤ۔ تم ذاتی طور پر کیا سمجھتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا تمہارے خیال میں وہ زندہ ہے۔ اگر نہیں تو اس کی لاش کہاں گئی؟''

اس بوڑھے چیف نے مجھے حیران کر دیا۔ لگتا تھا کہ وہ زندگی کی طرف واپس آرہا ہے۔ وہ وہیل چیئر میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ اس کا صرف ایک ہی منطقی جواب ہے۔''

میں بمشکل تمام اپنے جوش پر قابو پا سکا۔ کیا یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے بلایا تھا۔ کیا اس چالیس سال پرانے معمے کا حل سامنے آنے والا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نہیں بتا سکتا کیونکہ میں جو جانتا ہوں، اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ جواب اپنے ساتھ لے کر قبر میں چلا جاؤں گا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت قریب آگیا ہے۔''

''کم از کم اتنا تو بتا سکتے ہو کہ اگر وہ زندہ ہے تو کہاں ہے؟''

''ہاں، یہ بتانا آسان ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ ہینکس پونڈ کی تہ میں ہے جہاں وہ چالیس سال سے ہے۔''

میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تو خود تالاب کی تلاشی کا حکم دیا تھا۔ وہ اتنا بڑا بھی نہیں ہے۔''

اس نے صرف ہنکارا بھرا پھر بولا۔ ''بس مجھے یہی کہنا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک اور سوال۔'' میں پھٹ پڑا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

پہلے وہ کچھ بوکھلایا۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ سمجھ نہیں سکا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں پھر وہ کرسی میں دھنستے ہوئے بولا۔ ''کیا؟ کیا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو کہ میں ہیلن کی گمشدگی میں ملوث ہوں۔''

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اس کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ الزام اسے مار ڈالے گا یا وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس کے علاوہ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرے۔ اس کے بجائے اس نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

''چالیس سال سے میں ہیلن ہارپر کی گمشدگی کے بارے میں مختلف قسم کی کہانیاں سن رہا ہوں لیکن یہ پہلی بار ہوا ہے کہ مجھ پر اس واقعے میں ملوث ہونے کا الزام لگا دیا گیا۔ یہ واقعی بڑی دلچسپ بات ہے۔''

''تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو جبکہ سب باتیں تمہارے اوپر فٹ بیٹھتی ہیں۔''

اس کے قہقہے رک گئے اور اس نے ایک بار پھر بری طرح کھانسنا شروع کر دیا۔ جب اس کی کھانسی رکی تو وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تم سے اپنے پیشہ ورانہ تجسس کی بنیاد پر پوچھ رہا ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟''

''میرے پاس تمہارے کیوں، کا جواب نہیں ہے لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ تم نے یہ کیسے کیا۔''

''ذرا میں بھی تو سنوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک یہی سننے کے لیے زندہ تھا۔ بتاؤ، یہ میں نے کیسے کیا؟''

میں نے کہا۔ ''جہاں تک میرا ذہن کام کر رہا ہے۔ تم نے صبح کے وقت ہارپر ہاؤس فون کیا۔ ہیلن یا کسی اور نے فون ریسیو کیا اور تمہارا نمبر لکھ لیا۔ اس کی وضاحت کرسی پر لکھے ہوئے فون نمبر سے ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ اس نے تمہیں فون کرنے کے لیے یہ نمبر لکھا ہوگا لیکن اس کا کوئی اور مقصد تھا۔ تم نے اسے فون پر کوئی دھمکی دی تھی۔ جب اس نے تمہیں جواب میں فون نہیں کیا تو تم خود گاڑی چلاتے ہوئے اس کے گھر پہنچ گئے، جب تم نے ڈرائیو وے میں ملی کی کار دیکھی تو واپس سڑک پر آگئے پھر تم نے دیکھا کہ ملی کہیں جا رہی تھی۔ تم واپس ڈرائیو پر آگئے۔ ہیلن ہارپر نے تمہاری کار دیکھی، وہ کسی وجہ سے تم سے بچنا چاہ رہی تھی جو مجھے نہیں معلوم۔ چنانچہ اس نے دلدل کی طرف جانے کی کوشش کی لیکن تم نے اسے پکڑ لیا اور اسے باتیں کرنے کے لیے گھر واپس جانے پر قائل کرنے لگے۔ تم نے اسے ہتھکڑیاں پہنائیں اور کہا کہ وہ زیر حراست ہے۔ شاید اسی کشمکش میں اس کا ہاتھ کٹ گیا۔ دیوار پر وہ خون آلود ہاتھ کے نشان سے یہی ظاہر ہوتا ہے پھر تم اسے گھر سے باہر لے آئے۔ پولیس اسٹیشن لے جانے

کے بجائے تم نے اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش کار کی ڈکی میں بند کر دی پھر تم منشیات رکھنے کی غرض سے دوبارہ اس کے گھر میں گئے۔ تم اسے صرف مارنا نہیں بلکہ اس کی شہرت بھی داغ دار کرنا چاہتے تھے۔ تم نے میزالٹ کر اس کے نیچے کوئی چیز رکھی پھر تمہیں وہاں سے بدحواس ہو کر نکلنا پڑا۔ غالباً ملی واپس آ رہی تھی یا پھر تم نے اس سات سالہ لڑکی کو دیکھ لیا تھا جو تمہاری کار پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ تم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تم وہاں سے صرف ایک منٹ کے فاصلے پر تھے کہ ہیلن کی گمشدگی کی اطلاع آ گئی اور تم بڑی تیزی کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

''بہت دلچسپ کہانی ہے۔'' چیف بولا۔ ''گو کہ اس میں کئی جھول ہیں۔''

''مثلاً؟'' میں نے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ لاش کا کیا ہوا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی نے میری کار میں اس کی کوئی علامت نہ دیکھی ہو؟ اس کال کے بارے میں کیا کہو گے جو اگلے روز ایک عینی شاہد نے کی تھی جس نے اسے تالاب پر دیکھا تھا؟''

''یہی اس کہانی کا چالاک ترین حصہ ہے۔ اگلے روز تم نے ایکٹنگ چیف کا چارج سنبھال لیا۔ تم تحقیقاتی افسر بھی تھے۔ اس کے بعد اپنے ہی باس بن گئے۔ کوئی بھی تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں چیک نہیں کر سکتا تھا۔ تمہارے پاس جھوٹی شہادتیں بنانے کا بھی موقع تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ ایسی کوئی گمنام کال موصول نہیں ہوئی اور تم نے اسے بہانہ بنا کر ہینکس پونڈ کو چیک کرنے کا حکم دے دیا۔ جب تلاش کرنے والوں کو وہاں کچھ نہیں ملا تو تم نے بڑے محفوظ طریقے سے ہیلن کی لاش تالاب کی تہ میں ڈال دی۔ اس کے بعد کسی نے اس تالاب کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ابھی تم نے مجھے خود بتایا کہ تمہارے خیال میں اس کی لاش کہاں ہو سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم یہاں بستر مرگ پر پڑے ہوئے شخص کا اعترافی بیان لینے نہیں آئے تھے اور نہ ہی ایسا ہو رہا ہے۔ چلو مان لیا کہ جو کچھ تم نے کہا اس کا کچھ حصہ صحیح ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں ایسا کیوں کروں گا؟ تم مجھ پر شبہ کیوں کر رہے ہو؟''

''یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ مجھ سے بہت پہلے کی بات ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مسز ہار پر سے تمہارا کیا تعلق تھا۔ گو کہ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ شاید تمہارا اس کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا؟''

''ہونہہ۔'' وہ غرایا۔ ''یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔ اگر تم مجھے جانتے تو کبھی ایسی بات نہ کہتے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اپنے کیریکٹر کی گواہی لا سکوں۔ تمہیں میرے الفاظ پر بھروسا کرنا ہوگا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں فرشتہ نہیں ہوں لیکن کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ فلرٹ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اسے بھی مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟''

''میں اندازہ لگا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ تم کچھ چھپا رہے تھے اور تمہیں شبہ ہوا ہو کہ نیویارک سے آنے والی وہ تحقیقاتی رپورٹر تمہاری تاک میں ہے۔ ممکن ہے کہ تم کسی بدعنوانی میں ملوث رہے ہو جیسے چوری شدہ مال کی خرید و فروخت۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک پولیس والے کے لیے یہ بہت آسان ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ میں نے تم پر شک کیوں کیا تو اس کا جواب تم خود دے چکے ہو۔ یاد کرو اوکیم ریزر؟''

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا اور وہ ایک بار پھر کرسی میں دھنس گیا پھر اس نے تقریر شروع کر دی۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ بڑے شہر سے آئی ہوئی ایک اعلیٰ پائے کی رپورٹر ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ صرف مالی معاملات پر لکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے کبھی مجھ پر اس طرح کے گھٹیا الزامات لگائے تو تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔ یہی بات میں نے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ کرسی گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا اور نرس نے مجھے بتایا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پیچھے لگنے کی کوئی وجہ باقی رہی تھی کیونکہ اسی رات چیف بین ویزا کوما میں چلا گیا اور تین دن بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ہیلن ہارپر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ چیف نے مجھے جو کچھ بتایا، میں نے اس پر بھی یقین نہیں کیا۔ اس سال مجھے ایک اور دلچسپ کام ملا ہے۔ ان گرمیوں میں شہر کو ریکارڈ خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے ہینکس پونڈ تقریباً خشک ہو گیا۔ اب مجھے اس کی تہ میں سے ملے ہوئے عورت کے ڈھانچے پر کہانی لکھنی ہے۔ کون جانتا تھا کہ یہ معما اس انداز میں حل ہوگا۔

☆☆☆

گڑھا

عکس فاطمہ

اندھیروں سے بوجھل ایک تاریک رات کی بات... اس کی سحر میں نصف شب حائل تھی... وہ سحر جو کسی کے لیے صبحِ امید تھی اور کسی کے لیے صبحِ ملال... مغرب کی سحر آفریں راتوں میں رونما ہونے والے حادثات کی کہانی جس کے کردار التفات و عداوت میں بیک وقت ساتھ ساتھ چل رہے تھے... کہیں چنگاری تھی تو کہیں شعلہ خوار...

اپنی ہی ذات میں پوشیدہ پہلوؤں کو عیاں کردینے والا معاملہ بیان

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل چار مرتبہ بجی تو وہ چونک گیا۔ یہ تیز اور باریک آواز خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ پوپ کاؤنٹی شیرف ڈین پیرش بغیر اِستری کی وردی پہنے ہوئے کھڑکی سے جھیل منواسکا کا نظارہ کررہا تھا۔ اس آواز نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا اوراس کے دل میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بج کر پندرہ منٹ پر آنے والی اس فون کال کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا۔ یہ کسی کی موت کی اطلاع

تھی۔ عام طور پر اس کاؤنٹی میں لوگ بڑھاپے یا بیماری کے سبب مرتے تھے اور ان کی اطلاع پولیس اسٹیشن کو دی جاتی تھی جہاں اس کے ڈپٹی موجود ہوتے تھے لیکن یہ معاملہ کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ صبح سویرے اس کے گھر فون آنے کا مطلب تھا کہ یہ غیر طبعی اور بے وقت موت ہے۔ ممکن ہے کہ رات میں تیز رفتاری سے کار چلاتے ہوئے کسی نوجوان کو حادثہ پیش آگیا ہو یا پھر چلانے والا نشے میں دھت ہو۔ کوئی ٹریکٹر الٹ گیا یا غلے کے گودام میں دم گھٹنے سے موت واقع ہوئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حادثاتی موت ہو جو جھیل میں ڈوبنے یا شکاری کی گولی لگنے سے واقع ہوسکتی ہے۔

ایک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس کا دل انجانے اندیشوں سے بھر گیا۔ وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھا اور ریسیور اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''میں شیرف بول رہا ہوں۔ ہینک کیا اطلاع ہے؟''

ہینک بورڈے اس کا ڈپٹی تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ پولیس والوں کے لیے قانون کی عمل داری آمدنی کا ذریعہ ہو لیکن ہینک کے لیے یہ اس کی روح کا حصہ تھی۔ اس نے میری کی بیماری میں ڈین کا بہت ساتھ دیا تھا۔ شیرف کی بیوی طویل عرصے سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھی۔ جن دنوں ڈین اس کی بیماری کی وجہ سے کام پر آنے کے قابل نہ تھا تو ہینک نے اس کا سارا کام سنبھال رکھا تھا۔

''وان رینارڈ نے ابھی ابھی مجھے فون کر کے بتایا ہے کہ اسے نینسی کی لاش آج صبح اس کے گھر کے پاس ندی سے ملی ہے جو تمہاری زمین پر واقع ہے۔''

رینارڈ کے گھر اور ڈین یا اس کے رشتے داروں کے تین مکانات کے درمیان چار سو فٹ چوڑا جنگل پیرش وڈز کہلاتا تھا۔ یہ جنگل ایک ڈھلوان سطح زمین پر واقع تھا جس میں سے ایک پہاڑی نالا گزرتا ہوا جھیل منواسکا میں جا گرتا تھا۔ بچپن سے ہی وہ اکثر و بیشتر اس جنگل کی طرف جایا کرتا تھا اور ندی کے ساتھ ساتھ آدھ میل جا کر واپس ہو جاتا لیکن اس نالے پر نینسی کی لاش کا ملنا اس کے لیے باعثِ تعجب تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ مداخلت بے جا کی مرتکب ہوئی ہو۔ وہ غیر قانونی طور پر وہاں چلی آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک خود غرضانہ سوچ ہے لیکن وہ اپنے احساسات کی نفی نہیں کر سکتا تھا۔

''میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' ڈین نے کہا۔ ''ایرنی کو تصویریں لینے کے لیے بلاؤ اور جائے وقوعہ کا معائنہ کرلو۔ ٹریور کو بھی فون کرو۔ ہمیں اس کی بھی ضرورت ہوگی۔''

ڈین کا یہ دوسرا ڈپٹی ٹریور اپنے ساتھی ہینک کی طرح پُرجوش نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ گلین وڈ کے میئر والٹر گریفن کا بیٹا تھا جس نے عہدہ سنبھالنے کے نو سال بعد اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے سٹی کونسل کو آمادہ کرلیا کہ وہ اس کے بیس سالہ بیٹے کو پوپ کاؤنٹی میں ڈپٹی کی ملازمت دے دے۔ لیکن ایک ہی مہینے میں ٹریور کے نیم دلانہ رویے سے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس ملازمت کو پسند نہیں کرتا۔

''میں کوشش کروں گا کہ وہ وہاں موجود ہو۔'' ہینک نے کہا۔

ڈین نے ٹیلی فون رکھ دیا اور دوبارہ اس کھڑکی پر چلا گیا جہاں وہ فون سننے سے پہلے کھڑا ہوا تھا۔ یہ خبر سننے کے باوجود وہ گھر سے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی اور ساحل پر آنے والی موجوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ مشرق سے آنے والی ہوا ہے۔'' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کمرے میں اس کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس کی بیوی کو مرے ہوئے صرف چار ہفتے ہوئے تھے اور اس خالی پن کو اس کی اپنی آواز ہی دور کرتی تھی لیکن یہ سکون اتنی دیر ہی قائم رہتا جب تک کہ اس کے لفظوں کی گونج فضا میں موجود رہتی۔ اس کے بعد خالی کمرے میں وہی بے جان خاموشی چھا جاتی۔

''مشرق سے ہوا چلنے کا مطلب ہے کہ موسم تبدیل ہو رہا ہے۔''

میری نے کبھی ایسے تبصروں پر ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے اپنی پینتیس سالہ ازدواجی زندگی میں یہ جملہ کئی مرتبہ سنا تھا۔ وہ اخبار پڑھتی رہی اور یہ سلسلہ اس کی وفات سے چند ہفتے قبل تک جاری رہا۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں دنیا میں ہونے والے واقعات سے اس کی دلچسپی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ اس کا زیادہ وقت سونے یا گہری سانس لینے میں گزرنے لگا۔

بعض اوقات اسے محسوس ہوتا کہ وہ بھی اسی تکلیف اور کرب سے گزر رہا ہے اور وہ دوسرے لوگوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ یہ غم اتنا مضمحل کر دینے والا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے جیسا کہ کچھ لوگوں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا لیکن سوگ منانے کا عرصہ کتنا ہونا چاہیے۔ اس عورت کا غم منانے کے لیے چار ہفتے تو کم تھے جس کے ساتھ اس نے زندگی کے پینتیس برس گزارے۔

اس نے پلٹ کر ڈائننگ روم کی طرف دیکھا۔ جب

میری زندہ تھی تو میز کے گرد رکھی کرسیاں اتنی خالی خالی نظر نہ آتی تھیں۔ اتنی کھوکھلی جیسے اس کی زندگی میں ہر چیز خالی ہو گئی تھی۔ گھر، کار، دن، راتیں وغیرہ وغیرہ۔

ڈین نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اسے مشرق سے آنے والی ہوا پسند نہیں تھی۔ گرم ہوا جنوب اور ٹھنڈی ہوائیں شمال اور شمال مغرب سے آتی تھیں جبکہ مشرق سے آنے والی ہوا صرف مشکلات لے کر آتی تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے یہ ہوا بہتر تھی۔ اگر رات میں ہوا نہ چلے تو ڈین سو نہیں سکتا تھا اور خاموشی میں وہ گھر آسیب زدہ معلوم ہوتا جیسے دنیا میں اس کے سوا کسی نفس کا وجود نہیں ہے۔ یہ خاموشی اس کے دل اور دماغ میں گونجتی رہتی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی سے ہٹ گیا۔ کافی کا کپ سنک میں رکھ کر عقبی دروازہ بند کیا اور اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نینسی رینارڈ کا بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔ موسم ابر آلود تھا اور فضا میں خنکی چھائی ہوئی تھی۔ ڈین نے مشرق کی سمت میں پیرش روڈ کی جانب چلنا شروع کیا۔ اس کے گھر اور جنگل کے بیچ میں اس کے بھائی رے کا کیبن پڑتا تھا جو اس کے دادا نے چرچ سے ملنے والے کاٹھ کباڑ سے بنایا تھا۔ گو کہ رے خود بھی کارپینٹر تھا اور بیس میل دور بینسن میں رہائش پذیر تھا لیکن اس نے کیبن کی دیکھ بھال اور اسے بہتر بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گو کہ یہ کیبن ڈین کے گھر کی طرح سرد موسم سے بچاؤ کے لیے ناکافی تھا اور نہ ہی وہاں ٹیلی فون کی سہولت تھی پھر بھی رے ممکنہ حد تک سال کا بیشتر وقت یہیں گزارتا۔

ڈین نے چمنی سے دھواں اٹھتا دیکھا پھر اس کی نظر رے پر گئی جو خاکی جیکٹ اور خاکی پتلون میں ملبوس جنگل کے سرے پر ایک چھوٹی کلہاڑی سے لکڑیاں چیر رہا تھا۔

''صبح بخیر رے۔''

رے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی ڈین کی طرح نیلی تھیں لیکن اس کے علاوہ دونوں بھائیوں میں بہت کم مشابہت تھی۔ رے کے چہرے پر گھنی مونچھیں اور کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی جبکہ ڈین ہمیشہ کلین شیو رہتا تھا۔ رے اپنے بھائی سے پانچ سال چھوٹا اور قد میں تین انچ زیادہ تھا جبکہ ڈین فربہ اندام ہونے کی وجہ سے سست خرام تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دونوں کے کام کی نوعیت مختلف تھی۔

رے کے چہرے پر ایک نیم دلانہ مسکراہٹ اُبھری اور اس نے کہا۔ ''ہوا مشرق سے چل رہی ہے۔''

ڈین نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وان رینارڈ کو آج صبح نینسی کی لاش پہاڑی نالے پر ملی ہے۔''

رے کی آنکھیں پتھرا گئیں اور اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے اپنا ہیٹ سر سے اتارا اور چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو پھر اس کی نظریں دوبارہ ڈین پر آ گئیں۔

''کسی نے غلطی سے رینارڈ کے بجائے اسے قتل کر دیا۔ اگر اس نکمے وکیل کو مار دیا جاتا تو یہ کوئی بُری بات نہ ہوتی۔''

''لیکن ابھی تک ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے۔ یہ کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''شاید لیکن میں کبھی بھی وان رینارڈ کی کہی ہوئی بات پر بھروسا نہیں کروں گا۔ اس نے کبھی نینسی کی تعریف نہیں کی حالانکہ وہ بہت خاص تھی۔'' رے نے نظریں جھکا لیں اور اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے لمبے سانس لینے لگا۔

ڈین اپنے بھائی کے اس شدید ردِعمل پر حیران تھا۔ وہ عام طور پر اپنی کلہاڑی کی طرح بے حس تھا لیکن لگتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا گو کہ میری کی تدفین کے موقع پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے لیکن ماں کے مرنے پر بھی رے کی جذباتی کیفیت ایسی نہ تھی۔ جب اس نے دوبارہ نظریں اٹھا کر ڈین کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھ سے آنسو غائب ہو چکے تھے۔

''وان کے پاس سب کچھ ہے لیکن وہ اب بھی عورتوں کا پیچھا کرتا ہے۔'' رے نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نینسی کے مرنے پر وہ خوش ہو رہا ہوگا۔ وہ بدمعاش کچھ بھی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

ڈین نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہمیں اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔''

''میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ایک کام آ گیا ہے۔'' رے نے کہا۔ ''میں صرف تمہاری گاڑی کو دھکا لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''میں تمہاری مدد کا خیر مقدم کروں گا۔'' ڈین نے رے کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''پھر ملیں گے۔'' پھر ایک خیال کے تحت اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر رے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آڈرے بھی تمہارے ساتھ آئی ہے؟''

''نہیں، وہ قصبے میں ہی ہے۔ سال کے حصے میں یہ

موسم اس کے لیے بہت سرد ہے۔''

ڈین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ گزشتہ شب میں نے یہاں کچھ آوازیں سنی تھیں۔''

رے نے اپنے کیبن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً ریڈیو کی آواز ہوگی۔ میں نے تو آڈرے کو کافی دنوں سے نہیں دیکھا۔ سب ٹھیک تو ہے؟''

رائے سے رخصت ہو کر ڈین آگے بڑھا اور پیرش وڈز میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک کچے راستے کا انتخاب کیا۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر وہ بچپن میں متعدد بار آچکا تھا۔ آگے چل کر اس نے مشرق کا رخ کیا جہاں سے یہ راستہ جھیل اور ندی کے سرے کی جانب مڑ جاتا تھا۔ جب وہ ان دونوں کے سنگم پر پہنچا تو اسے بگلوں کی جوڑی نظر آئی جو جھیل کی سطح پر تیر رہے تھے۔ ندی کے سرے پر ایک لکڑی کا پل تھا جو مخالف سمت میں اس راستے سے ملا ہوا تھا جو رینالڈ کے گھر کی طرف جاتا تھا لیکن ڈین نے پل پار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نینسی کی لاش اسے کہاں ملے گی۔

رینالڈ کا گھر ندی کے آخری موڑ سے صرف چالیس فٹ کے فاصلے پر مشرق کی جانب تھا۔ جس جگہ ندی جھیل میں گرتی تھی وہاں دس فٹ اونچا پشتہ بنا ہوا تھا۔ یہ جھیل سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ ڈین نے درختوں کے نیچے اگے ہوئے چھوٹے پودوں کے درمیان سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ گرے ہوئے درختوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتا ہوا آگے بڑھا۔ ندی کے کم گہرے موڑ کے قریب اس کی نظر ایک گھاس کے قطعے پر گئی جہاں جگہ جگہ سے گھاس غائب تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کسی جانور نے اپنے نوکدار پنجے مارے تھے۔

ڈین نے ایک گہری سانس لی اور بمشکل تمام ایک تنگ جھنڈ سے گزرنے لگا پھر اسے ندی کی تہ میں ریت کے پاس نینسی کی لاش نظر آئی جس کا چہرہ کھڑے پانی کی جانب جھکا ہوا تھا۔ اس کے بال گیلے اور الجھے ہوئے تھے لیکن ڈین کو اب بھی اس کے بالوں کا رنگ یاد تھا جب وہ اپنی جوانی میں اس سے ڈیٹنگ کر رہی تھی لیکن اب وہ سرخی مائل سنہری ہو گئے تھے۔ اس کا لباس بھی گیلا ہو گیا تھا لیکن اس پر کیچڑ نہیں لگی ہوئی تھی۔ البتہ اس کے داہنے پاؤں پر ایڑی سے پنڈلی تک گھاس اور کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ بائیں پاؤں پر بھی گھاس کے ٹکڑے نظر آرہے تھے لیکن اس پر کیچڑ نہیں تھی۔

ڈین نے جھک کر اس کا سر زمین سے اوپر اٹھایا۔ لاش کی گردن اکڑنا شروع ہو گئی تھی جو لاش کے اکڑنے کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس طرح ڈین کو یہ معلوم ہو گیا کہ نینسی کو مرے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کا رنگ پہلے کی طرح آسمانی ہی تھا لیکن ان میں زندگی کی حرارت مفقود ہو چکی تھی۔ اس کے سر کے بائیں جانب کنپٹی کے قریب کسی نوکدار پتھر کی ضرب سے بیس بال کی گیند کے برابر ایک گڑھا بن گیا تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ اس کی کھوپڑی میں فریکچر ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کی کھال ایک ستارے کی شکل میں کھل گئی تھی۔ کئی گھنٹے پانی میں رہنے کی وجہ سے زخم کے قریب کی کھال خاکستری رنگ کی ہو گئی تھی اور زخم سے بہنے والا خون ندی کے پانی نے دھو دیا تھا۔

ڈین نے دوبارہ اس کا سر پانی میں رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی نگاہیں جھیل پر جمی ہوئی تھیں، اس کا جی بری طرح متلا رہا تھا۔ اس نے اپنی بیس سالہ ملازمت میں کئی لاشیں دیکھی تھیں لیکن اب اس کے لیے یہ سب برداشت کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ پشتے کی بلندی پر نقل و حرکت دیکھ کر اس کا ہاتھ فوراً اپنی گن پر گیا۔ وان رینارڈ پشتے کے کنارے اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بیک وقت دیکھا۔ وان نے گہری سانس لی اور اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''میں ابھی......''

''وان! مجھے نینسی کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔''

رینارڈ نے اپنی پتلون کے گھٹنوں پر سے مٹی جھاڑنے کی کوشش کی پھر اس نے زمین پر دیکھا اور ڈین سے بولا۔ ''گھاس ابھی تک گیلی ہے۔ وہ ضرور کنارے پر سے پھسلی ہوگی......''

وہ کہتے کہتے رک گیا اور ڈین پر نظریں جما دیں جیسے اس کے خیالات کا تسلسل رک گیا ہو۔ اس کا چہرہ گول تھا اور اس کی عمر ستاون برس تھی۔ ڈین بھی تقریباً اس کا ہم عمر ہی تھا لیکن دیکھنے میں وان اس سے دس برس بڑا لگتا تھا۔

''میں تمہاری مدد کا شکریہ ادا کرتا ہوں وان لیکن تمہیں چاہیے کہ میرے آدمیوں کو ثبوت تلاش کرنے دو۔''

رینارڈ کی آنکھوں میں سختی اتر آئی اور وہ لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ میں نے اسے مارا ہے؟''

''میں نے ایسا نہیں کہا لیکن فی الوقت تم ایک ممکنہ کرائم سین کو پیروں تلے روند رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں سے ہٹ کر واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔''

''تم مجھ پر اس کے قتل کا الزام لگانے کی جرأت نہ کرنا شیرف۔ یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

''خاموش ہوجاؤ وان۔ میں نے تم پر کوئی الزام نہیں لگایا۔'' ڈین نے قطعہ زمین کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''رکو، میں وہیں آرہا ہوں۔''

ڈین نے پانی میں قدم رکھا اور ابھری ہوئی چٹانوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا پھر اس نے ایک کم گہرے مقام تک تیزی سے حرکت کی جہاں سے رینارڈ کے احاطے کی طرف راستہ جاتا تھا۔ وان ابھی تک نالے کے کنارے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے کی گھاس چپٹی ہوچکی تھی اور ایسے نشانات نظر آنے کا امکان ختم ہوگیا تھا جن سے کچھ معلوم ہوسکتا۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں ڈین نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ۔''

''جب میری مرضی ہوگی تو چلا جاؤں گا۔''

چند لمحے پہلے ڈین کو اس سے ہمدردی محسوس ہورہی تھی گوکہ اس نے کبھی اسے پسند نہیں کیا۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں۔ وہ عورتوں کا رسیا تھا۔ اس کے میئر گریفن جیسے بدعنوان لوگوں سے قریبی تعلقات تھے۔ ایک سے زائد مرتبہ پڑوسیوں نے ڈین کو فون کر کے بتایا کہ اس کے گھر سے لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔

ڈین نے رینارڈ کے احاطے کے پار دیکھا۔ ہینک اور ٹریور لان عبور کر کے اس کی طرف آرہے تھے۔ میئر کی نظریں رینارڈ پر تھیں۔ ''ایرک بھی آرہا ہے۔'' اس نے ڈین سے کہا۔ ''تم دونوں اندر کیوں نہیں چلے جاتے۔ ٹریور اور میں یہاں سنبھال لیں گے۔''

''وان نے یہ جگہ چھوڑنے سے انکار کردیا ہے اور وہ وقوعہ کے بارے میں کسی بھی شہادت ملنے کے امکان کو بھی ختم کرچکا ہے۔''

رینارڈ نے ان کی طرف چلنا شروع کیا۔ ''یہ سچ نہیں ہے۔'' اس نے ہینک کی طرف دیکھا اور اس کی آواز میں قدرے نرمی آگئی۔ ''ہیلو ہینک، میں صرف یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ نینسی کس طرح گری۔ وہ ننگے پیر ہے اور میرا خیال ہے کہ گیلی گھاس پر اس کا پاؤں پھسل گیا ہوگا اور شاید اس کا سر چٹان سے جا ٹکرایا۔ ابھی میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا کہ شیرف آگیا اور اس نے مجھ پر قتل کا الزام عائد کردیا۔''

رینارڈ نے ڈین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب جانتے ہیں کہ تم حالیہ دنوں میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام شواہد ملنے سے پہلے تم میرے ساتھ ایک مجرم جیسا سلوک کرو۔ تمہیں ہینک سے کچھ سیکھنا چاہیے۔ تمہاری غیر موجودگی میں اس نے غیر معمولی طریقے سے شیرف کے فرائض انجام دیے تھے۔''

ہینک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہوگیا وان۔ اب میں نہیں بلکہ ڈین شیرف ہے۔ میں اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہوں اور تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ تم اندر چلے جاؤ۔ چند منٹوں بعد ہم تم سے کچھ سوالات کریں گے۔''

رینارڈ نے فرمانبرداری میں اپنے ہاتھ اٹھائے اور بولا۔ ''تمہاری طرح میں بھی سچ جاننا چاہتا ہوں۔ میں وکیل ہوں اور صرف یہ جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ حقیقت معلوم کرنے کے لیے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر جانے کے لیے مڑا اور ڈین کے پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''بشرطیکہ جھوٹے الزامات نہ لگائے جائیں۔''

ڈین نے اس کے تبصرے کو اہمیت نہیں دی اور اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب وہ دروازہ بند کر کے گھر میں چلا گیا تو ڈین نے ہینک کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اس کی بیوی کو مرے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں لیکن لگتا ہے کہ اسے کچھ زیادہ غم نہیں ہے۔''

ہینک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہ ایک وکیل ہے اور اس کے سینے میں دل نہیں۔ ممکن ہے کہ میں اندر جاؤں اور اس سے سوالات کروں۔''

ڈین کو محسوس ہوا کہ ٹریور گریفن اس کے احکامات کی بجا آوری میں جھجک رہا ہے۔ اس نے تائید کے لیے ہینک کی طرف دیکھا تو وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''پریشان مت ہو شیرف۔ تم اب بھی باس ہو اور ہم انتظار کررہے ہیں کہ کب تم پوری طرح اپنی ذمے داری نبھانے واپس آرہے ہو۔''

''میں جانتا ہوں ہینک۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے میری غیر موجودگی میں بڑی خوبی سے اپنی ذمے داری نبھائی۔'' ڈین نے کہا۔

ہینک نے ڈین کے کندھے پر تھپکی دی اور بولا۔ ''اندر جاؤ اور وان سے بات کرو۔''

وہ کچن میں بیٹھے ہوئے تھے جس کی کھڑکی سے لان

اور جھیل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ وان نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اس نے دو کپ کافی بنائی۔ ڈین نے پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم غلط راستے پر چل رہے تھے وان۔ مجھے نینسی کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔''

رینارڈ اس کے بالمقابل میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ''شکریہ شیرف لیکن تم اپنی بات جلدی ختم کرلو۔ میری دس بجے عدالت میں پیشی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے بتاؤ کہ گزشتہ شب کیا ہوا تھا؟''

رینارڈ نے نپے تلے لفظوں میں بولنا شروع کیا۔ ''میں نصف شب کے قریب گھر واپس آیا۔ بارش ہو رہی تھی لیکن میرے گھر پہنچتے پہنچتے رک گئی۔ میں نے لائٹس آن کیں تو اس کا بستر خالی تھا۔ میں نے باہر نکل کر اسے آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہیں ملا حالانکہ میں نے ندی کے مغرب میں جنگل میں کسی کے دوڑنے کی آواز سنی تھی۔''

''کیا تم نے دیکھا کہ وہ کون تھا؟''

''نہیں۔ وہ ہرن بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے انداز سے لگا کہ وہ کسی انسان کے قدموں کی آواز تھی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ قدموں کی آواز نینسی کی تھی یا کسی اور کی؟''

''مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔''

''کیا تم نے اسے آواز دی تھی؟''

''ہاں لیکن کوئی جواب نہیں ملا پھر میں سونے چلا گیا۔''

''تم نے نینسی کو تلاش نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ باہر بہت اندھیرا تھا اور میں نالے میں گر کر مرنا نہیں چاہ رہا تھا۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں آج صبح باہر آ گیا اور اسے اسی حال میں دیکھا جیسا تم دیکھ چکے ہو پھر میں نے ہینک کو فون کیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اب بھی شیرف ہو۔''

ڈین نے کافی کا گھونٹ لیا۔ اس طرح وہ کچھ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنی جھنجلاہٹ پر بھی قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رینارڈ کے جوابات بڑے نپے تلے تھے جیسے اس نے پہلے سے ان کی تیاری کر رکھی ہو۔ اس نے کسی کے جنگل میں بھاگنے کی آواز سننے کا کہہ کر ایک شک پیدا کر دیا تھا۔ اگر اس نے نینسی کو پشتے پر سے دھکا دیا ہو تو بھی اسے کوئی ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

''تم نے کہا کہ نصف شب کو واپس آئے تھے۔ کیا کوئی اس کی تصدیق کر سکتا ہے؟''

رینارڈ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، میرا خیال ہے کہ تم اسے جانتے ہو۔ کلارا ہنری۔''

ڈین نے کوشش کی کہ اس کا ردِعمل ظاہر نہ ہونے پائے لیکن وہ اپنے جبڑوں کی معمولی سی حرکت کو نہ روک سکا۔ اس نام سے کئی متضاد جذبات وابستہ تھے۔ وہ ایک ایسا راز تھا جس کے بارے میں اسے امید تھی کہ کبھی ظاہر نہیں ہو گا۔

رینارڈ اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایک چھوٹی سی آبادی ہے شیرف۔ کیا تم اس سے اتفاق نہیں کرتے؟''

ڈین کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ کلارا کے ساتھ اس کا تعلق تین چار ہفتوں سے زیادہ نہ رہ سکا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری کو موت کی طرف جاتا دیکھ کر وہ ذہنی دباؤ اور تنہائی سے عاجز آ چکا تھا۔ تب اسے ان اندھیروں سے نکلنے کے لیے ایک عارضی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے کلارا کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈی لیکن اب وہ ان لمحات کو یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس سے بات کرنی ہوگی۔''

''مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس سے بات کرنا خود ایک تفریح ہے۔ میں نے رات اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔''

''تمہیں اس سے ملتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''ہم ہائی اسکول میں نہیں پڑھتے شیرف۔'' اس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

ڈین نے دل میں سوچا کہ یہ ایک بدصورت شخص ہے۔ موٹا، گنجا، سنگ دل اور گنہگار اور کلارا اس سے مل رہی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

''تمہیں اس کے ساتھ تعلق قائم ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

رینارڈ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری اور وہ بولا۔ ''پریشان مت ہو شیرف۔ صرف ایک مہینا ہوا ہے۔''

''میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔ تم دونوں بالغ ہو۔''

''شکریہ شیرف۔ تمہاری زبان سے یہ الفاظ سن کر خوشی ہوئی۔'' یہ کہہ کر رینارڈ کھڑا ہو گیا، اس نے کرسی کی پشت پر لٹکی ہوئی ٹائی گلے میں باندھی اور اس کی ناٹ

درست کرتے ہوئے بولا۔ ”کوئی اور بات! اب مجھے کام پر جانا ہے۔“

”فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ ثبوتوں کا جائزہ لینے کے بعد تم سے مزید سوالات ہوں گے۔“

ڈین نے اپنی پیٹرول کار پیزیکی ریسورٹ کے مرکزی لاج کے قریب ایک اسٹاپ پر کھڑی کی۔ جھیل کے مشرقی ساحل پر واقع اس انکلیو میں دو درجن کیبن کرائے پر دستیاب تھے۔ ڈین فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک پارہ دری تک پہنچا جو لاج کے وسط سے جھیل تک جارہی تھی۔ وہ چار سیڑھیاں چڑھ کر ایک شاہ بلوط کے بنے ہوئے دروازے پر پہنچا۔ اس کی ناب گھمائی اور لابی میں داخل ہو گیا۔

داہنے ہاتھ پر کچھ مہمان ڈائننگ روم میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ناشتے کے دوران انہوں نے اپنی آواز دھیمی رکھی ہوئی تھی جبکہ بائیں ہاتھ پر کافی تعداد میں خالی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کلارا کا کہنا تھا کہ انیس سو پندرہ میں جب اس کے باپ نے یہ لاج بنایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کلارا میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی جیسا کہ اس نے دو ماہ قبل اسے دیکھا تھا۔

وہ لابی سے متصل رجسٹریشن ڈیسک کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پہلے کی طرح اپنے سیاہ بالوں کی پونی ٹیل بنائی ہوئی تھی اور اب بھی نیلی جینز اور سرخ فلالین کی قمیص میں ملبوس تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح دبلی اور صحت مند نظر آرہی تھی۔ اس کی یہی خوش مزاجی ڈین کو بھا گئی تھی۔

”ہیلو کلارا۔“

”ہائے ڈین۔“

”میں یہاں سرکاری کام سے آیا ہوں۔“

”مجھے اس کا اندازہ ہے۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“

”نہیں۔“

ڈین نے اس کی بات کا یقین کر لیا اور وہ یہی سمجھا کہ کلارا کو نینسی کی موت کا علم نہیں ہے۔

”نینسی کی موت واقع ہو گئی ہے۔“

کلارا نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”وان کو آج صبح اس کی لاش اس کے گھر کے پاس نالے سے ملی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ پشتے کی اونچائی سے گری ہے۔“

”اوہ میرے خدا، وان کیسا ہے؟“

ڈین مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا آتش دان تک گیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ”وہ غیر متاثر لگ رہا ہے۔ اسے اپنی بیوی کے مرنے سے زیادہ اس گواہ کی فکر ہے جو جائے وقوعہ سے اس کی غیر موجودگی کی تصدیق کرے اور تم جانتی ہو کہ وہ گواہ کون ہے؟“

کلارا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”وہ تم ہو۔“

کلارا نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

ڈین نے کہا۔ ”میرے خدا، تم نے اس شخص میں کیا دیکھا؟“

اس کے جبڑے بھنچ گئے اور وہ جھیل کی طرف دیکھنے لگی پھر اس نے اپنی نظریں دوبارہ ڈین پر جمائیں اور بولی۔ ”وہ اس کاؤنٹی کے کسی بھی مرد سے زیادہ اسمارٹ اور دلکش ہے۔ وہ سیاسیات، فنون، بین الاقوامی امور اور ہر موضوع پر بات کر سکتا ہے۔ وہ عام مردوں سے بہت مختلف ہے۔“

ڈین اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ان الفاظ سے اسے تکلیف پہنچی تھی۔ اس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم بھی کئی موضوعات پر باتیں کیا کرتے تھے۔“

کلارا کچھ نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں لیکن تم نہیں سمجھ سکتے کہ اس چھوٹے سے قصبے میں مرد کے بغیر تنہائی کا احساس کتنا شدید ہوتا ہے۔“

ڈین نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ کیا رینارڈ گزشتہ شب تمہارے ساتھ تھا؟“

”ہاں۔“

”کتنی دیر؟“

”آٹھ بجے سے تقریباً پونے بارہ بجے تک۔“

”اس دوران تم کیا کرتے رہے؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“

”نہیں، لیکن اگر کوئی اور بات سامنے آئی تو شاید تم سے دوبارہ بات کروں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کہاں مل سکتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ گھومی اور رجسٹریشن کاؤنٹر سے اپنے دفتر میں چلی گئی۔

گلین وڈ اسپتال کے تہ خانے میں قائم عارضی مردہ خانے میں ڈین اس میز کی پائنتی کھڑا ہوا تھا جس پر نینسی کی

لاش چادر سے ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ ڈپٹی ٹریور گریفن دیوار کے ساتھ لگا ایک کپ سے کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اس کے بیمار چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔

''تمہارے پاس کیا رپورٹ ہے ایرنی؟'' ڈین نے پارٹ ٹائم کورونر اور فل ٹائم ڈاکٹر سے پوچھا۔ ڈین نے کبھی اس کے پوسٹ مارٹم پر بھروسا نہیں کیا تھا لیکن پوپ کاؤنٹی میں صرف دو ہی ڈاکٹر تھے اور سینئر ہونے کے ناتے ایرنی ہی کورونر کے فرائض انجام دیا کرتا۔ زیادہ تر اموات طبعی ہوتی تھیں جن میں ایرنی کو بہت زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں تھی اور وہ انتہائی کم وقت میں بڑی تیزی سے ایک سادہ سی رپورٹ تیار کر لیتا تھا۔ بہت کم کیسز میں زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی تھی۔

''بالکل سادہ سا کیس ہے شیرف۔'' ایرنی نے نینسی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

ڈین کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے تیز نظروں سے ایرنی کو دیکھا۔

''دماغ پر چوٹ لگنے سے کھوپڑی میں فریکچر ہو گیا ہے۔''

''جس چیز سے ضرب لگی وہ تیز تھی یا کند؟''

''کند۔ فریکچر کے سائز سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا سر کسی چٹان سے ٹکرایا ہے اور ڈپٹی گریفن نے مجھے جائے وقوعہ پر ایک ابھری ہوئی چٹان دکھائی تھی جس پر خون لگا ہوا تھا۔ اس چٹان کا سرا فریکچر کے سائز سے میچ کرتا ہے۔''

''موت کے وقت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' ڈین نے پوچھا۔

ایرنی نے آنکھوں پر چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتانا مشکل ہے۔ اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ رات میں کسی وقت اس کی موت واقع ہوئی ہے۔''

''کیا اس کے جسم پر کسی اور جگہ زخموں کے نشان ہیں۔ خراش یا اس طرح کی کوئی اور چیز؟''

''میں نے کوئی اور غیر معمولی بات نوٹ نہیں کی۔''

''کوئی ایسا زخم جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ اس نے جدوجہد کی یا اس کے ساتھ زیادتی ہوئی؟''

گریفن اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ وان اسے مار رہا تھا؟''

''ضروری نہیں۔ میں صرف حقیقت جاننا چاہ رہا ہوں۔'' وہ دوبارہ ایرنی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کوئی ایسی بات جو جدوجہد سے مطابقت رکھتی ہو؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

ڈین کو ایرنی کے جواب میں بے یقینی نظر آئی۔ ''کیا تم میری خاطر ایک بار پھر لاش کا معائنہ کر سکتے ہو؟''

گریفن قریب آکر بولا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ نینسی کے بدن پر کوئی خراش نہیں تھی۔ کیا ہم یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ بو میرے دماغ کو چڑھ رہی ہے۔''

ڈین نے گریفن کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہاں رکنا نہیں چاہتا لیکن نینسی ہماری بہترین کوششوں کی مستحق ہے۔'' پھر وہ ایرنی سے بولا۔ ''کیا ہم لاش کو ایک دفعہ اور دیکھ سکتے ہیں؟''

''جیسا تم کہو شیرف۔'' ایرنی کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی تھی۔

ایرنی نے چشمہ اتار کر جیب میں رکھا اور نینسی کے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ کمر کے بل بے لباس لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی جلد کہیں موٹی اور کہیں پچکی ہوئی تھی۔ نینسی کی لاش کو اس حالت میں دیکھ کر ڈین کو شرمندگی ہونے لگی۔ اسے لگا کہ وہ مداخلت بے جا کا مرتکب ہو رہا ہے لیکن وہ یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ لاش پر کسی جدوجہد یا حملے کی علامات تو نہیں ہیں۔ وہ یہ سب کچھ اسی کی خاطر کر رہا تھا۔

گریفن کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا جبکہ ڈین اور ایرنی میز کے قریب آ گئے۔ انہوں نے لاش کا سر سے پیر تک معائنہ کیا۔ اس کے ہاتھوں پر نظر آنے والی چھوٹی خراشیں دیکھیں لیکن انہیں کوئی واضح خراش یا رگڑ کا نشان نظر نہیں آیا پھر انہوں نے لاش کو پلٹ کر اوپر سے نیچے تک دیکھا لیکن انہیں کوئی ایسے نشانات نہیں ملے۔ ڈین نے اشارہ کیا اور انہوں نے دوبارہ لاش کو کمر کے بل لٹا کر اسے چادر سے ڈھانپ دیا۔

اپنے بھائی رے کی طرح ڈین نے بھی ذہن میں یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ وان رینارڈ نے ہی نینسی کو قتل کیا ہے لیکن کلارا کی جانب سے وان کی جائے وقوعہ سے غیر حاضری کی تصدیق اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے اس مفروضہ کی نفی ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ڈین جانتا تھا کہ کسی بھی فرد کو قتل کرنے کے ایسے طریقے ہیں جن کے ظاہری نشانات نظر نہیں آتے۔

''کیا اس کے پھیپھڑوں میں پانی تھا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ڈوبی ہو اور بعد میں گرنے سے اس کے سر میں فریکچر ہو گیا ہو؟''

''گویا اب تم یہ سمجھ رہے ہو کہ وان نے پہلے اسے قتل کیا اور بعد میں پشتے سے نیچے پھینک دیا؟'' گریفن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

ڈین نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے اپنی نظریں ایرنی پر جما دیں۔ ''کیا یہ ہوسکتا ہے کہ پہلے اسے پانی میں ڈبویا گیا ہو؟''

''ایرنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' جب ہم نے اسے منہ کے بل موڑا تو اس کے منہ سے پانی نہیں نکلا، غالباً اس کے پھیپھڑوں میں اتنا پانی نہیں تھا جو ڈوبنے کی صورت میں ہونا چاہیے۔''

''کیا تم نے اسے پہلی بار منہ کے بل موڑا تھا؟'' ڈین نے پوچھا۔

''ہاں کیونکہ میں اکیلا یہ کام نہیں کرسکتا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ وہ کس طرح مری۔ اگر کسی نے اسے ڈبویا ہے تو کوئی جدوجہد کی علامت ہونی چاہیے جیسا کہ تم اس کے جسم پر خراشیں تلاش کررہے تھے یا انگلیوں کے ناخن کے نیچے کھال یا خون کے ذرات ہونے چاہیے تھے۔''

''کیا تم نے اس کی انگلیوں کے ناخن دیکھے تھے؟''

''میں نے پہلا کام یہی کیا تھا لیکن مجھے وہاں کھال یا خون کے ذرات نہیں ملے۔''

ڈین نے گریفن کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب اسے جائے وقوعہ سے ہٹایا گیا تو کسی نے اس کے منہ سے پانی نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟''

گریفن اور ایرنی نے یک آواز ہوکر کہا۔ ''نہیں۔''

پولیس اسٹیشن میں دورانِ گفتگو ہینک نے تصدیق کی کہ جائے وقوعہ سے کوئی واضح ثبوت نہیں ملا البتہ پشتے کے کنارے پر کئی ناقابلِ شناخت قدموں کے نشانات دیکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد ڈین ایک بار پھر رینارڈ کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے اور آسمان ابھی تک ابرآلود تھا۔ جب وہ اس کے گھر کے قریب پہنچا تو وان کی کیڈی لیک سڑک پر نظر آئی۔ اس نے ڈین کو دیکھ کر اپنی کار اس کے برابر لاکر روکی اور اپنی جانب کا شیشہ گرادیا۔ ڈین نے بھی ایسا ہی کیا۔

''گڈ آفٹرنون شیرف۔'' رینارڈ نے ایسے لہجے میں کہا جس نے ڈین کو محتاط ہونے پر مجبور کردیا۔

''میں صرف ایک اور مرتبہ نالے کے گردونواح کا جائزہ لینے آیا تھا۔''

''تم ابھی تک میرے خلاف ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے خیال میں، میں نینسی کو مارتا تھا۔''

ڈین کو اپنے گال سرخ ہوتے محسوس ہوئے۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ ٹریور گریفن کے منہ پر زوردار لات رسید کرے۔ اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ میں صرف تمام امکانات کو دیکھ رہا ہوں تاکہ ہم کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔''

''میں نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا شیرف جو میں سمجھتا ہوں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی ثابت ہوگیا ہوگا پھر تم اس حقیقت کو کیوں نہیں قبول کرلیتے کہ نینسی کی موت حادثاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر موت کے پیچھے کوئی مذموم محرک ہو۔''

''مجھے اس پر حیرت ہورہی ہے کہ تمہیں اپنی بیوی کے مرنے کا ذرا سا بھی دکھ نہیں ہے جیسے اس کے بجائے کسی اجنبی کی موت ہوئی ہو۔''

رینارڈ سخت لہجے میں بولا۔ ''میں اس سے محبت کرتا تھا اور اسے یاد کرتا رہوں گا لیکن میں اپنے جذبات کا اظہار نہیں چاہتا۔ یہ اور بات ہے کہ اب ہمارے تعلقات میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ اگر یہ جرم ہے تو میں خطاوار ہوں۔''

ڈین نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اپنے بارے میں کیا کہوگے پیرش؟ کیا آخری دنوں میں بھی میری کے ساتھ تمہارے تعلقات روزِ اول کی طرح پُرجوش تھے؟''

''میں ہر روز اس کا غم محسوس کرتا ہوں۔'' ڈین نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا وقت گزرنے کے ساتھ میری کے بارے میں تمہارے جذبات تبدیل نہیں ہوئے؟''

ڈین دوسری جانب دیکھنے لگا۔ وہ رینارڈ کے سامنے کوئی اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رینارڈ جیسا شخص دوسرے کی کمزوریوں سے طاقت حاصل کرتا ہے۔

رینارڈ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم نے اس کے ساتھ بے وفائی کی پیرش۔ تمہارے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت بتارہی ہے کہ اس کے بارے میں تمہارے جذبات تبدیل ہوگئے تھے۔''

اس نے اپنی ایک کہنی کھڑکی میں رکھی اور ڈین کی

طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا اب تم مجھے بتاؤ پیرش کہ اگر اس کے بارے میں تمہارے جذبات تبدیل ہو گئے تھے تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ تم نے اسے مارا ہے؟''

ڈین کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کے گال سرخ ہو گئے۔ اس نے بمشکل اتنا کہا۔ ''مجھ سے جرح مت کرو رینارڈ۔ ہم نینسی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

''کیا واقعی شیرف یار مجھے گھیر رہے ہو۔ تم نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا اور جب سے تم نے نینسی کی لاش دریافت کی ہے، تم اصل واقعہ معلوم کرنے کے بجائے مجھے مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

ان کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ملیں پھر ڈین دوسری جانب دیکھنے لگا۔ رینارڈ چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''تم بے فکر ہو کر یہاں کا جائزہ لے سکتے ہو۔ اگر مجھے گرفتار کرنا چاہو تو ریزورٹ آ جانا، آج کلارا اور میں ڈنر پر مل رہے ہیں۔''

ڈین اس جگہ پہنچا جہاں نینسی گری تھی، یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے وان کو اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے ذریعے رینگتے ہوئے دیکھا تھا جب وہ خود نینسی کی لاش کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ڈین نے پشتے کے کنارے کو غور سے دیکھا۔ اس کا زیادہ حصہ ہموار تھا۔ سوائے ایک جگہ کے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پانی کا گلاس زمین میں گاڑ دیا ہو جس سے وہاں دو انچ گہرا گڑھا بن گیا تھا۔ یہ کسی عورت کی ایڑی کا نشان لگ رہا تھا۔

ڈین نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ نینسی اندھیرے میں چلی آ رہی ہے اور جیسے ہی وہ پشتے کے قریب آئی تو اس نے اپنے ننگے پاؤں کی ایڑی کے نیچے سے زمین ہٹتی ہوئی محسوس کی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دس فٹ گہرائی میں جا گری۔ اس کی وضاحت نینسی کی ایڑی اور ٹخنوں سے اوپر لگی ہوئی کیچڑ سے بھی ہو رہی تھی جو ڈین نے لاش کے معائنے کے دوران دیکھی تھی۔

پہلی بار ڈین نے سوچنا شروع کیا کہ شاید وان نے اسے نہ مارا ہو۔ اگر اس نے نصف شب کے قریب نینسی کو دھکا دیا تھا تو وہ اپنے قدموں کے نشان مٹانے کے لیے صبح کا انتظار کیوں کرتا۔ وہ اتنا ہوشیار ضرور تھا کہ قتل کے فوراً بعد ہی یہ کام کر لیتا اور اگر اس نے نینسی کو دھکا دیا ہوتا تو اس کی ایڑی سے پشتے کے کنارے پر اتنا گہرا گڑھا نہ بنتا۔

ڈین نے جھیل کی طرف چلنا شروع کیا اور نالے میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ لکڑی کے پُل پر جا کر رک گیا جو ندی اور پیرش وڈ کی طرف جاتا تھا۔ اس نے پل پار کرتے ہوئے جھیل کی طرف دیکھا۔ زیادہ تر لہریں مشرق کی طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ جھیل سے واپس مڑا اور ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا پھر اس جگہ آ کر رک گیا جہاں اس نے گھاس دیکھی تھی۔ وہ جگہ ایسی لگ رہی تھی جیسے وہاں کسی جانور نے پنجے مارے ہوں۔

وہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا اور گھاس کے ایک ٹکڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے اپنا سینہ جکڑتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ گھاس کسی جانور کے پنجے سے خراب نہیں ہوئی تھی جیسا کہ اسے پہلے شبہ ہوا تھا۔ اسے کسی انسان کے قدموں کے نشان نظر آئے۔ گھاس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی شخص یہاں کچھ دیر رکا تھا۔ وہ شخص کون ہو سکتا تھا۔ رینارڈ کے کہنے کے مطابق جب اس نے نینسی کا نام لے کر پکارا تو اس نے کسی کے دوڑنے کی آواز سنی۔

ڈین آہستہ آہستہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوا۔ اب اس کے دماغ میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا کہ جب نینسی مری تو یہاں کون تھا؟

''وہ گری ہے ڈین۔'' یہ آواز ایک فاصلے سے آئی تھی۔ ڈین اس جانب گھوما اور اپنی گن نکال لی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے بھائی۔''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو رے؟''

''بالآخر مجھ میں اتنی ہمت آ گئی کہ دن کی روشنی میں یہ جگہ دیکھ سکوں۔''

''تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''وہ اس جگہ سے گری ہے۔ اس کے علاوہ تم کچھ اور مت سوچو۔''

''کیا تم نے اسے دھکا دیا تھا؟''

رے نے اپنی گن نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا کیوں کروں گا؟ میں اس سے محبت کرتا تھا۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔

ڈین نے اپنی گن نیچے نہیں کی اور بولا۔ ''گزشتہ شب میں نے تمہارے کیبن سے جو آواز سنی وہ اسی کی تھی؟''

رے نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کے دروازے پر خدا حافظ کہا اور اپنے کیبن کی طرف چلنا شروع کیا۔ ابھی میں نے پل پار کیا تھا کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر چلائی۔ میں نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ مسکراتے ہوئے پشتے کی طرف دوڑتی ہوئی

آرہی تھی۔ میں نے اسے چلا کر کہا کہ وہ اندھیرے میں محتاط رہے لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اس کا پیر پھسلا اور ایک خوفناک چیخ فضا میں ابھری پھر......''

رے کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا رگڑا اور بولا۔ ''پھر میں نے دیکھا کہ وہ مرچکی تھی۔''

ڈین نے اپنی گن نیچے کی اور بولا۔ ''کیا تم نے اسے چیک کیا تھا؟''

''بالکل لیکن جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ مر چکی تھی۔''

''کیا وقت تھا؟''

''ساڑھے گیارہ بجے کے قریب۔ وہ عام طور پر اسی وقت گھر جاتی تھی کیونکہ وان ہمیشہ نصف شب کے قریب واپس آتا تھا۔ وہ اس سے پہلے گھر پہنچ جاتی تھی تاکہ اسے معلوم نہ ہو سکے کہ وہ گھر سے باہر گئی تھی۔''

''تم میرے پاس کیوں نہیں آئے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''میں خوف زدہ ہو گیا تھا ڈین۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ میں گھاس پر بیٹھا سوچتا رہا لیکن میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ میں روتا رہا۔ میرے آنسو زمین پر گرتے رہے پھر میں نے وان کی آواز سنی۔ وہ اسے بلا رہا تھا اور میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔''

ڈین نے اس کی وضاحت پر غور کیا۔ اس کی بات سمجھ میں آرہی تھی لیکن یہ محض اس کا اپنا بیان تھا۔ ''کیا کوئی اور اس کی تصدیق کر سکتا ہے؟''

''ظاہر ہے کہ نہیں۔ وہاں صرف میں اور نینسی ہی تھے۔''

''تمہیں اس سے ملتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''تقریباً ایک مہینا۔ وہ تنہا تھی اور میں بھی۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ کچھ عرصے سے میں اور آڈرے ایک دوسرے سے دور ہیں۔ میری کے مرنے کے بعد وہ میرے پاس نہیں آئی۔''

''میری اس معاملے میں کیا کر سکتی تھی؟''

''اس کا کوئی قصور نہیں ڈین۔ آڈرے تمہاری وجہ سے نہیں آتی۔ تم نے میری کے ساتھ کیا کیا۔ اسے کس طرح مارا؟''

ڈین کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ سے گن گر گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا۔

''میں جانتا ہوں ڈین۔'' رے نے کہا۔ ''تم نے وہی کیا جو تمہیں کرنا تھا لیکن آڈرے اسے غلط سمجھتی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ تم نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم نے وہی کیا جو ایک اچھا آدمی کرتا۔''

ڈین نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ہم نے پانی میں گرنے کی آواز سنی تھی اور چاندنی رات میں تمہیں اس کی لاش کو گھر لاتے دیکھا تھا۔''

ڈین سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہت تکلیف میں تھی رے۔ اس کے پورے جسم میں کینسر پھیل گیا تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اسے اتنے عرصے سے تکلیف میں دیکھنا کتنا مشکل تھا۔ میں نے وہی کیا جو وہ چاہتی تھی گو کہ اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میں اس کی آنکھوں میں پڑھ سکتا تھا۔ وہ بیماری سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین ہے لیکن آڈرے کو نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ پوپ کاؤنٹی کے شیرف کے پاس یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کی جان لے سکے۔''

''رحم کے بارے میں کیا کہو گے؟ کیا آڈرے اس پر بھی یقین نہیں رکھتی۔ اس نے میری کو آخری دنوں میں دیکھا تھا۔ کیا اس کے پاس زندہ رہنے کا کوئی راستہ باقی رہ گیا تھا؟''

''نہیں۔ لیکن آڈرے سمجھتی ہے کہ اسے پانی میں ڈوب کر نہیں مرنا چاہیے تھا۔''

''یہ واحد راستہ تھا۔ ایرنی جانتا تھا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے اور مجھے بھی پتا تھا کہ وہ اس کا پوسٹ مارٹم نہیں کرے گا اگر میں اس کی کوئی وجہ نہیں بتاؤں گا۔ اس کے پاس پہلے سے اس کی موت کا سبب موجود تھا۔''

رے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا پھر اس نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔''

ڈین نے ایک نظر جھیل پر ڈالی اور بولا۔ ''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

رے نے نفی میں سر ہلایا اور پانی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا بھائی۔ بس اتنا اندازہ ہے کہ ہمیں اس حقیقت کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہوگا۔''

ڈین کو اس لمحے محسوس ہوا کہ وہ کبھی اپنے بھائی کے اتنے قریب نہیں ہوا تھا۔ اسے رے کے الفاظ سے حوصلہ تو ملا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خلش بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میری کی موت کی بے رحم گونج اسے تنگ کرتی رہے گی۔ وہ گونج جو اس کے دل میں بس کر رہ گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نینسی کی موت کی تفتیش کرتے کرتے وہ خود گڑھے میں جا گرے گا۔

☆☆☆

طاہر جاوید مغل

انگارے

پچیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں درد مند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ناقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پارا ہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلیں اور مقابلے میں سرغنہ ناقب اور اس کا ساتھی عبرتناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔

بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچر سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جاناں کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور حلمی نے خوفناک منصوبہ بندی کی تھی۔ بالآخر میرے جو خدشات تھے وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہم سب زیر زمین پر آسائش تہ خانے میں منتقل ہو چکے تھے...... آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا بُرا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نہایت ہوشیاری سے ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ اور میں اس جلسے میں جا پہنچا جہاں رائے زل اور آقا جان کی ٹیم موجود تھی۔ میں نے رائے زل کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اور یہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا۔ ہمارا منصوبہ تقریباً کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ رائے زل بالکل ٹھیک ہے۔ اسٹیج پر اس کی جگہ نقلی رائے زل تھا۔ ہم زیرِ زمین مقید تھے۔ رائے زل زندہ ہے یہ خبر بہت ہی دل سوز تھی۔ ہم خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک باہر جاتے ہیں مگر پتا چلتا ہے کہ باہر ایجنسی کے لوگ تھے...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... مجھ پر بے پناہ تشدد کیا مگر ان کی ہر کوشش لاحاصل رہی۔ بالآخر انہوں نے مجھے ہاناوانی کے سامنے پیش کر دیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے لات مار کر کرسی سمیت نیچے گرانے والی خود مادام ہاناوانی ہی تھی۔ غالباً مجھے زیر کرنے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس نے جھنجلاہٹ میں یہ حرکت کی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں ایک طویل سفر کر کے آیا ہوں اور تھکن سے چور ہوں۔ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر یہاں بیٹھا ہاناوانی کو ''سہتا'' رہا تھا۔ سات رنگوں کا ایک بہت بڑا بھنور سا تھا جو مجھے اندر ڈبونا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر قوتِ برداشت کو بروئے کار لا کر خود کو اس بھنور سے دور رکھا تھا۔ اپنے انفیکشن زدہ سوجے ہوئے انگوٹھے کو میں نے اس بری طرح کچلا تھا کہ زخم پھٹ سا گیا تھا اور ہتھیلی پر لہو کی چپچپاہٹ تھی۔

کچھ دیر بعد تین مسلح اور چوکس گارڈز اندر داخل ہوئے، میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گارڈز نے مجھے کرسی سے علیحدہ کیا اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ کمرائے خاص سے نکال کر میرے اپارٹمنٹ میں لے گئے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا کہ میں اس بے پناہ ماورائی دباؤ کو ناکام بنانے میں کامیاب رہا ہوں جسے ہاناوانی کی آنکھوں کا طلسم کہا جاتا ہے۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ہاناوانی کے سامنے جانے کے بعد میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ میں کچھ خاص یاد نہیں کر سکا۔ بس یہی یاد آیا کہ ہاناوانی قیمتی گہنوں سے لدی پھندی بڑی شان سے میرے سامنے اپنی شاہی نشست پر بیٹھی تھی پھر اس نے اپنی سیاہ عینک اتاری تھی۔ ایک عجیب سی دھندلاہٹ اور خود فراموشی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ یہ بھی یاد آیا کہ ہاناوانی نے جب اپنی عینک اتاری تو مجھے اس کے ہاتھ کی چھ انگلیاں نظر آئی تھیں۔ ذکری نے مجھے بتایا تھا کہ ہاناوانی اپنے شکار پر عموماً تین بار جھپٹتی ہے۔ اگر یہ تین کوششیں ناکام ہوں تو پھر وہ مزید کوششیں نہیں کرتی۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں اس کی تین زبردست قسم کی کوششیں جھیل چکا ہوں۔

مجھے اپارٹمنٹ میں لاک کرنے کے بعد حسب معمول آہنی راڈز والی کھڑکی کی طرف بلایا گیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر اپنی پشت کھڑکی کی طرف کر لی۔ گارڈز نے میری الٹی ہتھکڑی کھول دی اور میں اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ میں نے اپنی بند مٹھی کھول کر انگوٹھے کا حشر

نشتر دیکھا۔ اسے مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ انگوٹھے کے زخم سے بہنے والے خون نے ہتھیلی کو سرخ کر دیا تھا۔

اسی دوران میں سی سی ٹی وی کیمرے پر بھی میرے زخم کو دیکھ لیا گیا۔ کمرے میں لگے ہوئے اسپیکر پر فوراً آواز ابھری۔ ''تمہارے زخم کو بینڈیج کی ضرورت ہے۔ فوراً کھڑکی کی طرف آؤ۔''

میں کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ملائیشین ڈاکٹر بھی وہاں آن موجود ہوا۔ ''کیا ہوا تمہارے انگوٹھے کو؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''دروازے میں لگ گیا ہے۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

اس نے میڈیکل باکس کھول کر زخم کو صاف کیا اور اچھی طرح بینڈیج کرنے کے بعد کھانے کے لیے بھی دوا دی۔ وہ کچھ الجھن میں نظر آرہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ انگوٹھے کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ بعد میں سی سی ٹی وی کی فوٹیج دیکھ کر بھی کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ بہر حال یہ بات ان میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ میں نے ان کی مادام ہاناوانی کے ''ٹرانس'' سے بچنے کے لیے خود کو یہ جسمانی اذیت پہنچائی ہے۔

جس راز کو میں نے سینے میں دفن کیا تھا، وہ اب واقعی دفن ہو چکا تھا۔ میرا تہیہ تھا کہ اب کسی بھی صورت اس کو باہر نہیں آنے دوں گا۔ ابھی تک میں اپنے اس ارادے میں مکمل کامیاب تھا۔ امریکی لونگ جیک کا بے پناہ تشدد اس راز کی قبر کشائی نہیں کرسکا تھا اور اب اپنی آنکھوں میں جادو رکھنے والی مادام ہاناوانی بھی اس کوشش میں بظاہر ناکام ہوئی تھی۔ آئندہ کیا ہونا تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اگلے پانچ چھ روز تک مجھے لونگ کی منحوس شکل تو نظر نہیں آئی۔ تاہم مجھ سے پوچھ گچھ کے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے رہے۔ یہ سارے طریقے نرمی کے تھے اور ان میں تکنیک سے کام لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک امریکی سائیکاٹرسٹ نے اپنے قریباً دس گھنٹے مجھ پر ضائع کیے اور آزاد تلازمے اور کونسلنگ کا طریقہ اپنا کر میرے اندر سے کچھ نکالنے کی ناکام کوشش کرتا رہا پھر ایک دن مجھ پر ''جھوٹ سچ'' جانچنے والا آلہ آزمایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کی نبض کی رفتار میں فوراً ردوبدل ہوتا ہے اور کچھ کیمیائی تبدیلیاں وغیرہ آتی ہیں۔ ایک دن مجھے ایک انجکشن دیا گیا۔ بتایا تو یہ گیا کہ یہ انگوٹھے اور دیگر زخموں کے انفیکشن روکنے کے لیے ہے لیکن حقیقت مختلف تھی۔ اس انجکشن کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہوئی مگر یہ صرف غنودگی نہیں تھی۔ اس میں ایک عجیب طرح کی یاسیت اور پژمردگی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس ماحول اور اردگرد کے سارے حالات سے فرار اختیار کر کے کہیں دور چلا جاؤں۔ بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ۔ ان لوگوں کی بات مان لوں اور اپنی جان چھڑالوں۔

نیلی آنکھوں والا پال اس کیفیت کا فائدہ اٹھانے کے لیے میرے سامنے آن بیٹھا اور مختلف سوال شروع کر دیے۔ اس نے مجھے یہ چکما دینے کی کوشش بھی کی کہ مادام ہاناوانی اور بیگم نورل کے درمیان مفاہمت ہوگئی ہے اور بڑا اچھا ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ اگر میں اپنے ساتھیوں کا اتا پتا بتا دوں تو ان کے ساتھ رعایتیں ہوسکتی ہیں اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ انہیں عام معافی مل جائے۔

میں نے غنودہ لہجے میں کہا۔ ''اگر انہیں معافی ہی دینی ہے تو پھر ایسے ہی دے دو۔ اُن کا پیچھا چھوڑ دو۔''

پال بولا۔ ''قانون کے کچھ تقاضے ہیں۔ وہ تو ہر صورت پورے ہونے ہی ہیں۔''

''تم لوگ جتنے بڑے قانون پسند ہو۔ دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔''

پال کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن تحمل سے بولا۔ ''دنیا اور بھی بہت کچھ جانتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ہم نے عراق کے صدام کو کہاں سے کھینچ کر باہر نکال لیا تھا اور اسامہ......''

وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں جیسے کہیں دور سے پہنچ رہی تھی۔ میرے اندر کی اولوالعزمی نجانے کہاں اوجھل تھی، جی چاہ رہا تھا کہ اس مسلسل پوچھ گچھ سے جان چھڑا کر سو جاؤں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں مگر یہ بات بھی ذہن میں موجود تھی کہ مجھ پر کسی خاص قسم کی میڈیسن کا اثر ہے اور میں فی الوقت نارمل حالت میں نہیں ہوں۔

پال کی وہ ساری گفتگو بھی اس کے لیے لاحاصل ہی رہی۔ میں اس کی یہ بات کسی صورت مان نہیں سکتا تھا کہ جس مادام ہاناوانی نے بیگم نورل کو بیوہ کیا ہے اور اس کے جوان بیٹے کمال احمد کی جان لی ہے وہ اس سے کسی طرح کی مفاہمت کرے گی۔ مجھ سے سخت قسم کی پوچھ گچھ جاری تھی لیکن اس پوچھ گچھ کا میرے لیے ایک مثبت پہلو بھی تھا۔ پوچھ گچھ ہوتی تھی تو مجھے تسلی ہو جاتی تھی کہ میرے ساتھی اب

تک محفوظ و مامون ہیں۔

اگلے روز کی بات ہے۔ میں چمکیلے راڈز والی کھڑکی کے پاس کھڑا ڈاکٹر سے اپنے انگوٹھے کی پٹی کروا رہا تھا کہ دو گارڈز آدھمکے۔ جونہی ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہوا۔ مجھے الٹی ہتھکڑی لگوانے کا حکم دیا گیا۔ میں نے ہتھکڑی لگوالی۔

''مجھے باہر لے جایا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کسی کو اندر لایا جا رہا ہے۔'' امریکی گارڈ نے خشک لہجے میں جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اپنے پاؤں بھی راڈز کے ساتھ لگاؤ۔''

''وہ کیوں؟''

''تمہیں دس مرتبہ کہا جا چکا ہے...... سوال جواب نہیں...... صرف وہ کیا کرو جو تم سے درخواست کی جاتی ہے۔'' گارڈ کے لہجے میں زہر نا کی تھی۔

میں نے پاؤں بھی آگے کر دیے۔ ایک بیڑی نما زنجیر پہنا دی گئی۔ اس کی وجہ سے میں بمشکل نو دس انچ کا قدم ہی اٹھا سکتا تھا۔ آج یہ خاص ''میزبانی'' ظاہر کر رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔ شاید کوئی خاص بندہ ملنے آ رہا تھا۔

اور پھر یہ خاص بندے والا قیافہ درست ثابت ہو گیا۔ دس منٹ بعد جو شخص میرے اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ کھول کر اندر آیا میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا مگر مجھے یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ وہ شکیل داراب تھا۔ داراب فیملی کا وہ سیاست زادہ جو پاکستانی سیاست اور حکومت میں کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ تھا۔ لشکارے مارتا ہوا خوب صورت چہرہ...... خوش لباس، خوش رُو لیکن اندر سے شاید اتنا ہی کالا۔ اس سے میری آخری ملاقات کافی دن پہلے لیہ کے پارا ہاؤس میں ہوئی تھی۔ اس وقت ہم عزت مآب ریان فردوس کے ساتھ بروناٹی آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ شکیل داراب نے کہا تھا کہ وہ بھی چند روز تک ہمارے پاس پہنچ رہا ہے مگر اب اس نے قریباً تین ماہ بعد شکل دکھائی تھی۔

اس نے کھڑکھڑاتی ہوئی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ میرے ہاتھ تو اس کی حفاظت کے لیے پشت پر باندھے گئے ہیں۔ وہ میرے سامنے نشست پر بیٹھ گیا اور اپنے رعب دار لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہارے حوالے سے یہی اندیشہ تھا کہ تم وہاں جا کر خود کو کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار کر لو گے، تمہارے اندر سیلانی روح ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو تمہاری روح مجھ سے زیادہ سیلانی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہاری روح گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہے جس طرف فائدہ زیادہ نظر آتا ہے اسی طرف چلی جاتی ہے۔''

''شاید تم ریان فردوس کی بات کر رہے ہو۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہے مگر اس نے بھی تمہاری طرح بہت غلطیاں کی ہیں۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ آدم کی بیٹی اور کمانڈر افغانی جیسے لوگ بہت طاقتور ہیں اور یہ سارے جوشیلے لوگ اسے یہاں کا صحیح حکمران بنا کر دم لیں گے۔ وہ ڈبل گیم کھیلتا رہا اور آخر مارا گیا۔''

''اس نے کوئی ڈبل گیم نہیں کھیلی تھی۔ وہ تو آخر تک قسطینا اور بیگم نورل کو لتاڑتا رہا اور انہیں مشورے دیتا رہا کہ وہ رائے زل اور امریکی ایجنسی کے پاؤں چھو لیں۔ عین جنگ میں بھی اس نے امریکی قیدیوں پر اپنی محبت نچھاور کی اور ''مفاہمت'' کی خاطر ان کو رہائی دلائی۔ اپنے ہاتھوں سے ان کی زنجیریں کاٹیں اور اس کے بدلے میں اپنے لیے امن اور اپنی عیاشیوں کا تحفظ مانگا مگر یہ لوگ اپنے خیر خواہوں کو ٹشو کی طرح استعمال کر کے پھینک دینے کے عادی ہیں۔ ریان فردوس کو بھی موت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ اس کے بیٹے کو بھی دردناک موت سے دوچار کیا اور ابھی نجانے کس کس کی باری آنی ہے۔''

شکیل داراب مسکرایا اور اس کے سفید کلیوں جیسے دانت چمک اٹھے' وہ بولا۔ ''تم ریان فردوس کی جن کارروائیوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ بہت دیر سے ہوئیں۔ اس وقت تک تو رائے زل اور امریکی یہ لڑائی تقریباً جیت چکے تھے۔ بہرحال میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ کچھ آئندہ کے بارے میں سوچا جائے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''اگر تم رائے زل اور ایجنسی کے نمائندے بن کر آئے ہو تو مجھے تمہاری بے حسی پر حیرت ہے۔''

''شاہ زیب! مجھے لگ رہا ہے کہ تم کچھ چیزوں کو غلط اینگل سے دیکھ رہے ہو۔ ریان فردوس کو تو میں جانتا تک نہیں تھا۔ میری دوستی آقا جان سے تھی۔ آقا جان کے ذریعے ہی ریان فردوس سے علیک سلیک شروع ہوئی۔ اب بھی میں آقا جان ہی کے پاس آیا ہوں، کل رات میرے اور آقا جان کے درمیان مشورہ ہوا تھا جس کے بعد میں نے

تم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔''

''اگر تم وہی سوال کرنا چاہتے ہو جو اَب تک پچاس ہزار دفعہ مجھ سے کیا جا چکا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرو، مجھ سے میری زندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''تم بہت زیادہ بدگمان لگ رہے ہو۔''

''میں نے یہاں اپنے دوست کھوئے ہیں شکیل صاحب، ان کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا ہے...... اور میرے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے، اس کی نشانیاں بھی تمہیں میرے جسم اور چہرے پر نظر آرہی ہوں گی۔ میرے سینے میں انگارے دہک رہے ہیں' میرا مشورہ تم کو بھی ہے کہ خود کو ان انگاروں سے دور رکھو۔''

وہ ٹھنڈے مزاج کا گہرا شخص تھا۔ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا جڑاؤ سگریٹ کیس نکالا۔ میری معلومات کے مطابق غریب پاکستان کے اس غریب سیاست داں کے سگریٹ کیس اور لائٹر کی قیمت 40 لاکھ روپے کے لگ بھگ تھی۔ اس نے سگریٹ میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا مگر میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس نے سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبایا اور سلگا لیا۔

میں جب بھی اس شخص کی آنکھوں میں دیکھتا تھا، مجھے ان میں ایک گھناؤنا پن نظر آتا تھا۔ مجھے درمیانی عمر کی پُرکشش ناہید یاد آجاتی تھی۔ شکیل نے اپنی اس اسکول ٹیچر سے عشق کیا (حالانکہ اسے عشق کہنا بھی اس جذبے کی توہین ہے) پھر اسے اپنے ساتھ خفیہ شادی پر مجبور کیا اور اس سے جی بھر جانے کے بعد ''دوسروں'' کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ان بااختیار امیرزادوں میں سے تھا جن کے لیے پورے پورے شہر ''شکارگاہوں'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وہ بولا۔ ''دیکھو شاہ زیب! تم اپنے دل دماغ کو ٹھنڈا رکھو اور اپنے آپ کو بڑی مصیبت میں پھنسا چکے ہو، اس سے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہاں ان لوگوں کا اپنا ہی قانون اور انصاف ہے۔ تم اسے ایک مائیکرو اسٹیٹ بھی کہہ سکتے ہو۔ یہاں تمہارے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے، مجھ سے کھل کر بات کرو تاکہ میں تمہاری مدد کرسکوں اور ہاں...... کیمروں وغیرہ کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ یہاں کا آڈیو ویڈیو سسٹم بالکل بند ہے۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہو رہی ہے، وہ بس ہم دونوں کے درمیان ہے۔''

اس کے کہنے سے پہلے ہی میں دیکھ چکا تھا کہ چھت میں موجود کیمروں کے شٹر آٹومیٹک طور پر بند ہو گئے ہیں۔

عین ممکن تھا کہ صوتی آلات بھی بند ہوں لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں تم سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا، میرا جو بھی حشر نشر ہے تمہارے سامنے ہے۔ تم بھی کھل کر بتادو کہ کس مقصد کے لیے یہاں پہنچے ہو؟''

وہ توقف کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب! ایک بات تو میں تمہیں صاف بتا دوں، یہ لوگ تم سے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں جانے بغیر تم کو چھوڑیں گے نہیں، تم خودکشی وغیرہ کرلو تو اور بات ہے ورنہ یہ تمہیں زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر رکھیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کون سا درمیانی راستہ ہو سکتا ہے جو تمہیں قبول ہو اور تمہیں پکڑنے والوں کو بھی۔ ایسے معاملات میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔''

''سیاست داں ہو تو سیاست والی بات ہی کرو گے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، میں ایک ایسے درمیانی راستے کی بات کر رہا ہوں جس سے تمہاری زندگی بچ جائے اور تم بری موت کے اس پھندے سے نکل سکو۔'' اس نے پھر ذرا توقف کیا۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر بولا۔ ''تم نے ڈی پیلس کے سامنے آقا جان کے منہ پر تھپڑ مارا، اس تھپڑ کی گونج پورے جاماجی میں سنائی دی اور شاید یہ گونج اب تک موجود ہے۔ تمہاری اس بے وقوفی نے تمہارے حالات بہت زیادہ خراب کر دیے ہیں۔ پھر بھی میں نے آقا جان سے بات کی ہے اگر دوسرے مسئلے حل ہو جائیں تو اس تھپڑ کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ معافی کے دو چار لفظ بول دینے سے یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔''

''اور دوسرے مسئلے کیا ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم قسطینا اور دیگر ساتھیوں کی گرفتاری میں مدد کرو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں شاہ زیب کہ تمہارے دونوں ساتھیوں سجاول اور انیق کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس کے علاوہ جو پاکستانی لڑکی زینب یہاں موجود ہے، وہ بھی بالکل محفوظ رہے گی۔ ایک دو ہفتوں کی رسمی کارروائی کے بعد ان تینوں کو یہاں سے پاکستان روانہ کر دیا جائے گا بلکہ چاروں کو، میری معلومات کے مطابق کوئی سنبل نامی لڑکی بھی یہاں موجود ہے۔''

''اور میرے بارے میں کیا نوید لائے ہو؟'' میرا لہجہ پھر طنزیہ تھا۔

''تم پر دو بڑے الزامات ہیں۔ ایک تو تم نے آدم کی بیٹی قسطینا سے مل کر برج کلب پر خوفناک فضائی حملہ کرایا جس میں ایجنسی کے چیف گیرنٹ کی جان گئی۔ دوسرے آقا جان کا دوست اور دستِ راست علمی تمہارے ''مشین پسٹل'' کی فائرنگ سے ہلاک ہوا۔ دونوں معاملات سنگین ہیں۔ اس سنگینی کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ تمہارے سر کی قیمت لگ بھگ تین کروڑ روپیا مقرر کی گئی تھی...... اب بھی کچھ لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہیں...... لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں رعایتیں دی جائیں گی۔ ابھی یہ کہنا تو قبل از وقت ہوگا لیکن تمہیں سلطانی گواہ بنانے کی کوشش بھی کی جاسکتی ہے۔'' شکیل اپنی تمام تر دانش وری کے ساتھ بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شکیل صاحب! تم جس حرام زادے آقا جان کی بات کر رہے ہو، میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی انسان کا بچہ نہیں۔ شاید کسی بھیڑیے اور مکار لومڑی کے ملاپ سے تولد ہوا ہے۔ وہ عریاں ہو کر گرم توے پر بیٹھ جائے تو بھی اس کی بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔''

شکیل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، بولا۔ ''شاہ زیب! تم اپنے لیے بڑے خوفناک گڑھے کھود رہے ہو۔ یہ لوگ ان کو آخر کار ڈھونڈ لیں گے۔ تم اگر ہٹ دھرمی چھوڑ دو تو اپنے ساتھ ساتھ اُن کا بھی بھلا کرو گے۔''

''میں ہٹ دھرمی تو تب کروں جب مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو، وہ ہم تینوں کی بے خبری میں ٹاپو سے چلے گئے۔ کہاں گئے ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے دونوں ساتھیوں کو بدترین تشدد کے ذریعے مار دیا گیا۔ اب میرے ساتھ بھی جو کرنا چاہتے ہیں، کرلیں۔''

میرے اور شکیل داراب کے درمیان قریباً ایک گھنٹے بات چیت ہوئی۔ اس نے ایک ماہر سیاست داں کی طرح مجھے ڈراور لالچ، دونوں طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ یہ چھوٹا سا جزیرہ معدنی دولت سے مالا مال ہے اور یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی اس میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر یہاں سرمایہ کاری کا کوئی سین بن جائے تو ایک سوڈالر لگا کر ایک ہزار ڈالر کمانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔

شکیل داراب کی یہ ساری گفتگو میرے لیے بے کار تھی۔ وہ بھی جان گیا کہ میں کتنی بیزاری کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہا ہوں۔ جہاندیدہ شخص تھا پھر آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن میں کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میرا کندھا اب آسانی سے حرکت کرنے لگا تھا۔ انگوٹھے کا زخم بھی ٹھیک ہو رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے مجھے باہر کے حالات کی خبر ہو سکتی۔ پال نے دبے لفظوں میں مجھے ایک دفعہ پھر پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو ذہنی سکون اور تفریح کے لیے کوئی لڑکی میرے پاس بھیجی جا سکتی ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میرا ذہنی سکون تو میرے مرنے والے ساتھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور میرا ذہنی سکون تو ان لوگوں کی سلامتی سے مشروط ہے جو یہاں سے دور ایک چھوٹے سے ٹاپو کے زیر زمین مکین ہیں، ایک تاریک دریا کے کنارے ایک ایسی سنگلاخ تاریکی میں دن رات گزار رہے ہیں جہاں مصنوعی روشنی کے بغیر ایک دوسرے کے ہیولے بھی دکھائی نہیں دیتے۔

پھر بھی میں نے اس خیال سے پال کی آفر قبول کرلی کہ انڈین لڑکی بینش سے دوبارہ ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ بے شک اس کے ساتھ نامناسب حالت میں چادر کے نیچے لیٹنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تھا، مگر یہ ایک مجبوری تھی۔

''وہی انڈین آئے گی؟'' میں نے پال سے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور اس کی نیلگوں آنکھوں میں اچیک نمودار ہوئی۔ ''اچھا ماڈل ہے، لگتا ہے اس کی ڈرائیونگ تمہیں پسند آئی ہے۔''

میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا، تاہم پال کو اثبات میں جواب دیا۔

شام کے بعد خوب صورت پارسی لڑکی بینش ایک بار پھر میرے پاس تھی۔ اس رات بھی وہی پہلے والا ڈراما رچایا گیا۔ میں نے لڑکی کے لیے لگاوٹ اور بے تابی کا مظاہرہ کیا۔ قربت کے ابتدائی مراحل کی پرفارمنس دینے کے بعد وہ اپنے برائے نام لباس سے آزاد ہو گئی، میرے جسم پر بھی فقط زیریں لباس تھا۔ ہم نے چادر کی پناہ لی۔ کمرے کی لائٹس آف ہو چکی تھیں۔ میں نے اسے بانہوں میں لے لیا اور ہم نے ایک دوسرے کے کانوں میں نہایت مدھم سرگوشیاں شروع کیں۔

''تم ماڈل ہو...... اور اچھی اداکاری کرتی ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ منمنائی۔

''اس صورتِ حال کے لیے سوری جس میں ہم یہاں موجود ہیں۔'' میں نے کہا پھر ذرا توقف سے اپنی بات

جاری رکھی۔ ''گرو جی سے تمہاری ملاقات ہوئی ؟''
اس نے میرے کان سے ہونٹ لگاتے ہوئے کہا۔
''جی ہاں، میں نے آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا اور آپ کا ''شکریہ'' بھی۔''
''کیا کہا انہوں نے؟ میرا مطلب ہے کہ ''میرے راہنمائی'' والے سوال کا انہوں نے کیا جواب دیا۔''
''وہ کہنے لگے اوپر والے نے چاہا تو سب اچھا ہوگا۔ دیر ہو سکتی ہے، اندھیر نہیں۔ کچھ مشکلات بھی نظر آ رہی ہیں مگر بندے کی ہمت کے سامنے کوئی مشکل...... مشکل نہیں ہوتی۔'' وہ بالکل سانسوں میں بول رہی تھی۔ شاید اس کی آواز اس کے اپنے کانوں تک بھی نہ پہنچتی ہو، ایسا ہی لہجہ میری سرگوشیوں کا بھی تھا۔
میں نے کہا۔ ''اگر اب ملاقات ہو تو ان سے کہو کہ اس جزیرے کا دشمن آقا جان سے بڑا اور کوئی نہیں۔ میں اس کو جڑوں سے اکھاڑنے کے لیے یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اس سلسلے میں میری کوئی راہنمائی کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔''
ہم سرگوشیاں کرتے رہے اور کبھی کبھی ڈاج دینے کے لیے قدرے بلند آواز میں بھی بولتے رہے۔ میں جسمانی طور پر اس کے بہت قریب مگر ذہنی طور پر بہت دور تھا اور دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی، خوش گفتار اور گل بدن لڑکی تھی۔ اگر چند ہفتے پہلے مجھ سے اس طرح ملی ہوتی تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔
میں نے اس سے پوچھا۔ ''بیگم نسا نورل کے بارے میں کچھ پتا ہے؟''
''جو کچھ نیوز میں آ رہا ہے اس کے مطابق وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مادام ہاناوانی پوری پوری سوکن بنی ہوئی ہے اور بیگم نورل سے گن گن کر بدلے لے رہی ہے۔ عزت مآب کی موت کے بعد ان کے بڑے بیٹے کمال احمد کی موت کا پتا آپ کو چل ہی گیا ہوگا؟''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''اب عزت مآب رائے زل، شب و روز ہز ہائی نس ابراہیم کو تلاش کروا رہے ہیں۔ شاید ان کو ہر ہائی نس قسطینا سے بھی کچھ زیادہ ابراہیم کی ضرورت ہے۔''
''رائے زل کے شدید زخمی ہونے اور پھر آناً فاناً صحت یاب ہو جانے کے بارے میں عام لوگوں کا کیا خیال ہے؟'' میں نے بینش سے پوچھا۔
وہ بولی۔ ''اس بارے میں دو طرح کی رائے ہے جی، کچھ لوگ تو اسے مادام ہاناوانی کی روحانیت کا کرشمہ قرار دیتے ہیں مگر پڑھے لکھے لوگوں کا خیال یہی ہے کہ جس شخص کو جلسہ گاہ کے اسٹیج پر گولیاں لگیں، وہ رائے زل نہیں بلکہ ان سے مشابہت رکھنے والا شخص تھا...... جسے سیکیورٹی خدشات کی وجہ سے وہاں بٹھایا گیا تھا۔''
''رائے زل کی مصروفیات آج کل کیا ہیں؟''
وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ''ان کی سب سے بڑی مصروفیت تو شراب اور عورت ہی ہے...... آج کل ڈی پیلس اس ''مصروفیت'' کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آقا جان کا چہیتا خواجہ سرا خیام، ہر روز عزت مآب رائے زل کے لیے نت نئے خوب صورت چہرے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔''
مجھے ڈاکٹر ماریہ کا خیال آیا۔ میں نے بینش سے پوچھا۔ ''کیا ڈاکٹر ماریہ بھی رائے زل کے پاس ہے؟''
''جی ہاں...... جو لوگ واقفِ حال ہیں، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ماریہ ازخود رائے زل کے پاس نہیں آئی تھی بلکہ اسے مجبور کر کے بلایا گیا تھا۔ رائے زل بہت عرصے سے ڈاکٹر ماریہ پر میلی نظر رکھتے تھے۔ اب لڑائی میں فتح پانے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر ماریہ کو حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا۔ اب وہ بے چاری کسی پالتو کی طرح رائے زل کے پیچھے پیچھے رہتی ہے۔ رائے زل کے بارے میں مشہور ہے کہ...... وہ لڑکپن سے جنسی فتوحات کا شوق رکھتا ہے......'' وہ شاید کوئی واقعہ بتانا چاہتی تھی مگر جھجک کے باعث خاموش ہو گئی۔
میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر ماریہ کا ایک بچہ بھی تو تھا؟''
''جی ہاں، وہ اب ڈاکٹر ماریہ کے پاس ہی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ کے قریبی عزیز بھی رائے زل اور ہاناوانی کے عتاب سے نکل گئے ہیں...... بلکہ ان میں سے کچھ کو نئی انتظامیہ میں عہدے بھی دیے جا رہے ہیں۔''
رائے زل کا ریچھ نما جثہ اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں میرے تصور میں گھومنے لگیں۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔
صبح ناشتے کے بعد میں نے بینش کو رخصت کر دیا۔ اس حبس زدہ بے خبری میں وہ میرے لیے تازہ ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہو رہی تھی۔
یہ تیسرے یا چوتھے روز کی بات ہے۔ میں بینش کو ایک بار پھر بلانے کے لیے پال سے رابطہ کرنے کا سوچ رہا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا۔ حسبِ معمول اس کی آمد سے پہلے مجھے راڈز والی کھڑکی کے پاس بلایا گیا اور ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں

جکڑے گئے۔ چند منٹ بعد نیلی آنکھوں والا دراز قد امریکی اندر آ گیا۔

آج پال کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے مجھے یہ باور کرا رکھا تھا کہ میری اور اس کی ملاقات کے وقت کیمرے اور ڈکٹافون وغیرہ بند رہتے ہیں۔ وہ امریکن لہجے میں بولا۔ ''ایسٹرن! میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بُرا وقت ایک بار پھر شروع ہونے والا ہے۔''

''میرا بُرا وقت ختم ہی کب ہوا تھا جو پھر شروع ہو گا؟'' میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''شاید میں تمہیں یقین نہیں دلا سکا مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ آج کسی وقت تمہارا پاکستانی دوست مسٹر شکیل تم سے ملنے اور تمہیں قائل کرنے کی آخری کوشش کرے گا۔ اگر اسے پہلے کی طرح ناکامی ہوئی تو تمہیں فوراً لونگ اور اس کی تفتیشی ٹیم کے حوالے کر دیا جائے گا اور یہ بات مانی جاتی ہے کہ یہ لوگ آخر کار پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری محبت کا شکریہ پال، لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ شکیل دار اب میرا دوست نہیں، فقط ایک ''جاننے والا'' ہے۔ ایسے مفاد پرست سیاست داں کسی کے دوست ہوتے بھی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر تم لوگوں کا سوال وہی رہے گا تو میرا جواب بھی وہی رہے گا...... چاہے یہ سلسلہ سو سال بھی چلتا رہے۔ تم لوگ اپنا ستم آزما لو، میں اپنی برداشت آزماؤں گا۔''

''میں جانتا ہوں ایسٹرن کہ ہمارا واسطہ MMA کے ایک نہایت سخت جان چیمپئن سے پڑا ہے اور وہ برداشت کی آخری حد تک جائے گا لیکن برداشت کی آخری حد کے بعد اچانک موت کا علاقہ بھی تو شروع ہو جایا کرتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اتنا بڑا باصلاحیت فائٹر ایسی دردناک موت کا شکار ہو جائے۔ میں تمہیں ایک بار پھر مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی گرفتاری میں مدد کرو۔ اس طرح تم اپنے علاوہ ان کے لیے بھی کچھ رعایتیں حاصل کر لو گے۔''

میں نے کہا۔ ''جس طرح کی رعایتیں تم لوگ کرتے ہو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ عزت مآب ریان فردوس کی موت اس کی ایک بہت بڑی مثال ہے......''

''دیکھو ایسٹرن! ایکسی لینسی ریان فردوس کو ایک مشتعل گروہ نے مارا تھا، اور ذمے داروں کو سزائیں بھی مل چکی ہیں، اگر وہ واقعہ......''

پال کو اپنی بات مکمل کیے بغیر خاموش ہونا پڑا۔ اپارٹمنٹ کے دروازے پر کوئی موجود تھا۔ پال اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ باہر کوئی بااختیار شخص تھا۔ پال کو دروازہ کھولنا پڑا۔ طویل قامت لونگ جیک کسی بگولے کی طرح اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی نصف درجن مسلح گارڈز موجود تھے۔

اس نے میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا اور دانت پیس کر بولا۔ ''لے چلو اس کو۔''

پال ان کے راستے میں آیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے لونگ! مجھے تھوڑی دیر پہلے بتایا گیا تھا کہ ابھی مسٹر شکیل کو یہاں بھیجا جائے گا...... اور مزید کوشش کی جائے گی۔''

پال کی بات کے جواب میں لونگ پھنکارا۔ ''یہ نیا حکم ہے۔ کوئی مزید کوشش نہیں ہوگی۔ کتے کی دم ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔''

وہ مجھے دبوچنے کے لیے خود آگے بڑھا۔ پال نے پھر اس کا راستہ روکا۔ ''لونگ ذرا صبر کرو، پہلے مجھے رائے زل صاحب سے بات کرنے دو۔''

''میں بھی رائے زل صاحب کے پاس سے ہی آ رہا ہوں۔ صبر کا نتیجہ ہم سب نے دیکھ لیا ہے۔ اب اور انتظار حماقت کے سوا اور کچھ نہیں، تم پیچھے ہٹو۔''

''لیکن...... میں رائے زل سے بات کیے بغیر اسے لے جانے نہیں دوں گا۔''

''آفیسر! تم اپنی حد میں رہو۔'' لونگ دہاڑا اور میرا گریبان اپنی آہنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ دو آٹومیٹک رائفلوں کے بیرل میرے سر سے لگ چکے تھے۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں تھے۔ مزاحمت کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

چند ہی سیکنڈ میں لونگ اور پال کے درمیان تصادم کی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ جب لونگ نے پال کو دھکا دیا تو پال کے ساتھ آنے والے دو گارڈز آگے بڑھے مگر لونگ کے ساتھ آنے والے گارڈز تعداد میں زیادہ اور زیادہ مشتعل تھے۔ انہوں نے پال کے گارڈز کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی دوران میں لونگ کی تفتیشی ٹیم کے کچھ مزید ارکان موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے پال کو راستے سے ہٹایا اور مجھے کھینچتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر لے آئے۔

پال اپنے سیل فون پر غالباً رائے زل یا مادام سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آثار سے پتا چل رہا تھا کہ

کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ وہ مجھے لونگ کے حوالے کرنا نہیں چاہ رہا تھا، مگر لونگ کا زور چل گیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس بار میرا مسکن ڈی پیلس کے اندر ہی ایک ٹارچر سیل ٹھہرا۔ یہ سیل ڈی پیلس کے وسیع و عریض عقبی احاطے میں واقع قبرستان کے قریب تھا۔ یہ وہی اندرونی قبرستان تھا جہاں کمانڈر افغانی اور دیگر لوگوں کو دفن کیا گیا تھا۔ شاید یہیں پر کہیں کمال احمد اور ریان فردوس کی قبریں بھی تھیں۔ وہی ریان فردوس جو چند روز پہلے تک ایک بادشاہ کی سی شان و شوکت کے ساتھ ڈی پیلس میں داد عیش دیتا تھا۔ آج یہاں دو گز زمین میں منوں مٹی کے نیچے سمایا ہوا تھا۔ اس کی منظورِ نظر خواصیں جو سات پردوں میں رہتی تھیں نچلے درجے کے ملازموں اور فوجی افسروں کے حوالے تھیں۔ یا دو دو ٹکے میں فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کی ایک مثال سنبل کی صورت میں میرے سامنے تھی، جسے ہم نے آسیان نامی سیکیورٹی اہلکار کے چنگل سے نکالا تھا۔

یہ ٹارچر سیل دوسری جنگ عظیم کے عقوبت خانوں کی یاد دلا رہا تھا۔ سیاہی مائل پتھریلی دیواریں، آہنی سلاخیں، وزنی آہنی دروازے، کہیں کہیں ایذا رسانی کے آلات دیواروں پر سجے ہوئے لیکن، نصف درجن مسلح گارڈز مجھے جس کمرے میں لے کر آئے وہ باقی عقوبت خانے سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عقوبت خانے کا یہ پورشن حال ہی میں جدید تقاضوں کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے۔ مجھے ایک ایسے چوکور کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک سلائڈنگ دروازے کے سوا آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دیواروں اور فرش پر فوم جیسے کسی نرم میٹریل کی تہ تھی۔ کمرے میں خاص فوم ہی کا ایک بیڈ موجود تھا جس کے ساتھ واش روم کا چھوٹا دروازہ تھا۔ سلائڈنگ دروازے کے اندر ہی ایک چھوٹا سا روزن تھا۔ قریباً ڈیڑھ فٹ ضرب ایک فٹ کے روزن میں اسٹیل کے چمکیلے راڈ لگے ہوئے تھے۔ اس روزن کا مقصد بھی یقیناً وہی تھا جو پہلے اپارٹمنٹ میں راڈز والی بڑی کھڑکی کا تھا۔ اس کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر میری الٹی ہتھکڑی کھولی اور لگائی جاتی تھی۔

میں کوئی مزاحمت نہیں کر رہا تھا، اس کے باوجود وہ لوگ مجھے دھکے دیتے اور ٹھوکریں مارتے ہوئے اس کمرے تک لائے اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ عقوبت خانے کے کسی اور کمرے میں کسی دوسرے قیدی پر تشدد ہو رہا تھا۔ وہ ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مدھم آواز میرے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ برونائی یا جاماجی کا ہی کوئی باشندہ لگتا تھا۔

کسی نے ملائی زبان میں کڑک کر کہا۔ ”بولو...... مادام زندہ باد۔“

اس شخص نے فوراً کہا۔ ”مادام زندہ باد۔“

”زور سے بولو۔“ پہلی آواز کی گرج پھر ابھری۔ وہ شخص زور سے بولا۔ ”مادام زندہ باد...... مادام زندہ باد۔“

”اور زور سے بولو۔“ کڑک کر کہا گیا، اس کے ساتھ ہی قیدی کو کسی چیز سے مارے جانے کی آواز آئی۔

وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ”مادام زندہ باد......“ زور سے بولنے کے سبب اسے شدید کھانسی ہونے لگی۔ اسے شاید پانی وغیرہ پلایا گیا۔

گرج دار آواز نے پھر کہا۔ ”زور سے بولو...... میں اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔“

بدنصیب شخص لاچاری کے عالم میں پکارا۔ ”میں اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔“

”بولتے جاؤ۔“ ساتھ ہی تھپڑ کی زوردار آواز گونجی۔ وہ شخص کسی طوطے کی طرح یہ فقرہ بولتا چلا گیا۔

اسی دوران میں عقوبت خانے کے کسی دوسرے حصے سے کسی جواں سال عورت کی آہ و بکا بلند ہونے لگی۔ اسے بھی کسی چیز سے پیٹا جا رہا تھا اور وہ ترسناک انداز میں رو پیٹ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ عقوبت خانوں میں اس طرح کی آوازیں بھی ٹارچر کا ہی ایک حصہ ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے زیرِ تفتیش لوگوں کے ”نروس“ کو توڑا جاتا ہے۔ اگر یہ آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں تو ان کا مقصد بھی یقیناً یہی تھا۔ میں خاص فوم کے بستر پر لیٹ گیا اور خود کو ان آوازوں سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے ذہن میں کمال احمد کا خیال آیا۔ کہا تو یہی جا رہا تھا کہ وہ ڈر کر کسی جگہ چھپ گیا اور وہاں مقفل ہو کر رہ گیا۔ کھانے میں زہر کی مقررہ ڈوز نہ ملنے کے سبب اس کی موت واقع ہو گئی لیکن جابر رائے زل سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ کیا پتا کہ کمال کو بھی کسی ایسے ہی ٹارچر سیل میں ایذا دے کر مار دیا گیا ہو اور اگر وہ کھانا نہ ملنے کے سبب مرا تھا تو یہ بھی کوئی کم اذیت ناک بات نہیں تھی۔ میرا دھیان ایک بار پھر ابراہیم اور زینب کی طرف چلا گیا۔ اپنی محبوب بیوی کی خاطر ابراہیم نے خود کو ایک خطرناک مجبوری سے آزاد کرانے کی کوشش شروع کر رکھی تھی۔ اس نے زینب کو ایک دفعہ کھونے کے بعد پایا تھا۔ اب وہ دونوں پھر جدا ہو جاتے

تو یہ بہت بڑا المیہ تھا۔

چوبیس گھنٹے تک تو مجھ پر کوئی آفت نہیں ٹوٹی۔ صرف یہ ہوتا رہا کہ اس عقوبت خانے کے مختلف کمروں سے بلند ہونے والی کربناک آوازیں مجھے بے طرح جھنجوڑتی رہیں۔ اگلے روز مجھے روزن کے قریب بلا کر میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں باندھے گئے اور پھر چند منٹ بعد مجھے لونگ کی منحوس شکل نظر آ گئی۔ وہ جس طرح کل مجھے اچانک اپارٹمنٹ کے آرام دہ ماحول سے کھینچ کر یہاں لے آیا تھا، میرا یہ شک یقین میں بدل رہا تھا کہ اپارٹمنٹ میں سی سی ٹی وی کیمرے بند ہونے کے باوجود مجھے دیکھا اور سنا جا رہا تھا۔ پال کے ساتھ گفتگو کے دوران میں جب میں نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ شکیل داراب کو مجھ سے دوبارہ ملاقات کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو مجھے فوراً ٹارچ سیل منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

لونگ نے کسی بھیڑیے ہی کی طرح میرا منہ اپنے آہنی پنجے میں جکڑا اور اتنے زور سے دبایا کہ مجھے اپنا جبڑا ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پھنکارا۔ ”اب سب کچھ بکو گے، کیونکہ موت کی بھیک مانگنے سے بھی موت ملے گی نہیں۔“

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”زندگی کی طرح موت بھی تمہارے اختیار میں نہیں۔ تم کیپٹن تبارک کو مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ تمہاری ہی فائرنگ سے مر گیا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہو جاتا ہے اور مجھے پتا ہے میں قبرستان سے زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔“

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اسٹیل کا دروازہ سلائڈ کر کے کھلا اور میں نے نیم گنجے آقا جان کو اپنے سامنے پایا۔ وہ شاندار لباس میں تھا۔ اب اس کی حیثیت جاماجی کے نائب فرمانروا کی تھی۔ اس کے عقب میں مسلح شاہی دستہ بھی نظر آیا لیکن وہ باہر ہی رک گیا۔ ان میں سے صرف دو تنومند گارڈز اندر آئے۔

آقا جان کی آنکھوں میں کینہ اور نفرت کی بجلی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر آگے پیچھے جھلایا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ”کیوں باسٹرڈ! اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے یا نہیں؟“

”تم پہاڑ نہیں ہو آقا جان! کچرے اور غلاظت کا ڈھیر ہو۔ ایسے ڈھیر ایک ہی تیز بارش میں زمین کے برابر ہو جایا کرتے ہیں۔“

اس نے بھڑک کر کئی زوردار طمانچے میرے چہرے پر رسید کیے۔ یقیناً یہ اس ایک طمانچے کا بدلہ تھا جو میں نے ڈی پیلس کے سامنے اس کے منہ پر مارا اور گونج پورے جاماجی نے سنی تھی۔ ایک بااختیار شخص کے منہ پر یہ طمانچہ ضرب المثل بن گیا تھا۔ آقا جان ایک ہزار طمانچے بھی میرے منہ پر مار لیتا تو اس ”فی البدیہہ“ طمانچے کا داغ نہیں دھل سکتا تھا۔

آقا جان کے اشارے پر دونوں تنومند گارڈز مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ مجھے بے طرح زدوکوب کرنے لگے۔ میرے لباس کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ ایک تار بھی باقی نہیں بچا۔ کلیجا ٹھنڈا کرنے کے لیے لونگ بھی اس مار پیٹ میں شریک ہو گیا۔ کئی بار مجھے اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخا گیا۔ مجھے اپنے سامنے ایسی بیدردی سے پٹوا کر آقا جان کا سینہ خوشی سے پھول رہا تھا۔

نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے اندازہ ہوا کہ آقا جان نے میرے سر پر ایک سخت ٹھوکر لگائی ہے اور مغلظات بکتا باہر چلا گیا ہے۔ اپنی زخمی ٹانگ کے سبب اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ اب بھی موجود تھی۔ اس کی یہ ٹانگ حلمی کی موت کے وقت ٹوٹی تھی (میری فائرنگ سے بچنے کے لیے اس نے جلسہ گاہ کے اسٹیج سے چھلانگ لگائی تھی)

میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ میرا جسم لباس سے محروم تھا۔ پاؤں بھی ننگے تھے۔ تاہم مجھے پتا چلا کہ میری الٹی ہتھکڑی اب کھلی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا یہ لباس نہ ہونے کی وجہ سے سردی محسوس ہوئی ہے لیکن یہ سردی کا موسم کہاں تھا؟ پھر یہ ٹھنڈ؟ میں اپنی کہنیوں پر زور دے کر بمشکل خود کو فرش سے بلند کر پایا۔ بند کمرے میں اب میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کئی تازہ چوٹوں سے خون رس رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ بے شک یہ مصنوعی سردی تھی۔ کمرے کے نامعلوم حصوں سے ائرکنڈیشنز کی یخ ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ شروع میں تو یہ ہوا زیادہ بری نہیں لگی مگر پھر بتدریج یہ تکلیف دہ ہوتی گئی۔ میں نے کپکپانا شروع کر دیا۔

پندرہ بیس منٹ کے اندر ہی یہ نوبت آ گئی کہ میرے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ شاید اذیت رسانی کا نیا طریقہ مجھ پر آزمایا جا رہا تھا۔ بلکہ یقیناً ایسا ہی تھا۔ ٹمپریچر مسلسل گرتا چلا گیا۔ میں جیسے کسی ڈیپ فریزر میں لگ گیا۔ جسم کو گرم رکھنے کے لیے میں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ میں پنجوں کے بل اچھلتا رہا اور اپنے اندر حرارت پیدا کرتا رہا۔ ایسے طریقے سخت سردی میں کارگر ہوتے ہیں مگر ایک خاص حد تک۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ درجۂ حرارت صفر سے کافی

نیچے جاچکا ہے۔شاید پندرہ بیس تک۔

میرے بالائی جسم کے سارے رگ پٹھے، پتھر کی طرح سخت ہونا شروع ہو گئے۔ سانس بھاپ کی صورت خارج ہو رہی تھی۔ میں دیکھ کر چونکا کہ بازوؤں اور ٹانگوں پر برف کے باریک ذرات نمودار ہو رہے ہیں۔ کمرے کے کسی خفیہ اسپیکر سے لونگ کی مکروہ آواز ابھری۔ ''کہتے ہیں کہ آگ کی طرح ایک جہنم برف کا بھی ہے۔ آج تم برف کے جہنم میں ہو۔ یہ جہنم تمہیں مارے گا نہیں، مگر تم زندہ بھی نہیں رہو گے۔ حل صرف ایک ہی ہے۔ ہمارے سوالوں کے جواب دے دو۔''

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر یوں محسوس ہوا کہ باقی جسم کی طرح جبڑا بھی اکڑ گیا ہے۔ بولنے کے لیے جبڑے کو حرکت دینا ضروری ہوتا ہے۔ جسم پر برف جم رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جن زخموں سے خون رس رہا تھا، وہ اب خشک نظر آنے لگے تھے۔ میں نے کمرے کے مختلف حصوں کا جائزہ لینا شروع کیا مگر کوئی ایسا خاص راستہ یا سوراخ وغیرہ نظر نہیں آیا جہاں سے یہ جان لیوا ٹھنڈ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ لونگ بدستور دھمکا رہا تھا۔ اس کی کرخت آواز میرے کانوں میں جیسے نشتر چبھو رہی تھی۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہیں بتاؤں گا کہ تشدد کسے کہتے ہیں اور تم جیسے ڈھیٹ سوّروں کی زبانیں کیسے کھلوائی جاتی ہیں۔''

سردی بڑھتی چلی گئی، ایک جان لیوا تیزی کے ساتھ مجھے جکڑتی چلی گئی۔ وہ سلاخ دار روزن جس میں سے مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی اور کھولی جاتی تھی اب بند تھا...... صرف ٹھنڈ کے آنے کے راستے تھے، باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ایک کونے میں خود کو اپنے آپ میں سمیٹ کر بیٹھا رہا۔ دھیرے دھیرے مجھے لگنے لگا کہ میں برف کی قبر میں دفن ہو رہا ہوں۔ دماغ سن ہوتا چلا جا رہا تھا پھر ایک غشی سی طاری ہونے لگی۔ اس غشی نے مجھے اردگرد کے ماحول اور اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔

میں نے تصور میں دیکھا کہ میں برہنہ بدن کسی برف زار میں بھٹک رہا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں نیلے پڑے ہوئے ہیں۔ جاناں کی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے......

میں اُسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی

اشتہار اور مکڑی

مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوئین، اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ ایک دفعہ ایک وہمی خریدار کو اخبار کے اوراق میں ایک مری ہوئی مکڑی ملی۔ اس نے ایڈیٹر سے اپنے ایک خط کے ذریعے استفسا کیا کہ اخبار میں مکڑی کا ملنا کیسی فال ہے؟ ...... مارک ٹوئین نے اس کے جواب میں لکھا:

''آپ ہمارے بہت پرانے خریدار ہیں اور شہر کے ایک معروف تاجر بھی۔ آپ کو اخبار میں جو مردہ مکڑی ملی ہے، وہ نہ نیک فال ہے نہ بد، بلکہ وہ تو ہمارے اخبار کے شعبہ اشتہارات کا اس لیے مطالعہ کر رہی تھی کہ کون سا تاجر اشتہار نہیں دیتا، تاکہ وہ اس کے گودام کے دروازے پر جالا تان کر باقی عمر اطمینان سے گزار سکے!''

مرسلہ: فیض الرحمٰن، ناظم آباد، کراچی

اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......

میں دائیں بائیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ شاید کہیں آس پاس ہی موجود ہے پھر وہ ایک برفیلے ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوتی ہے۔ لمبا قد، نازک بدن، آبشار جیسے طویل بال۔ وہ بھاگتی ہوئی میری طرف آتی ہے، اس کی دائیں بغل کے نیچے ایک رول کیا ہوا کمبل ہے اور دوسرے ہاتھ میں دنیا کی سب سے خوب صورت چیز...... حرارت بخش آگ۔ یہ جلتی ہوئی لکڑیاں ہیں، وہ کمبل میرے برہنہ جسم پر ڈالتی ہے اور جلتی ہوئی لکڑیاں میرے قریب رکھ دیتی ہے۔

''آپ نے میری مدد کی تھی۔ آج میں آپ کی مدد کر رہی ہوں۔'' اس کی گونجتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

میں اپنے تصور میں ہی سوچتا ہوں...... یہ تو مر چکی ہے، پھر یہاں کیسے ہے؟ کیا وہ سچ مچ یہاں ہے؟ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، وہ اردگرد کہیں نہیں تھی۔ نہ نرم گرم کمبل تھا نہ حرارت بخش آگ۔

میں نے اپنا جسم دیکھا، وہ واقعی نیلا پڑ رہا تھا۔ نیلگوں ہاتھ پاؤں جن پر برف کی سفیدی تھی۔ کیا واقعی کچھ ایسا ہو

جائے گا جس کی توقع اس حرام زادے لونگ کو بھی نہیں ہو گی۔ اچانک میرے دل کی دھڑکن تھم جائے گی اور رگوں میں خون جم جائے گا۔ میں نے کئی چہروں کو اپنے تصور میں دیکھا۔ سُریلی آواز والی ریشمی...... جو کبھی اپنے ظالم شوہر پرویز سے تنگ تھی۔ اب اسے اس شوہر سے ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی تھی۔ اس کی شادی دوسری جگہ ہو چکی تھی پھر میری نگاہوں کے سامنے چاچا رزاق کا چہرہ آیا جو کبھی ایک گول کیپر تھا۔ اس نے اپنی بیٹی ریشمی کے لیے ملنگی ڈیرے پر لازوال قربانی دی تھی اور خوبرو رضوان ٹی، جو ایک کڑے امتحان سے گزرا تھا اور اس کے اندر سے ایک باہمت نوجوان برآمد ہوا تھا۔ ماضی قریب کے یہ سارے چہرے مجھے ایک برفیلی دھند میں چھپے نظر آرہے تھے۔

مجھے لگا کہ اذیت کی انتہا کو چھو کر میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ کیا یہ قوتِ مدافعت تھی جو کمزور پڑ رہی تھی۔ میں اس صورتِ حال سے فرار چاہتا تھا...... چاہے یہ تھوڑی دیر کے لیے ہی ہوتا۔ میں نے اپنے جسم اور دل و دماغ کی تمام قوت جمع کی اور ایک ناقابلِ شناخت آواز میں بمشکل بولا۔ ''لونگ! مجھے لگتا ہے...... کہ تم...... مجھے کھو دو گے...... تمہیں کچھ حاصل...... نہیں ہو پائے...... گا۔''

''تو پھر بولو، کیا چاہتے ہو؟''

''تم بھی...... جانتے ہو...... میں کیا...... چاہتا...... ہوں۔'' میں بے حد دشواری سے یہ کپکپاتا فقرہ مکمل کر پایا۔

''حرارت؟'' لونگ نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے شاید گہری سانس لے کر کہا تھا۔ ''چلو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔''

سردی بتدریج کم ہونے لگی۔ نیم غشی کی سی کیفیت میں مجھے لگا کہ میری رگوں میں جمتا ہوا خون پھر رواں ہو رہا ہے۔ میں وہیں فرش پر پڑا رہا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں فرش یا دیواروں پر منڈھے ہوئے ریگزین اور فوم کو پھاڑ دوں اور سردی سے بچنے کے لیے اس کے اندر گھس جاؤں اور شاید آدھ پون گھنٹا پہلے میں نے یہ کوشش کی بھی تھی مگر ناکام رہا تھا...... یہ ریگزین اور فوم نہیں تھا کوئی اینٹی فائر قسم کا میٹریل تھا۔

ٹمپریچر بتدریج اوپر آتا گیا۔ میں اب قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ پتھرائے گئے رگ پٹھے بھی اب کچھ رواں محسوس ہونے لگے۔ میں نے خود کو بمشکل اٹھایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...... پانچ دس منٹ کے اندر ٹمپریچر نارمل ہوا...... اور پھر بڑھنا شروع ہو گیا۔ حرارت پہلے تو کچھ سکون دیتی رہی...... جیسے دسمبر کے ٹھٹھرے دنوں کی دھوپ جسم میں جذب ہو رہی ہو، مگر پھر اس ''دھوپ'' سے جسم میں سوئیاں سی چبھنا شروع ہو گئیں۔ ٹمپریچر بڑھتا جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ پہلے برف کا جہنم اور اب آگ کا جہنم۔

حرارت بڑھتی چلی گئی۔ میرے دو چار زخموں سے پھر خون رسنا شروع ہو گیا۔ سر اور سینے کے بالوں میں رکی ہوئی برف بھی پہلے پگھلی پھر بڑھتی ہوئی حرارت میں اوجھل ہونے لگی۔ دیواروں اور فرش پر منڈھا ہوا فوم اور ریگزین شدید سردی کے بعد وہ شدید گرمی بھی آسانی سے برداشت کر رہا تھا۔ میرے پاؤں جلنے لگے اور جسم کے ہر مسام سے پسینا دھاروں کی طرح بہہ نکلا۔ مجھے وہ مناظر یاد آگئے جب میں اور قسطینا ائر ریڈ شیلٹر میں چھپے تھے اور آتشزدگی کے سبب وہ شیلٹر تندور کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ تندور اس تندور سے زیادہ دہک رہا تھا۔ شدید ترین جلن پاؤں کے تلووں محسوس کر رہے تھے۔ میں کبھی ایک پاؤں اٹھاتا کبھی دوسرا۔ ایک دو منٹ بعد اس طرح بھی گزارا ممکن نہ رہا، میں چلّانے لگا۔

یہ اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ آگ تو جلا دیتی ہے اور ایک دو منٹ کے اندر ختم کر دیتی ہے۔ لیکن اگر درجہ حرارت کو اس طرح بڑھایا جائے کہ بندے کو آگ تو نہ لگے مگر وہ دھیمی آنچ پر روسٹ ہونا شروع ہو جائے تو اس تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل ہو گا اور میں اسی تکلیف سے گزر رہا تھا۔ بے انتہا تپی ہوئی دیواریں اور تپا ہوا فرش۔ کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ کوئی گوشۂ اماں نہیں تھا۔ میں تلووں کو جلنے سے بچانے کے لیے، ہاتھوں کے بل آگے کو گر گیا۔ وہ پوزیشن ہو گئی جو ڈنٹر پیلنے کے وقت ہوتی ہے۔ تلووں کو ذرا سکون ملا تو ہتھیلیاں کباب ہونے لگیں۔ میں تڑپ کر پھر پاؤں پر کھڑا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب تلوے جلتے ہیں تو ماممتا بھی گہنا جاتی ہے...... اس بندریا کی حکایت بیان کی جاتی ہے جس نے خود کو جلن سے بچانے کے لیے اپنا بچہ پاؤں کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں شاید اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہ کر سکوں جو مجھ پر طاری تھی۔ میں واقعی مر جانا چاہتا تھا۔

لونگ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''جلدی سے بول دو...... ورنہ ابھی اور بہت کچھ باقی ہے۔''

ایک سیکنڈ صرف ایک سیکنڈ کے لیے میرے دل میں آیا کہ خود اپنی جان لے لوں مگر کس طرح؟ ان لوگوں نے

کسی طرح کے چھٹکارے کا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔ کئی دفعہ تشدد کے گھیرے میں آئے ہوئے قیدی خود کو زخمی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہاں تو کوئی ایسی شے موجود ہی نہیں تھی جس سے کسی بھی طرح خود کو یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا جاسکے۔ حتیٰ کہ دیواروں اور فرش پر بھی خاص قسم کا فوم منڈھ دیا گیا تھا اور اس کے اوپر ریگ زین نما میٹریل کی دبیز تہ تھی۔

تکلیف جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو قدرت کا نظام حرکت میں آتا ہے۔ انسانی ذہن کا رابطہ اس کے جسم سے منقطع ہونے لگتا ہے۔ میں بھی اس وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ عین اس وقت جب سانس سینے میں اٹک رہی تھی اور جسم پر آبلے سے نمودار ہونے لگے تھے، میں ہوش و حواس کھو کر گر گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں دائیں پہلو پر گرا ہوں اور یہ پہلو تپے ہوئے فرش کے لمس سے چیخ اٹھا ہے۔

دوبارہ حواس بحال ہوئے تو ایک اندازہ سا ہوا کہ دو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس عقوبت خانے کا ٹمپریچر اب نارمل تھا۔ دروازے میں موجود وہ مختصر روزن بھی کھلا ہوا تھا جس میں اسٹیل کے راڈ لگے تھے۔ روزن چونکہ کھلا ہوا تھا اس لیے کسی قریبی کمرے سے کسی قیدی سے مار پیٹ کی مدھم آوازیں آرہی تھیں اور اس کی آہ و بکا بھی سنائی دے رہی تھی۔ غالباً مارنے والوں کے حکم پر وہ گاہے بگاہے پکارنے لگتا تھا۔ ”عزت مآب (رائے زل) زندہ باد......“

میں نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ ہتھیلیوں اور تلووں پر آبلے تھے۔ سارے جسم پر چھوٹے بڑے سرخ نشان نظر آرہے تھے۔ یہ شدید جلن کا نتیجہ تھے۔ خاص طور سے جس پہلو میں گرا تھا وہ زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ بے ہوشی کی ہی حالت میں مجھے ایک انڈرویئر پہنایا گیا تھا اور میرے جسم کے متاثرہ حصوں پر ”فلیمازین“ قسم کی کوئی دوا لگائی گئی تھی۔

لونگ کی آواز سنائی دی۔ ”تھوڑا آرام کرلو، پھر دوبارہ کام شروع کریں گے۔“

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”لونگ جیک! اتنا ہی ظلم کرو جتنا سہہ سکتے ہو۔“

لونگ نے ایک زہر بھرا قہقہہ بلند کیا۔ ”تم اسے ظلم کہتے ہو، یہ تو ایک ٹریلر ہے۔ فلم ابھی باقی ہے اور یہ ٹریلر بھی ہم نے تمہاری فرمائش پر ہی تمہیں دکھایا ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ تمہیں حرارت دی جائے۔“

☆☆☆

اگلے دس پندرہ روز اس قدر بھیانک تھے کہ میں ان کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو اس کے لیے دفتر درکار ہوں گے...... اور اظہار کا حق شاید پھر بھی ادا نہ ہو سکے۔ وہ ایک ایسی اذیت تھی جو صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔ جسم کو جلا دینا اور بات ہے مگر جسم کو ہلکی آنچ پر جلن کے ناقابلِ برداشت کرب سے دوچار کرنا اور بات۔ ایک دو مواقع ایسے آئے جب مجھے واقعی مرنے کی خواہش ہوئی۔

ٹمپریچر جب بڑھنا شروع ہوتا تھا تو پہلے جسم گرم ہوتا تھا، پھر پسینا دھاروں کی صورت میرے مساموں سے بہتا تھا اور شدید پیاس محسوس ہونے لگتی تھی۔ گلے میں کانٹے سے پڑتے تھے پھر پسینا خشک ہونے لگتا تھا اور ناقابلِ بیان جلن کا آغاز ہوتا تھا۔ اس جلن سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی تھی۔ جہاں جہاں پہلے سے آبلے موجود ہوتے تھے وہ جگہ زیادہ اذیت دیتی تھی۔ بالآخر میں چلّانے لگتا تھا۔ اپنے ہی جھلستے ہوئے بالوں کی بو میرے نتھنوں سے ٹکراتی تھی۔

لونگ کی دور افتادہ آواز میرے کانوں تک پہنچتی تھی۔ ”میرے سوال کا جواب دو ایسٹرن، اور اپنی جان چھڑالو۔“

جب جب یہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تب تب میرے اندر ایک ضد پیدا ہوتی تھی، ایک جنون جاگتا تھا...... میں مر جاؤں گا لیکن زینب، ابراہیم، سجاول اور دیگر ساتھیوں کی نشاندہی نہیں کروں گا۔ مجھے بھون ڈالو، میرے گوشت کے ریشے ریشے کو جدا کردو، میری ہڈیوں میں درد کی ہزار ہا میخیں ٹھونک دو، لیکن میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ تمہارا واسطہ ایک چیمپ سے پڑا ہے، اور وہ RING کا چیمپ ہی نہیں، وہ درد سہنے کا بھی چیمپ ہے، وہ تم گوروں کو جیت کر دکھائے گا...... تم کو مر کر دکھائے گا۔

قدرت نے انسان سے وعدہ کررکھا ہے کہ کسی ذی نفس کو اس کی برداشت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اس وعدے پر میرا یقین پختہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میری برداشت آخری حدوں کو چھونے لگتی تو میں اس وعدے کے ایفا ہونے کا انتظار کرتا۔ میں اس بے ہوشی کا انتظار کرتا جو جسم اور ذہن کا رابطہ منقطع کر کے انسان کو ”نامعلوم“ کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے اور پھر وہ بے ہوشی لپکتی ہوئی آتی، مجھے اپنی ٹھنڈی آغوش میں لے لیتی۔ میں اپنے آبلوں، اپنے پیپ آلود زخموں اور اپنی بے پناہ جلن سے

بہت دور چلا جاتا۔

ایک بار پھر مجھے طبی امداد دی جاتی۔ میرے جسم کے مختلف حصوں پر آئنٹمنٹ وغیرہ لگائی جاتی اور غالباً اینٹی بائیوٹک بھی انجیکٹ کی جاتی لیکن یہ دیکھ بھال کسی ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی۔ اس دیکھ بھال کا واحد مقصد یہی تھا کہ میں درد سہنے کے لیے زندہ رہوں اور میرے جسم کی کھال بھی زندہ رہے تا کہ درد سہہ سکے۔

ایک روز میں نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی گردن پر بے پناہ بوجھ پڑا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مجھے ہیجڑے خیام مانش کا چہرہ نظر آیا۔ ہاں یہ وہی تھا اور میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس نے اپنا پاؤں میری گردن پر رکھا ہوا تھا اور سرمہ لگی آنکھوں سے قہرناک انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں ایک بار پھر جکڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں بیڑی اور ہاتھوں میں الٹی ہتھکڑی تھی۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر خیام نے اپنا پاؤں میری گردن پر سے ہٹا لیا۔ میں نے کوشش کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ خیام بنگالی لہجے کی اردو میں بولا۔ ''توم کا کیا حال ہے چیمپئن شوپ؟'' وہ س کو ش بولتا تھا۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا فربہ جسم حسبِ معمول زرق برق کپڑوں میں کسا ہوا تھا۔ اس نے رخساروں پر غازہ تھوپا ہوا تھا جو اس کا سانولا رنگ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی اور اس سرخی کو پان کی لالی نے مزید بھدا کر دیا تھا۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی سی آواز میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''توم کے شاتھ شونے کو من چاہتا ہے (ساتھ سونے کو دل چاہتا ہے) پر اتنے زخم ہیں تمہاری باڈی پر کہ گھن آتی ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

وہ عورتوں کی طرح بل کھا کر بولا۔ ''اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنے کے کچھ اور بھی طور یقے (طریقے) ہیں میرے پاش۔''

اس نے اپنی زرق برق قمیص اوپر اٹھائی۔ پیٹ پر چمڑے کی ایک موٹی بیلٹ بندھی ہوئی تھی جس پر کہیں کہیں اسٹیل کے بٹن چمکتے تھے۔ اس نے بیلٹ کھول لی اور اسے کسی کوڑے کی طرح لہرا کر بولا۔ ''شیانے کہتے ہیں...... جلی ہوئی کھال پر چوٹ پڑے تو شخت تو کلیف (سخت تکلیف) ہوتی ہے۔ اس تو کلیف سے پہلے ہی کچھ بول دو تو آچھا ہے......''

مجھے بولنا ہوتا تو بہت پہلے بول چکا ہوتا۔ اب تو ایسے لگ رہا تھا جیسے زیادہ سفر طے ہو گیا ہے، تھوڑا باقی ہے۔ کسی دن کچھ ایسا ہوگا کہ حرکتِ قلب بند ہوگی اور مجھے زندگی موت کے درمیان لٹکائے رکھنے کے خواہش مند، منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

ہیجڑے خیام نے پان چباتے ہوئے وہی سوال کیا جو اَب تک ہزاروں دفعہ کیا جا چکا تھا۔ میرا جواب بھی وہی تھا جو میں ہزاروں دفعہ دے چکا تھا۔ ہیجڑے خیام کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے خاص طور سے انیق کی بازیابی میں دلچسپی ہے۔ یہ انیق ہی تھا جس نے اسے ننگی کا ناچ نچایا تھا اور اسے، اس کے مردہ ساتھی سمیت کئی پہر تک ایک فریزر میں بند رکھا تھا۔

سوال جواب کے ایک مرحلے میں خیام جھنجلا گیا۔ اس نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ وہ مجھ پر پل پڑا، چمڑے کی وزنی بیلٹ سے مجھے بے دریغ مارنے لگا اور اپنی ٹھوکروں سے میرے جسم کے نازک حصوں کو نشانہ بنانے لگا۔ وہ ایک جنونی تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ یقیناً اسی طرح اس نے زینب فدا کو بھی نشانہ بنایا ہو گا۔ تب کوئی خاص قسم کا آتشیں پان کھا کر وہ زینب پر پل پڑا تھا اور اسے نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا تھا۔ (اگر اس وقت انیق تک زینب کی فریاد نہ پہنچی ہوتی تو پتا نہیں کیا ہو جاتا)

وہ مجھے مار مار کر ہانپ گیا تو ایک بار پھر میری گردن پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے زنانہ جوتے کی ایڑی میری رگوں کو مسل رہی تھی۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ کارڈ سائز فوٹو گراف نکالے، اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ ''اش طرح کا انجام ہوئے گا توم کا۔ اش طرح کا ہوئے گا۔''

یہ ان بدنصیب قیدیوں کی تصویریں تھیں جنہیں شدید ٹمپریچر والے اسی کمرے میں اذیت کے دوزخ سے گزارا گیا تھا۔ ان میں دو تین تصویریں عورتوں کی تھیں، باقی مرد تھے اور ان مردوں میں زیادہ تر گرین فورس کے لوگ تھے۔ انہیں واقعی ہلکی آنچ پر روسٹ کر دیا گیا تھا۔ آخری وقت میں ان کے سر کے بال چرمر ہو گئے تھے۔ پلکیں گل گئی تھیں، کئی جگہ سے جسم کی کھال پک کر لٹک گئی تھی۔ آبلے پھٹ گئے تھے اور رنگت سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی۔ لاشوں کی یہ حالت دیکھے جانے کے لائق نہیں تھی۔

خیام کا پاؤں بدستور میری گردن پر تھا۔ وہ اپنے ''پان رنگے دانت'' پیس کر بولا۔ ''چندون پہلے توم کو موقع دیا گیا تھا کہ توم کچھ شوچ شمجھ لے۔ پرتوم نے شمجھا کہ توم اشی طرح اش بینش کے ساؤتھ (ساتھ) عیش کرتا رہے گا۔''

بولتے ہوئے وہ بے رحمی سے میری گردن پر اپنے پاؤں کا دباؤ بھی بڑھا دیتا تھا۔ بے بسی حد سے تجاوز کر رہی تھی مگر میں اس ہیجڑے کو بتانا چاہتا تھا کہ بندھے ہاتھوں اور بندھی ٹانگوں کے ساتھ بھی اس جیسے غلیظ جانور کے ساتھ کچھ نہ کچھ تو کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً اسے میرے حوالے سے کچھ ہدایات بھی دی گئی ہوں گی مگر وہ عالم طیش میں بے پروائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے اس کے جسم کا فاصلہ اور زاویہ بھانپ لیا۔ جونہی موقع ملا میں نے اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے اپنے جسم کو موڑا، سر کی جانب اٹھایا اور بندھے ہوئے پاؤں سے ایک شدید ضرب خیام کی پشت پر لگائی۔ اس کا سارا وزن ایک ٹانگ پر تھا، کیونکہ دوسرا پاؤں اس نے میری گردن پر رکھا ہوا تھا۔ ضرب کھا کر وہ اُڑتا ہوا دروازے سے ٹکرایا...... یہ ''ایم ایم اے'' کے فائٹر کی ضرب تھی۔ اگر دروازے پر فوم کی تہ نہ ہوتی تو شاید خیام کا سر دو ٹکڑے ہو گیا ہوتا۔ پھر بھی چوٹ کم شدید نہیں تھی۔ وہ الٹ کر میرے قدموں میں گرا۔ میں نے اس کی ناک سے خون کی پچکاری نکلتے دیکھی۔ میں نے لیٹے لیٹے دونوں پاؤں سے پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کاری چوٹ لگائی۔ وہ تڑپ کر کئی فٹ پیچھے گیا۔ پھر وہیں کمر پکڑ کر بل کھانے لگا۔ اس کی کربناک آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ''ہائے ماردیا، ہائے توڑ ڈالی ہوڈی (ہڈی)۔''

سی سی ٹی وی پر سب کچھ دیکھ لیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو رول کر کے پھر خیام کے قریب جاتا اور مزید ضرب لگاتا، دروازہ کھلا اور امریکن گارڈز جھپٹتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ وہ مجھ پر پل پڑے اور رائفل کے کندوں سے بے دریغ مارنے لگے۔ چند گارڈز نے واویلا کرتے ہوئے فربہ اندام خیام کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور تیزی سے باہر لے گئے۔ وہ اب ٹھیٹ بنگالی میں پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ انسان کو بدترین حالات میں بھی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ میں بھی کوشش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک موقع مجھے اس وقت نظر آیا جب خواجہ سرا خیام کو دروازے سے باہر نکالا جارہا تھا۔ وہ باہر نکل چکا تھا مگر دروازہ ابھی پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔

دروازے سے میرا فاصلہ اتفاقاً بہت کم تھا۔ میں اپنے پنجوں کے بل اچھلا اور جست کرتا ہوا دروازے سے باہر گرا۔ گرتے ساتھ ہی میں اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ماربل کے فرش پر رول کرنے لگا۔ رول کرتا اور لڑھکتا ہوا میں پلک جھپکتے میں قالین پوش سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ میں نے بلاتوقف خود کو سیڑھیوں سے گرا دیا۔ جہاں نصف سیڑھیاں مکمل ہوتی تھیں وہاں مجھے ایک طویل کھڑکی نظر آرہی تھی جس میں اوپر تک قریباً دو مربع فٹ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں شیشہ توڑ کر خود کو باہر گرا دیتا تو کم از کم اس جہنمی ٹارچ سیل میں مرنے سے تو بچ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں شدید زخمی ہوتا اور مجھے کچھ عرصے کے لیے ''ہاسپٹلائزڈ'' کرنا پڑ جاتا۔ یا پھر کوئی کرشمہ بھی رونما ہوسکتا تھا۔ مسلح گارڈز تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپک رہے تھے۔ میرے پاس شاید ایک یا دو سیکنڈ کا وقت تھا۔ میں جانتا نہیں تھا کہ میں کس فلور پر ہوں۔ بس ایک اندازہ سا تھا کہ یہ فرسٹ فلور ہے۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا، میں نے سر کی ضرب سے ایک شیشے کو چکنا چور کیا مگر اس سے پہلے کہ میں خود کو باہر گرا پاتا، ایک گارڈ نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے کوئی نصف درجن گارڈز مجھ سے چمٹ چکے تھے۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' میں وحشت میں چلّایا۔

میری بات کا جواب انہوں نے ٹھوکروں اور گھونسوں سے دیا۔ مجھے سیڑھیوں پر گھسیٹتے ہوئے وہ واپس سیل میں لے آئے۔ ان کا طیش بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اسپیکر سے ابھرنے والی لونگ کی آواز نے انہیں مزید مار پیٹ سے روک دیا۔ یقیناً وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی ایسی شدید چوٹ لگ جائے جس کے بعد مجھے ''حرارت'' والی اذیت نہ دی جاسکے یا اس کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے موقوف کرنا پڑے۔

ایک دو منٹ بعد ہی میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ دروازہ اور روزن دونوں آٹومیٹک طریقے سے بند ہو گئے۔ بیپ کی وہی مختصر سی منحوس آواز آئی جو تب پیدا ہوتی تھی جب ٹمپریچر بڑھنا شروع ہوتا تھا۔ اب یہ آواز مجھے اتنی دہشت ناک لگتی تھی کہ اسے سنتے ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔ ٹمپریچر دھیرے دھیرے بڑھنا شروع ہو گیا۔ لگتا تھا کہ آج مجھے اپنی کوشش کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور یہ ٹمپریچر زیادہ اوپر جائے گا۔ اگر دیکھا جاتا تو میں نے ایک بیکار کوشش ہی کی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پاؤں بھی آزاد

نہیں تھے۔ میں کھڑکی سے باہر کود بھی جاتا تو کہاں جا سکتا تھا۔ شاید یہ ایک اضطراری کوشش تھی۔ ویسی ہی کوشش جیسی، زنجیر سے بندھا ہوا جانور کرتا ہے۔ جانتا بھی ہے کہ چھوٹ نہیں سکتا، پھر بھی زنجیر سے الجھتا رہتا ہے۔

ٹمپریچر بتدریج اوپر آرہا تھا۔ مجھے لگا کہ میری ہمت جواب دینے لگی ہے۔ کچھ بھی تھا، میں گوشت پوشت کا انسان تھا، جس کی قوتِ مدافعت اور برداشت کی ایک نہ ایک حد ہوتی ہے۔ ''کیا کروں؟ کیا کروں؟'' میں نے جیسے دل ہی دل میں پکار کر خود سے پوچھا۔

کیا وقتی فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈوں؟

کیا ان لوگوں کو کوئی ڈاج دے کر عارضی ریلیف حاصل کروں۔

ہمت ہارنے اور ہتھیار پھینکنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اگر میں ایسا کرتا تو پھر جوان جہان سیفی کی موت کس خانے میں فٹ ہوتی؟ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا تھا تاکہ وہ تشدد کے سامنے کہیں اپنی زبان نہ کھول دے۔

''کیا سوچ رہے ہو بدبخت چیمپئن؟'' لونگ کی مکروہ آواز اسپیکر سے نکل کر اس ٹارچ سیل میں گونجی۔

''میں...... مسٹر پال سے ملنا چاہتا ہوں...... یا پھر شکیل داراب سے۔''

''ان لوگوں سے ملنے کا وقت گزر چکا ہے۔'' لونگ نے سفاک لہجے میں کہا۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں باسٹرڈ، اب تم کو صرف اپنے ساتھیوں کی نشاندہی کرنی ہے...... اور کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔''

اسپیکر آف ہو گیا۔ ٹمپریچر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پسینے کی دھاریں نکلنا شروع ہوگئیں۔ بہت جلد یہ پسینا خشک ہو جاتا تھا۔ گلے میں پیاس سے کانٹے پڑ جاتے تھے۔ پھر وہی جسم و جاں کو جھلسا دینے والی تپش...... وہی جان لیوا جلن۔

☆☆☆

یہ بڑا منفرد عقوبت خانہ تھا۔ ہر جگہ فوم اور ریگزین کی وہی ایک ڈیڑھ انچ موٹی تہ تھی جو شاک آبزرور کا کام کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس پر بے تحاشا مُکے برسائے۔ یہ مُکے میں نے عام دیوار پر برسائے ہوتے تو میری کھال چھل جاتی اور ہاتھ کی ہڈیاں ننگی ہو جاتیں مگر یہاں مُکے برسانے سے ہاتھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ یہ خاص قسم کا ریگزین تپ کر انگارا ہو جاتا تھا مگر نہ پگھلتا تھا نہ کسی

اور طرح متاثر ہوتا تھا۔ عقوبت خانے کے علاوہ واش روم میں بھی فرش اور دیواروں پر یہی میٹریل استعمال کیا گیا تھا۔

مجھے جو کھانا دیا جاتا تھا، وہ ڈسپوزایبل برتنوں میں ہوتا تھا۔ کھانا کسی وقت میں کھاتا تھا کسی وقت پڑا ہی رہنے دیتا تھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ کھانا بالکل بند کر دوں تاکہ جسم میں اتنی جان ہی نہ رہے کہ اذیت محسوس کر سکے۔ لیکن یہ بے سود تھا۔ میرے اندر جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے یہ لوگ مجھے ''انفیوژن'' کے ذریعے خوراک دے سکتے تھے یا طاقت کے انجکشنز لگا سکتے تھے۔

بے بسی کے عالم میں یہ سوچ بھی ذہن میں آئی تھی کہ کچھ قیدی مسلسل اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی کلائیوں وغیرہ کی شریانوں کو اپنے ہی دانتوں سے ادھیڑ دیتے ہیں اور خون کے زیادہ اخراج کے سبب ایک ایسی نقاہت کا شکار ہوتے ہیں جو خاموشی سے موت میں بدل جاتی ہے۔

لیکن کیا اس طرح اپنی جان لینا ٹھیک تھا؟ کیا یہ بزدلی نہیں تھی؟ کیا یہ قدرت کے اس وعدے پر شک نہیں تھا کہ وہ اوپر والا کسی ذی نفس کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا؟ ایسا سوچ کر ایک عجیب سا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔

لونگ کی اس بے مثال اذیت رسانی کے دوران میں دو تین دن کا وقفہ بھی آ جاتا تھا۔ یہ وقفہ اس لیے ہوتا تھا کہ میری چمڑی کی حالت بہتر ہو جائے اور وہ بہتر طریقے سے جلن کی اذیت کو محسوس کر سکے۔

ایک ایسے ہی وقفے کے دوران میں، میں فرش پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ ہاتھ سیدھی ہتھکڑی میں اور پاؤں بیڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو افراد اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ''سویپر'' تھا۔ اس نے فرش پر سے خون اور پیپ کے وہ داغ صاف کیے تھے جو میرے زخموں کے سبب لگے تھے۔ دوسرا ڈاکٹر تھا جس نے مجھے اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا تھا اور جو تین چار سیریس زخم تھے، ان پر بینڈیج کی تھی۔ مجھے تیز بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر رات کے بعد سویرا ہے۔ میری یہ رات بہت طویل اور اندھیری ہوتی جا رہی تھی۔ میرا سویرا نظر نہیں آ رہا تھا مگر دل کی گواہی تھی کہ سویرا آئے گا۔ اندھیرا بہت گہرا ہو جاتا ہے تو صبح کی امید بھی توانا ہو جاتی ہے۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سلاخ دار روزن سے باہر تمتمائے چہرے والا سفاک امریکی لونگ جیک کھڑا تھا۔ بھیڑیا......سو فیصد بھیڑیا۔ ایسے ہی لگتا تھا کہ کسی انسان کے جسم پر خونخوار بھیڑیے کا سر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی ڈینش ہے۔ اس کے طور اطوار اور حلیہ دیکھ کر نجانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ڈنمارک میں میرے ہی شہر کوپن ہیگن کا رہنے والا ہوگا۔ لونگ اور وہ شخص آپس میں کچھ دیر کھسر پھسر کرتے رہے، پھر وہ شخص اپنے سیل فون پر بات کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

لونگ میرے قریب آیا۔ اس نے روزن میں سے مجھے جھانکا۔ نہایت سرد لہجے میں بولا۔ ''اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ......تم نے صرف یہ محاورہ سنا ہوا ہے کہ بندہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے ہوتوں سوتوں کو سچ مچ زندگی موت کے درمیان لٹکاؤں گا......''

اس کے ساتھ ہی اس نے روزن سے میری جانب تھوکا اور گالیاں بکتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز کسی دوسرے بدنصیب قیدی کے کمرے سے آرہی تھی۔

لونگ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور سینے میں بے چینی کی ایک نئی لہر اٹھنے لگی تھی۔ لونگ کے ساتھ ایک ڈینش نظر آیا تھا......اور لونگ نے میرے ہوتوں سوتوں کی بات کی تھی۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا وہ میرے کسی قریبی عزیز پر ہاتھ ڈالنے کا سوچ رہا تھا۔ ڈنمارک میں میرے والد اور والدہ کے علاوہ اور کون تھا......اور ان کے حوالے سے مجھے بہت تسلی تھی۔ وہ فی الوقت بہت محفوظ تھے اور اگر خدانخواستہ ان کی طرف سے کوئی غلطی نہ ہوتی (جس کا امکان بہت کم تھا) تو وہ کسی کی زد میں نہیں آسکتے تھے۔ درحقیقت وہ ڈنمارک میں تھے ہی نہیں۔ پلاننگ کے مطابق اب وہ سویڈن کے شہر اوسلو میں تھے اور انہوں نے خود کو اپنی چار دیواری میں اس حد تک محدود کیا ہوا تھا کہ ان تک پہنچنا ناممکن تھا۔

اور ان کو اس محفوظ ٹھکانے پر میں نے اس لیے نہیں پہنچایا تھا کہ مجھے لونگ کی طرف سے خطرہ تھا۔ جب وہ روپوش ہوئے اس وقت تک تو لونگ اور رائے زل وغیرہ کی دشمنی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ ان کی روپوشی دراصل اسی سنگین ترین دشمنی کا نتیجہ تھی جس کا تعلق یورپی گینگسٹر جان ڈیرک سے تھا۔ میں نے جان ڈیرک پر جو آخری وار کیا تھا، وہ اس کی نسلوں کو یاد رہنا تھا اور یہی وار تھا جس کے بعد جان ڈیرک اور اس کے نیٹ ورک کا ہر فرد خونخوار ہو کر دیوانہ وار مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے جان ڈیرک کے بے حد لاڈلے بیٹے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ جرائم کی دنیا کا وہ شہزادہ جس کی طرف کوئی میلی نظر سے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اس کو کوپن ہیگن کی سڑکوں پر برہنہ دوڑایا تھا اور پھر ایک چوراہے پر اسے سڑک پر لٹا کر ذبح کر ڈالا تھا۔ اس کی گردن سے ابلتا ہوا خون اور خون سے نکلتی ہوئی بھاپ آج تک میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس وقت میں نے اس مقتول سے نو، دس الفاظ پر مشتمل جو فقرہ کہا تھا، وہ بھی مجھے آج تک یاد تھا، میں نے کہا تھا......تمہارا باپ ٹھیک ہی کہتا تھا، مجھ سے دور رہو۔

جان ڈیرک کے اکلوتے بیٹے کا قتل جرائم کی دنیا کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جان ڈیرک کا ٹیکساری گینگ اور ان کے ہمنوا گروپ ہر جگہ دیوانہ وار میری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں زیادہ دیر ان سے دور نہیں رہ سکتا تھا......اور جب سے جاماجی میں مجھے ایسٹرن کی حیثیت سے پہچان لیا گیا تھا، مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ میرے گرد موت کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔

بات دور نکل گئی۔ میں ذکر کر رہا تھا لونگ کا اور اس کی مبہم دھمکی کا۔ میں نیم بے ہوش سا سیل کے فرش پر پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ دو دن خیریت سے گزر گئے ہیں۔ آج تیسرا دن تھا اور یقینی بات تھی کہ آج پھر مجھ پر گرمی یا سردی سے شدید حملہ کیا جائے گا۔ زخموں کا برا حال تھا اور جب زخموں کی صورتِ حال ایسی ہوتی تھی تو ''ذائقے کی تبدیلی'' کے لیے مجھے گرم جہنم کے بجائے سرد جہنم کی سیر کرادی جاتی تھی۔

اور پھر قریباً ایک گھنٹے بعد یہی ہوا۔ بیپ کی منحوس آواز آئی اور سیل کا ٹمپریچر مسلسل گرنا شروع ہو گیا۔ بے پناہ اذیت کے اگلے دو گھنٹے شروع ہو چکے تھے۔

میں جیسے برف کے ایک غار میں تھا۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑتے چلے جارہے تھے۔ لگتا تھا کہ میرے کاسۂ سر میں میرا دماغ سکڑ کر رہ گیا ہے، برف کا ڈھیلا بن گیا ہے۔ میں اپنے حواس کھو دوں گا یا پھر میرے جسم سے میرے دل و دماغ کا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے گا۔

نیلی آنکھوں والے پال کی دور افتادہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ شاید کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے، تم میری بکواس پر دھیان نہ دو مگر یہ سینئر

موسٹ ڈاکٹر ہے اس کی بات کو تم کیسے جھٹلا سکتے ہو۔ اب یہ بندہ مر جائے گا اور تم اپنی خون کی پیاس بجھا کر ٹھنڈے ٹھار ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔''

بھیڑیا صفت لونگ جیک کی پھنکار میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''آفیسر! میں نے اسے ایکسی لینسی رائے زل سے حاصل کیا ہے، وہی مجھ سے واپس لے سکتے ہیں۔ تم بار بار اس معاملے میں اپنی گندی ناک نہ گھسیڑو، ورنہ پچھتاؤ گے۔''

جواب میں پال نے بھی کوئی سخت بات کہی جو میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ بس اس کے آخری الفاظ میری سمجھ میں آئے۔ ''ابھی چند منٹ میں تحریری آرڈر بھی تم تک پہنچ جائے گا۔''

''تو پھر ابھی یہاں سے جاؤ آفیسر۔'' لونگ چیخ کر بولا۔ ''جب تحریری آرڈر آئے گا تو دیکھ لوں گا۔''

وہ لڑتے جھگڑتے میرے سرد جہنم سے دور چلے گئے۔ سردی اب بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی، کیونکہ روزن کھلا تھا اور ہیوی ائر کنڈیشنرز بھی بند کر دیے گئے تھے۔

چند گھنٹے بعد نیم غنودگی کی ہی کیفیت میں مجھے احساس ہوا کہ میں اب اس منحوس ٹارچ سیل سے باہر ہوں...... اور شاید اس اپارٹمنٹ میں ہوں جہاں سے مجھے پال سے چھین کر لے جایا گیا تھا۔ میں نے کوشش کر کے اپنی پلکیں اٹھائیں اور آنکھوں کو نیم وا کیا۔ مجھے اپارٹمنٹ کی چھت نظر آئی۔ میں آرام دہ بستر پر چت لیٹا تھا۔ ہاں یہ وہی اپارٹمنٹ تھا۔ میرے نتھنوں میں اسپرٹ کی بو گھس رہی تھی۔ شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے کوئی انجکشن لگایا گیا تھا۔ میرے زخموں کی پٹیاں بھی بدلی گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی، وہ فی الوقت آزاد تھے، پاؤں کو بھی حرکت دی جا سکتی تھی۔

غالباً مجھے کوئی سکون بخش دوا دی گئی تھی۔ بہت جلد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔

سونے جاگنے کا یہ دورانیہ قریباً دو دن جاری رہا۔ میری جلی ہوئی کھال کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔ جلن کی وجہ سے سر کے بال چرمر ہو کر تباہ حال ہو گئے تھے۔ یہاں اپارٹمنٹ میں لا کر میرے سر پر مشین چلائی گئی تھی اور بال بالکل چھوٹے کر دیے گئے تھے۔ سر کے متاثر حصوں پر بھی آئنٹمنٹ لگائی گئی تھی۔ مجھے صرف سیال خوراک دی جا رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر جوسز، انرجی ڈرنک اور دودھ وغیرہ کی بوتلیں رکھی تھیں۔ زیادہ طلب ہوتی تو میں خود ہی چند گھونٹ لے لیتا تھا۔

پال سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی شکیل داراب نے شکل دکھائی تھی۔ آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک دن میں نے نیم غنودگی میں اٹھ کر دودھ کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی نے خود ہی گلاس بھر کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے گلاس تھام کر اپنے مددگار کو دیکھا اور سکتے میں رہ گیا...... زمین پھٹ جاتی یا آسمان ٹوٹ کر ٹکڑوں کی صورت میں نیچے گرنے لگتا تو شاید مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اس کو دیکھ کر ہوئی۔ پھر یہ خیال ذہن میں آیا کہ شاید میں ابھی غنودگی کی حالت میں ہوں اور میرا تخیل مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ لیکن نہیں...... وہ جیتی جاگتی تاجور تھی...... اور میرے سامنے بیٹھی تھی۔

وہی پاکستانی رواج کا لباس، شلوار قمیص اور دوپٹا نما چادر۔ اس کی کلائیوں میں ہمیشہ کانچ کی چوڑیاں نظر آیا کرتی تھیں مگر آج یہ چوڑیاں نہیں تھیں۔ شاید اسے میرے اپارٹمنٹ میں بھیجنے سے پہلے چوڑیاں اور ایسی دیگر اشیا اس کے جسم سے علیحدہ کی گئی تھیں تاکہ میں ان اشیا کا کوئی غلط استعمال نہ کر سکوں۔

تاجور کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے اندر سے خوشی کی ایک بلند و بالا لہر اٹھی۔ نجانے ان لمحوں میں کیوں میرا دل چاہا کہ میں سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر، ارد گرد کے ہر منظر کو فراموش کر کے اسے اپنی بانہوں میں بھر لوں۔ اس کی پیشانی پر لہراتی لٹیں پیچھے ہٹاؤں اور اسے چومتا چلا جاؤں۔ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی پیار کی یہ لہر بہت بلند و بالا تھی مگر یہ جتنی جلدی اٹھی تھی اتنی ہی جلدی او جھل بھی ہو گئی۔ یہاں کلوز سرکٹ کیمرے تھے۔ سب کچھ دیکھا اور سنا جاتا تھا۔ میں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر تاجور کے دونوں ہاتھ تھام لیے، دو مہکے ہوئے گلاب جن کو چھوتے ہی پورے جسم میں انبساط کی کرنیں پھیل گئیں۔

''تاجور! تم یہاں؟'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''آپ تو بہت زیادہ زخمی ہیں...... مم...... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کو اس حالت میں دیکھوں گی۔''

''مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں ہو رہا۔'' میرا لہجہ لرزاں تھا۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں ہو رہا شاہ زیب، لیکن......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

شاید وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ...... ''لیکن اتنا مجھے پتا تھا کہ آپ جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں، آپ کے ساتھ

عنقریب کچھ بہت برا ہو جانا ہے اور آج میں نے یہ ''برا'' اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔''
''آ...... آپ یہ دودھ پی لیں۔'' اس نے گلاس پھر میری طرف بڑھایا۔
اچانک میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ تاجور کو اپنے سامنے دیکھ کر میں دس پندرہ سیکنڈ کے لیے سب کچھ بھول گیا تھا مگر اب ہر چیز یاد آ گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے مجھے اچانک تپتی، دہکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا ہے اور ان زنجیروں کو اتنی زور سے بھینچا جا رہا ہے کہ زنجیروں کا لوہا میرے گوشت میں گھس رہا ہے اور ہڈیوں کو کاٹ رہا ہے۔ تاجور کو ہزاروں میل دور سے اٹھا کر میرے سامنے کیوں لایا گیا تھا۔ شاید وہ لوگ جانتے تھے کہ یہ لڑکی دنیا کی وہ واحد ہستی ہے جو مجھے بولنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ یہ میرے دشمنوں کی بہت بڑی اور بے انتہا سنگین چال تھی۔
یہ چال کس نے چلی تھی؟ کس نے چلی تھی؟
فوراً ہی جو چہرہ میرے تصور میں آیا، وہ شکیل داراب کا تھا۔ گورا چٹا، لشکارے مارتا، وجیہہ چہرہ...... یقیناً یہی شخص تھا، یہی تھا جس نے یہ زہریلا خنجر میرے دل میں پیوست کیا تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ تاجور اور اس کی فیملی تک کیسے پہنچے اور کیسے تاجور کو یہاں جاماجی میں اور میرے اپارٹمنٹ تک لانے میں کامیاب ہوئے۔ یقیناً اس کے پیچھے ایک طویل اور کٹھن کوشش تھی۔ شکیل داراب جیسے بااثر شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پاکستان میں اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ یقیناً اس نے اپنے ان لمبے ہاتھوں کو چاند گڑھی اور چاند گڑھی سے آگے سکھیرا گاؤں تک پہنچا دیا تھا اور وہاں سے تاجور کو اچک کر یہاں میرے سامنے لے آیا تھا......
ہاں یہ شکیل داراب ہی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی۔
ایک سیکنڈ میں ہی سب کچھ میرے ذہن سے گزر گیا۔ دودھ کا گلاس میں نے تاجور کے ہاتھ سے نہیں لیا اور بستر سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔
''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' تاجور کی منمناتی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
میں خاموش رہا۔ میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، فیصلہ سخت تھا لیکن میں نے کر لیا۔ دل پر ایک کوہ ہمالیہ جیسا وزن رکھ کر میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں پاکستان سے شکیل داراب صاحب لائے ہیں یہاں؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جھکا لیا۔
''کس لیے؟''
''وہ کہتے ہیں کہ آپ کو مدد کی ضرورت ہے۔ آپ ایک بڑی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ نے کوئی...... ضد پکڑی ہوئی ہے...... اور وہ ضد آپ کو بہت نقصان دینے والی ہے۔''
''چلو، اگر ایسا ہے بھی تو...... تم اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہو؟''
''ان کا خیال ہے کہ...... میں آپ کو سمجھاؤں گی...... تو شاید آپ سمجھ جائیں گے۔''
''اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے روکھے پن سے دریافت کیا۔
''میں...... کیا کہہ سکتی ہوں؟'' اس کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی۔
میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تمہیں یہاں لانے والے بھی اس وقت ہماری یہ باتیں سن رہے ہیں۔ اگر وہ سن رہے ہیں تب بھی اور اگر نہیں سن رہے تب بھی...... میرا جواب وہی ہے جو پہلے دن تھا اور یہ جواب میری موت تک یہی رہے گا۔''
تاجور نے لرز کر میری طرف دیکھا۔ میرے زخموں سے چور جسم نے اسے پہلے ہی بے حد ہراساں کر رکھا تھا، اب میرے لب و لہجے نے اسے بالکل کاٹ کر رکھ دیا۔
وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بالوں کی ریشمی لٹیں اپنے کانوں کے پیچھے اڑس کر اس نے اپنی دلکش آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور نرم لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب! آخر...... وہ...... کون لوگ ہیں...... جن کی خاطر...... آپ اپنے آپ پر اتنا ظلم سہہ رہے ہیں۔ میں...... آپ کی منت کرتی ہوں...... مجھے کچھ بتائیں...... میری عقل اتنی تو نہیں...... لیکن شاید میں آپ کو کچھ مشورہ دے سکوں۔''
''سوری تاجور! میں اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے یہ ورق اپنی کتاب سے پھاڑ دیا ہے۔'' میرا لہجہ سخت تھا۔
اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور روہانسی نظر آنے لگی۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے، اس نے تھوڑا توقف کیا اور کہنے لگی۔ ''کیا...... یہ بھی نہیں پوچھیں گے کہ میں...... اتنی دور یہاں کیسے پہنچی ہوں...... کن حالات سے گزری ہوں اور باقی لوگ کیسے ہیں؟''
میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! ہوسکتا ہے کہ تمہیں میری بات سخت لگے، لیکن حقیقت یہی ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ ہماری راہیں اسی دن جدا ہو گئی تھیں جب میں نے تمہارے نئے گاؤں پہنچ کر تمہیں موٹر سائیکل سے اتارا تھا۔ ہمارے درمیان جو کچھ بھی تھا...... وہ اب ایک باسی کڑی کی طرح ہے۔ اگر شکیل یا لونگ جیسا کوئی بے وقوف یہ سمجھتا ہے کہ وہ تمہیں میرے سامنے لا کر اس باسی کڑی میں ابال لا سکتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔''
اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔
''میں جانتی ہوں شاہ زیب! میرے اور آپ کے درمیان اب بہت فاصلہ ہے لیکن کبھی یہ فاصلہ اتنا نہیں تھا، میں سچ کہتی ہوں مجھے آپ کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے اور وہ لوگ...... یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ آپ کو بولنے پر مجبور کرنے کے لیے ہر حد تک جائیں گے۔ آپ...... ان کی کچھ باتیں مان کیوں نہیں لیتے؟ شکیل صاحب بتا رہے تھے کہ اس سے آپ کو کچھ رعایتیں مل جائیں گی اور ان لوگوں کو بھی جن کو آپ بچانا چاہ رہے ہیں۔''
''کیا تمہیں ایک لیکچرار کے طور پر میرے پاس بھیجا گیا ہے؟'' میں نے پُرتپش لہجے میں کہا۔
وہ زیرک تھی۔ سمجھ گئی کہ اب میری بے رخی مزید بڑھ جائے گی۔ اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ ''ایک انڈین ملازمہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بتا کر گئی ہے کہ دس بجے آپ کی دوا کا وقت ہے اور دس بس بج ہی گئے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''ویسے میری خواہش ہے کہ یہ دوا میں خود کھاؤں...... اور ایک خواہش یہ بھی ہے کہ...... یہ لوگ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''
میں نے چھت کی طرف منہ کیا اور نادیدہ کیمروں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ لے جاؤ اِس کو یہاں سے...... لے جاؤ۔''
کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ لوگ یہی ظاہر کر رہے تھے کہ کلوز سرکٹ کیمرے بند ہیں اور ہم دونوں پرائیویسی میں بات چیت کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے ایسا ظاہر کرنا ہوتا تھا تو کیمروں کے شٹر بند ہو جاتے تھے مگر اس صورتِ حال پر یقین کرنا مشکل تھا۔
تاجور سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس اپارٹمنٹ میں رات دن کا علم صرف وال کلاک سے ہی ہوتا تھا اور وال کلاک میں بھی چونکہ شیشہ موجود تھا، اس لیے وہ اپارٹمنٹ کے اندر نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے مجھے راڈز والی کھڑکی کے پاس جانا پڑتا تھا۔

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں تاجور کے پاس واپس اپنے بیڈروم میں پہنچا اور اسے بے رخی سے مخاطب کر کے بولا۔ ”میں اپنی دوا خود کھالوں گا۔ اگر تم چاہو تو ساتھ والے کمرے میں جا کر سو سکتی ہو۔“

وہ نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے میڈیسن لی اور پہلو کے بل اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میرے اندر اور باہر کی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق تھا جو سرد مہری اور جھنجلاہٹ میں ظاہر کر رہا تھا اس کے برعکس میرے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ تاجور میرے پاس تھی۔ چند فٹ کی دوری پر، ایک ہی چھت کے نیچے، میں اسے اپنی پلکوں پر بٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے سانسوں کی خوشبو اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا۔ اس سے گھنٹوں اور پہروں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈھیروں سوال تھے جو میرے سینے میں مچل رہے تھے۔ وہ کہاں سے آئی ہے؟ کیسے لائی گئی ہے؟ اس کے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟ چاند گڑھی اور سکھیرا گاؤں کے حالات کیا ہیں؟ اس کے والد دین محمد صاحب، اس کے چھوٹے بھائی اسفند اور راحیل عرف کاکا...... اس کی والدہ، سب لوگ کیسے ہیں؟ اور پھر وہ وڈیو کلپ جو میں نے بدنصیب سیفی کے فون میں دیکھی تھی۔ اس میں تاجور نے کہا تھا...... غلطی ہوئی ہے...... ہاں یہ غلطی تو ہوئی ہے۔

کتنا بڑا ستم تھا، حالات کا کتنا بے رحم جبر تھا۔ وہ ایک ہی چھت کے نیچے میرے ساتھ موجود تھی اور میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ کیا ایسے حالات میں وہ سو سکتی تھی؟ کیا ایسے حالات میں، میں سو سکتا تھا؟ میں بستر پر مسلسل کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ سمجھ دار تو بہت تھی، کیا وہ بات کی تہ تک پہنچ پا رہی تھی کہ میری یہ شدید بے رخی کیوں ہے، یہ شدید بے رخی تاجور کو اس دردناک انجام سے بچانے کی ایک ناتواں سی کوشش تھی جو میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل سینے میں ٹکڑے ہو کر بکھرنے لگا۔ سوال بے حد سفاک تھا، مگر ایک ٹھوس حقیقت بن کر میرے سامنے موجود تھا۔ کیا میری زبان کھلوانے کے لیے میرے سامنے تاجور کو تشدد کے شکنجے میں کسا گیا تو میں چپ رہ سکوں گا؟

میری پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ شکیل داراب کی مدد سے ان لوگوں نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا جہاں میرا جسم دو ٹکڑے ہو رہا تھا۔

وہ بڑی کربناک رات تھی، شاید اُن راتوں سے بھی زیادہ جو میں نے ٹارچر سیل میں ”زندہ روسٹ“ ہوتے ہوئے گزاری تھیں۔ رات آخری پہر شاید تھوڑی دیر کے لیے میں سو گیا۔ کسی نے میرا شانہ ہلا کر مجھے جگایا تھا۔ میں نے پلکیں اٹھائیں تو وہی سادہ و ملیح چہرہ میرے سامنے تھا جو میرے دل کا انمٹ داغ بن چکا تھا۔ ابھی میرا ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ بس اس کا چہرہ نظر آیا تھا، وہ حالات نظر نہیں آرہے تھے جن میں یہ چہرہ موجود تھا۔ جی چاہا اسے کھینچ کر اپنے اوپر گرا لوں...... لیکن اگلے ہی لمحے میں اس سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر چلا گیا...... ذہن بیدار ہو گیا تھا۔ خوفناک حالات اپنی تمام تر شدت کے ساتھ احاطۂ شعور میں آگئے تھے۔

”آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے شاہ زیب!“ تاجور نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں میڈیسن اور پانی سے بھرا ہوا ڈسپوزایبل مگ تھا۔

میں نے دوا اس کے ہاتھ سے لے لی اور وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے پانی کے ساتھ نگل لی۔ ”میں نے تمہیں رات کو ہی کہا تھا کہ یہ زحمت نہ کرو...... اب تم جا سکتی ہو۔“

”آ...... آپ نہائیں گے؟“ اس نے پوچھا، پھر میرے زخموں پر جا بجا چپکی ہوئی پٹیاں دیکھیں اور ”سوری“ کہہ کر رہ گئی۔

میں نے کہا۔ ”تمہاری بے حد مہربانی ہے، میرے لیے پریشان ہونے کی کوشش نہ کرو۔ ہو سکے تو جو لوگ تمہیں یہاں لائے ہیں اُن سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ وہ گائے کے بجائے بیل کا دودھ دھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

وہ منمنائی۔ ”میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی ہوں اور شاید مرضی سے جا بھی نہیں سکتی ہوں۔“

”لیکن...... مجھ سے...... اپنی شکل دور تو رکھ سکتی ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ اپنے بے رحم فقرے کا ردِعمل اس کے چہرے پر دیکھ سکوں۔

میرا خیال تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے گی مگر قدموں کی آواز نہیں آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایک موتی ٹپک کر اس کے سینے پر گرا۔ وہ اپنے مرمریں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پر پڑی۔ اس میں ایک چھوٹی انگوٹھی چمک رہی تھی...... اس کی منگنی کی انگوٹھی۔ میرے سینے پر ایک نیا تیر لگا اور اندر تک دھنس گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے کبڈی شاہ سیفی کا خوبرو

چہرہ گھوم گیا۔ زندگی سے بھرپور سرخ و سپید چہرہ۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لی تھی۔ انگوٹھی کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ میں جیسے اندھا ہو گیا۔ اپنا سر جھکا کر میں نے اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

''کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' تاجور کی پریشان آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے چہرے سے بخار لگ رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ یہاں سے۔'' میں نے اسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دیے دیے کہا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑی رہی...... شاید تذبذب میں تھی پھر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے میری پیشانی چھوئی۔

میں نے درشتگی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گرج کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں...... اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہیں بھی میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں مروں یا جیوں تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر تم یہاں آئی ہو تو اس میں تمہارا کوئی مقصد ہے، تمہارا کوئی مطلب ہے۔''

''مم...... میرا کیا مقصد ہو سکتا ہے شاہ زیب؟'' وہ لرز گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر زہریلے لہجے میں کہا۔ ''شکیل داراب کافی مالدار آدمی ہے، اپنا مطلب نکالنے کے لیے وہ کافی روپیا دے سکتا ہے تمہیں اور تمہاری فیملی کو......''

''آپ...... یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کو بولنے پر راضی کرنے کے لیے میں نے کسی سے پیسا لیا ہوگا؟''

''تو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' میں اسی تند لہجے میں بولا۔ ''جتنی محبت تمہیں مجھ سے ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے نزدیک میں ایک شرابی، بدکار، بدمعاش شخص ہوں...... اور میں ہوں...... میں ہوں...... تم مجھ پر تھوک کر اپنی پاک صاف دنیا میں جا چکی ہو۔ تمہیں میری صحت سلامتی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ اگر اب تم یہاں ہو تو اس کے پیچھے دھن اور دھونس کی کارفرمائی ہے...... اور ہو سکتا ہے کہ دھن کی کارفرمائی زیادہ ہو۔''

وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں...... کیا...... آپ کی کوئی مجبوری ہے...... یا آپ واقعی مجھ کو اتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں۔''

''وقت سے بڑا جلاد کوئی نہیں ہوتا۔ لوہے کو زنگ بنا دیتا ہے، صندل کو راکھ کر دیتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی بہت کچھ بدل چکا ہے تاجور! بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ یہاں سے۔'' میں بیزارانہ انداز میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اٹھتے ہوئے ہاتھ بستر کی تین چار فٹ اونچی ٹیک سے ٹکرایا۔ یہاں بھی کلائی پر زخم تھا۔ سفید بینڈیج کے نیچے سے تھوڑا سا خون رس پڑا۔ تاجور جیسے تڑپ کر آگے بڑھی۔ اس نے اتر جانے والی بینڈیج کو درست کرنا چاہا۔ میں نے اس کا بازو تھام کر اسے روک دیا۔ ''دیکھو تاجور! مجھے ان چونچلوں کی کوئی ضرورت نہیں اور میں پھر کہتا ہوں یہاں سے چلی جاؤ تو اچھا ہے، میں اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ میرے اندر آگ بھڑک رہی ہے اگر...... کچھ ہو گیا تو اچھا نہیں ہو گا۔''

''لیکن شاہ زیب! میں نے......''

''چلی جاؤ یہاں سے، میں کہتا ہوں چلی جاؤ......'' میں اتنی زور سے بولا کہ اپارٹمنٹ گونج اٹھا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے تاجور کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اس کی پھولدار قمیص نیچے تک پھاڑ ڈالی۔ وہ سکتہ زدہ تھی۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کے دونوں رخساروں کو اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کے درمیان زور سے بھینچا۔ اس کی شکل بگڑ گئی۔ خوب صورت آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میرا انداز پُرغضب تھا...... میں نے جنونی لہجے میں کہا۔ ''میرے پرانے زخموں کو مت کریدو۔ تمہاری یہ خوب صورتی، اور یہ تنہائی تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں، تم چلی جاؤ یہاں سے۔'' میں نے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرے ہوئے تھے پھر وہ تیزی سے مڑی اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے سائڈ ٹیبل کو زور سے ٹھوکر ماری...... اور کلائی کی خون آلود پٹی اتار کر پھینک دی۔

وہ سارا دن مکمل خاموشی میں گزر گیا۔ ایک عجیب بے بسی کی کیفیت تھی۔ میں جس کو اپنی پلکوں پر بٹھانا چاہتا تھا جس کے قدموں میں اپنی دھڑکنیں بچھا دینا چاہتا تھا۔ وہ ہزاروں میل دور سے معجزانہ طور پر میرے پاس پہنچی تھی اور میں اسے خود سے دور کرنے اور ٹھکرانے پر مجبور تھا۔

لیکن یہ سب کرنے کے باوجود میں مطمئن نہیں تھا۔ کیا میری یہ کوشش فائدہ مند ثابت ہو سکے گی۔ کیا اس سے ان حالات پر کچھ فرق پڑے گا جو تاجور کے ساتھ پیش آنے والے تھے، کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ......

اس سے آگے میں سوچ بھی نہ سکا۔ میں نے سیفی کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔ کیا زینب، ابراہیم اور اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے اور تاجور کو بدترین تشدد سے محفوظ رکھنے کے لیے، میں تاجور کے ساتھ بھی ایسا کچھ کر سکتا تھا؟ میں اس کی جان لے سکتا تھا؟ یہ سوچ کر ہی جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا۔ اس سے بہتر تو پھر یہ تھا کہ میں کسی طرح خود اپنی جان لے لیتا۔

دوپہر کے وقت حسبِ معمول پہریدار نے مجھے حکم دیا کہ میں راڈز والی کھڑکی کے پاس آؤں اور خود کو ہتھکڑی لگواؤں۔ اب یہ سب کچھ معمول کا حصہ بن چکا تھا اور احتجاج یا مزاحمت کا سوچنا بیکار تھا۔ مجھے لگا کہ کوئی مجھ سے ملنے آرہا ہے۔

میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے، پھر پاؤں بھی جکڑ دیے گئے۔ لیکن مجھ سے ملنے کوئی نہیں پہنچا۔ نہ ہی اسپیکر پر میرے لیے کوئی ہدایت جاری ہوئی۔ دس منٹ بعد دو گارڈز دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ تاجور بھوکی پیاسی دوسرے کمرے میں بند تھی۔ گارڈز نے اسے وہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لے کر باہر چلے گئے۔ تاجور کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اَن گنت سوال تھے ان آنکھوں میں، پھر وہ باہر چلی گئی۔

دس منٹ بعد لونگ کی کرخت آواز اسپیکر کے ذریعے میرے اپارٹمنٹ میں سنائی دی۔ ”ڈراما اچھا کر لیتے ہو۔“ وہ بولا۔

”کیسا ڈراما؟“

”اپنی لور...... اپنی ڈارلنگ...... اپنی سویٹ ہارٹ کے ساتھ تمہارا ڈراما۔“

”اگر تم اسے ڈراما سمجھتے ہو تو تمہاری مرضی ہے۔ میری صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

”تمہاری صحت پر اس سے اثر پڑے گا...... اور یادگار اثر پڑے گا۔ میں جو کچھ اس لڑکی کے ساتھ کراؤں گا وہ تمہیں سب کچھ اسکرین پر نظر آئے گا اور ان میں سے کوئی ایک منظر بھی ایسا نہیں ہوگا جو تمہارے دیکھنے کے قابل ہو۔“

میں اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا، مگر اپنے تاثرات کو سنبھالے رکھا۔ ”تم ظلم کرو گے اور اس کا خمیازہ بھی تمہیں ایک دن ضرور بھگتنا پڑے گا لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح تم مجھ سے کچھ اگلوانے میں کامیاب رہو گے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“ میں نے آخری جملے کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔“ لونگ کی آواز وحشت ناک تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے...... اپنے شکنجے میں آنے والے شخص کو وہ اس بیدردی سے نچوڑتا تھا کہ وہ موت کو ترسنے لگتا تھا اور وہ تو ایک لڑکی تھی۔ نرم دل اور ذرا سی بات پر آنکھوں کے کٹورے بھر لینے والی۔ جسمانی لحاظ سے بے شک دودھ مکھن کی پلی تھی اور عام شہری لڑکیوں سے مختلف بھی مگر تھی تو لڑکی۔ ایک طاقتور مرد بھی اسے زیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے ساتھ یہاں کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ اس کو مصیبت میں دیکھ سکتا، یا اس کی آواز سن سکتا۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین دورانیہ تھا۔

اور پھر قریباً ایک گھنٹے بعد سب کچھ میرے سامنے آ گیا۔ اس کھڑکی کے عین سامنے ایک ایل سی ڈی لا کر رکھی گئی جس کے اندر ہاتھ ڈال کر مجھے ہتھکڑی وغیرہ لگائی جاتی تھی۔ چند منٹ بعد اسکرین پر ایک لرزہ خیز منظر نمودار ہوا۔ وہی تاجور جو قریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے اس اپارٹمنٹ سے چادر میں لپٹی لپٹائی اور میری طرف حسرت سے دیکھتی ہوئی گئی تھی۔ ایک کمرے کی چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ چادر اس کے سر سے کھینچی جا چکی تھی۔ وہ صرف شلوار قمیص میں تھی۔ دونوں پاؤں بھی ننگے تھے۔ اس کے ہاتھ نائیلون کی ایک رسی سے باندھ کر چھت کے پنکھے سے منسلک کر دیے گئے تھے۔ رسی کا سائز ایسا تھا کہ تاجور کے پاؤں کے صرف اگلے پنجے فرش سے چھوتے تھے۔ کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ نہ لٹک رہی تھی، نہ فرش پر تھی۔ اس کے چہرے پر دنیا جہاں کا درد اور خوف سمٹا ہوا تھا۔

فرنیچر سے آراستہ اس کشادہ کمرے میں تین ہٹے کٹے نقاب پوش موجود تھے۔ فقط ان کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ان آنکھوں سے ان کی قومیت وغیرہ کا پتا چلنا دشوار تھا۔ تینوں کے جسموں پر ایک ہی طرح کے ہلکے نیلے چست لباس تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں بید کی لمبی چھڑیاں تھیں جو انہوں نے جارحانہ انداز میں افقی رخ پر اٹھا رکھی

تھیں۔

اندازہ ہوتا تھا کہ اسکرین پر اس بند کمرے کا منظر نظر آنے سے پہلے ہی تاجور کے ساتھ تھوڑی سی مار پیٹ ہو چکی ہے کیونکہ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

کمرے میں لونگ جیک کی کرخت آواز گونجی۔ ''یہ تمہاری پاکستانی ہمشیرہ انگلش نہیں جانتی ورنہ میں اسی سے کہتا کہ تم سے اپنی جان بخشی کے لیے التجا کرے۔ تم ہی ہو جو اس کی جان چھڑا سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''لونگ! میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں، اسے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ وہ کچھ ہوگا جو تم...... سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' لونگ نے زہرخند لہجہ اختیار کیا۔ ''یہ تو تمہاری کچھ لگتی ہی نہیں۔ اس کے بُرے بھلے کا تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔''

''دیکھو لونگ، جو کچھ ہے تمہارے اور میرے درمیان ہے۔ یہ بزدل ہیجڑوں والا کام نہ کرو۔ ایک عورت کو درمیان میں مت لاؤ۔'' میں اتنی زور سے بولا کہ مجھے اپنے گلے کی رگیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔

''یہ ایک عورت نہیں۔ یہ تمہاری محبوبہ ہے۔ تم اس کے ساتھ سونے کے لیے دن رات تڑپتے ہو لیکن اب اس کے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کے بعد تم کم از کم اپنی یہ تڑپ تو بھول جاؤ گے۔''

''میں سب کچھ جلا ڈالوں گا، راکھ کر دوں گا۔'' میں دہاڑا اور کھڑکی کی سلاخوں پر تابڑتوڑ مکے برسائے۔ یہ سلاخیں دراصل ٹھوس اسٹیل کے چمکیلے راڈز تھے۔ شروع میں ان کے اوپر کچھ نہیں تھا لیکن چند دن پہلے جب میں نے جارحانہ انداز اختیار کیا تو ان کے اوپر بھی خاص قسم کے فوم اور ریگ زین کی وہی تہ چڑھا دی گئی جو باقی اپارٹمنٹ میں ہر جگہ موجود تھی۔

اسٹیل کے راڈز جھنجھنا اٹھے لیکن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ شاید ان پر سوگنا زیادہ طاقت سے ضرب لگائی جاتی تو بھی انہیں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔

''میرے مطالبے کچھ زیادہ نہیں ہیں شاہ زیب!'' لونگ نے کہا۔ ''مجھے تمہارے بھگوڑے ساتھیوں کا پتا چاہیے۔ ہم ان کو انصاف کے کٹہرے میں لانا چاہتے ہیں۔ جب تک تم اپنی پلید زبان کو حرکت دے کر ان کا پتا نہیں اگلو گے تمہاری جان چھوٹے گی نہیں اور نہ تمہاری اس سویٹ ہارٹ کی مشکل آسان ہوگی۔''

اس کے ساتھ ہی اپنے باس کا کوئی اشارہ پاکر دو نقاب پوشوں نے تاجور کو چھڑیوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے ٹخنوں اور پنڈلیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا دلدوز ترین منظر تھا۔ ٹخنوں اور پنڈلیوں پر چوٹ لگتی تھی تو تاجور تڑپ کر پاؤں اوپر اٹھاتی تھی۔ ایسے میں نائیلون کی رسی کو ہلکا سا جھٹکا لگتا تھا اور تاجور رسی سے جھول جاتی تھی۔ اس کی کربناک آواز سے کمرا گونج اٹھتا تھا اور میں جانتا تھا...... یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ اس کمرے میں بہت کچھ ہونے والا تھا...... شیطان ننگا ہو کر ناچنے والا تھا۔

سب کچھ میری برداشت سے باہر ہونے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر کان تو کھلے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ سامنے کی طرف ہتھکڑی میں تھے۔ اگر میں کان بند کرنا چاہتا تو صرف ایک کان میں انگلی ٹھونس سکتا تھا۔ دوسرے کان میں انگلی ٹھونسنے کے لیے تیسرا ہاتھ درکار تھا اور وہ میرے پاس نہیں تھا۔

میرا جی پھر چاہا کہ میں ان لمحوں میں اپنی جان لے لوں، مگر کیسے؟ اس اپارٹمنٹ میں کوئی ایسی...... چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں رہنے دی گئی تھی جس سے میں خود کو یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا۔ ڈسپوزایبل برتن، اَن بریک ایبل شیشے کی بوتلیں اور گلاس، بجلی کا ہر تار چھپا ہوا اور محفوظ...... در و دیوار پر خاص فوم اور ریگ زین کی تہ۔ یہاں زندگی اور موت کے درمیان لٹکائے جانے کا پورا انتظام موجود تھا۔

میں کیا کروں؟ کس طرف جاؤں؟ میں نے جیسے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا۔ جواب کوئی نہیں تھا اور تاجور کی فریادی آواز میری برداشت سے باہر تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لونگ سے کہا تھا کہ اگر وہ تاجور کے حوالے سے اپنے بھیانک ارادوں سے پیچھے نہ ہٹا تو میں سب کچھ جلا ڈالوں گا، راکھ کر ڈالوں گا...... مگر غور کیا جاتا تو یہ صرف الفاظ تھے۔ ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی وسیلہ دور دور نظر نہیں آتا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک نقاب پوش روتی بلکتی تاجور کی طرف بڑھا۔ تاجور کی قمیص کا گریبان پہلے سے پھٹا ہوا تھا (یہ میری وحشت کا نتیجہ تھا) اس نے پھٹے ہوئے گریبان کو گرہ دے رکھی تھی۔ نقاب پوش نے بڑے سکون سے یہ گرہ کھول دی۔ اس کا بالائی جسم نیم عریانی کی زد میں آگیا۔

وہ تشدد پر آمادہ تھے اور ہر قسم کے تشدد پر آمادہ

تھے..... اور میں جانتا تھا کہ یہ تشدد تاجور سے زیادہ مجھ پر کیا جارہا ہے جب میں اس تشدد کو دیکھنے کے لیے موجود نہ ہوں گا تو یہ رک جائے گا اور مجھے اسے روکنا تھا، ہر صورت روکنا تھا۔ انسان خود اپنا سانس بند کر کے اپنی زندگی نہیں چھین سکتا، ورنہ میں یہ بھی کر گزرتا۔

میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا۔ میں بس ایک ہی ردِعمل دے سکتا تھا اور وہ میں نے دیا..... میں نے اپنے دانتوں سے اپنی کلائیوں کی شریانیں بھنبھوڑ ڈالیں۔ میں نے سائڈ کے نکیلے دانتوں کی مدد سے اپنے گوشت کو چیرا اور نسیں کاٹ ڈالیں۔ دونوں کلائیوں سے خون کی پچکاریاں سی نکلیں اور پھر خون روانی سے بہنے لگا۔ چند سیکنڈ..... صرف چند سیکنڈ کے اندر فرش کا ایک بڑا حصہ خون سے سرخ نظر آنے لگا۔

نقاب پوشوں کی توجہ اب تاجور کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ اب وہ ایک دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہاں بھی کوئی ایل سی ڈی موجود تھی جس پر لونگ اور اس کے یہ نقاب پوش ہرکارے میرے اپارٹمنٹ کے مناظر دیکھ رہے تھے۔

لونگ گرجا۔ ”تمہارے یہ ناٹک اس لڑکی کو اس مشکل سے نکال نہیں سکتے۔ راستہ صرف اور صرف ایک ہی ہے جو میں نے تم کو بتایا ہے۔“

تاجور مسلسل پکار رہی تھی۔ ”بچاؤ..... میری مدد کرو.....شاہ زیب! میں مرجاؤں گی، شکیل صاحب، میں مر جاؤں گی۔“

وہ شکیل داراب کو بھی پکار رہی تھی۔ حالانکہ اسے اس ناقابلِ بیان عذاب سے دوچار کرنے والا وہی سیاست زادہ تھا۔

خون بہتا چلا جارہا تھا..... تھوڑی ہی دیر میں میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں بستر پر بیٹھ گیا۔ خون..... گرم خون میری جھولی میں گرنے لگا اور بیڈ شیٹ کو بھگونے لگا۔ اب تک تقریباً چار منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے۔

”دیکھو اس حرامی کو۔“ لونگ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اہلکار کو میرے بارے میں حکم دے رہا ہے۔

میں اپنی جگہ سے ڈگمگاتا ہوا اٹھا۔ آہنی بیڑی کی وجہ سے میں چھوٹے چھوٹے سے قدم ہی لے سکتا تھا۔ چھوٹے قدم اٹھاتا، میں واش روم تک پہنچا اور خود کو اندر بند کرلیا۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی مسلح امریکن گارڈز اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ تاجور کی آہ و بکا واش روم میں بھی سنائی دے رہی تھی..... وہ مسلسل مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں اسے بتا سکتا تو ضرور بتاتا کہ خود کو موت کے منہ میں جھونک کر میں اس کی مدد ہی تو کررہا ہوں۔ ویسے مجھے یہ بھی پتا تھا کہ یہ لوگ اتنی آسانی سے مجھے مرنے نہیں دیں گے۔

واش روم کے بند دروازے پر دھڑا دھڑ رائفلوں کے کندھے برسائے جانے لگے۔ دوسری طرف واش روم کے لگژری ٹب کے اندر میرا خون مسلسل گر رہا تھا۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر اندر گارڈز نے واش روم کا دروازہ توڑ دیا اور مجھ پر جھپٹے۔ اسپیکرز پر لونگ کی کرخت آواز گونجی۔ ”پہلے اس باسٹرڈ کی کلائیاں دباؤ..... تاکہ اس کا خون بند ہو، جلدی کرو۔“

دو گارڈز نے میری اُدھڑی ہوئی کلائیوں کو دبا لیا۔ تب تک میرا سر بری طرح گھومنا شروع ہوگیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ واش روم میں ہر طرف خون ہی خون ہے۔ کچھ یہی حال بیڈ اور بیڈ کے ارگرد کے فرش کا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانا شروع ہوگیا۔ وہ لوگ مجھے کھینچ کر اور گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور میں ایک ایک انچ پر مزاحمت کررہا تھا۔ گاہے بگاہے میری کلائیاں گارڈز کی گرفت سے نکل جاتی تھیں اور خون کی دھاریں سی بہنے لگتی تھیں۔ تاجور اب خاموش تھی۔ شاید چھت سے لٹکے لٹکے اس نے بھی اسکرین پر اپارٹمنٹ کا خونی منظر دیکھا تھا اور مبہوت ہوگئی تھی۔

میں جتنی زیادہ مزاحمت کررہا تھا، کلائیوں سے خون نکلنے کی رفتار اتنی ہی بڑھ جاتی تھی۔ تب میں نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے سفید کوٹ والے دو ڈاکٹرز کو دیکھا، وہ اپارٹمنٹ کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ میرے اردگرد کون لوگ ہیں؟ سب سے پہلا خیال تاجور کا ہی آیا۔ وہ بدترین مشکل میں تھی۔ وہ تاجور تھی، اور تاراج ہونے جارہی تھی۔ اسے تاراج ہونے سے بچانے کے لیے میں نے وہ کچھ کیا تھا جو میرے بس میں تھا۔ کیا وہ بچ گئی تھی؟ اس کا جواب مجھے فوراً ہی مل گیا۔ وہ میرے قریب موجود تھی۔ یہ

اسپتال کا کمرا تھا۔ میں سفید بستر پر چت لیٹا تھا۔ میری دونوں کلائیوں پر بھاری پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پہلے سے موجود زخموں پر بھی ٹیپ سے تازہ پٹیاں چپکائی گئی تھیں۔ اس کمرے میں قریباً دوفٹ ضرب پانچ فٹ کا خلا تھا جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بلٹ پروف شیشہ تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر تاجور نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں ورم زدہ تھیں، بال منتشر اور رنگت اُڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ ''نہیں شاہ زیب۔'' وہ کمزور آواز میں بولی۔ ''آپ ابھی لیٹے رہیں۔ آپ کی طبیعت بہت مشکل سے سنبھلی ہے۔''

وہ اب ہلکے براؤن رنگ کی شلوار قمیص میں تھی۔ سر پر سفید پھولوں والی ایک براؤن اوڑھنی تھی۔ اس کی کلائیوں پر نیلگوں نشان دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔ یہ نائیلون کی رسی کے نشان تھے۔ میں نے دیکھا مستطیل شیشے کی دوسری جانب خونخوار چہروں والے وہی امریکن گارڈز موجود تھے جنہوں نے کئی ہفتوں سے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ میرے بستر کے اردگرد کئی طبی آلات اور انفیوژن کو ہینگ کرنے والے اسٹینڈ رکھے تھے۔ آکسیجن سلنڈر اور ماسک وغیرہ بھی پڑا تھا، جو غالباً شروع میں استعمال ہوا تھا۔ تاجور نے دل گرفتہ لہجے میں مجھے بتایا کہ مجھے خون کے کئی بیگ چڑھائے جا چکے ہیں اور ابھی شاید مزید کی ضرورت پڑے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہم اس وقت جاماجی کے سب سے بڑے اور جدید اسپتال میں ہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آج دوسرا دن ہے۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''تاجور! مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ زیب۔''

''یہ سفید سؤر تمہیں پیٹ رہے تھے...... تمہیں چھت سے لٹکایا ہوا تھا۔''

شرمندگی اور دکھ کے سبب تاجور نے نگاہیں جھکا لیں۔ بمشکل بولی۔ ''جب آپ نے خود کو زخمی کیا اور کمرے میں ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آئے تو ان کی ساری توجہ آپ کی طرف ہو گئی...... پھر میرے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔''

تاجور کے لہجے میں عجیب سا تردّد اور دکھ تھا۔ یقیناً اس کی وجہ وہ رویّہ ہی تھا جو میں نے اپارٹمنٹ میں اس سے روا رکھا تھا۔ لونگ وغیرہ کو دکھانے کے لیے میں نے تاجور سے نہایت سخت زبان میں بات کی تھی اور اس کا گریبان تک پھاڑ دیا تھا۔ بہرحال تاجور نے یہ بھی تو دیکھا تھا کہ جب اس پر تشدد شروع ہوا تو میں نے اسے بچانے کے لیے ہرممکن کوشش کی اور اپنی رگیں کاٹ لیں۔ وہ بڑا خوفناک تجربہ تھا۔ خود کو موت کی طرف لے جانے کے لیے اپنے گوشت کو اپنے ہی دانتوں سے نوچنا اور پھاڑنا، میرے منہ میں جیسے ابھی تک اپنے خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا......

تاجور میرے بستر سے دوفٹ کی دوری پر خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے سر موڑا تو میری نگاہ اس کے پاؤں پر پڑی۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی۔ پاؤں سوجے ہوئے تھے اور ان پر نیلگوں نشان تھے۔ ایک بار پھر دل کٹ کر رہ گیا۔

''تم کب سے یہاں میرے پاس ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے ہی...... مجھے آپ کی دیکھ بھال کے لیے کہا گیا ہے۔''

''صرف دیکھ بھال کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے کچھ اور ہدایات بھی دی گئی ہوں گی۔ شاید وہ تاجور کے ذریعے میرے منہ کا تالا کھلوانے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتے تھے۔ ایک اور ''ٹارچر فری'' کوشش۔ عورت کے آنسوؤں کو دنیا کی سب سے بڑی آبی قوت کہا گیا ہے...... اور اس وقت یہ آنسو تاجور کی آنکھوں میں موجود تھے۔ وہ لرز رہے تھے اور کہہ رہے تھے...... ہم بہت بُرے دن دیکھ رہے ہیں، بہت ہی بُرے۔ ہم بہت بہہ چکے ہیں، ابھی ہمیں اور کتنا بہنا ہے؟

اسپتال کے اس وی آئی پی کمرے میں ایل سی ڈی اور ریفریجریٹر سمیت کئی سہولتیں موجود تھیں، مگر میں نے دیکھا کہ ایل سی ڈی کی پاور وائر کاٹ دی گئی تھی۔ یہ کام شاید ابھی کچھ دیر پہلے ہی کیا گیا تھا۔

شیشے میں سے گارڈز نے تاک لیا تھا کہ میں ہوش میں آگیا ہوں۔ چند سیکنڈ بعد ہی چار مسلح گارڈز دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ بیڈ کے ساتھ اسٹریپس موجود تھیں۔ مجھے ان اسٹریپس میں کس دیا گیا تاکہ میں طیش کے عالم میں کسی طرح کا ردِعمل نہ دکھا سکوں۔

ایک کے سوا باقی گارڈز باہر نکل گئے تو ایک امریکن ڈاکٹر اور ملائیشین کمپاؤنڈر اندر آگئے۔ گارڈز کی طرح ان

کے چہروں پر بھی کچھ سنسنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے وائٹل سائنز چیک کیے گئے۔ میڈیکل فائل میں کچھ اندراجات ہوئے۔ ڈاکٹر نے مجھے بازو میں دو انجکشن دیے۔ اس کے انجکشن دینے کے جھلائے ہوئے انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ میرے خلاف بھرا بیٹھا ہے۔ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''تم جہاں جاتے ہو...... اپنے ساتھ نحوست اور مصیبت لاتے ہو۔''

''تم لوگوں کے بارے میں میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

میری بات کی گہرائی نے امریکی ڈاکٹر کو سرخ کر دیا۔ دانت پیس کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے...... تم نے بلک بلک کر مرنا ہے...... اور یہ لڑکی اگر زندہ بچ گئی تو ساری زندگی تمہاری بدبختی کو اور اپنی حالت کو روتی رہے گی۔''

''جس کو اپنے باپ کا پتا نہ ہو، وہ آنے والے وقت کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شٹ اَپ۔'' وہ زور سے گرجا۔ ممکن تھا کہ مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاتا مگر پھر امریکن طرز کی گالیاں بکتا ہوا باہر نکل گیا۔ کمپاؤنڈر اور گارڈ بھی اس کے پیچھے گئے۔

تاجور نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے شاہ زیب، اسپتال سے باہر کوئی سخت قسم کی گڑبڑ ہے۔ یہ سارے لوگ پریشان نظر آرہے ہیں۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ رک رک کر بولی۔ ''ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے میں نے ویسے ہی یہ سامنے والا ٹی وی لگایا تھا۔ کوئی خبروں والا چینل لگا ہوا تھا۔ ایک بہت بڑا جلوس دکھایا جارہا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ایک عمارت کو گھیرا ہوا ہے......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ ذرا تذبذب کے بعد وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے اسی اسپتال کو گھیرا ہوا ہے۔ جب یہ لوگ گاڑی پر بٹھا کر مجھے یہاں لائے تھے تو میں نے اسپتال کو باہر سے دیکھا تھا...... مجھے تو وہ یہی جگہ لگتی ہے۔''

میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔ میں نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظر کا زاویہ سمجھ کر بولی۔ ''میرے ٹی وی لگانے پر وہ سخت غصے میں آگئے تھے۔ پتا نہیں انگریزی میں کیا کیا بول رہے تھے۔ انہوں نے ٹی وی کی تار ہی کاٹ ڈالی ہے۔''

میں نے شیشے سے باہر دیکھا۔ گارڈز ریڈ الرٹ تھے۔ ان کی رائفلوں کے رخ عمودی تھے اور انہوں نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ تاجور اور مجھ سے زیادہ ان کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ مجھے ہیلی کاپٹر کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پھر فائرنگ کی ہلکی سی گونج۔ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ یہ سیدھی فائرنگ ہے یا ہوائی۔ مجھے شک ہوا کہ آنسو گیس کی ہلکی سی بو بھی فضا میں موجود ہے۔

سوال یہ تھا کہ اگر واقعی اس اسپتال کا گھیراؤ کیا گیا ہے تو کیوں؟ اور گھیرنے والے لوگ کون تھے؟ میرے کانوں میں وہ الفاظ گونجے جو امریکی ڈاکٹر نے تھوڑی دیر پہلے بولے تھے۔ ''تم جہاں بھی جاتے ہو، اپنے ساتھ نحوست اور مصیبت لے کر آتے ہو۔''

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ہجوم جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تاجور نے دیکھا اور جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس نے اسی اسپتال کو گھیرا ہوا ہے، وہ یہاں میری وجہ سے موجود ہو۔ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ جاماجی کے عام لوگ ابھی اپنا ردِعمل ظاہر کرنے میں ناکام تھے۔ میں نے افغانی کی میت پر گولاباری دیکھی تھی۔ میں نے ریان فردوس کا مختصر جنازہ دیکھا تھا۔ میں نے حریت پسند عبدالکریم اور دیگر بے گناہوں کی پھانسیوں کے مناظر بھی ملاحظہ کیے تھے......اور نوجوان پرنس کمال احمد کی دردناک موت پر بھی شہر کے مناظر میری نظروں سے گزرے تھے۔ کہیں بھی لوگوں کا متوقع ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ مختلف جگہوں پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں نے احتجاج کیا تھا لیکن اجتماعی ری ایکشن سامنے نہیں آیا تھا۔ کیا آج واقعی کوئی ایسی بات ہوئی تھی کہ لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے اور انہوں نے رائے زل اور ایجنسی کے مسلح ہرکاروں کے رنگ زرد کیے تھے؟

میں اور تاجور جہاں موجود تھے وہاں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آوازیں ہم تک پہنچتی تو تھیں لیکن بہت مدھم صورت میں۔ کچھ دیر پہلے ایک ایسی آواز آئی تھی جیسے کہیں پاس ہی کوئی بہت بڑا شیشہ چکنا چور ہوا ہو۔ پھر چھت پر بھاگتے قدموں کی آہٹیں ابھری تھیں۔ یہ آہٹیں، مردانہ اور زنانہ دونوں طرح کی تھیں۔ ہیلی کاپٹر بھی نیچی پرواز کر کے آگے نکل جاتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک طرح کا اضطراب ظاہر کرتا تھا لیکن یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ فائرنگ کی آواز دوبارہ نہیں ابھری تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اب لوگ منتشر ہوچکے ہوں۔ رائے زل اور ایجنسی کے

سفاک ہرکاروں کے سامنے اور کالے قوانین کی موجودگی میں کون ثابت قدمی سے احتجاج کرسکتا تھا۔

میرے ہاتھ کے انگوٹھے کا زخم ابھی تک ٹھیک نہیں تھا۔ انگوٹھا کہیں ذرا سا بھی ٹچ ہوجاتا تھا تو خون رسنے لگتا تھا۔ یہی زخمی انگوٹھا تھا جسے میں نے بری طرح کچل کر خود کو اذیت میں مبتلا کیا تھا اور مادام ہاناوانی کے وار سے خود کو بچایا تھا۔ حاذق ذکری کی بتائی ہوئی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ مادام ہاناوانی اپنے شکار پر زیادہ سے زیادہ تین بار جھپٹتی ہے اور اگر فرض محال ناکام ہوجائے تو پھر کوشش نہیں کرتی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میرے انگوٹھے کے زخم اور دو تین دیگر زخموں کو چند گھنٹوں کے لیے پٹی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تھا...... اب ان پر دوبارہ بینڈیج کرنے کے لیے کمپاؤنڈر اندر آیا۔ یہ ملائیشین کمپاؤنڈر میرے انگوٹھے کی پٹی کرتے کرتے اچانک ہولے سے بولا۔ ''آپ کے لیے اچھی خبر ہے۔ لوگ آپ کو رہا کرانے کے لیے اسپتال سے باہر جمع ہیں۔ بہت بڑی تعداد ہے۔ امید ہے وہ کامیاب ہو جائیں گے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ ملائیشین کمپاؤنڈر بھی بن مشہد وغیرہ کی طرح قسطینا کے ان ''انفارمرز'' میں سے ہے جو رائے زل کی صفوں میں موجود تھے اور جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''ان لوگوں کو پتا کیسے چلا کہ میں یہاں موجود ہوں؟''

کمپاؤنڈر نے اپنی ساری توجہ میرے زخمی انگوٹھے پر مبذول رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی ایک اچھا اتفاق تھا۔ کل دوپہر جب آپ کو زخمی حالت میں ڈی پیلس سے یہاں اسپتال لایا جارہا تھا۔ آپ کو لانے والی ایمبولینس کا تصادم ایک فوجی گاڑی سے ہوگیا۔ آپ کو ایمبولینس سے نکال کر ایک دوسری گاڑی میں منتقل کیا جارہا تھا جب کئی لوگوں نے آپ کو پہچان لیا۔ ان میں میڈیا کے ایک دو بندے بھی تھے......''

میں اور کمپاؤنڈر اس انداز میں گفتگو کررہے تھے جیسے یہ انگوٹھے کے بگڑے ہوئے زخم کے بارے میں ہو۔

میں نے انگوٹھے کے جوڑ کو انگلی سے دباتے ہوئے کہا۔ ''ہجوم کتنا بڑا بھی ہو رائے زل کے ہرکارے ان پر فائر کھول دیں گے۔ نہتے لوگ کہاں تک کھڑے رہیں گے؟''

کمپاؤنڈر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''معاملہ اتنا سیدھا نہیں رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہجوم بہت بڑا ہے اور مزید بڑھ رہا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مادام ہاناوانی بھی اس وقت اسی اسپتال میں موجود ہیں۔'' کمپاؤنڈر کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو انگلش میں ہورہی تھی۔

''وہ بیمار ہیں۔'' کمپاؤنڈر نے جواب دیا اور انگوٹھے سے فارغ ہوکر میرے گھٹنے کے زخم کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں پر پولیتھین کے دستانے تھے اور وہ اپنے کام میں ماہر نظر آتا تھا۔ اس کی سفید شرٹ پر اس کا نام ارکب لکھا ہوا تھا۔

''کیا بیماری ہے اُس کو؟'' میں نے پوچھا۔

کمپاؤنڈر ارکب نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مادام کی بیماری کی وجہ آپ کی ذات سے جڑی ہوئی ہے۔''

''میری ذات سے؟''

''مادام کو آپ سے کوئی صدمہ پہنچا ہے مگر فی الحال اس بارے میں بس اُڑتی اُڑتی سی بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

اچانک ایک بار پھر میں اور تاجور چونک گئے۔ باہر سے کئی سنگل فائر سنائی دیے۔ اس کے ساتھ ہی دو چھوٹے برسٹ چلائے گئے۔ کمپاؤنڈر ارکب بھی ٹھٹک سا گیا مگر اپنے کام میں مشغول رہا۔

''لگتا ہے معاملہ بگڑ رہا ہے۔'' میں نے زخم کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''مگر زیادہ نہیں بگڑے گا۔'' ارکب بولا۔ ''انتظامیہ کسی صورت بھی مادام کی سلامتی کو خطرے میں نہیں ڈالے گی۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ شدید خون خرابے سے بچنے کے لیے یہ لوگ آپ کو آپ کے حمایتیوں کے حوالے کر دیں گے۔''

''مگر...... ایسا ہوگیا تو...... یہ حمایتی جائیں گے کہاں۔ ظاہر ہے کہ سارا ہجوم تو ہمارے ساتھ نہیں رہے گا۔ لوگ بکھر جائیں گے۔ پھر جب تعداد کم ہوگی یہ لوگ دوبارہ ہتھکڑیاں لے کر میرے سر پر پہنچ جائیں گے۔''

''بات اتنی سادہ نہیں ہے شاہ زیب صاحب، آپ دیکھتے جائیں کیا ہوتا ہے۔''

اسی دوران میں گونجتی ہوئی مدھم آوازیں ہمارے

کانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ یہ دو چار سو یا دو چار ہزار لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت بڑی تعداد میں تھے۔ ایک گونج تھی جو پھیل رہی تھی اور در و دیوار کو لرزا رہی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، سچ کو ظلم سے دبایا نہیں جاسکتا۔ اس حوالے سے دیر ہوسکتی ہے اندھیر نہیں۔ خلقِ خدا بالآخر خوف کی دیواریں پھاندتی ہے، جبر کے پردے چاک کرتی ہے، سینے تن جاتے ہیں، جھکے ہوئے سر بے ساختہ اٹھ جاتے ہیں، آنکھوں میں بجلیاں لپکتی ہیں اور نقدِ جاں ہتھیلیوں پر لے کر لوگ نکل آتے ہیں، ہاں برداشت شرط ہے...... اور صبر شرط ہے اور شرط ہے وہی مستقل مزاجی، دنیا کے دانشور جس کی تلقین کرتے ہیں۔

میں نے ابھی لوگوں کے اس بپھرے ہوئے جمِ غفیر کو دیکھا نہیں تھا، صرف ان کی آوازیں سنی تھیں، فقط ان کے نعرے میرے کانوں میں پڑے تھے اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی کچھ ہوجائے گا۔ کچھ ایسا جو اس جزیرے میں ایک انقلاب کی بنیاد رکھ دے گا۔

کمپاؤنڈر ارکب کچھ کاٹن وغیرہ لینے کے بہانے باہر گیا۔ اس دوران میں، میں نے شیشے میں سے جھانکا، گارڈز کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے جیسے اسپتال کے اس وی آئی پی کمرے کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے تھے۔ قریباً تین منٹ بعد ارکب واپس آیا۔ اس نے میری دائیں پسلیوں کے زخم کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں نے گھیرا مزید تنگ کر دیا ہے۔ وہ پتھراؤ کر رہے ہیں اور بیرونی شیشے توڑ رہے ہیں۔ گرے سپاہی قطاریں باندھ کر تیار کھڑے ہیں لیکن اگر وہ سیدھی گولی چلائیں گے تو بہت خون خرابا ہوگا۔ مادام کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''اس کا اینڈ کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

گرے کمانڈوز اور جلوس کو لیڈ کرنے والوں میں بات چیت ہورہی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی چار پانچ منٹ میں نتیجہ نکل آئے گا۔''

''اس گفتگو میں ایجنسی شریک نہیں؟''

''ایجنسی کے لوگ بھی ہیں۔''

ابھی ارکب کا فقرہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ امریکن گارڈز نے ٹھکا ٹھک سیلیوٹ مارے اور ہر طرف ہلچل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ رائے زل کا دستِ راست کمانڈر اروان اور ایک بڑا امریکی آفیسر یہاں پہنچے ہیں۔ اس بڑے امریکی آفیسر کے ساتھ مجھے نیلی آنکھوں والا پال کورنی بھی

نظر آیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ میرے اور تاجور کے لیے صورتِ حال کچھ بہتر ہونے جارہی ہے مگر ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ امریکی آفیسرز کے حکم پر پہلے میرے جسم کی بالائی اسٹریپس کھولی گئیں اور مجھے اٹھا کر بٹھا دیا گیا۔ میرے ہاتھوں کو حسبِ معمول الٹی ہتھکڑی لگائے جانے کا پروگرام تھا مگر کلائیوں کی بھاری پٹیوں کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا اور میرے ہاتھ کیبل ٹائی میں جکڑے گئے۔

کمانڈر اروان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہلکورے لے رہی تھی۔ یہ وہی کمانڈر اروان تھا جس نے عین گھمسان کی لڑائی میں اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس نے توہم پرستی کی بُری مثال پیش کی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ مادام ہانا وانی کی آنکھوں کا جادو رضا کاروں اور سپاہیوں کے دل و دماغ کو جکڑ رہا ہے اور شکست یقینی ہوتی جارہی ہے۔ اب کمانڈر اروان کو اپنی بے وفائی کا صلہ ملا تھا اور وہ کلیدی عہدے پر فائز تھا۔

مجھے اور تاجور کو قریباً ایک درجن مسلح افراد کے نرغے میں کمرے سے باہر لایا گیا۔ ''تمہارے لیے وہیل چیئر لائی جائے؟'' پال نے سپاٹ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''نہیں شکریہ۔'' میں نے کہا اور تاجور کے ساتھ لنگڑاتا ہوا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا باہر آگیا۔ میرے جسم پر پتلون تھی۔ بالائی جسم زخموں کی وجہ سے عریاں تھا۔

ایک کوریڈور سے گزر کر ہم ایک برآمدہ نما جگہ پر پہنچے۔ یہاں بے شمار شیشے کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آنسو گیس کی بُو بھی محسوس ہورہی تھی۔ ہم نے دیکھا اسپتال کی بیرونی چار دیواری سے باہر اور وسیع گیٹ کے سامنے مشتعل لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ کم از کم جہاں تک ہماری نگاہ جارہی تھی وہاں تک تو سر ہی سر نظر آتے تھے۔ چہرے تمتمائے ہوئے اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ مظاہرین کے اس لہریں لیتے ہوئے سیلاب کے سامنے ایجنسی کے سفید فام گارڈز اور سیکڑوں گرے فوجیوں نے بند باندھ رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی وجہ سے یہ بند کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔

مجھے دیکھ کر فلک شگاف نعرے بلند کیے گئے۔ ہجوم میں ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جو گرے فوجیوں کو دھکیلتے ہوئے کچھ مزید پیچھے لے آئی۔ مجھے بھروسا نہیں ہورہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے لیے ہورہا ہے۔ ایم ایم اے کے فائٹر کی حیثیت سے میرے ہزاروں پرستار تھے مگر اس طرح کے پرستار میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے...... ستم زدہ چہرے، امید بھری آنکھیں۔

مجھے اور تاجور کو فوراً مظاہرین کے سرکردہ لیڈروں کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے مجھے اپنے حصار میں لے کر ایک اسٹیشن ویگن میں بٹھا دیا۔ عجیب منظر تھا۔ مجھ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جا رہی تھیں۔ عورتیں، مرد، جوان اور بوڑھے مجھے دیکھنے کے لیے اُمڈے پڑ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر سے کھول دیے گئے، عورتیں اور بوڑھے مرد میرے ساتھ ساتھ تاجور کی بلائیں بھی لے رہے تھے۔ بڑے جذباتی انداز میں میری پیشانی اور ہاتھوں کو بوسے دیے جانے لگے۔

ایک شخص نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔ ''تم نے ان حرام زادوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ تم نے ہمارے سر فخر سے بلند کیے ہیں۔ ہم ان سے تمہارے ایک ایک زخم کا بدلہ لیں گے۔''

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ''ہم تمہیں سلام کرتے ہیں۔ تمہاری عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ مل کر جاماجی کی تقدیر بدلیں گے۔''

بہت بلند بانگ فقرے بولے جا رہے تھے۔ جذباتی ماحول تھا اور مجھے ایک ایسا درجہ دیا جا رہا تھا، میں خود کو جس کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ جلوس میں سیکڑوں لٹھ بردار اور ڈنڈا بردار ایسے تھے جنہوں نے چہروں پر اسکائی ماسک چڑھا رکھے تھے تاکہ فوٹیج میں ان کی شکلیں نظر نہ آئیں۔ انہوں نے اسٹیشن ویگن کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ایجنسی اہلکار اور گرے فوجی ہجوم پر سیدھی فائرنگ کرتے تو جواب میں ان پر بھی فائرنگ کی جا سکتی تھی۔

ہزاروں پُرجوش افراد کے گھیرے میں اسٹیشن ویگن نے اسپتال کی مخالف سمت میں رینگنا شروع کر دیا۔ نوجوان ویگن کی چھت پر چڑھ گئے اور انہوں نے جاماجی کے دو رنگے پرچم لہرا دیے۔ مظاہرین کے دو لیڈر بھی میرے اور تاجور کے ساتھ اسٹیشن ویگن میں ہی موجود تھے۔ ویگن میں طبی امداد کا کافی سامان مع آکسیجن سلنڈر وغیرہ موجود تھا۔ لیکن فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو لوگوں کے بے پناہ جوش و خروش اور فلک شگاف نعروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک نوجوان نے ویگن کی کھڑکی سے منہ لگایا۔ اس کا چہرہ اسکائی ماسک میں چھپا ہوا تھا، صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ پکار کر بولا۔ ''کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں...... مینوں دس دیو ہوا کیہہ قصور میرے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کولوں۔''

میں اچھل کر رہ گیا۔ یہ انیق کی آواز تھی۔ انیق اور یہاں؟ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے اسے فوراً اندر بلا لیا۔ وہ آبدیدہ ہو کر میرے گلے لگ گیا۔ اس نے کتنی ہی دیر میرے کندھے سے سر ٹکائے رکھا، پھر میرے جسم کے زخموں کو دیکھا اور مزید رنجیدہ ہونے لگا۔

میں نے اردو میں اس سے پوچھا۔ ''تم اکیلے ہو؟''

''نہیں بھائی! میرے ساتھ آپ کا امریش پوری بھی ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی آپ کے آس پاس ہی ہے۔ اس کا چہرہ بھی میری طرح ماسک میں چھپا ہوا ہے لیکن اگر نہ بھی چھپا ہو تو آپ اسے مشکل سے پہچان سکیں گے۔ ابھی آپ کو تفصیل کا پتا چل جائے گا۔''

میں سناٹے میں تھا۔ ان لوگوں نے پناہ گاہ سے باہر نکل کر بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میرے چہرے پر گہری تشویش دیکھ کر انیق نے سرگوشی کی۔ ''آپ فکرمند نہ ہوں۔ باقی لوگ وہیں پر ہیں اور بالکل محفوظ ہیں۔''

''ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟''

''زیادہ دور نہیں۔ شہر کے اندر ہی مرکوزا نامی علاقے میں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہائی نس قسطینا اور ریان فردوس مرحوم کے حمایتی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ علاقہ حکومت مخالف سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے چھوٹی سڑکوں اور گلیوں میں اپنے گیٹ لگا لیے ہیں گرے فوجیوں اور گورے گارڈز کو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ان گلیوں میں گھس سکیں۔''

جلوس آگے کو رینگتا رہا۔ شرکا کی تعداد کم نہیں ہوئی تھی بلکہ شاید اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہو۔ مجھے جگہ جگہ ایسے کتبے نظر آئے جن میں قسطینا کی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ مکمل فوجی لباس میں تھی اور اس کے دونوں ہاتھ بلند تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے وکٹری کا نشان بنا رکھا تھا اور دوسرے میں رائفل تھام رکھی تھی۔ کچھ مظاہرین نے ایسے کتبے بھی اٹھا رکھے تھے جن پر کمانڈر فارس جان کی تصویر تھی۔ اس تصویر میں اس کے سر پر ایک سفید پٹی نظر آتی تھی جس پر عربی میں کچھ لکھا تھا جو تیسری تصویر مجھے جابجا نظر آئی اور جس نے مجھے ششدر کیا وہ ایک زخمی شخص کی تھی۔ اس کا بالائی دھڑ بالکل عریاں تھا۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے زخم اتنے زیادہ اور اتنے شدید تھے کہ کئی جگہ سے اس کی کھال کسی جھالر کی طرح لٹک رہی تھی۔ یہ کوئی اور نہیں...... میں تھا اور میری یہ تصویر اسی جہنمی ٹمپریچر والے ٹارچر سیل میں اتاری گئی تھی جہاں بہت دنوں تک مجھے زندگی میں ہی موت کا مزہ چکھایا گیا تھا۔ میری یہ تصویر درجنوں ہاتھوں میں نظر آ رہی تھی۔

''یہ کیا ہے انیق؟''

''وہی کچھ جو آپ کے ساتھ ہوا ہے اور جس نے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں آگ بھڑکائی ہے۔ آپ کی یہ تصویر آپ کے ایک معالج کے ذریعے ہی ٹارچر سیل سے باہر آئی اور ہر طرف پھیل گئی۔ اس وقت یہ تصویر مرکوزا کے علاقے میں قریباً ہر دیوار پر نظر آتی ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

ہاں تکلیفیں رائگاں نہیں جاتیں...... ہاں برداشت اپنا صلہ پاتی ہے...... اور بے شک اندھیرا جب بہت گہرا ہو جاتا ہے تو ''اجالے'' اپنی جھلک دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں بھی وہی جھلک دیکھ رہا تھا۔ جاماجی کے لوگ، جنہوں نے بڑے بڑے واقعات پر ٹولیوں کی صورت میں چھوٹے چھوٹے احتجاج کیے تھے، آج ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں نظر آ رہے تھے اور یہ سب کے سب ''چارجڈ'' لوگ تھے۔ مرنے مارنے پر آمادہ۔ میں سمجھ گیا کہ انیق میرے جس معالج کا ذکر کر رہا ہے وہ وہی کمپاؤنڈر ہے۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ چھتوں پر جگہ جگہ گرے فورس کے مسلح اہلکار دکھائی دیتے تھے۔ بلندی پر ہیلی کاپٹرز پرواز کر رہے تھے۔ مگر عوام کی اتنی بڑی تعداد کے خلاف کارروائی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جلوس جلد ہی شہر کے اس گنجان علاقے میں داخل ہو گیا جس کا نام انیق نے مرکوزا بتایا تھا۔ یہاں دو تین منزلہ عمارتیں تھیں اور تنگ گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اسٹیشن وین پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جانے لگیں۔ لوگ اسٹیشن وین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جوشِ محبت کچھ ایسا تھا کہ وہ وین کو ہاتھ لگانے کو ہی اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ مجھے اپنے زخم زخم جسم والی اتنی تصویریں یہاں نظر آئیں کہ میں حیران رہ گیا۔

یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا تھا۔ جاماجی کے خاموش پانیوں میں یہ طوفان کیسے ابھرا تھا۔ مجھے گلیوں میں جگہ جگہ آہنی گیٹ نظر آئے جہاں لٹھ بردار نوجوان ٹولیوں کی صورت پہرا دے رہے تھے۔ اندازہ ہوا کہ مزید گیٹ بھی

لگائے جارہے ہیں ترانہ گونج رہا تھا۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے...... اور سینہ تان کے جینا ہے

ہم نے عزم کرلیا...... جنگ میں قدم دھرلیا......

☆☆☆

یہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز تھا۔ ابھی ایک مسلم ملائیشیائی ڈاکٹر میرا معائنہ کر کے گیا تھا۔ انیق اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بھاری بھرکم سکھ تھا۔ بڑا سا پگڑ اور کمر کے ساتھ کرپان بندھی ہوئی تھی۔

''کیا حال ہے شاہ زیب؟'' اس نے جذباتی آواز میں کہا۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ سجاول تھا۔ سردار سجاول سیالکوٹی۔ انیق کی شباہت بھی بہت حد تک بدلی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ براؤن تھا اور وہ گھونگرالے نظر آرہے تھے۔ اس کے رخساروں میں ابھار پیدا کیا گیا تھا جس کی وجہ سے آنکھیں چھوٹی ہو کر بالکل بدل گئی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ٹاپو کی زیرِ زمین پناہ گاہ میں جہاں اور بے شمار سہولتیں موجود ہیں، وہاں حلیے میں تبدیلی لانے کے لوازمات بھی دستیاب ہیں۔ انیق نے گاڑی میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں مرکوزا میں اس کی اصلیت کا علم صرف یہاں کے میئر یاذان گوہر کو ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ یہاں رحمانی کے نام سے موجود ہے اور سجاول، پربت سنگھ کے نام سے۔

سجاول کو دیکھ کر عجیب سی توانائی کا احساس ہوا۔ میں نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ میرے قریب بستر پر بیٹھ گیا اور بغلگیر ہونے والے انداز میں ہولے سے میرے ساتھ لگ گیا۔ انیق کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔

سجاول بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تیرا کیا حال ہو گیا ہے شاہ زیب! لیکن ہم تیرے ایک ایک زخم کا حساب لیں گے۔''

انیق نے کہا۔ ''اور شاہ زیب بھائی! آپ نے جس برداشت کا ثبوت دیا ہے اور جس طرح ان گوروں کے سامنے ڈٹے ہیں، اس نے لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ بہت بڑی تبدیلی آئی ہے یہاں۔''

میں نے سب سے پہلے زینب اور ابراہیم کا پوچھا۔

انیق نے کہا۔ ''وہ دونوں خیریت سے ہیں بھائی! قسطینا صاحبہ، کمانڈر فارس، سنبل وغیرہ بھی سب خیریت سے ہیں۔ صرف بن مشہد علیل ہے۔ اسے شدید قسم کا ملیریا ہے لیکن اب وہ بھی بہتر ہو رہا ہے۔''

انیق نے پریشان نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''کیپٹن تبارک اور سیف؟''

اس کا سوال سن کے میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ ذرا توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''ان دونوں کے بارے میں اچھی خبر نہیں ہے میرے دوستو...'' میری نحیف آواز کچھ اور نحیف ہو گئی تھی۔

''زخمی ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ ہم میں نہیں ہیں۔'' انیق اور سجاول دونوں گم صم ہو گئے۔ اُن کے چہرے الم کی تصویر تھے۔ خاص طور پر انیق کے لیے سیف کی موت کی خبر بہت بڑا دھچکا تھی۔ وہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکا۔

میں نے مختصر لفظوں میں انہیں بتایا کہ کس طرح کیپٹن تبارک کو کھائی سے نکالنے کے بعد ہم رائے زل کے امریکی گماشتوں کی زد میں آگئے اور کس طرح ہم سے وہیں ٹاپو پر دردناک تفتیش کا آغاز ہوا۔

انیق کی آنکھوں میں جیسے آگ سی بھڑکنے لگی تھی، کچھ یہی کیفیت سجاول کی بھی تھی۔

میں نے انیق اور سجاول کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کی موجودگی چھپاتے چھپاتے تبارک اور سیف کی جان گئی...... میں نے بدترین تشدد سہا، لیکن تم دونوں اب یہاں موجود ہو، تم نے اتنا بڑا رسک کیوں لیا؟''

سجاول نے انیق کی طرف اور انیق نے سجاول کی طرف دیکھا۔ سجاول نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ رسک ہم نے صرف تین چار دن پہلے لیا ہے، اور پوری طرح سوچ سمجھ کر...... کسی طرح کا کچا کام نہیں کیا تھا ہم نے...... اور اب بھی ہم پکے قدموں پر ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

سجاول کی پیشانی اور کنپٹیاں وغیرہ مکمل طور پر پگڑی نے چھپائی ہوئی تھیں۔ گھنی بھاری مونچھوں اور داڑھی نے چہرے کو کافی حد تک ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ یہ نقلی داڑھی بالکل اصلی کی طرح تھی۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے تھوڑا سا نیچے جھکا اور اپنی ریشمی قمیص پیٹ پر سے تھوڑی سی اٹھا دی۔ اس کی بالوں بھری توند کے ساتھ کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی دھماکا خیز ڈیوائس تھا جو برج کلب والے مشن پر جاتے ہوئے قسطینا نے اپنی کمر سے باندھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک چھوٹی سی ڈوری کے ساتھ لگا ہک کھینچتے ہی یہ ڈیوائس پھٹ کر جسم کے ٹکڑے کر سکتا ہے۔

انیق نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ایسی ہی بیلٹ میری کمر

سے بھی بندھی ہوئی ہے بھائی۔ ہم دونوں نے پناہ گاہ چھوڑنے سے پہلے خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھائی تھی اور تحریری عہد کیا ہے کہ اگر ہم پناہ گاہ سے باہر پکڑے گئے تو گرفت میں آنے سے پہلے ہی خود کو اُڑا لیں گے اور اس عمل میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کریں گے۔''

انیق کے لہجے میں چٹانی ارادہ تھا۔ اس نے بھی اپنی قمیص اٹھا کر مجھے اپنی دھماکا خیز بیلٹ کی جھلک دکھائی اور بولا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ پچھلے تین چار دن میں تو ان بیلٹوں کی ڈوریاں کھینچنے کی نوبت نہیں آئی۔''

''مگر تمہیں نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ اتنی محفوظ جگہ ہے انیق کہ یہ لوگ برسوں بھی سر مارتے رہیں تو اس کا کھوج نہیں پا سکتے...... وہاں طویل مدت تک رہنے کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔''

سجاول نے ایک طویل اور بوجھل سانس لی۔ ''وہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی مگر تمہاری کمی تو تھی۔ تم وہاں نہیں تھے اور ٹی وی کے ذریعے جو خبریں ہم تک پہنچتی تھیں، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ تم بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تمہیں بلک بلک کر مرنے دیتے اور وہاں چھپ کر بیٹھے رہتے۔ قسطینا سمیت ہم سارے کے سارے بہت دکھی تھے۔ دن رات سوچتے تھے کہ کس طرح تمہاری مدد کی جائے پھر میں نے اور تمہارے نکو شہزادے نے پہل کی۔ نکو شہزادے نے اپنے چہرے پر تھوڑا سا رنگ روغن کیا اور میرے لیے یہ سکھوں والا لباس ڈھونڈا۔ آدھی رات کے بعد جب سارے سو رہے تھے ہم نے فیصلہ کیا اور پکے ارادے کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔''

انیق نے کہا۔ ''میں ہر ہائی نس قسطینا کے لیے ایک تحریر چھوڑ آیا تھا جس سے انہیں ہماری روانگی کا علم ہو گیا۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' میں نے ماتھا پکڑ لیا۔ ''اس ٹاپو سے تمہارا نکلنا، سمندر پار کر کے یہاں جزیرے تک پہنچنا...... یہ سب کیسے ممکن ہوا۔''

سجاول نے اپنے صندوق جیسے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ''جب چھاتی میں آگ ہو ناں...... اور سر اپنی تلی (ہتھیلی) پر رکھ لیا جائے تو بڑے بڑے اوکھے کام بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ یہ قصہ تمہیں بعد میں سنائیں گے۔ فی الحال کچھ اور سوچنے کی ضروری باتیں ہیں۔''

باہر سے مدھم شور سنائی دیتا تھا۔ وقفے وقفے سے سیکڑوں لوگ نعرہ زنی کرنے لگتے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ مرکوزا کے بے شمار لوگ سڑکوں پر موجود ہیں، وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے نزدیک مقامی ہیروز کی صف میں تو اسی روز شامل ہو گیا تھا جب رائے زل کے حملے کے وقت ڈی پیلس سے چند کلومیٹر کی دوری پر گھمسان کی لڑائی میں، میں نے ان کی لیڈر قسطینا کا دفاع کیا تھا مگر اب حلمی کو قتل کرنے اور اس کے بعد ایجنسی کا بے پناہ تشدد سہنے اور ثابت قدم رہنے کے بعد میں ان کے لیے بے حد اہم ہو گیا تھا۔ سجاول اور انیق یہاں تاجور کی موجودگی پر بھی ازحد حیران تھے۔ انہیں کل ہی علم ہوا تھا کہ تاجور بھی یہاں موجود ہے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں بتایا کہ موجودہ صورتِ حال میں شکیل داراب کا کیا کردار ہے اور تاجور کن حالات میں اور کیسے یہاں پہنچی ہے۔ وہ دونوں بے حد حیرت سے سنتے رہے۔ کافی دیر بعد جب موضوع بدلا تو میں نے انیق سے پوچھا۔ ''یہاں پہنچنے کے بعد تمہارے ارادے کیا تھے؟''

''ہم کسی بھی طرح آپ تک پہنچنا اور آپ کو بچانا چاہتے تھے۔ ذہن میں کوئی پلان نہیں تھا لیکن ارادہ صرف ایک ہی تھا، جان ہتھیلی پر رکھنی ہے اور مرنا ہے یا کچھ کرنا ہے۔'' انیق کا یہ لب ولہجہ میں پہلی بار سن رہا تھا۔ وہ عام قد کاٹھ کا تھا مگر جب اس انداز سے بولتا تھا تو اس میں بلند پہاڑوں کی آن بان نظر آتی تھی۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مشکور انداز میں آسمان کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''ابھی ہم سوچ بچار میں ہی تھے کہ قدرت نے مدد کی۔ ہمیں پتا چلا کہ ڈی پیلس کے نزدیک ایک ایمبولینس اور آرمی کی گاڑی میں تصادم ہوا ہے۔ ایمبولینس میں موجود مریض کو دوسری گاڑی میں منتقل کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ وہ مریض آپ ہیں اور بے حد زخمی حالت میں ہیں۔ یہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گیا۔ اس کے بعد مرکوزا اور دوسرے علاقوں کے لوگ وکٹوریہ اسپتال کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے، کسی کو توقع نہیں تھی کہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں نکلیں گے اور معاملہ یہ رخ اختیار کرے گا۔''

میرا دھیان بار بار ابراہیم کی طرف جا رہا تھا جب میں پناہ گاہ سے نکلا تو اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس نے زینب کی خاطر اپنی ''زہر کی ڈوز'' خطرناک حد تک کم کر دی تھی اور سخت مشکل میں تھا۔ میں نے انیق اور سجاول کو اس بارے میں کریدا۔ ان کے جوابات سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ بدستور اسی حالت میں ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی مرکوزا کا میئر باذان

گوہر بھی اجازت لے کر اندر آ گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ریان فردوس کی فیملی کے قدیم خدمت گار تھے اور اس فیملی کی وفاداری ان میں رچ بس چکی تھی۔ کمال احمد کی موت نے باذان گوہر کے سینے پر گہرا گھاؤ لگایا تھا اور اب وہ ابراہیم کی سلامتی کے بارے میں ازحد فکر مند تھا۔ انیق اور سجاول کی طرح میں نے بھی اسے تسلی دی کہ عزت مآب ریان فردوس کا اصل وارث پرنس ابراہیم صحیح سلامت ہے اور جلد ہی اپنے لوگوں کے درمیان ہوگا۔

گفتگو شروع ہوئی تو میں نے باذان گوہر سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے مسٹر! رائے زل اور ایجنسی یہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلے گی۔ اسپتال میں تو وہ مادام کی موجودگی کی وجہ سے مجبور تھے مگر اب وہ اس علاقے پر چڑھ دوڑیں گے۔''

''یہ سب اتنا آسان بھی نہیں ہے شاہ زیب صاحب۔'' میسرشستہ انگلش میں بولا۔ ''یہاں کا بچہ بچہ ان کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ ہم نے علاقے کے زیادہ تر راستے لوہے کے گیٹ لگا کر بند کر دیے ہیں۔ اب ہم باقی راستوں کو بھی بند کریں گے۔''

''مگر کوئی حکومت بھی اپنے شہر میں ''نو گو ایریاز'' برداشت نہیں کرتی۔ یہ رائے زل کیسے کرے گا جبکہ اسے اب یہ پتا ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ یہ لوگ شاید ایک آدھ دن میں ہی یہاں کوئی بڑی کارروائی کر گزریں گے...... میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے یہاں لا کر اہلِ علاقہ کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔''

''خطرہ تو اب مول لینا ہی لینا ہے مسٹر شاہ زیب! ورنہ عمر بھر کی ذلت اور غلامی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب طبلِ جنگ بج چکا ہے۔''

باذان گوہر کی عمر پینتیس سال سے اوپر تھی۔ چوڑی کاٹھی، روشن چہرہ ارادے کا بہت مضبوط نظر آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، اس کے سیل فون پر کال آئی۔ کسی نے ملائی زبان میں اسے بتایا کہ گیٹ نمبر 8 کے سامنے گرے فورس اور ایجنسی کی گاڑیاں جمع ہو رہی ہیں۔ دیگر سڑکوں پر بھی گرے فورس کا گشت بڑھ گیا ہے۔

باذان گوہر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''یہ ابھی اندر گھسنے کی جرأت نہیں کر سکتے...... اس وقت یہ جلے پاؤں والی بلی ہیں...... ان کو چکرانے دو۔''

''معاف کرنا مسٹر، مجھے خون خرابے کی بُو آ رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہاں کسی ایک بے گناہ شہری کی زندگی کو بھی نقصان پہنچے۔''

''خون خرابے سے ڈرنے کا وقت اب گزر چکا ہے مسٹر شاہ زیب! ہمیں ایک ایک کر کے مارا جا رہا ہے۔ ہماری عورتوں کو بے عزت کیا جا رہا ہے۔ ہمارے گھروں کو لوٹا جا رہا ہے۔ اب بات تخت یا تختے کی طرف جا رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں مسٹر شاہ زیب کہ ایجنسی کے افسروں میں ایک دو دور اندیش لوگ بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر پال کورنی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ ایسے لوگ رائے زل کو اتنے بڑے خون خرابے کی اجازت دیں گے۔''

''رائے زل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں جہاں بے رحم ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔ سات پہروں میں اور سات پردوں میں چھپا ہوا۔ جب سے آپ نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا ہے وہ پبلک مقامات پر شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔ وہ عیاشیوں میں ڈوبا ہوا جنس زدہ ریچھ ہے۔ باہر سے جتنا بارعب اور دبنگ اندر سے اتنا ہی کمینہ اور بزدل۔ یہ ریچھ اب زیادہ دیر تک ہمارے گوشت اور ہمارے دل میں اپنے پنجے نہیں گاڑ سکتا۔'' باذان گوہر کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

ایک شخص اندر آیا اس نے ادب سے جھک کر مسٹر باذان کے کان میں کچھ کہا اور باہر چلا گیا۔ باذان گوہر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! آپ کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ آپ سے طویل ملاقاتیں کی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ ابھی شاید آپ کو مزید خون کی ضرورت پڑے۔ آپ آرام کریں۔ آپ کی ساتھی خاتون مس تاجور بھی کچھ پریشان ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں، ہم اپنی گفتگو کل دوپہر تک کے لیے ملتوی کرتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر بعد تاجور ایک بار پھر میرے پاس کمرے میں موجود تھی۔ رو رو کر اس کا برا حال تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب! اب تو آپ اپنے لوگوں میں آ گئے ہیں...... اپنے مددگاروں میں پہنچ گئے ہیں۔ میں آپ سے منت کرتی ہوں، آپ مجھے شکیل صاحب کے پاس واپس بھجوا دیں۔''

''تم شکیل صاحب کے پاس واپس جا کر کیا کرو گی؟''

''وہ مجھے پاکستان واپس لے جائیں گے۔ میرے امی ابو، میرے بھائی، سب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر پہنچی ہے۔ اس نے جو کچھ آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...... شکیل داراب بہت لمبے ہاتھوں والا شخص تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی کو ڈھونڈنا چاہتا اور ڈھونڈ نہ سکتا۔ اس نے یہاں جاماجی میں میرا صاف انکار سننے کے بعد تاجور کو یہاں لانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کچھ دن پہلے برونائی سے فلائٹ پکڑی اور پاکستان پہنچ گیا۔ اس کے ان گنت گماشتوں نے دن رات کوشش کر کے سکھیرا گاؤں میں تاجور کا سراغ لگالیا۔ تاجور اور اس کے گھر والے ایک دم وی آئی پی بن گئے۔ دین محمد کو زرعی خدمات میں انعام دینے کے بہانے مع اہل وعیال اسلام آباد بلا لیا گیا اور وہاں فوری طور پر انہیں ایک فارم ہاؤس الاٹ کر دیا گیا۔ شکیل داراب کی بیوی نے تاجور کو آناً فاناً اپنی بہن کا درجہ دے دیا اور میاں بیوی اسے لے کر یہاں جاماجی پہنچ گئے...... یہ سب کچھ اتنی تیز رفتاری سے ہوا کہ تاجور سمیت اس کے سب گھر والے حیران رہ گئے۔

تاجور کی پوری رُوداد سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''تاجور! مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ تم اب بھی شکیل داراب کے پاس جانا چاہ رہی ہو۔ کیا ڈی پیلس میں چھت سے لٹکنے کے بعد بھی تم یہی سمجھتی ہو کہ تم شکیل کی بیوی کی بہن ہو اور وہ تمہارا خیر خواہ ہے؟''

''ہو سکتا ہے...... شش شکیل صاحب کو پتا ہی نہ ہو کہ...... میرے ساتھ ایسا کیا گیا ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''کبوتر کی طرح آنکھیں بند مت کرو۔ وہ حرام زادہ تمہیں یہاں صرف اس لیے لایا ہے کہ تم پر تشدد کر کے میری زبان کھلوا سکے۔ وہ جانتا ہے تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہو تاجور۔'' میں روانی میں کہہ گیا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ایک ہی لمحے میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے پیشانی پر جھولتی ہوئی دو ریشمی لٹوں کو ہٹا کر کانوں کے پیچھے اڑسا اور دکھی انداز میں بولی۔ ''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شکیل صاحب کے پاس واپس چلی جاؤں میرے گھر والے ان کے پاس ہیں۔''

''اس شاطر شخص کے پاس جا کر تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرو گی تاجور، اور میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ کم از کم ابھی تو نہیں۔'' میرے لہجے میں تختی، محبت، خلوص سبھی کچھ شامل تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''یہ لوگ جو ہمیں یہاں لے کر آئے ہیں، کون ہیں، کیا چاہتے ہیں آپ سے؟''

''تاجور، یہ سمجھو کہ یہ مظلوم اور پسے ہوئے لوگوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ یہاں کے جابر حاکموں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر رہا ہے۔ جلد ہی یہاں زور کا معرکہ ہونے والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شکیل داراب جیسے مطلب پرست بھی اس رگڑے میں آ جائیں۔''

وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! میں اپنے رویّے پر تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈی پیلس کے اپارٹمنٹ میں تم سے بڑی سخت باتیں کیں۔ تمہارا گریبان تک پھاڑ ڈالا...... دراصل......''

''میں سمجھتی ہوں شاہ زیب۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''آپ ان لوگوں پر ظاہر کر رہے تھے کہ آپ کو میری کوئی پروا نہیں۔ میں سب سمجھ رہی تھی۔''

''وہاں کیمرے اور خفیہ آڈیو سسٹم موجود تھا تاجور، ان لوگوں نے یقیناً سب دیکھا ہو گا۔''

''آپ نے جس طرح مجھے بچانے کے لیے اپنے بازو زخمی کیے وہ میں کبھی بھول نہیں سکوں گی۔ مجھے اسکرین پر سب کچھ نظر آ رہا تھا۔'' وہ جیسے جھرجھری لے کر بولی۔

''یہ سب مصیبتیں بھی تو تم پر میری ہی وجہ سے ٹوٹ رہی ہیں تاجور۔ میں نے تمہیں تمہارے بچپن کے منگیتر اسحاق سے تو بچایا مگر اسحاق سے کہیں زیادہ خطرناک لوگوں کی دشمنیاں تمہاری جھولی میں ڈال دیں۔''

''یہ سب کچھ...... قدرت نے میری قسمت میں لکھا ہوا تھا شاہ زیب! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ اب آپ...... اگر کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کریں کہ مجھے کسی طرح واپس پاکستان بھجوا دیں۔ میرے گھر والے بے حد پریشان ہوں گے۔ پتا نہیں کہ شکیل صاحب نے انہیں کیا بتایا ہے۔ میری امی تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھیں۔''

''کس بات کے لیے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔ ''میری منگنی ہو چکی ہے شاہ زیب، اگلے مہینے میری شادی تھی۔''

اپنی طرف سے اس نے مجھ پر ایک بڑا انکشاف کیا تھا۔ حالانکہ یہ سب میں بہت عرصہ پہلے جان چکا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''مبارک باد والے حالات تو نہیں لیکن پھر بھی مبارک ہو، کہاں ہوئی ہے تمہاری

منگنی؟"

"سکھیر اگاؤں کے ہی لوگ ہیں۔"

"کیا کرتا ہے لڑکا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی۔ سر جھکائے جھکائے بولی۔ "ہماری ہی طرح زمیندار ہے۔"

"آج کل کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

میرا یہ سوال اسے بے محل محسوس ہوا۔ ذرا اٹک کر گھبرائے انداز میں کہنے لگی۔ "وہ آج کل کام کے سلسلے میں گاؤں سے باہر ہیں...... بہاولپور گئے ہوئے ہیں۔"

"تم خوش ہو تاجور؟" میں نے اچانک دریافت کیا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور دوبارہ پلکیں گرالیں۔ اس نے وہی جواب دیا جو قریباً ہر مشرقی لڑکی دیتی ہے کہنے لگی۔ "جہاں میرے ماں باپ خوش ہیں، وہیں میں بھی خوش ہوں...... اور...... اور مجھے آپ سے بہت زیادہ معافی بھی مانگنی ہے شاہ زیب! اگر کسی بھی وجہ سے میں نے آپ کا دل دکھایا ہو، میری کسی بات سے آپ کو رنج ہوا ہو تو مجھے معاف کردیں۔"

"معافی تو غلطی پر مانگی جاتی ہے تاجور...... اور تم نے کون سی غلطی کی۔ تم نے اس لیے اپنا راستہ مجھ سے جدا کیا تھا کہ میں خطرناک اور گمراہ زندگی گزار رہا ہوں، بہت جلد مصیبتوں کا شکار ہو جاؤں گا...... اور میں ہو چکا ہوں۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے اور ابھی پتا نہیں کہ مزید کیا کچھ ہونا ہے۔" میں نے اپنے زخم زخم جسم کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سسک اٹھی۔ "تو پھر...... تو پھر کیوں نہیں چھوڑ دیتے یہ سب کچھ؟"

میں گم صم اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر ہولے سے کہا۔ "یہ وہی سوال ہے جو تم جیسی ہمدرد عورتوں نے اَن گنت مرتبہ گمراہ مردوں، گینگسٹروں اور قاتلوں سے کیا ہے، اور اس کا جواب بھی وہی صدیوں پرانا ہے تاجور...... میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اکثر واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ انہیں صرف آگے ہی جانا ہوتا ہے۔"

وہ عجب بے تابی سے بولی۔ "آپ...... کہیں چھپ جائیں...... کہیں دور چلے جائیں...... اتنی بڑی دنیا ہے، کسی کونے میں، کسی کونے میں......" وہ باقاعدہ رونے لگی۔

کمرے کی ایک کھڑکی میں سے تاریک رات کے چند ستارے جھلک دکھا رہے تھے۔ مرکوزا کی گلیوں میں ابھی تک ہلکا ہلکا شور اور نعرے تھے۔ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "اس دنیا میں بڑے لمبے ہاتھوں والے لوگ موجود ہیں تاجور اور جب وہ کسی کو ڈھونڈنا چاہیں تو ڈھونڈ لیتے ہیں اب دیکھو، تمہیں بھی سکھیر اگاؤں سے ڈھونڈ ہی لیا گیا نا...... اور اگر تم پھر کہیں چھپو گی تو شکیل جیسے لوگ پھر تمہیں ڈھونڈ لیں گے...... اس لیے میرا فیصلہ ہے کہ ابھی تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتا ہوں تاجور۔" میں نے اپنا زخمی ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

وہ جیسے اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ وہ شاید اب اپنے آپ کو کسی کی امانت سمجھ رہی تھی اور وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ اپنے جس منگیتر کا ذکر کررہی ہے اور جس سے شادی کی بات پر اس کا چہرہ سرخ ہوتا ہے...... وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سویرے انیق سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اسے بدلے ہوئے حلیے میں شناخت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ یہاں اسے رحمانی کے نام سے پکارا جارہا تھا۔ اسے اور سجاول کو لوگ رضا کار دستے کا فرد سمجھ رہے تھے۔ انیق نے مجھے بتایا کہ کل رات گرے فورس کے کچھ اہلکاروں نے مرکوزا کے ایک محلے میں داخل ہونا چاہا۔ وہ دو افراد کو گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر اہلِ علاقہ نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ انہوں نے گیٹ بند کردیے اور وہاں تین چار سو افراد جمع ہو گئے۔ گرفتاری کے لیے آنے والے واپس چلے گئے۔ انیق نے کہا۔ "ابھی میں دیکھ کر آیا ہوں۔ کئی جگہ لوہے کے گیٹ لگائے جارہے ہیں۔ یہاں مجھے مشہور بریگیڈ پاسبان کے لوگ بھی نظر آئے ہیں...... مجھے لگتا ہے کہ مرکوزا والوں کے تیور خطرناک ہیں۔ آپ کی یہاں موجودگی کو بھی وہ ایک بڑا اچھا شگون سمجھ رہے ہیں۔ میں تو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو قسطینا صاحب ہی کی طرح اپنے سرآنکھوں پر بٹھالیا ہے۔"

"اور یہ غلط ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں اُن کی توقعات پر پورا اتر سکتا ہوں۔"

"مگر انہوں نے تو توقعات لگا لی ہیں۔ آپ کی وہ تصویر یہاں چپے چپے پر لگی ہے جس میں آپ زخموں کے سبب نیم جان ہیں اور گرمی کی وجہ سے آپ کی کھال جگہ جگہ سے جھلس گئی ہے۔ میں خود حیران ہوں بھائی کہ آپ نے اتنی تکلیف کیسے برداشت کی۔ مجھے کل دو بڑی عمر کے ملائیشین

ایسے بھی ملے جو آپ کو سپرنیچرل قرار دے رہے تھے۔''
''سپرنیچرل؟''
''جی ہاں اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ آپ نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ مادام ہاناوانی اسپتال میں کیوں ہے؟'' میں سوالیہ نظروں سے انیق کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ مادام ہاناوانی نے آپ کو اپنی آنکھوں کے جادو سے زیر کرنے کی کوشش کی...... اور یہ ایسی سرتوڑ کوشش تھی جو اس نے کبھی شاید ہی کی ہو۔ وہ آپ کو زیر کرنے میں ناکام رہی۔ اسی ردِعمل میں اس کی اپنی ذہنی صحت متاثر ہوئی۔ اب پتا نہیں کہ یہ اطلاع غلط ہے یا صحیح لیکن کہا جا رہا ہے کہ مادام اپنی آنکھوں اور سر کے پچھلے حصے میں شدید قسم کا درد محسوس کرتی ہے اور ایسا واقعہ اس کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کچھ لوگ جو مادام کی ماورائی صلاحیتوں کو مانتے ہیں، یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اب زیادہ بوڑھی ہوگئی ہیں اور ان کی ''روحانی طاقت'' پہلے جیسی نہیں رہی۔''

مجھے وہ سارے مناظر پھر یاد آگئے، جب ہاناوانی نے اپنی سیاہ عینک اتاری تھی اور میں ایک ناقابلِ بیان عذاب سے دوچار ہوا تھا۔ اپنے محسن ذکری کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنی سانس روک لی تھی اور اپنے انگوٹھے کے زخم کو اپنی مٹھی میں لے کر بری طرح کچل ڈالا تھا۔ مجھے ٹھیک سے ادراک نہیں تھا کہ وہ معرکہ کتنی دیر جاری رہا لیکن یقیناً وہ ایک طویل دورانیہ تھا...... وہی سات رنگ کا بہت بڑا بھنور جو مجھے بار بار اپنی طرف کھینچتا تھا اور میں اس کی زد سے نکلتا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''وہ واقعہ معمولی نہیں تھا شاہ زیب بھائی! لوگوں نے آپ کی محبت میں اسے مزید بڑھا چڑھا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ جیسا شخص ہی مادام اور اس کے ''عورت باز'' بیٹے کے سامنے خم ٹھونک سکتا ہے...... اور ایجنسی کے سفید سٹوروں کو یہاں سے چلتا کرسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ غلط سمجھ رہے ہیں۔ بے وقوفی کر رہے ہیں۔ میں کوئی فوجی ماہر یا جنگجو کمانڈر نہیں ہوں جو ان کی کمان کروں گا اور جو میری حالت ہے وہ بھی تم دیکھ رہے ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری وجہ سے ان لوگوں پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ میں نے رات کو ایک فیصلہ کیا ہے انیق! اور فیصلہ یہی ہے کہ میری طبیعت ذرا بہتر ہوتی ہے تو ہم مرکوزا سے نکل جائیں گے۔''

''کیسے نکلیں گے؟''
''یہ مجھ پر چھوڑ دو...... میں کل رات تک تمہیں بتادوں گا۔''

انیق نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ آپ کے ارادے سے بے خبر نہیں ہیں۔ ان میں بے چینی پائی جارہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے جس طرح لوگ اپنے لیڈروں کی گاڑیوں کے سامنے لیٹ جاتے ہیں، یہ بھی لیٹ جائیں گے۔''

اچانک ایک مدھم شور نے ہمیں متوجہ کرلیا۔ شدید نقاہت کے سبب میرے لیے تو اٹھنا ممکن نہیں تھا انیق کھڑکی تک گیا اور کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ شور میں اضافہ ہورہا تھا۔ نعرے بھی لگائے جارہے تھے، زیادہ تر عورتوں ہی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ انیق کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اگر آپ یہاں آسکتے ہیں تو آکر دیکھیں، کیا تماشا ہے۔''

میں اٹھا اور انیق کے سہارے چل کر اس دو منزلہ مکان کی کھڑکی تک آگیا۔ منظر قابلِ توجہ تھا یہ ایک بڑا جلوس تھا مگر اس میں سب کی سب عورتیں ہی تھیں...... زیادہ تر جوان مقامی عورتیں۔ ان کے ہاتھوں میں ملائی زبان کے مختلف کتبے تھے اور وہ نعرہ زنی کر رہی تھیں۔

انیق نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں یہ جلوس کس کے لیے ہے؟'' میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''ہماری ایک بڑی بہن ہے جس کا نام تاجور ہے یہ اسی کے لیے ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''یہ سیکڑوں عورتیں آپی تاجور سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ آپ کو یہاں سے جانے سے روکیں۔ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ دونوں محبت کے اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں بلکہ آپی تاجور کی انگلی میں جو RING ہے اسے بھی آپ سے ہی منسوب کیا جارہا ہے۔ ان عورتوں کا خیال ہے کہ جو بات آپ سے کوئی نہیں منوا سکتا وہ آپی تاجور منوا سکتی ہیں...... اور یہی وجہ ہے کہ انہیں پاکستان سے یہاں پہنچایا گیا ہے۔''

میں اس کایا پلٹ پر ششدر تھا......

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

دوسرا کیس

کبیر عباسی

بھیس بدل کر کارنامے انجام دینا کوئی نئی بات نہیں... دوستوں کے ایک ایسے گروہ کا قصہ... وہ اپنی دانست میں بڑے ذہین سراغ رساں تھے... اور بڑے سے بڑے مجرموں کو آسانی سے پکڑنے کا فن بخوبی جانتے تھے... ہمارے اردگرد پھیلے ایسے کتنے کردار ہیں جو بھیس بدل کر ہر طرح کے جرم کر رہے ہیں...

درست ساتھی کا انتخاب جو زندگی کے ہر شعبے میں اہمیت رکھتا ہے......

تیسرے سیمسٹر کے فائنل ٹرم کے بعد ہم آج کل فری تھے۔ میں گھر میں پڑا دھوپ سینک سینک کے اور مالٹے کھا کھا کے بور ہو رہا تھا کہ حسیب کی کال آگئی۔ وہ شاپنگ پر جانا چاہ رہا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ اُس کے ایک کزن کی منگنی تھی اور وہ ایک کوٹ اور چند چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا چاہ رہا تھا۔

میں اور حسیب اس وقت شاپنگ میں مصروف تھے۔ حسیب کو میرون کلر کا ویلوٹ کا ایک کوٹ پسند آیا۔ اُس نے

کوٹ پہن کے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیسا لگ رہا ہے؟''

کوٹ تو اس پر بیچ رہا تھا مگر میں نے ''دوستانہ و بے تکلفانہ کمینے پن'' کا مظاہرہ کیا۔ ''کوٹ تو اچھا لگ رہا ہے مگر تو اس میں پورا میراثی لگ رہا ہے۔'' میرے لہجے میں شوخی اور شرارت کا امتزاج تھا۔

جواب میں مجھے اس کی طرف سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی مگر میں اس کا ردعمل دیکھ کے ششدر رہ گیا۔ اس کا منہ پورا کھل گیا اور وہ انتہائی حیرانی بلکہ سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کا غیر متوقع ردعمل دیکھ کے میں حیرت سے بولا۔ ''ابے، میں نے کوئی پہلی دفعہ تیری اتنی تعریف تو نہیں کی جو تجھے سکتہ ہو گیا۔''

وہ کچھ بولنے کے بجائے مسکرایا۔ اس کی شرمیلی سی مسکراہٹ دیکھ کے میری حیرانی میں اتنی ہی تیزی سے اضافہ ہوا جتنی تیزی سے شادی کے بعد خرچوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں ایک مترنم سی... کھلکھلاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، جو لڑکیاں دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ایک نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ شاید اس طرح اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ان کے چہرے تو نہیں دیکھ سکا تاہم حلیے سے وہ شریف گھرانے کی لگ رہی تھیں۔ اب مجھے حسیب کے سکتے والی کیفیت کی سمجھ آ گئی تھی۔ وہ میرے بجائے ان لڑکیوں کو دیکھ کے سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔

انہیں دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کے حسیب اپنی ''اصل حالت'' میں لوٹ آیا۔

''چل بے، اُن کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ لائن دے رہی تھیں۔'' وہ میرا بازو پکڑ کے بولا۔

''تجھے کیسے پتا کہ......'' میں مشکوک لہجے میں بولا۔

حسیب مناسب قامت کے ساتھ چھریرے بدن کا مالک ہے۔ اس کے چہرہ اتنا معصوم اور بھولا بھالا ہے کہ عام طور پر لڑکیوں کا دل بے اختیار اسے بھائی بنا لینے کے لیے مچلنے لگتا ہے۔ سو مجھے اس کے بیان پر شک تو ہونا ہی تھا۔

''وہ ہرے دوپٹے والی لڑکی مجھے دیکھ کے مسکرائی تھی اور لال دوپٹے والی کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش تھی۔'' وہ شاعرانہ انداز میں بولا۔

''ہم...... چلو نہ چاہتے ہوئے بھی مان لیا کہ وہ تمہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھیں مگر کیا جو بھی لڑکی تجھے لائن دے گی تو اس کے پیچھے چل پڑے گا؟'' وہ اسے لائن دے رہی تھیں مجھے نہیں اس لیے میں لہجے میں حیرانی، شکایت، ملامت اور رقابت چاروں یکساں نسبت سے بھر کے بولا۔

اس نے ملامتی نظروں سے مجھے دیکھا اور جل کے بولا۔ ''دوست بن ناصح بننے کی ضرورت نہیں!''

اتنی دیر میں لڑکیاں دروازہ کھول کے باہر نکل چکی تھیں۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ہم دروازے سے باہر نکلنے ہی لگے تھے کہ عقب سے ایک آواز سن کے رکنے پر مجبور ہو گئے۔

''سر، آپ نے پیمنٹ نہیں کی۔'' یہ ایک سیلز مین تھا جس نے اس ''ایمرجنسی صورتِ حال'' میں دخل در نا معقولات کر کے ہمارے لڑکیوں کے تعاقب میں جانے کے ارادے کی راہ میں روڑا اٹکا دیا تھا۔

حسیب نے جلدی سے کوٹ اتار کے سیلز مین کے ہاتھ میں رکھا اور بولا۔ ''سوری جناب، مجھے ابھی ایک کام یاد آ گیا ہے، یہ میں بعد میں لے لوں گا۔''

سیلز مین معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں لکھا صاف نظر آ رہا تھا۔ ''بیٹا جی، سب سمجھ رہا ہوں تمہیں اچانک کیا کام درپیش آ گیا ہے۔''

باہر آ کے حسیب اس ماں کی طرح ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا جس کا بچہ بھری بھیڑ میں کھو گیا ہو۔

میں بھی اپنے اردگرد کا ایکسرے کر کے اس کی مدد کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنے لگا۔ تاہم کامیابی اسی کو ہوئی جس کے جذبے میں صداقت تھی۔

''وہ......وہ جا رہی ہیں۔'' حسیب نے اوورہیڈ برج کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بازو سے پکڑ کے کھینچا۔ میں اس کے ساتھ کھنچتا چلا گیا۔

برج کی سیڑھیاں کافی دور تھیں۔ راستے میں لوگوں اور گاڑیوں کا خاصا ہجوم لگا تھا۔ ہم ان سے بچتے بچاتے، ٹکراتے سیڑھیوں تک پہنچے۔ حسیب کی کوشش تھی کہ ایک وقت میں چار چار قدم پھلانگیں مگر رش نے ہمیں چھلانگیں لگانے سے باز رکھا اور ہم ''بندر کے پتر'' کے بجائے ''بندے کے پتر'' کی طرح ہی سیڑھیاں چڑھنے پر مجبور ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ اب ہمارا لڑکیوں تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ سیڑھیوں سے

چڑھتے ہی او ور برج کے درمیان کھڑی دونوں لڑکیوں کو دیکھ کے مجھے حسیب کے ''جذبۂ محبت'' کی صداقت کا یقین آ ہی گیا۔

لڑکیاں پل کے جنگلے پر لگے کسی اشتہار کے مطالعے میں غرق تھیں۔ ایک لڑکی نے موبائل نکال کے اشتہار کی تصویر بنائی اور آگے بڑھ گئیں۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک وہ دوسری طرف کی سیڑھیوں پر پہنچ چکی تھیں۔ میں جنگلے پر لگے اشتہار کی عبارت پڑھنے لگا۔ اس اشتہار میں لڑکیوں کی دلچسپی کی وجہ تو سامنے آ گئی تھی مگر میں وہ عبارت پڑھ کے اتنا حیران ہوا کہ حسیب کی آواز تک نہ سن سکا جو میرے پیچھے رہ جانے پر مجھے بلانے کے لیے لگا رہا تھا۔

مجھے اشتہار کے سامنے مہاتما بدھ بنے دیکھ حسیب کو چار و ناچار واپس آنا پڑا۔ اس نے مجھے پکڑ کے اپنی طرف کھینچا تو میں چونکا۔ اب وہ اشتہار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اشتہار پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں بھی حیرت ابھری مگر اس کی ''حیرت'' کی وجہ میری ''حیرت'' سے مختلف تھی۔

''افسوس ہے تجھ پر...... اُدھر تیری بھابی کے بھائی بننے کی امید معدوم ہوتی جا رہی ہے اور اِدھر تو بغیر تصویر کے اشتہار کو ایسے گھور رہا ہے جیسے تو نے سنی لیون کو دیکھ لیا ہو۔'' وہ مجھے ملامتی نظروں سے دیکھ کے بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑ کے پھر سے کھینچنا شروع کر دیا۔

میں اس کے پیچھے گھسٹتے ہوئے بولا۔ ''تجھے افسوس کس بات کا ہے۔ اشتہار کے بغیر تصویر کے ہونے کا، یا میری بھابی کے بھائی بننے کی امید کے معدوم ہونے کا؟'' میرا سوال شرارتی قسم کا تھا مگر لہجہ معصوم۔

اس نے آج کی تاریخ میں کوئی تیسری بار مجھے ملامتی نظروں سے دیکھا، حالانکہ میں نے کوشش کی تھی کہ اس بار وہ مجھے ملامتی کے بجائے خونخوار نظروں سے دیکھے۔ دوستوں کو اس طرح تپانے کا مزہ ہی الگ ہے۔

وہ میرا بازو ابھی تک پکڑے مجھے گھسیٹے جا رہا تھا۔

''میرا بازو تو چھوڑ۔ تو گدھا ہے مگر میں تیرا تانگا نہیں۔'' میں نے اسے پھر سلگانے کی کوشش کی مگر اس بار بھی مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس بار اس نے مجھ پر ملامتی نظر تک نہیں ڈالی تھی۔

''اچھا یہ تو بتا، تجھے ان لڑکیوں سے کہنا کیا ہے؟''

''یہی کے میں انہیں حج کرانے لے جانا چاہتا ہوں، ان کا محرم بن کے۔'' جملہ تو اس کا مزاحیہ تھا مگر ادائیگی اس نے جل بلکہ بھن کے کی تھی۔ اس کا انداز دیکھ کے میری ہنسی نکل گئی۔

''دونوں کو، یہ کہے گا؟'' میں نے اُس کو تپانے کی کوشش جاری رکھی۔

''ہاں، دونوں کو کہہ دوں گا۔ کسی ایک کے دل میں تو اتر جائے گی میری بات۔'' اس نے میری کوشش پھر سے ناکام بنا دی۔

سیڑھیوں سے نیچے پہنچ کے اس نے پھر سے وہ عمل دہرایا جو اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے کیا تھا۔ نتیجہ اس بار بھی حسبِ منشا نکلا۔ اطراف کا ایکسرے کرتی اس کی نظروں نے اُس بار بھی گوہرِ مقصود یعنی لڑکیوں کو تلاش کر لیا تھا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ میں، حسیب اور ارسلان اپنے گھر کی چھت پر سگریٹ پھونکنے میں مصروف تھے۔ ساتھ ہی ہم بحالتِ مجبوری یعنی پکا راگ بھی سن رہے تھے۔ اس راگ کا سنگر، موسیقار اور تخلیق کار ایک ہی ''فرد'' تھا۔ آپ اس ''ہمہ جہت شخصیت'' کی شہرت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ قطب شمالی سے لے کے قطب جنوبی تک ہر شخص ہی اس سنگر کو نہ صرف سن چکا ہے بلکہ بھگت بھی چکا ہے۔

ارسلان نے اپنے ہی منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ اس کا ذہنی توازن بالکل درست تھا مگر اس کے باوجود ہمیں اس کی اس حرکت پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہم بھی یہی حرکت کر چکے تھے۔ ''یار، ایک تو یہ بھونک رہا ہے اوپر سے کاٹ بھی رہا ہے۔'' ارسلان غصے سے بولا۔

''اتنے سُریلے میوزک کو تو بھونکنا کہہ رہا ہے۔'' مچھر کے ''پکے راگ'' کو ''سُریلا میوزک'' کہہ کے میں نے ارسلان کو تپانے کی کوشش کی۔

''سُریلا تو، تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے راحت فتح علی خان کا استاد یہی نامعقول مچھر ہے۔'' ارسلان کا تپا انداز دیکھ کے مجھے اپنی کوشش کے کامیاب ہونے کا اندازہ ہو گیا۔

میں اور حسیب ہنسنے لگے۔ ''شکر ہے تو بھی ہنسا۔ ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ کم از کم دو چار دن تو، تو اپنی نہ ہونے والی محبوبہ کی بے اعتنائی کے صدمے میں کچھ کھا پی تک نہیں سکے گا۔'' اس بار میں نے حسیب کو چھیڑا۔

''پی تو رہا ہوں۔'' وہ کمالِ بے نیازی سے اس

''شے'' کی طرف اشارہ کر کے بولا جو وہ کافی دیر سے پی رہا تھا۔

''یہ تو، تو غم غلط کرنے کے لیے ہی پی رہا ہے ناں۔'' میں ہنسا۔

''سگریٹ سے کیا غم غلط کرنا، غم تو اس چیز سے غلط ہوتا ہے جو دیوداس فلم میں دیوداس پیتا تھا۔'' وہ اس بار فلسفیانہ انداز میں بولا۔

''اسے کیا غم ہے؟'' ارسلان حیرانی سے بولا۔

''بتا دوں اسے؟'' میں حبیب کی طرف دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں بولا۔

''بتا کے دکھا۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کے لڑاکا عورتوں کی طرح بولا۔

میں نے سہم جانے کی اداکاری کی۔ ''مذاق کر رہا تھا یار تو، تو دل پہ لے گیا۔''

ارسلان نے بہت کوشش کی کہ میں اسے حبیب کے ''غم'' کے بارے میں بتاؤں مگر میں نے اسے نہیں بتایا مگر آپ میرے دوست نہیں اس لیے آپ کو بتانا نہیں بلکہ بتانا بنتا ہے سو آپ کو بتا دیتا ہوں۔

لڑکیاں ہمیں پیچھے آتے دیکھ کے رک گئی تھیں۔ انہیں رکتا دیکھ کے حبیب بھی کچھ فاصلے پر رک گیا۔

''چل جا اپنا حالِ دل کہہ دے اُن سے۔'' میں نے اسے دھکیلا۔

''یہ رک کیوں گئی ہیں؟'' وہ آگے جانے کے بجائے پریشانی سے بولا۔

''تاکہ آپ جا کے ان سے اظہارِ الفت کر سکیں۔'' میں نے اس کی ہمت بڑھائی۔

ہمیں رکتا دیکھ کے لڑکیاں پھر چل پڑیں۔ حبیب کے چہرے پر بھی اطمینان جھلکا۔ وہ دوبارہ مجھے بازو سے پکڑ کے ان کے پیچھے چل پڑا۔

چند قدم چل کے ہرے دوپٹے والی لڑکی نے عقب میں دیکھا۔ ہمیں اپنے پیچھے آتا دیکھ کے اس کے چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ ابھری۔ لڑکیاں دونوں واقعی حسین تھیں۔

''وہ تجھے لائن دے رہی ہے تو تُو ڈر کیوں رہا ہے؟'' میں نے حبیب سے سوال کیا۔ چند لمحے جب کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے اپنی دائیں طرف دیکھا۔ پھر پیچھے دیکھا، پھر بائیں طرف مگر یہ کیا حبیب تو کہیں غائب ہو چکا تھا۔ جب میں نے سامنے دیکھا تو اس کے غیاب کی وجہ میری سمجھ میں

آ گئی۔ لڑکیاں ایک ٹریفک پولیس والے سے کوئی بات کر رہی تھیں۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ بھی کر رہی تھیں۔ پولیس والا بھی مجھے معاندانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ شاید پولیس والے سے ہماری شکایت کر رہی تھیں۔

حبیب ان معاملات میں زیادہ تجربہ کار تھا۔ وہ خطرہ بھانپ کے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اور مصیبت میں، میں پھنسنے والا تھا لیکن مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس طرح کے مصائب کو تو میں خود دعوت دیا کرتا ہوں۔

جب مجھے لگا کہ پولیس والا میری طرف بڑھنے لگا ہے تو میں بھی اس کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کے پولیس والے کی آنکھوں میں ''سنگل حیرت'' جبکہ لڑکیوں کے چہروں پر ڈبل حیرت ابھری۔

میں پاس جا کے لڑکیوں سے بولا۔ ''ایکسکیوزمی، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے پولیس والے کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔

''کیا بات؟'' ہرے دوپٹے والی لڑکی حیرت سے بولی۔ اس نے لہجے میں روکھا پن پیدا کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر کچھ خاص کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

''آپ نے اوپر جس اشتہار کی تصویر بنائی تھی، میں اس کے متعلق آپ کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔'' میں نے اوور برج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہیے۔'' گاڑیوں کے ہارن بجتے دیکھ کے پولیس والا اپنی اصل ڈیوٹی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے بیچ سے نکلتے دیکھ کے میں سکون سے بولا۔

''اِدھر کھڑے کھڑے تو سب نہیں بتا سکتا۔ ایسا کرتے ہیں یہ ساتھ ہی ایک ریفرشمنٹ سینٹر ہے اُدھر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔''

لڑکی کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات ابھرے۔ اس بار لال دوپٹے والی بولی۔ ''سوری، ابھی ہم جلدی میں ہیں۔''

''اوہ، اگر ممکن ہو تو اپنا فون نمبر دے دیں۔ میں کال پر آپ سے بات کر لوں گا۔'' میں شریف لڑکوں کی طرح مہذب انداز میں بولا مگر اس کے باوجود وہ متاثر نہیں ہوئیں۔

''آپ اپنا نمبر دے دیں۔ میں خود بھائی کے نمبر سے کال کر لوں گی۔'' ہرے دوپٹے والی تو قدرے سیدھی سادی لگ رہی تھی مگر یہ لال دوپٹے والی خاصی تیز طرار تھی۔

میں نے اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کے

اس کی طرف بڑھایا۔ ''اوکے، مگر یاد رکھیے گا بات آپ ہی کے فائدے کی ہے۔ آپ نے مجھے کال نہ کی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں آپ کو نقصان ہو سکتا ہے۔'' میں نے ساتھ ہی انہیں تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

وہ کارڈ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کے الٹا کیا اور جھینپ کے بولا۔ ''یہ کارڈ کی بیک سائڈ پر میرا نمبر لکھا ہے۔''

مجھے اکثر کسی نہ کسی کو اپنا فون نمبر دینا پڑتا تھا اس لیے وزیٹنگ کارڈز کی بیک سائڈ پر اپنا نمبر لکھ کے ایسے کچھ کارڈز اپنے پاس رکھتا ہوں۔

یہ کارڈ کسی عامل کامل بابا جی کا تھا تبھی لڑکی کے چہرے پر اسے دیکھ کے حیرت ابھری تھی۔ کارڈ کی بیک سائڈ پر نمبر لکھا دیکھ کے وہ مسکرائی اور طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اوکے حنان صاحب، فون پر بات کریں گے۔''

دفعتاً اس کے چہرے پر طنز کی ''مقدار'' میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اس بار پہلے سے بھی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اپنے دوست کو بھی سمجھا دیجیے گا کہ اگر کوئی لڑکی انہیں دیکھ کے ہنستی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ان سے متاثر ہو گئی ہے کیونکہ ہنسی تو جونی لیور کی شکل دیکھ کے بھی نکل ہی جاتی ہے۔'' وہ حسیب کو دیکھ کے اس پر طنز کا بھرپور وار کر کے چل دی۔ حسیب جو پولیس والے کو ہٹتے دیکھ کے میرے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا تھا، شرمندہ ہو گیا۔

اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ لڑکیوں سے میری کیا بات چیت ہوئی تھی مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔

میں گھر پہنچا تو گھر میں کوئی نہیں تھا۔ امی کو کال کی تو پتا چلا کہ وہ کسی شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ اشتہار نے میرے اندر کے ''جاسوس'' کو ایک بار پھر بیدار کر دیا تھا۔ پہلے کیس کی کامیابی کو کافی وقت گزر چکا تھا۔ اب میں اپنے دماغ کو ایک بار پھر تھوڑی زحمت دینا چاہ رہا تھا۔ چھٹیاں ویسے بھی کافی بور گزر رہی تھیں۔

میں نے اشتہار پر لکھا نمبر ملایا جو میں نے یاد کر لیا تھا۔ چند گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو۔'' شائستہ لہجے میں ایک مترنم آواز ابھری۔

''میں نے یہ نمبر ایک اشتہار پر لکھا پڑھا تھا۔ میں اس کے متعلق بات کرنا چاہ رہا تھا۔'' میں بھی شائستہ انداز میں بولا مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی۔ میں نے ری ڈائل کیا تو نمبر بزی تھا۔ اگلے دس منٹ تک میں مسلسل کوشش کرتا رہا مگر ہر بار نمبر بزی ہی ملا۔ میرا شک اب یقین کی جڑ پکڑ چکا تھا۔

رات کا وقت تھا ورنہ میں ابھی سیلولر کمپنی میں اپنے کسی دوست سے نمبر کی ملکیت جاننے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اگلے دن اتوار تھا گویا نمبر کی ملکیت جاننے کے لیے مجھے مزید ایک دن انتظار کرنا پڑتا جو میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے دستیاب وسائل کی مدد سے نمبر کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ مگر کہیں بھی نمبر کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔ میرے شبہے میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میں نے اشتہار کے حوالے سے بات کرنے کے لیے ارسلان اور حسیب کو کال کر کے بلا لیا۔

ارسلان آتے ہوئے میرے کہنے پر تین پیزا اور کولڈ ڈرنکس لے آیا تھا۔ ہم نے ''ڈنر'' کیا اور سگریٹ پینے کے لیے چھت پر آ گئے مگر یہاں مچھروں نے اپنا راگ چھیڑ دیا۔ اپنے راگ میں ہماری عدم دلچسپی دیکھ کے انہوں نے کاٹ کاٹ کے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کیا تو ہم مجبوراً سگریٹ پی کے نیچے آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے میں نے انہیں اشتہار اور اپنے ارادوں کے متعلق بتایا۔

''تو حنان ہے، حنان رہ شامی یا تیمور بننے کی کوشش نہ کر۔'' حسب توقع حسیب نے کمینے پن کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں، پہلے بھی تو نے ارشد کے سامنے اتنی ڈینگیں ماری تھیں مگر کیس حل نہیں کر سکا تھا۔'' ارسلان نے بھی کمینے پن میں حسیب کا ساتھ دیا۔

میں پُراسرار انداز میں بولا۔ ''وہ کیس تو میں نے ایک گھنٹے میں حل کر لیا تھا۔''

''کیا......؟'' دونوں حیرانی سے بیک وقت بولے۔

''تو نے بتایا نہیں ہمیں۔'' ارسلان شکوہ کناں انداز میں بولا۔

''بتاؤں گا تو تم لوگ اچھل پڑو گے مگر اس شرط پر بتاؤں گا کہ یہ کیس حل کرنے میں تم لوگ میرا ساتھ دو گے۔''

''تو ابھی بتا۔'' حسیب نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی مگر میں اس سے زیادہ ہٹ دھرم واقع ہوا تھا۔ وہ دونوں اس بات سے واقف تھے۔

''ہو سکتا ہے تم نے یہ کیس واقعی حل کر لیا ہو کہ مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ مگر یاد رکھ سیانے کہہ گئے ہیں کہ ہر بار پراٹھے نہیں ملتے۔'' آخرکار تھک ہار کے حسیب نے ''پہاڑی سیانوں'' کا معروف قول پیش کر کے میرے ارادوں کو ڈانواں ڈول کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''وہ پچھلے دور کے سیانے تھے آج کل کے دور... میں ان کے محاورے قابلِ عمل نہیں رہے۔'' میں نے نیا فلسفہ جھاڑا۔

''وڈا آیا نیا سیانا۔'' حبیب جل کے بولا تو میں ہنس دیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ چاہے جتنے مرضی نخرے کریں آخرکار انہیں میری بات ماننا ہی تھی۔ میری توقع کے مطابق کچھ دیر کی بحث وتمحیص کے بعد وہ مان ہی گئے۔ اب ہم اپنا نیا ''کیس'' ڈسکس کر رہے تھے۔

☆☆☆

بروز پیر صبح گیارہ بجے میں اپنے منصوبے کے مطابق اٹھال چوک، بہارہ کہو، میں کھڑا تھا کہ ایک سلور کلر کی کلٹس میرے پاس آکے رکی۔ میں پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھا تو حیران رہ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ تھی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی تھی مگر ڈرائیونگ سیٹ خالی تھی۔ دفعتاً میری سائڈ کے شیشے پر دستک کی آواز ابھری۔ میں پلٹا تو ''ڈرائیور'' ادھر موجود تھی۔ وہ سارہ تھی۔ میری کلاس فیلو، دوست اور شاید محبت بھی......

''ساتھ ہو جاؤ'' اس نے اشارہ کیا۔ میں ادھر سے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ کے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''اتنے رش میں ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے کی وضاحت کی۔

''مادام، ڈرائیور موجود ہو تو آپ کو فکر کی کیا ضرورت۔'' میں سینے پر ہاتھ رکھ کے جھک کے بولا۔

''اچھا اب چلو، زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

اس نے سیاہ رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جیکٹ کے بازو اس نے فولڈ کیے ہوئے تھے۔ جس سے اس کی گوری کلائیاں جھلک رہی تھیں۔ بالوں کو اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں پیچھے باندھ رکھا تھا۔ گہری سیاہ آنکھوں کی سیاہی میں کاجل نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرے کے باوجود وہ انتہائی حسین لگ رہی تھی۔ میں اسے کافی دن بعد دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کے مجھے احساس ہونے لگا کہ اتنے دن اسے دیکھے بغیر میں رہا کیسے تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' سوال پوچھتے ہوئے وہ بظاہر شرمائی تو نہیں تھی کہ آج کل کی لڑکیوں کو شرمانے سے بھی شرم آتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کے چہرے پر جو لالی بکھری تھی اس نے اس کی خوبصورتی میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

''تم تو چھٹیوں میں اور زیادہ حسین ہو گئی ہو۔'' میں جان لٹانے والے انداز میں بولا۔

''اور تم فلرٹ۔'' اس نے میرے ''وار'' سے کمالِ خوبصورتی سے بچتے ہوئے جوابی ''وار'' کرتے ہوئے میرے سارے رومانوی موڈ کا ستیاناس کر دیا۔

''اور تم کھڑوس۔'' بڑبڑاتے ہوئے میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ راستے میں، میں اسے اپنے منصوبے کے متعلق آگاہ کرنے لگا۔ یہ سب میں اسے فون پر بھی بتا چکا تھا مگر پھر بھی دہرانا ضروری سمجھا۔

''او کے بھئی، یہ سب تو تم فون پر بتا چکے۔ میں سمجھ گئی ہوں سب۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

میں نے اسے بلوا تو لیا تھا مگر اب مجھے اس کے متعلق فکر ہو رہی تھی۔ ''میں چاہتا ہوں تم ایک بار پھر سوچ لو۔ یہ کام خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔'' میں نے اسے تنبیہ کی۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں اپنا دفاع کرنا جانتی ہوں۔ ویسے بھی ہم کچھ تھرل ہی تو چاہتے ہیں۔ اب ڈرنا کیسا......'' وہ پُراعتماد انداز میں بولی تو میری فکر کچھ کم ہو گئی۔

کچھ ہی دیر میں ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک کنال کے رقبے پر موجود دو منزلہ کوٹھی تھی۔ میں نے گاڑی کا ہارن بجایا مگر گیٹ نہیں کھلا۔ میں نے گاڑی سے اتر کے کال بیل بجائی تو چھوٹا گیٹ کھلا۔

''جی، کس سے ملنا ہے آپ کو۔'' وردی میں ملبوس چوکیدار اکھڑ لہجے میں بولا۔

''مس طلعت ہیں؟'' چوکیدار کے لہجے نے مجھے طیش دلا دیا تھا مگر میں اپنے لہجے کو کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔

''کون مس طلعت؟'' اس بار چوکیدار پہلے سے بھی زیادہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

اس سے پہلے میں کوئی جواب دیتا، سارہ جو جانے کب گاڑی سے اتر کے باہر آگئی تھی، مسکراتے ہوئے چوکیدار سے بولی۔

''میری مس طلعت سے فون پر بات ہوئی تھی' وہ کہہ رہی تھیں کہ گیارہ سے بارہ کے درمیان آجاؤں۔''

''آپ ٹھہریں میں اندر پتا کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

سارہ میری طرف پلٹ کے فخریہ انداز میں مسکرائی۔
''مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔'' میں فکرمندی سے بولا۔
''گڑبڑ کا پتا لگانے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔'' سارہ اطمینان سے بولی۔
چند لمحات کے بعد چوکیدار نے دروازہ کھول کے کہا۔
''آپ آجائیں۔'' سارہ میری طرف دیکھتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ چوکیدار نے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے راستہ دیا تھا مگر جب میں اندر داخل ہونے لگا تو وہ میری راہ میں حائل ہو گیا۔
''آپ باہر بیٹھیں۔ ادھر مردوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔
میں سارہ کو روکنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی چوکیدار نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے فوراً سیل نکال کے سارہ کو کال کی۔
''سارہ، کال کاٹنا نہیں...... میں تمہاری اندر ہونے والی بات چیت سننا چاہتا ہوں۔'' اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں بے تابی سے بولا۔
اس نے دھیمے لہجے میں اوکے کہہ دیا۔
واپس گاڑی میں بیٹھ کے میں نے سیل کان سے لگایا ہی تھا کہ کال منقطع ہو گئی۔ میں نے پھر سے نمبر ملایا مگر اب نمبر بند جا رہا تھا۔ میرا فکر سے برا حال ہو گیا۔ شاید سارہ کو اس معاملے میں شامل کر کے میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔

☆☆☆

رات کو جب اشتہار کی عبارت میں نے حبیب اور ارسلان کو بتائی تھی تو میری طرح انہیں بھی اشتہار مشکوک لگا تھا۔ میں نے انہیں اپنی کال اور نمبر کی جاسوسی کی کوششوں کے متعلق بتایا تو ان کے شبہے میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن شروع میں انہوں نے مجھے اپنی ٹانگ اس معاملے میں پھنسانے سے منع کیا تھا۔ میں منع کیا ہوتا الٹا میں نے ان کی ٹانگیں بھی اس معاملے میں پھنسانے پر تیار کر لیا تھا۔
''ایسا کرتا ہوں، میں بھی اس نمبر پر ایک بار کوشش کرتا ہوں۔'' رضامندی کے اظہار کے بعد ارسلان بولا تھا۔
میں نے سر ہلا کے اسے اجازت دے دی۔ اس نے نمبر ڈائل کیا لیکن میری طرح اس کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ جب اس نے اشتہار کا ذکر کیا تو دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی۔ ارسلان کی دوسری کوشش پر اسے نمبر بزی ملا۔

''یار ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کسی نے شرارت کے طور پر یہ اشتہار لگایا ہو اور نمبر بھی اس عورت کا لکھ دیا ہو، جسے وہ تنگ کرنا چاہتا ہو۔'' حبیب نے نیا زاویہ پیش کیا تھا۔
یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''ہاں یار، ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید وہ عورت اشتہار کے متعلق کالز سن سن کے تنگ آچکی ہو اسی لیے اشتہار کا ذکر سنتے ہی کال منقطع کر دیتی ہو اور نمبر بھی بلیک لسٹ کر دیتی ہو۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔
''ہاں تو مسٹر جاسوس، آپ کا کیس تو اِدھر ہی ٹھپ ہو گیا۔ اب تیرا کیا ہوگا کالیا......'' اس نے بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے گھسا پٹا مکالمہ دہرایا۔
کیس کے اس نئے رخ نے مجھے مایوس کر دیا تھا مگر میں اتنی آسانی سے اس ''کیس'' کو ''حل'' ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
''اگر کوئی لڑکی کال کرے اور اسے بھی اسی ردِعمل کا سامنا کرنا پڑے تو میں تیری تھیوری مان لوں گا۔'' میں نے حبیب سے کہا۔
''اچھا، تو کہتا ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ تیرا یہ بھائی لڑکیوں کی آواز نکالنے کا ماہر ہے۔'' وہ شاہانہ انداز میں ''ڈینگ'' مارتے ہوئے بولا۔
''اچھا!'' میں مشکوک انداز میں آنکھیں پھاڑ کے بولا۔
''اور نہیں تو کیا، کئی لڑکوں سے تو میں لڑکیوں کی آواز میں بات کر کے ایزی لوڈ کروا چکا ہوں۔'' اس نے فخریہ انداز میں اپنا کارنامہ بیان کیا۔
''اوئے، وہ عائشہ تو، تو نہیں؟'' ارسلان شاید کسی عائشہ کو لوڈ کرا تا رہا تھا سو اُس کا ذہن فوراً اُدھر گیا۔
''ہاہاہا......'' ہم دونوں ہنسنے لگے۔ تاہم حبیب نے اپنے عائشہ ہونے یا نہ ہونے کا اعتراف نہیں کیا۔ اس سے پہلے کے ارسلان اس سے عائشہ ہونے کا اعتراف کرانے کی کوششوں میں لگ جاتا، میں حبیب سے بولا۔
''چل تو ذرا لڑکی کی آواز نکال کے تو دکھا۔''
حبیب نے گلا کھنکھار کے جو آواز نکالی وہ سن کے ہماری ہنسی نکل گئی۔
وہ کھسیا کے بولا۔ ''وہ ابھی میں نے کولڈ ڈرنک پی تھی تو میرا گلا خراب ہو رہا ہے۔''
وہ اگلے پانچ منٹ تک لڑکی کی آواز نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور ہم ہنستے رہے۔

''ایسا کرتے ہیں کوئی وائس چینجر استعمال کر لیتے ہیں۔'' ارسلان نے مسئلے کا حل پیش کیا۔ میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے ''پلے اسٹور'' کھول لیا مگر کافی تلاش بسیار کے بعد بھی کال کے ساتھ چلنے والا وائس چینجر نہیں ڈھونڈ سکا۔

اتنی دیر میں امی ابو آگئے اور حسیب اور ارسلان کو رخصت ہونا پڑا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے سیل پر میسنجر کی ٹون بجی۔

''کیسی گزر رہی ہیں چھٹیاں۔'' یہ سارہ کا میسج تھا۔

اس کا میسج دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ میں نے اسے کال کر کے سب بتایا۔ وہ کال کرنے پر تیار ہوگئی مگر رات کافی ہو چکی تھی سو ہم نے کال کرنے کا ارادہ اگلے دن پر چھوڑ دیا۔

سونے سے ... پہلے میں ایک دعا کر کے سویا تھا کہ یا اللہ، یہ کیس اتنی آسانی سے حل نہ ہو۔ میں نے تو اپنی دانست میں یہ دعا کی تھی مگر اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ یہ دعا میرے لیے بددعا بننے والی ہے۔

☆☆☆

اگلے دن پروگرام کے مطابق دن کے گیارہ بجے میں نے سارہ کو کال کر کے وہ نمبر ڈائل کرنے کا کہا۔ سارہ نے کانفرنس کال ملائی۔ اب دونوں طرف ہونے والی بات چیت میں بھی سن سکتا تھا۔ سارہ نے اپنا تعارف کرانے کے بعد جب اشتہار کی بابت بات کی تو دوسری طرف کا ردِعمل دیکھ کے میں خوشی سے اچھل پڑا۔ اس ''کیس'' میں واقعی کچھ تھا۔

''آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟'' وہ عورت اس سے پوچھ رہی تھی۔

میں سارہ کو اصل جگہ بتانے سے منع کرنا چاہتا تھا مگر فوری طور پر یہ ممکن نہیں تھا تاہم سارہ ہوشیار نکلی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

''اشتہار کس ایریے کے متعلق ہے؟''

''اشتہار تو پورے پنڈی اسلام آباد کے متعلق ہے تاہم انٹرویو ہم بہارہ کہو میں لے رہے ہیں۔''

''اوکے، تو میں کب آؤں؟'' سارہ نے اس بار بھی جواب گول کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

عورت نے اس سے کوالیفکیشن اور فیملی کے متعلق کچھ سوالات کرنے کے بعد اسے اگلے دن کا وقت دے دیا۔

سارہ کے ایڈریس پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ کچھ دیر میں اسے ایڈریس سینڈ کر دے گی۔

سارہ اس کی کال کاٹ کر مجھ سے بولی۔

''ہاں بھئی، اب کیا ارادے ہیں؟''

''اب تو ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ مشکوک ہیں۔ وہ تمہیں ایڈریس سینڈ کرے تو تم مجھے وہ سینڈ کر دینا اس کے بعد ہم اپنا اگلا لائحہ عمل طے کریں گے۔'' میری بات سن کے اس نے اوکے کر دیا۔

میں نے حسیب اور ارسلان کو کال کر کے بھی سب بتا دیا مگر میرے برعکس وہ کیس کو ''چھلیتے'' دیکھ کے ناخوش ہی ہوئے تھے۔

گھنٹے بعد اس نے ایڈریس سینڈ کر دیا تھا۔ ایڈریس بہارہ کہو کے ہی ایک علاقے شاہ پور کا تھا۔ میں حسیب اور ارسلان کو لے ادھر پہنچ گیا۔ ہم اپنی بائکس پر تھے۔ بائک ہم نے مطلوبہ ایڈریس سے کچھ فاصلے پر روک دی تھیں۔ ہم پیدل چلتے ہوئے اس گھر کے سامنے پہنچے۔ ایک کنال کے رقبے پر بنے اس دو منزلہ گھر .... پر اس وقت ہو کا عالم طاری تھا۔ اس گھر کے سامنے والے دونوں پلاٹس خالی تھے، ان میں جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اردگرد موجود باقی گھر .... بھی ایک کنال کے رقبے پر بنے تھے تاہم گلی ویران ہی لگ رہی تھی۔ یہ تقریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ سردیوں کے دن تھے البتہ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ایسے میں گلی میں مکمل ویرانی کچھ عجیب لگ رہی تھی۔

اسی وقت گلی میں ایک ٹیکسی داخل ہوئی جو دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی اسی مکان کے سامنے آ کے رک گئی۔ ٹیکسی سے ایک لڑکی اتری۔ اس نے ہاتھ میں ایک فولڈر اٹھا رکھا تھا۔ اس نے کوٹھی کو بغور دیکھتے ہوئے شش و پنج کے عالم میں کال بیل بجائی۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلا اور لڑکی اندر داخل ہوگئی۔

ٹیکسی لڑکی کو اتار کے روانہ ہوگئی تھی۔ ہم چند قدم کے فاصلے پر موجود یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

لڑکی کے اندر جانے کے بعد ارسلان نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔

''کیا خیال ہے یہ کتنی دیر بعد باہر آئے گی؟''

''اس کے حلیے اور جھجک سے تو اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ انٹرویو دینے ہی ادھر آئی ہے۔ لیکن پتا نہیں اندر اس سے کس قسم کا انٹرویو ہوگا۔'' میں افسردہ سے انداز میں بولا۔

''اگر اصلی والا انٹرویو ہوا تو اسے زیادہ سے زیادہ

آدھے گھنٹے میں واپس آجانا چاہیے البتہ تیرے اندازے والا انٹرویو ہوا تو پھر کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔'' حسیب نے اپنی رائے دی۔

ہم چلتے ہوئے اپنی بائکس پر آکے بیٹھ گئے۔ سردیوں کی دھوپ بھلی لگ رہی تھی۔ ہم اپنے سیل نکال کے اپنی اپنی مصروفیت میں مگن ہو گئے مگر گاہے بگاہے گھر کے گیٹ کی طرف بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ وقفے وقفے سے کوئی گاڑی ہمارے پاس سے گزرتی تاہم اس گلی میں پیدل آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لڑکی کے اندر جانے کے بعد ہمارے مطلوبہ گھر سے نہ کوئی باہر نکلا تھا نہ ہی اندر داخل ہوا تھا۔ ہمیں وہاں کھڑے کافی وقت گزر گیا تو آخرکار حسیب اور ارسلان بور ہو گئے۔

''یار میں نے کینڈی کرش کے بیس لیولز کلیئر کر لیے مگر تیری کچھ لگتی وہ ابھی تک باہر نہیں آئی۔'' حسیب بیزاری سے بولا۔

اس کی بات سن کے میں چونکا۔ لڑکی کو اندر گئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ فیس بک پر لگے مجھے، وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ فیس بک کا نشہ ایسا تھا کہ لڑکی کو اندر جاتے دیکھ کے اس کے متعلق میرے ذہن میں جو تشویش جاگی تھی، وہ بھی کہیں سو گئی تھی۔ ''ہاں یار، اب تک تو اسے باہر آجانا چاہیے تھا۔ کیا خیال ہے بیل بجا کے اس کے بارے میں پوچھیں؟'' میں تشویش سے بولا۔

وہ کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ گھر کا دروازہ کھلا اور ایک گاڑی باہر نکلی۔ ہم چوکنے ہو کے کھڑے ہو گئے۔ گاڑی ہمارے قریب سے گزری۔ ڈرائیور نے ہمیں مشکوک سے انداز میں گھورا۔ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے اندر جھانکا۔ پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ گاڑی کی رفتار کی وجہ سے میں اس کی شکل واضح طور پر تو نہیں دیکھ سکا تاہم کپڑوں سے وہ وہی لڑکی لگ رہی تھی۔ جو ہمارے سامنے ہی کوٹھی کے اندر داخل ہوئی تھی۔

حسیب نے چہرے پر الجھن لیے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کندھے اچکا دیے

''مطلب ہمارے لوکل جیمز بانڈ کچھ نتیجہ اخذ نہیں کر سکے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''نتیجے تو بہت سے اخذ کیے جا سکتے ہیں تاہم وہ سب اندازے ہی ہوں گے۔'' میں اس کا طنز نظرانداز کر کے بولا۔

واپس آکے بھی ہم کافی دیر اس عجیب وغریب کیس پر بات کرتے رہے تھے تاہم کوئی واضح نتیجہ اخذ نہیں کر سکے۔ وہ دونوں چاہتے تھے کہ میں اس کیس سے ہاتھ کھینچ لوں مگر میں بار بار ایک فلمی مکالمے کی ''ایڈیٹنگ'' کر کے دہرا رہا تھا کہ ''میں نے خود سے کمٹمنٹ کر لی ہے، اور جب میں خود سے کمٹمنٹ کر لوں تو پھر میں خود کی بھی نہیں سنتا۔'' جواب میں وہ ''پہاڑی سیانوں'' کا مقولہ دہراتے کہ ''ہر بار پراٹھے نہیں ملتے۔''

وہ میرے ڈائیلاگ سے متاثر نہیں ہوئے اور میں ان کے سیانوں کے قول سے۔ تنگ آکے وہ بکتے جھکتے چلے گئے۔

میں نے سارہ کو کال کر کے ساری کارگزاری سنائی تو اس کے جوش میں بھی اضافہ ہو گیا۔

''ایسا کرتے ہیں ہم خود جا کے وہاں جاسوسی کرتے ہیں۔''

میں اسے اس کیس میں ملوث تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کیس کو حل کر کے حسیب اور ارسلان کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اگر میرے شکوک درست تھے تو میں بے شمار لڑکیوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچا سکتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے اسے اگلے دن آنے کا کہہ دیا تھا مگر اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میرا یہ فیصلہ ہمارے لیے کتنے مسائل لے کے آنے والا ہے۔

☆☆☆

سارہ کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ میں نے حسیب اور ارسلان کو ٹیکسٹ کر کے ساری صورتِ حال بتا دی۔ میں گاڑی سے اتر کے کال بیل بجانے ہی لگا تھا کہ میرا سیل بجا۔ نمبر دیکھ کے میں اچھل پڑا یہ اسی نمبر سے کال آرہی تھی جو میں نے اشتہار پر دیکھا تھا۔ میں نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔

میرے ہیلو کہتے ہی اسپیکر میں آواز ابھری۔ ''اندر آجاؤ۔'' آواز سن کے میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ سارہ کی آواز تھی۔

''تمہارا نمبر کیوں بند ہے؟'' میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

''انٹرویو کے دوران میں موبائل پاس رکھنے کی اجازت نہیں، وہ میں نے آف کر کے باہر جمع کرا دیا تھا۔ میں نے میڈم کو تمہارے بارے بتایا تو انہوں نے تمہیں اندر بلانے کے لیے کہا ہے۔'' اس نے ایک ہی جملے میں ساری

وضاحت کر دی۔ میں ایک بار پھر الجھن کا شکار ہو گیا۔ میڈم کو بھلا مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔

اسی دوران سیل پر ایک اور کال آنے لگی۔ میں نے دیکھا تو یہ حسیب کی کال تھی۔ ''او کے، میں اندر آتا ہوں۔'' سارہ کو کہتے ہوئے میں نے کال کاٹ کے دوسری کال ریسیو کی۔ حسیب کو بھی میں نے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

اتنی دیر میں چوکیدار خود دروازہ کھول چکا تھا اور اب منتظر نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کال منقطع کی تو وہ مجھ سے بولا۔ ''آپ کو میڈم اندر بلا رہی ہیں۔''

میں اندر داخل ہوا تو اس نے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ سامنے ایک کار پورچ تھا جس کے دونوں اطراف چھوٹا سا لان بنا ہوا تھا۔ پورچ کے اختتام پر گھر کا داخلی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ میرے سر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر سر پر لگنے والی چوٹ زوردار تھی۔ میں ڈگمگایا اور اگلے ہی لمحے پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے حسیب کے ''پہاڑی سیانوں'' کے محاورے پر میں ایمان لے آیا تھا کہ ''ہر بار پراٹھے نہیں ملتے۔''

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میرے سر کے عقبی حصے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں مگر یہ کیا؟ میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ سر پر لگنے والی چوٹ سے بینائی متاثر ہونے کا بھی خدشہ ہوتا ہے تو کیا میں اپنی بینائی کھو چکا تھا؟ یہ خیال ہی میرے لیے روح فرسا تھا۔ ''بیٹا، اور لے پنگے۔ دیکھ لیا اپنے ایڈونچر کا انجام۔'' میں نے خود کو ہی لتاڑا۔

چند لمحے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے کے بعد مجھے ہلکا ہلکا نظر آنے لگا۔ مجھے گونا گوں اطمینان کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب تھا میری بینائی سلامت تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں تقریباً ایک بجے کے لگ بھگ بے ہوش ہوا تھا۔ تو کیا اب رات ہو چکی تھی؟ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے سارہ کا خیال آیا۔ میں نے فوراً اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں۔ میں کھردرے فرش پر سر ٹکا کے سارہ کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔

دفعتاً میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔

''تم لوگوں سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ یہ اور لڑکی مشکوک تھے تو لڑکی کو انکار کر کے بھیج دیتے۔ خوامخواہ مصیبت مول لے لی۔'' کوئی جھنجلا کے بولا تھا۔ اسی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور بے ہوشی کا ناٹک کرنے لگا۔

اندر آ کے انہوں نے لائٹ جلائی۔ مجھے بے ہوش پڑا دیکھ کے دوسرا شخص بولا۔

''یہ اور دو لڑکے کل بھی مشکوک انداز میں باہر منڈلا رہے تھے۔ ہم گیٹ پر لگے کیمرے سے ان کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا یہ لوگ چلے گئے ہیں مگر جب بشیر لڑکی کو اس کے گھر چھوڑنے گیا تو اس نے انہیں باہر گلی میں کھڑا دیکھا۔ آج یہ اس لڑکی کو لے کے اِدھر آ گیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ہماری جاسوسی کر رہا ہے۔''

''کہیں یہ پولیس والا یا کسی ایجنسی کا بندہ تو نہیں۔ کسی عام آدمی کو اس طرح ہماری ٹوہ لینے کی کیا ضرورت؟''

''جو بھی ہے میرے خیال میں اسے اور لڑکی کو اِدھر سے فوراً نکال دیتے ہیں۔ انہیں کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جا کے ان سے پوچھ گچھ کریں تو یہ اپنا سارا کھایا پیا اُگل دیں گے۔''

متوقع تشدد کا سن کے میری روح کانپ اٹھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بار مجھے ''پراٹھوں'' کے بجائے ''جوتے'' ملیں گے۔

''ہاں، اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ مگر پہلے اسے چیک تو کرو۔ کہیں یہ مر ہی تو نہیں گیا۔''

''دُر فٹے منہ۔'' اس شخص کے اندیشوں پر میں نے اسے دل ہی دل میں کوسا۔

ایک بندہ قریب آ کے میری نبض ٹٹولنے لگا۔ یہ میرے لیے سنہری موقع ہوتا اگر میں کسی ایکشن کہانی کا ہیرو ہوتا۔ مگر میں تو عام سا فرد تھا۔ خاموشی سے پڑا رہا۔

''نبض تو چل رہی ہے اِس کی۔''

''اسے تھوڑا سا کلوروفارم اور سنگھا دو۔ یہ نہ ہو راستے میں ہوش میں آ کے ہمارے لیے نئی مصیبت کھڑی کر دے۔''

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں نے اپنی ناک پر ایک ہاتھ محسوس کیا۔ میں نے سانس روک لی مگر کمزوری کے باعث زیادہ دیر تک سانس نہیں روک سکا۔ وہ خبیث بھی میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے ہٹانا بھول ہی گیا تھا۔ چند لمحوں

بعد میں ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں حسیب اور ارسلان تینوں حسب معمول چھت پر کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ''یار، تو اکثر کہانیوں پر تنقید کرتا رہتا تھا کہ جب بھی ہیرو مصیبت میں ہوتا ہے اس کے دوست یا پولیس ادھر کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ تو اب پتا چلا کہ ایسے اتفاقات حقیقت میں بھی ہو سکتے ہیں۔'' ارسلان نے مجھ پر چوٹ کی۔

''تو اسے اتفاق کہہ کے میری ساری کوشش پہ پانی تو نہ پھیر۔'' حسیب خفگی سے بولا۔

''نہ جی...... میں آپ کی کوششوں پر بھلا پانی پھیر سکتا ہوں۔ جب بھی ''دوسرا کیس'' لکھا جائے گا اس میں آپ کی کوششوں کا احوال ''زبر کٹئے'' مار کر سے لکھا جائے گا۔'' ارسلان نے طنز کیا۔

واقعی اگر حسیب نہ ہوتا تو آج شاید میں نہ ہوتا۔

حسیب کا ایک کزن معیز اسلام آباد پولیس میں ایس پی تھا۔ اتوار کی شام حسیب کے ایک کزن کی منگنی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات معیز سے ہوئی تو حسیب نے گپ شپ میں اسے اس مشکوک گروہ اور اپنی ''جاسوسانہ کوششوں'' کے بارے میں سب بتا دیا۔ معیز نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس گروہ پر کام کرے گا۔

اگلے ہی دن میں انہیں بغیر بتائے سارہ کو لے کے وہاں پہنچ گیا تھا۔ جب میں میڈم کے بلاوے پر اندر جانے والا تھا تو میں نے حسیب اور ارسلان دونوں کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد میرا نمبر جب اسے آف ملا تو حسیب نے سب معیز کو بتا دیا۔ معیز نے مقامی پولیس کو متحرک کیا مگر اس سارے کام میں بھی کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ پولیس والے جب وہاں پہنچے تو وہ لوگ مجھے اور سارہ کو ایک ہی گاڑی کی ڈکی میں ٹھونس کے باہر نکال رہے تھے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ہم دونوں کو ایک ہی ڈکی میں ڈال کے لے جا رہے تھے تو میں ٹھنڈی سانس لے کے رہ گیا۔ محبوبہ جان کی اتنی قربت نصیب ہوئی بھی تھی تو بے ہوشی کی حالت میں۔

پولیس نے گیٹ سے باہر نکلتی گاڑی کو ادھر ہی روک لیا تھا۔ ریڈ میں میڈم سمیت پانچ بندے گرفتار ہوئے تھے۔ میں اور سارہ بے ہوشی کی حالت میں گاڑی کی ڈکی سے برآمد ہوئے تھے۔

ہمیں فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ سارہ اور میرے والدین بھی اُدھر پہنچ گئے۔ انہیں ساری صورت حال کا علم ہوا تو ہم دونوں کی ''امیاں'' خونخوار بلیوں کی طرح ایک دوسرے پہ غرانے لگیں۔ میری امی کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی آفت کی پرکالہ ہے اور مجھے ورغلا کے اس مصیبت دان میں لے گئی تھی جبکہ سارہ کی امی کا خیال تھا کہ میں برے قماش کا لڑکا ہوں اور جانے کس چکر میں ان کی بیٹی کو ورغلا کر اس گھر میں لے گیا تھا۔

اسپتال کی انتظامیہ نے اسپتال کے امن و امان میں خلل ڈالنے کے جرم میں ان کی اسپتال بدری کے احکامات صادر فرمائے تھے مگر اتنی ہمت کسی میں نہیں تھی کہ ان کے خونخوار تیوروں کا سامنا کر سکتا۔ آخر کار ہم دونوں کے والد اور کچھ دیگر لوگوں کی ملی جلی کوششوں کی بدولت ان دونوں کے مابین ہونے والی جنگ وقتی طور پر ٹل گئی۔

جب مجھے اس واقعے کا پتا چلا تو میں ٹھنڈی سانس لے کے رہ گیا۔ گویا ہم دونوں کی محبت کی کونپل پروان چڑھنے سے پہلے ہی اندیشوں کی زد میں آ گئی تھی۔ بہرحال مجھے امید تھی کہ اگر شعیب ملک اور ثانیہ کے کیس میں انڈیا اور پاکستان جیسے ''مثالی دشمن'' ایک دوسرے کے سمدھی بن سکتے ہیں تو ہم دونوں کی ''امیوں'' کا بھی ایک دوسرے کی سمدھن بننا عین ممکن ہے۔

صبح پولیس نے ہمارا تفصیلی بیان لیا۔ میں نے انہیں بلاکم و کاست سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میرا اور سارہ کا سیل فون اور پرس ان لوگوں نے ہتھیا لیا تھا۔ پولیس والوں سے میں نے اس کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ پچھلے کیس میں مجھے پانچ لاکھ کے لگ بھگ رقم حاصل ہوئی تھی جبکہ اس کیس میں پچاس ہزار کے لگ بھگ کے دو موبائل اور تین ہزار کے قریب رقم پلے سے چلی گئی تھی۔ سچ ہے کہ ''ہر بار پراٹھے نہیں ملتے۔''

صبح اسپتال میں ہی میری سارہ سے ملاقات بھی ہوئی۔ اس کا چہرہ اُجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی ساری شوخی ہوا ہو چکی تھی۔ میرا دل اسے دیکھ کے کٹ کے رہ گیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ وہ بچ گئی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں ساری زندگی اپنے ''جاسوسی کے کیڑے'' کو لعن طعن کرتا رہتا۔ اس نے میرے کہنے پر اپنی ساری رُوداد سنا دی۔ آپ بھی اس کی رُوداد اسی کی زبانی سنیں۔

''میں تم سے فون پر بات کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی تو فرش پر رکھی کسی چیز سے میرا پاؤں الجھا۔ میں لڑکھڑا گئی۔ سیل میرے ہاتھ سے پھسل کے گر گیا۔ میرا استقبال

کرنے والی لڑکی نے سیل اٹھالیا اور مجھ سے بولی۔

''آپ یہ ساتھ والے روم میں چلی جائیں۔ میڈم ادھر ہی انٹرویو لے رہی ہیں۔'' ساتھ ہی اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

میں نے اس سے سیل مانگا تو وہ بولی۔ ''انٹرویو کے دوران سیل پاس رکھنے کی اجازت نہیں، آپ یہ واپسی پر لے سکتی ہیں۔''

اتنے میں اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ میں مجبوراً اندر داخل ہوگئی۔ میڈم جس نے فون پر مجھے اپنا نام طلعت بتایا تھا۔ میری توقع کے برعکس انتہائی اسمارٹ سے خاتون تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی مگر اس نے خود کو مکمل فٹ رکھا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ بمشکل تیس سال کی لگ رہی تھی۔ اس نے خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ میرے بیٹھنے کے بعد وہ سیل فون کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑگئی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ مجھ سے گویا ہوئی۔ ''آپ اکیلی آئی ہیں یا آپ کے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟''

میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے تمہیں اندر بلانے کے لیے کہا۔ میں نے اس سے سیل لے کے کال کر کے تمہیں اندر بلالیا۔ اتنے میں ایک ملازمہ ہمارے لیے چائے لے آئی تھی۔ اس نے مجھے چائے پیش کی مگر میں نے تمہاری ہدایات کے مطابق چائے پینے سے انکار کر دیا۔ اس کے کافی اصرار پر بھی میں نے چائے نہیں لی تو وہ پھر سے سیل کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ میں بے چینی سے تمہاری آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک اس نے انٹرویو لینا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ اچانک میں نے اپنے منہ پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اگلے ہی لمحے میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ مجھے جب ہوش آیا تو خود کو اسپتال میں پایا۔

''تو پھر کیسا لگا تمہیں یہ ایڈونچر؟'' میں شوخی سے بولا۔

''جان بچی سو لاکھوں پائے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

میں گھر پہنچا تو ٹی وی پر اسی کیس کے متعلق چرچا ہو رہا تھا مگر اس کیس کے اصل ہیرو یعنی میرا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ ساری کامیابی پولیس نے اپنے کھاتے میں ہی ڈال دی تھی۔ آپ اسی سے ہمارے پولیس کے ''بے ایمان'' ہونے کا اندازہ لگالیں۔ اگر میں یورپ میں اتنا بڑا ''کارنامہ'' سرانجام دیتا تو میری واہ واہ ہو جاتی۔ اِدھر تو کسی نے میری ''جاسوسانہ'' خدمات کا اعتراف تک نہیں کیا تھا۔

یہ دراصل پورا گروہ تھا جو سیدھی سادی غریب لڑکیوں کو جاب کا جھانسا دے کے گھر پر بلاتا تھا۔ وہاں انہیں بے ہوش کر کے ان کی برہنہ ویڈیوز بنالی جاتی تھیں۔ لڑکیاں ان ویڈیوز کی وجہ سے ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ وہ ان لڑکیوں کی دلالی کرتے۔ بلیک میلنگ کا یہ سارا مواد پولیس کو اس گھر سے مل گیا تھا۔ اس گروہ کو یہ کام کرتے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ان کی قسمت خراب تھی کہ ان کے اشتہار پر مجھ جیسے ''جاسوس'' کی نظر پڑگئی۔

کیس کے متعلق میڈیا کوریج دیکھتے یکدم مجھے سارہ کا خیال آیا۔ وہ بھی اتنی دیر اُن کے پاس بے ہوشی کی حالت میں موجود رہی تھی۔ ایسا عین ممکن تھا کہ اس کی بھی کوئی ایسی ویڈیو بنالی گئی ہو۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اب میں دعا ہی کر سکتا تھا کہ اگر ایسی کوئی ویڈیو بنالی گئی ہو تو وہ بھی منظرِ عام پر نہ آئے۔

اچانک مجھے حبیب کے ایس پی کزن کا خیال آیا۔ یہ سارا کارنامہ اسی کے کھاتے میں پڑا تھا۔ میں نے حبیب کو کال کر کے اپنے شبہے سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنے کزن سے بات کر کے مجھے یقین دلایا کہ وہ سارا مواد پولیس نے ضائع کر دیا ہے۔

یہ بات قابلِ یقین تو نہیں لگ رہی تھی مگر یقین کرنا میری مجبوری تھی۔

اب اس کیس سے متعلق ایک ہی چیز ایسی ہے جس کے بارے میں آپ جاننا چاہ رہے ہوں گے۔

اس اشتہار پر انگریزی زبان میں ایک مختصر سا جملہ درج تھا۔ ''خواتین اساتذہ کی ضرورت ہے۔'' اس جملے کے ساتھ صرف ایک موبائل نمبر درج تھا۔ ٹیچنگ سے متعلق ایسا اشتہار میں نے پہلی بار دیکھا تھا جس میں کسی اسکول یا ادارے کا نام تک درج نہیں تھا سو اسے دیکھ کے میری جاسوسانہ رگ پھڑک اٹھی تھی۔ آپ بھی جاسوسی ڈائجسٹ پڑھتے ہیں اگر بھی ایسا اشتہار نظر سے گزرے اور آپ کی جاسوسانہ رگ پھڑکنے لگے تو اسے فوراً سے بیشتر کنٹرول کر لیجیے گا کیونکہ جیسے ''ہر بار پراٹھے نہیں ملتے، ایسے ہی ہر ایک کو بھی پراٹھے نہیں ملتے۔''

☆☆☆

تجربے کی ذہانت

فاروق انجم ساحلی

تجربے کا کوئی نعم البدل نہیں... تجربہ تو انسان کا محسن ہے... جو اسے وقت سے پہلے غلط فیصلوں اور آفات سے بچا لیتا ہے... تجربے اور مشاہدے کی کڑی آزمائش سے گزرتے رویے جو نہ صرف ذمے دار بناتے ہیں بلکہ حقائق تک پہنچنے کا زینہ ثابت ہوتے ہیں... تجربہ کار باپ اور نوآموز بیٹے کے ماہرانہ مکالمات میں گندھی تحریر...

قتل کی واردات کا ماجرا قاتل اس کی نظروں کے سامنے تھا......

سراغ رساں سارجنٹ ڈونالڈ برکی نے کاغذات کا بنڈل ڈائننگ روم کی میز پر پھینکا اور خود اپنی پسندیدہ آرام کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ ''میں نے آج اپنے کیریئر کا پہلا قاتل پکڑا ہے۔'' اس نے بڑے فخریہ انداز میں اعلان کیا۔

''مبارک ہو ڈارلنگ۔'' اس کی بیوی ایلسی نے گوشت بھونتے ہوئے باورچی خانے ہی سے آواز لگائی۔ ڈونالڈ برکی کے سسر ایڈگر ہوگن نے کچھ کہنے کے بجائے ہنکارا بھرا اور اخبار کا صفحہ پلٹ دیا۔ وہ صوفے

میں دھنسا ہوا بڑی محویت کے عالم میں اخبار کا اداریہ پڑھ رہا تھا۔

ایلسی کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ سسر اور داماد کے تعلقات بہتر ہو جائیں چنانچہ اس نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ''آپ نے سنا پاپا؟'' اس نے باپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ڈونالڈ نے آج ایک قاتل پکڑا ہے۔ کتنی اچھی بات ہے نا؟''

''میں تو اسے جب ہی مبارک باد دے سکوں گا جب ملزم پر منصفانہ طریقے سے مقدمہ چلے اور اس کی اپیل کی بھی سنوائی ہو۔'' بوڑھے ایڈگر نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

''اس ملزم کے خلاف اتنی مستحکم شہادتیں موجود ہیں کہ اسے شک کا فائدہ نہیں مل سکتا۔'' ڈونالڈ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''کیا تمہارے ملزم کا تعلق ہوٹل میں قتل ہونے والی لڑکی سے ہے؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''بالکل، اسی نے لڑکی کو قتل کیا ہے مگر آپ کو کس طرح معلوم ہوا، کیا اخبار میں کوئی خبر ہے؟'' ڈونالڈ نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سسر کو گھورا۔

''ہاں، دی مرر کے صفحہ نمبر تین پر خبر موجود ہے۔''

''تب پھر غلط ہی ہوگی۔'' ڈونالڈ نے تیزی سے کہا۔ ''انہیں حقائق کا علم نہیں۔''

بوڑھے ایڈگر نے اپنا چشمہ ایک بار پھر صاف کر کے ناک پر ٹکا لیا۔ اب وہ بہ آوازِ بلند خبر پڑھ رہا تھا۔ ''ہوٹل میں قتل۔ طالب علم گرفتار، پولیس نے آج صبح میڈیکل کے ایک پچیس سالہ طالب علم کو شہر کے اندر واقع ڈی لکس ہوٹل میں ایک لڑکی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ طالب علم آج ہی سینٹرل کورٹ میں پیش ہوگا۔ پولیس کو آج نو بجے کے بعد اس وقت قتل کی اطلاع ملی جب ہوٹل کی ملازمہ نے لاش دیکھی۔ کہا جاتا ہے کہ ملزم لاش کے پہلو میں سو رہا تھا۔ یہ بھی علم ہوا ہے کہ قتل کی شب واردات والے کمرے کے برابر واقع سوئٹ میں نیو ساؤتھ ویلز سپریم کورٹ کا ایک جج بھی رات گزار رہا تھا۔''

''یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے۔'' ڈونالڈ نے کہا۔ ''لیکن پھر بھی انہیں حقائق کا پوری طرح علم نہیں۔''

''ملزم نے اقبالِ جرم کر لیا ہے؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں کیا مگر جلد ہی کر لے گا۔''

''یا پھر تم اس کا اقبالی بیان خود ہی تیار کر لو گے۔''

ایڈگر نے مسکراتے ہوئے مگر خشک لہجے میں کہا۔

''یہ کام آپ جیسے پرانے سراغ رساں کرتے تھے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔'' ڈونالڈ غرایا اور اسی لمحے ایلسی دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ وہ ہراساں لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''پلیز کھانے کے وقت لڑائی نہ کریں۔ پاپا آپ صرف مذاق کر رہے تھے نا؟''

''ہاں۔'' ایڈگر نے اس بار بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس مذاق کا ردِعمل بڑا دلچسپ ہوا۔ ویسے ڈونالڈ! تمہیں اس بات پر یقین کیوں ہے کہ ملزم اقبالِ جرم کر لے گا؟''

''کیونکہ اس کے سوا کسی اور نے قتل نہیں کیا۔'' ڈونالڈ نے بھی لہجے کی ترشی کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ''ہوٹل میں کام کرنے والی ملازمہ جب ناشتا لے کر اس کے کمرے تک گئی تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بعد میں دیکھا کہ ملزم لاش کے پہلو میں خراٹے لے رہا ہے۔''

''یہ خادمہ کمرے میں کس طرح داخل ہوئی؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''جج جس کمرے میں تھا، اس کا دروازہ اس کمرے میں کھلتا تھا جہاں قتل ہوا۔ ملازمہ اسی دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی۔''

ایڈگر کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ظاہر ہوئے جیسے اس کیس کی تفصیلات میں وہ کچھ زیادہ دلچسپی لے رہا ہو۔ اس نے ایک لمحے بعد دوسرا سوال کیا۔ ''کیا یہ غیر معمولی بات نہیں کہ ہوٹل کی ملازمہ ان لوگوں کے کمروں میں زبردستی اور بلا اجازت داخل ہو، جو کرایہ ادا کر کے وہاں رہتے ہیں۔ یہ بڑی غیر مناسب بات معلوم ہوتی ہے۔''

''ممکن ہے مگر اس کیس میں یہ مناسب بات تھی کیونکہ قتل والی رات، کمرے میں جانے سے پہلے ملزم نے ہدایت کی تھی کہ ناشتا ٹھیک آٹھ بجے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ملازمہ ناشتے کی ٹرے لے کر مقررہ وقت پر کمرے کے دروازے پر پہنچی لیکن کئی مرتبہ کی دستک کے باوجود کوئی جواب نہ آیا تو وہ ٹرے لے کر واپس آ گئی۔ ساڑھے آٹھ بجے اس نے کمرے کے دروازے پر پھر دستک دی لیکن پھر بھی دروازہ نہ کھلا تو اس نے ماسٹر کی لگائی تاہم دروازے میں اندر سے زنجیر چڑھی ہوئی تھی لیکن اس طرح دروازہ اتنا کھل گیا کہ خادمہ نے اندر جھانک کر غسل خانے کا دروازہ دیکھ لیا جو

بند تھا، غسل خانے میں ویکیوم کے ذریعے ازخود بند ہو جانے والے دروازے نصب ہیں۔''

''بڑی ذہین عورت تھی۔'' ایڈگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور پھر ملازمہ نے دروازے کی درز میں سے اس جوڑے کو کئی آوازیں دیں۔ وہ سمجھی جوڑا رات بھر کی مصروفیت کے بعد تھک کر سو رہا ہے۔ عام طور پر ایسے جوڑے کمرے میں رات بھر۔۔۔ سرمستی کرنے کے بعد اس طرح بے سدھ ہوکر سوتے ہیں۔''

''تو یہ بھی ایسا ہی جوڑا تھا؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''لڑکی شادی شدہ تھی لیکن ہوٹل کے کمرے میں اس نے جس لڑکے کے ساتھ رات گزاری وہ اس کا خاوند نہ تھا۔ ملازمہ اس جوڑے کو پہچانتی تھی کیونکہ یہ دونوں کئی ماہ سے وقتاً فوقتاً ہوٹل کا کمرا ایک رات کے لیے لے لیا کرتے تھے۔ بہرحال ملازمہ نے برابر والے کمرے کی متبادل چابی لی اور بیچ کے کمرے والے مشترکہ دروازے سے اس جوڑے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔''

''ایک منٹ۔'' ایڈگر نے اسے ٹوک دیا۔ ''تم شاید صبح نو بجے کی بات کر رہے ہو جب چاروں طرف سورج کی روشنی پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں اور پردے گرے ہوئے تھے۔ بہرحال وہ جونہی کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا لڑکی اور لڑکا دونوں بستر پر ہیں۔ لڑکا کھڑکی کے قریب ڈبل بیڈ کے ایک کونے میں چت لیٹا تھا اور خراٹوں کی آواز برابر کمرے میں گونج رہی تھی۔ لڑکی اس کے برابر اس طرح پڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ بستر سے نیچے جھول رہے تھے۔ ملازمہ نے لڑکی کو شانے سے ہلایا تو وہ اسے غیر معمولی طور پر سرد لگی۔ اس کی پیٹھ میں چاقو گھسا ہوا تھا۔ ملازمہ خوف زدہ ہوکر چلائی جس کے باعث لڑکا جاگ گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ آنکھیں ملتا رہا اور پھر دو تین منٹ بعد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ ہمارے ایک ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق لڑکے نے اس رات انتہائی تیز نشے والی گولیاں کھائی تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد لڑکے نے دہشت زدہ ہونے کی اداکاری کی لیکن وہ کسی کو بھی بے وقوف نہ بنا سکا۔ ملازمہ نے کمرے سے ہی آپریٹر کو فون کیا جس نے ہمیں اطلاع دی۔ میں نو بجے کے بعد ہی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا، لڑکا جس کا نام جارج ہے، اس وقت بھی نیم غنودگی کے عالم میں سب کو تک رہا تھا۔''

''تو پھر اس نے نشہ آور گولیوں کے علاوہ بہت شراب بھی پی رکھی ہوگی؟'' ایڈگر نے چشمے کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اتنی زیادہ تو نہیں پی تھی۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ ''اس نے قتل والی رات سونے ۔۔۔۔۔۔ سے قبل بیئر کی دو چھوٹی بوتلیں اپنے کمرے میں پی تھیں اور ایک بوتل لڑکی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ریستوران میں پی۔ ہوٹل کا ریستوران گراؤنڈ فلور پر ہے۔''

''لڑکی کے قتل کی کوئی وجہ معلوم کی؟'' ایڈگر کچھ سوچ رہا تھا۔

''جب دونوں ریستوران میں کھانا کھا رہے تھے تو سروس ویٹر نے ان کی گفتگو سنی تھی۔ ویٹر کا کہنا ہے کہ دونوں کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ اس بحث کے دوران ایک مرتبہ لڑکی کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے چھری کانٹا میز پر پٹخ کر اپنا کوٹ اٹھایا اور ریستوران سے باہر سڑک پر نکل گئی۔ جارج اس کے پیچھے لپکا اور پھر دونوں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر کچھ دیر تک تیز لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ لڑکی کے چہرے پر برہمی تھی لیکن جارج پھر اسے منا کر واپس لے آیا تاہم وہ ریستوران کے بجائے سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ یہ کمرا جارج نے ایک روز قبل فون کے ذریعے بک کروایا تھا۔ رات آٹھ بجے کے قریب جارج نے روم سروس کو فون کر کے بیئر کی چھوٹی بوتل اور جن کا گلاس لانے کی ہدایت کی۔ پونے نو بجے جارج نے اس قسم کی دوسری فرمائش کی اور دونوں مرتبہ وہی ویٹر یہ مشروبات لے کر ان کے کمرے میں گیا جس نے ریستوران میں ان کے لیے کھانا لگایا تھا۔''

''یہ مشروبات کہاں تیار کیے گئے؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''ہوٹل میں مشروبات کی فراہمی کاک ٹیل بار سے ہوتی ہے۔ جو گراؤنڈ فلور پر ہے۔ ڈائننگ روم کے قریب۔''

''کیا ڈائننگ روم سے بار نظر آتا ہے؟''

''نہیں۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔

''یہ علم ہوا کہ گلاس میں جن کس نے انڈیلی تھی، بارمین نے یا ویٹر نے؟''

''کاک ٹیل بار میں رات دس بجے تک ایک بارمین

کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔'' ڈونالڈ نے اکتا کر جواب دیا۔
ایڈگر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ کسی اہم نکتے پر غور کر رہا ہو۔ ایک لمحے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''ہوٹل کا عملہ رات دن وہیں رہتا ہوگا؟''

''ہاں۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ ''سیکنڈ فلور پر عملے کے لیے کمرے ہیں جہاں دوسروں کے علاوہ بارمین اور ویٹر بھی رہتے ہیں۔''

''لڑکی کی لاش کس فلور پر ملی؟''

''چوتھے فلور پر...... ویسے پوری عمارت ائرکنڈیشنڈ ہے۔ کوئی کھڑکی کھلی نہیں رہتی اور نہ ہی کسی نے کھڑکی توڑنے کی کوشش کی ہے۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔
ایلسی باورچی خانے سے نکلی اور اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ سسر اور داماد کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

''تم نے پتا چلایا کہ جارج اور لڑکی کس وقت سوئے تھے؟'' ایڈگر نے گوشت پر چھری چلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' ڈونالڈ نے ایک لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک شخص نے جو ہوٹل میں ہی رہتا ہے بتایا کہ یہ جوڑا پونے دس بجے کے قریب اپنے بستر میں نظر آیا اور دس بجے کمرے کی بتیاں بجھ گئیں۔ بہرحال یہ شخص مجھے اچھا نہیں لگا۔''

''جج کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں، مثلاً وہ کب سونے کے لیے لیٹا۔ میرا خیال ہے کہ تم جج سے اس قسم کے سوالات کرنے کی ہمت نہیں کر سکے۔'' ایڈگر نے ڈونالڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' ڈونالڈ نے خفگی سے کہا۔ ''میں نے جج سے اس کے چیمبر میں ملاقات کی اور وہ فوراً ہی تعاون کرنے پر رضامند ہوگیا۔ جج کا کہنا ہے کہ گزشتہ شب اس نے اپنے مقررہ وقت پر کھانا کھایا اور گیارہ بجے سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس نے جارج کے کمرے میں کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنی۔''

''اور یہ جج اس وقت کہاں تھا جب صبح آٹھ بجے کے بعد ملازمہ اس کے کمرے سے گزرتی ہوئی جارج کے کمرے میں داخل ہوئی؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''خادمہ نے دستک دی تو وہ سو رہا تھا لیکن دستک کی آواز سن کر وہ بیدار ہوگیا اور اس نے دروازے کی زنجیر ہٹا دی تاکہ ملازمہ اندر آسکے۔''

''گویا جائے واردات پر وہ پہلا شخص تھا۔ جارج کے ردعمل اور رویے پر اس کی کیا رائے ہے؟''

''اس بارے میں، میں نے اس سے بات نہیں کی۔'' ڈونالڈ نے دھیرے سے کہا۔ ''جج کی خواہش ہے کہ وہ اس معاملے میں ملوث نہ ہو، یہ قدرتی خواہش ہے کیونکہ وہ ایک ذمے دار شخص ہے۔''
چند منٹ بعد کھانا ختم ہوگیا اور ایلسی برتن اٹھا کر لے گئی۔ ایڈگر نے سگار سلگاتے ہوئے اپنے داماد کے چہرے کا جائزہ لیا پھر کہا۔ ''تم نے جارج کے کمرے کی پوری طرح تلاشی تو ضرور لی ہوگی؟''

''بالکل، میں نے رپورٹ تیار کرلی ہے، کمرے کی تصویریں اتاری گئی ہیں جو فردِ جرم کے ساتھ منسلک کی جائیں گی۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا اور ایڈگر کی نظریں کاغذوں کے بنڈل پر جم گئیں جو ڈونالڈ گھر لے کر آیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''یہ رپورٹ اور تصاویر انہی کاغذوں میں ہیں؟''

''ہاں۔'' ڈونالڈ نے جواب دے کر فوراً ہی بنڈل کھولا جس میں واردات کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا۔
ایڈگر کچھ دیر تک جائے واردات کے نقشے کا جائزہ لیتا رہا جس میں جارج اور جج دونوں کے کمرے شامل تھے۔ ایک منٹ بعد بوڑھے نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''دونوں کمروں کے دروازوں پر اس وقت اندر سے زنجیر لگی ہوئی تھی۔ جب ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ملازمہ ناشتا لے کر آئی۔ اس کے علاوہ کمروں کا مشترکہ دروازہ بھی مقفل تھا۔''

''درست۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ ''جج کا کہنا ہے کہ سونے سے قبل اس نے دیکھ لیا تھا کہ مشترکہ دروازہ مقفل ہے یا نہیں۔''

''ہوں۔'' ایڈگر نے ہنکارا بھرا۔ ''جارج کے کمرے سے بیئر کی دو چھوٹی بوتلیں اور جن کے گلاس تو ضرور ملے ہوں گے؟''

''ہاں، اور ملازمہ کا کہنا ہے کہ اس نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''گلاسوں یا بوتلوں پر انگلیوں کے نشانات ملے؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''بیئر کے گلاس پر جارج اور جن کے گلاس پر لڑکی کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا سسر آخر اتنی جرح کیوں کررہا

ہے لیکن وہ محض ایلسی کی خاطر ان تمام بے تکے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

''اور بوتلوں پر؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

ڈونالڈ ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ''یہ واقعی بڑی عجیب بات ہے۔ جارج نے بوتلوں کو دھو کر رکھ دیا تھا تاکہ انگلیوں کے نشانات نہ مل سکیں۔''

''گویا بوتلوں پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں، مگر یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ بوتلوں کو جارج ہی نے دھویا۔ ممکن ہے لڑکی نے یہ حرکت کی ہو۔'' ایڈگر نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ بتدریج سرخ ہو رہا تھا۔

''ممکن ہے۔'' مگر لڑکی کو بوتلیں دھو کر رکھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟'' اس مرتبہ ڈونالڈ نے سوال کیا۔

''اس کا تو مجھے علم نہیں۔ یہ سوال بہرحال اپنی جگہ موجود ہے کہ جارج نے بوتلیں دھو کر کیوں رکھیں؟''

''ممکن ہے محض کسی خوف سے اس نے یہ کام کیا ہو لیکن اس سے بہرحال کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ڈونالڈ نے سگریٹ سلگائی۔

''پڑتا ہے، بہت فرق پڑتا ہے سارجنٹ ڈونالڈ۔'' بوڑھے ایڈگر کی بھویں آپس میں مل گئیں۔

''بالکل نہیں۔'' ڈونالڈ بڑے پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بیئر کی بوتلوں کو کس نے دھو کر رکھا تھا۔ ممکن ہے وہ بیئر کی بو سے بچنا چاہتے ہوں۔''

''شاید۔'' ایڈگر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''کمرے کی تلاشی کے دوران تمہیں کوئی غیر معمولی چیز تو نظر نہیں آئی؟''

''ان کی ذاتی اشیا کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔ دونوں بے لباس حالت میں تھے۔ اس کے علاوہ بوتلیں اور گلاس بھی پڑے ہوئے ملے۔''

''ردی کی ٹوکری میں کچھ نہیں ملا؟'' ایڈگر نے بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔ ردی کی ٹوکری میں نے خود دیکھی تھی۔'' ڈونالڈ نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''تب پھر یہ بتاؤ سارجنٹ ڈونالڈ کہ بوتلوں کے ڈھکنے کہاں گئے؟'' ایڈگر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' ڈونالڈ بڑبڑایا۔ ''یہ بڑا احمقانہ سوال ہے۔ بھلا مجھے کیا معلوم کہ بوتلوں کے ڈھکن کہاں گئے۔ ممکن ہے بارمین نے بوتلیں ویٹر کے حوالے کرنے سے قبل انہیں خود ہی کھول دیا ہو یا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ویٹر نے کمرے میں پہنچ کر بوتلیں کھولی ہوں اور ٹرے میں ڈھکنے رکھ کے واپس آگیا ہو۔'' ڈونالڈ اب بہت اکتا چکا تھا۔

''ہوں۔'' بوڑھے ایڈگر کی آنکھوں میں مچھلی کا شکار کرنے والوں کی سی چمک تھی۔ ''یہ ممکنات میں سے ہے۔'' وہ ایک بار پھر کیس کے کاغذات پر جھک گیا۔ ایک لمحے بعد اس نے تصویر نکالی اور اس کا بغور جائزہ لیا۔ ''یہ ایسے دروازے کی تصویر ہے جس پر زنجیر چڑھی ہوئی ہے۔ کیا یہ جارج کے کمرے میں لی گئی تھی؟''

ڈونالڈ نے تصویر کی پشت پر لکھے ہوئے نوٹ کو پڑھا اور بولا۔ ''ہاں جارج کے کمرے کا یہ دروازہ راہداری میں کھلتا ہے۔ جارج اور جج والے کمروں کے مشترکہ دروازے پر ایسی کوئی زنجیر نہیں، پرانا سا قفل ہے۔''

ایڈگر نے ایک مرتبہ پھر تصویر کو بغور دیکھا اور پھر اپنی میز کی دراز سے محدب شیشہ نکال کر تصویر کو دیکھنے لگا۔

''میرے خدا۔'' ڈونالڈ نے اپنا سر تھام لیا۔ ''آپ تو اس وقت بالکل شرلاک ہومز لگ رہے ہیں۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ قتل جارج ہی نے کیا ہے۔''

''میں یقین نہیں کر سکتا کیونکہ تمہاری کسی دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔'' ایڈگر نے جواب دیا۔ وہ محدب شیشے سے مسلسل تصویر کی جانچ کر رہا تھا۔

''مگر اس کے علاوہ قاتل اور کون ہو سکتا ہے؟'' ڈونالڈ نے قدرے برہمی سے کہا۔ ''اس کا رات کھانے پر لڑکی سے جھگڑا ہوا، اس کے بعد اس نے لڑکی کو قتل کر دیا اور پھر خود بھی نشہ آور گولیاں کھالیں۔''

''تم شاید ٹھیک کہتے ہو لیکن مجھے اب بھی شک ہے۔'' ایڈگر نے طویل سانس لے کر تصویر داماد کی طرف بڑھا دی۔ وہ بڑے سرد لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''دروازے کے ہینڈل کے نیچے قالین پر کچھ نشانات نظر آرہے ہیں۔ ذرا انہیں غور سے دیکھو۔''

ڈونالڈ نے بڑی بے چارگی کے عالم میں سسر کے ہاتھ سے تصویر اور محدب شیشہ لے کر تصویر پر نظریں جما دیں پھر بڑبڑایا۔ ''ہاں نشان تو ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے سلگتی ہوئی سگریٹ پھینک دی ہو جس کے باعث قالین میں سوراخ سا ہو گیا ہے۔''

ایڈگر نے داماد کی بات سُن کر گردن ہلائی اور دوسری

تصویر بھی اس کی طرف بڑھادی، وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ دوسری تصویر بھی جارج کے کمرے کی ہے، بستر کے اوپر دیوار پر ایک گھڑی لگی ہوئی ہے، کیا یہ الارم کلاک ہے؟''

''ہاں۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ ''الارم کلاک دس بجے کے لیے لگایا گیا تھا کیونکہ میں دس بجے کمرے میں ہی تھا کہ الارم بج اٹھا۔''

''ذرا سوچو میرے بیٹے۔'' ایڈگر نے بڑی شفقت سے کہا۔ ''بقول تمہارے جارج نے ملازمہ سے کہا کہ اسے صبح آٹھ بجے ناشتا کمرے میں بھیج دیا جائے اور دس بجے کا الارم لگا کر سو گیا۔''

''یہ بات اتنی اہم نہیں۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ ''جارج کا کہنا ہے کہ اس نے صبح سات بجے کے لیے الارم لگایا تھا مگر شاید وہ نشے میں اتنا دھت تھا کہ غلطی سے دس بجے کا الارم لگا بیٹھا، یہ کوئی اہم نکتہ نہیں۔''

''اس کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔'' ایڈگر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' ڈونالڈ نے برہمی سے کہا۔

''مطلب یہ کہ تم صرف ان نکات پر غور کررہے ہو جو جارج کو قاتل قرار دلوانے میں تمہاری مدد کرسکیں۔'' اب ایڈگر بھی برہم ہونے لگا تھا۔ ''اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو ابھی پولیس کو فون کر کے جارج کے خلاف تمام کارروائی رکوا دیتا۔''

''آپ احمقانہ باتیں کررہے ہیں۔'' ڈونالڈ نے رکھائی سے کہا۔

ایلسی اپنے باپ کی توہین برداشت نہ کرسکی۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ڈون! پاپا سے بدتمیزی مت کرو۔''

''ٹھیک ہے میں اپنے رویے کی معافی مانگتا ہوں بشرطیکہ پاپا یہ بتادیں کہ جارج کے کمرے میں کوئی رات دس بجے کے بعد کیونکر داخل ہوسکتا تھا۔ یہ بات بھی فراموش نہ کی جائے کہ تاک جھانک کرنے والے نے اس جوڑے کو اس وقت بستر میں دیکھا تھا۔ یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر قاتل جارج نہیں تو پھر قاتل کمرے کو اندر سے بند کر کے کس طرح باہر گیا۔ ملازمہ کے بیان کے مطابق کمرا صبح تک اندر سے بند تھا۔ بالفرضِ محال اگر زنجیر تبدیل کرنے پر غور کریں تو بھی یہ ناممکن ہے کہ کوئی باہر ہی سے زنجیر کھول کر اندر گیا اور پھر واپس آکر باہر ہی سے زنجیر لگادی۔ یہ ناممکن عمل ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے پاپا جج پر شبہ کررہے ہیں جو......''

''اس مرتبہ تم نے احمقانہ بات کی۔'' ایڈگر نے فوراً ہی اپنا بدلہ چکا دیا۔ ''تصویروں کو ایک بار پھر غور سے دیکھو۔ قالین پر ایک نہیں کئی نشان ہیں اور دروازے کے ہینڈل کے بالکل نیچے۔ یہی نشان قاتل تک لے جائیں گے۔ انہی سے معلوم ہوگا کہ کس نے کیا کیا ہے۔''

''کیسی باتیں کررہے ہیں...... ہونہہ۔'' ڈونالڈ نے حقارت سے کہا مگر بوڑھے ایڈگر نے یہ تحقیر آمیز رویہ بالکل نظرانداز کردیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

''کیا تم نے سیکنڈ فلور کے اسٹاف کوارٹرز کی تلاشی لی ہے؟''

''نہیں۔'' ڈونالڈ نے اکتاہٹ سے جواب دیا۔ ''اس کیس میں عملے کا کوئی آدمی ملوث نہیں۔''

''تم غلط راہ پر تفتیش کرتے رہے ہو ڈونالڈ۔'' ایڈگر نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں فی الفور اسٹاف کوارٹرز کی تلاشی لینی چاہیے اور خاص طور سے بارمین کے پورے کمرے کو کھنگال ڈالو۔''

''مگر بارمین تو اس پورے قضیے میں جارج کے کمرے کے قریب پھٹکا تک نہیں۔'' ڈونالڈ نے قدرے حیرت سے کہا۔

''یہ بھی احمقانہ مفروضہ ہے ڈونالڈ۔'' ایڈگر بہت سنجیدہ تھا۔ ''کیا قتل والی رات تم نے بارمین پر نظر رکھی تھی جو اتنے اعتماد سے اس نکتے کو خارج از امکان قرار دے رہے ہو؟ تمہیں کچھ بھی علم نہیں کہ رات دس بجے کے بعد وہ کیا کرتا رہا ہے۔''

''مگر بارمین ہی کیوں؟'' ڈونالڈ کا اعتماد اب متزلزل ہونے لگا تھا۔ ''اگر ہم ایک لمحے کو یہ فرض کرلیں کہ لڑکی کا قاتل عملے کے کسی فرد نے کیا ہے تو سب سے پہلے ویٹر مشکوک قرار پائے گا جس نے قتل والی رات جارج کے کمرے میں شراب پہنچائی تھی۔''

''ہاں مگر وہ صرف اپنے اس عمل کے باعث مشکوک ہونے سے بچ سکتا ہے۔'' ایڈگر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''لڑکی اگر ویٹر کو جانتی یا اس سے خوف زدہ ہوتی تو جارج کو ضرور بتاتی اور جارج اپنی کھال بچانے کے لیے اس کا ذکر ضرور کرتا اور یہ بات طے شدہ ہے کہ قتل کسی ایسے شخص نے کیا ہے جس سے لڑکی واقف ہے۔ کیا جارج نے تمہیں بتایا کہ مقتولہ اور ویٹر میں کوئی شناسائی تھی؟''

''نہیں مگر......''

''مگر میرے عزیز، بارمین وہ واحد شخص ہے جس پر ہم شبہ کر سکتے ہیں کہ وہ مقتولہ سے اور مقتولہ اس سے واقفیت رکھتی تھی۔ بارمین اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا کہ وہ خود کو مقتولہ کی نظروں میں نہ آنے دے۔ کیا بارمین شادی شدہ ہے؟ اور وہ کب سے ہوٹل میں کام کر رہا ہے؟''

''میں نے ابھی تک اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ڈونالڈ۔'' بوڑھے سابق سراغ رساں نے ایک طویل سانس لی۔ ''میں یہ حق نہیں رکھتا کہ تمہارے پیشہ ورانہ امور میں دخل دوں لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اب تک بارمین سے پوچھ گچھ بھی... مکمل کر لیتا، اس کے کمرے کی تلاشی بھی ضرور لی جاتی۔ تم اب بھی ایسی کوشش کر کے اس کے خلاف شہادتیں جمع کر سکتے ہو۔''

ڈونالڈ ایک لمحے تک سوچتا رہا اور پھر طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے پاپا، مجھے اب بھی یقین ہے کہ آپ غلط خطوط پر سوچ رہے ہیں لیکن بارمین کے بارے میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے میں کوئی خرابی بھی نہیں۔ میرا انتظار کریں، میں بس ابھی آیا۔''

☆☆☆

ڈونالڈ اس رات بارہ بجے کے بعد ہی واپس آسکا۔ اس نے بے تابی سے ایڈگر کو اپنا منتظر پایا۔ بوڑھا سسر بے دلی سے ٹی وی دیکھنے میں محو تھا۔

اس نے ڈونالڈ کے قدموں کی چاپ سنتے ہی ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا اور نوجوان سراغ رساں کو سوالیہ نظروں سے گھورنے لگا۔ ''ملا کچھ؟'' اس کی آواز میں اعتماد تھا۔

''ہاں کچھ ملا تو ہے۔'' ڈونالڈ پژمردہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا اس حالیہ انکشاف کو کس خانے میں فٹ کیا جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک رومال نکالا اور میز پر ڈال دیا۔

رومال میں لوہے کی ایک چھوٹی سی زنجیر تھی جس سے دھات کا ایک ٹکڑا منسلک تھا۔ دھات کے اس ٹکڑے میں دو سوراخ تھے۔ ایسی زنجیر عام طور پر دروازوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ زنجیر کی کڑیاں ایک جگہ سے تقریباً دو انچ ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایڈگر کی آنکھیں اس زنجیر کو دیکھ کر کسی شکاری کتے کی طرح چمکنے لگیں، وہ بڑبڑایا۔ ''یہ زنجیر تمہیں کہاں سے ملی! بارمین کے کمرے سے؟''

''ہاں۔'' ڈونالڈ بہت سنجیدہ تھا۔

مونالیزا

آپ کے سامنے مشہور عالم عجائب گھر ''لوور'' ہے جس میں لاکھوں نوادر رکھے ہیں لیکن روایتاً محض اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مونالیزا کی تصویر بھی دھری ہے۔ دانشوروں کا مقولہ ہے کہ اگر آپ نے پیرس جا کر مونالیزا کی تصویر نہیں دیکھی تو آپ کا ذوق مشکوک ہے اور سفر مجہول۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم نے ڈٹ کر پیرس دیکھا۔ ڈٹ کر لوور کا عجائب خانہ بھی دیکھا مگر مونا لیزا سے اجتناب کیا اور وجہ یہ نہیں کہ ہم دانشوروں کی توقعات پر پانی پھیرنا چاہتے تھے...... اگرچہ یہ ایک علیحدہ کارِ ثواب ہے...... وجہ یہ تھی کہ ہم مونالیزا کا مان توڑنا چاہتے تھے۔ اصل میں اس عورت کو لوگوں نے بلاوجہ بگاڑ رکھا ہے، اس کی مسکراہٹ کی داد کچھ اس انداز سے دی جاتی ہے جیسے ہمارے مشاعروں میں طرف دار لوگ اپنے یاروں کے گھٹیا شعروں کی دیتے ہیں۔ سبحان اللہ، مکرر! اور پھر شاعروں سے زیادہ سامعین مشاعرہ کرتے ہیں۔ کوئی مغربی طرف دار مونالیزا کی مسکراہٹ پر ایک دفعہ واہ واہ کہہ تو بیٹھتا ہے۔ اب باقی سامعین رو کے نہیں رکتے۔ حالانکہ سچ پوچھیں تو مونالیزا ایک گھامڑ سی خاتون ہے جو کھسیانی مسکراہٹ مسکرا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آج بھی اگر یہ تصویر کسی کھمبے کے ساتھ کھڑی کر دی جائے تو مونالیزا تصویر سے نکل کر کھمبا نوچنا شروع کر دے۔ لیونارڈو ڈونچی نے اس سے بہتر تصاویر بھی بنائی ہیں اور اس تصویر میں بھی مونالیزا کے ہونٹ نہیں ڈونچی کی شہرت مسکرا رہی ہے۔ ورنہ مونالیزا تو بے چاری وہی خاک ہے جو تھی۔ بلکہ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ مونالیزا کی تصویر مونالیزا سے قدرے بہتر ہے...... اکثر تصویریں اپنی مونالیزاؤں سے بہتر ہوتی ہیں۔ ہم نے زندگی میں فقط دو چیزیں ایسی دیکھی ہیں جو اپنی تصویروں سے زیادہ خوبصورت نکلیں۔

ایک تاج محل اور دوسری غزالہ۔ اور دونوں کو علم نہیں کہ ہم نے انہیں کس حال میں دیکھا۔ مگر او خدایا، ہم مونالیزا سے کہاں آ گئے؟ تاج محل دیکھ کر ہم شاہ جہاں کے غم میں کھو گئے اور غزالہ کی دید نے ہمیں اپنا غم دے دیا۔ لیکن حاشا، ہم شکایت نہیں کر رہے نہ تاج محل کو پشیمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ غزالہ کو۔

نہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

(چار شہر اڑتے خاکے...... از کرنل محمد خان)

انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

''تم نے معلوم کیا کہ وہ ہوٹل میں کب سے کام کر رہا ہے؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''تقریباً دو ہفتوں سے۔''

''کیا وہ شادی شدہ ہے؟''

''ہاں، مگر اس کی بیوی سے ناچاقی ہو گئی ہے۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔

بوڑھے ایڈگر نے جوش میں آکر صوفے کے بازو پر زوردار گھونسا مارا، وہ کہہ رہا تھا۔ ''تمام کڑیاں مل گئی ہیں سارجنٹ ڈونالڈ۔ مقتولہ یقیناً اس کی بیوی ہی تھی۔''

ڈونالڈ اپنے سسر کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ''لیکن اب بھی بارمین کے خلاف کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا، اس کے خلاف کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں۔''

''ثبوت نہیں۔'' ایڈگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمام ثبوت تمہاری جھولی میں پڑے ہیں۔'' وہ ٹوٹی ہوئی زنجیر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''مگر یہ زنجیر بارمین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروا سکتی۔'' ڈونالڈ نے کہا۔ ''میں اسے صرف اس وجہ سے اٹھا لایا کہ اس نے اسے بڑی حفاظت سے اپنے جوتوں میں چھپا کر رکھا تھا۔ وہ کچھ پریشان بھی نظر آ رہا تھا۔''

''کیا وہ تمہیں اپنے کمرے میں ملا تھا؟'' ایڈگر نے پوچھا۔

''ہاں، مگر وہ تنہا نہیں تھا۔'' ڈونالڈ نے جواب دیا۔ منیجر مجھے اس کے کمرے تک لے گیا اور جب کرائس یہ بارمین کا نام ہے...... نے دروازہ کھولا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ منیجر نے بتایا کہ میں کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں اور جب میں کمرے میں گیا تو معلوم ہو گیا کہ وہ پریشان کیوں ہے۔ وہ اس وقت صرف ڈریسنگ گاؤن میں تھا اور اس کے کمرے میں سرخ بالوں والی استقبالیہ کلرک پڑی کسمسا رہی تھی۔''

''ایک اہم ترین بات معلوم ہوئی، ویری گڈ ڈونالڈ۔'' ایڈگر نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا۔

ڈونالڈ نے دوبارہ سلسلۂ کلام جاری کیا۔ ''اس کے بعد میں نے پورے کمرے کو کھنگال ڈالا تو مجھے اس کے جوتے میں یہ زنجیر ملی لیکن میں سوچتا ہوں اس زنجیر سے ہم کیا ثابت کر سکیں گے؟''

''دیکھو، جارج کو بے گناہ تسلیم کرنے کے بعد۔''

''جارج کو کس نے بے گناہ تسلیم کیا ہے پاپا؟'' ڈونالڈ نے ایڈگر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں اب بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ قتل جارج ہی نے کیا ہے۔'' ایڈگر مسکرایا۔

''مگر یہ بھی تو سوچو کوئی شخص قتل کر کے لاش کے ساتھ پوری رات نہیں سو سکتا۔ قاتل یا تو لاش کو فوراً ٹھکانے لگانے کی تدبیر کرتے ہیں یا پھر جائے واردات سے فرار ہو جاتے ہیں، یہ مجرموں کی نفسیات کا پہلا سبق ہے جسے تم فراموش کر رہے ہو پھر ذرا اس ملازمہ کے بیان پر غور کرو جو ناشتا لے کر جارج کے کمرے میں گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ جارج اس کی چیخ سن کر بیدار ہوا اور جب اس نے لاش دیکھی تو اس کے چہرے پر دہشت اور حیرت کے آثار تھے، ظاہر ہے حیرت صرف اس بات کی تھی کہ وہ جس کی لاش دیکھ رہا ہے، وہ محض دس بارہ گھنٹے قبل اس کے ساتھ زندہ حالت میں تھی۔ جہاں تک اس کی مدہوشی کا تعلق ہے تو ممکن ہے، وہ صدمے یا پھر خواب آور گولیوں کا نتیجہ ہو جو بقول تمہارے اس نے رات کے وقت کھائی تھیں۔ اس کے ساتھ یہ کہنا کہ اس نے لڑکی کو قتل کیا اور پھر خودکشی کے لیے خواب آور گولیوں کی بڑی مقدار کھالی، محض بچپنا ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے خواب آور گولیاں خودکشی کے لیے نہیں کھائیں کیونکہ وہ میڈیکل کا سینئر طالب علم ہے اور اسے یقیناً علم ہے کہ ایسی گولیوں کی کتنی مقدار سے خودکشی ممکن ہو سکتی ہے۔''

''تب پھر اس نے گولیاں کھائی ہی کیوں؟'' ڈونالڈ نے جز بز ہو کر پوچھا۔

''اس کا جواب بہت آسان ہے۔'' ایڈگر نے سگار سلگایا۔ ''ممکن ہے اس نے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے ایک آدھ گولی خود کھالی ہو لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اتنا مدہوش کیوں ہو گیا کہ اس نے اس مدہوشی کے عالم میں الارم صبح سات بجے کے وقت پر لگانے کے بجائے دس بجے کا لگا دیا۔ اس نے شراب زیادہ بھی نہیں پی تھی کہ وہ اتنی مدہوشی کا شکار ہو جائے۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ کوئی مرد کسی لڑکی کا قرب حاصل کرنا چاہے اور یہ سوچے کہ اس قرب کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو وہ ہوٹل کا کمرا محض اس مقصد کے لیے بک کروائے اور پھر خواب آور گولیاں کھا کر مقصد حاصل کیے بغیر مدہوش ہو کر سو جائے۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی ایسی کوئی حرکت نہ کرتے۔''

''تو کیا اس لڑکی نے اسے خواب آور گولیاں کھلا دی تھیں؟'' ڈونالڈ نے پوچھا۔ اس کے ذہن میں اب بھی

تصویر واضح نہیں ہو سکی تھی۔

''بالکل نہیں۔'' ایڈگر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لڑکی کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار کرو، مجھے یقین ہے کہ اس کے معدے میں بھی خواب آور گولیوں کی علامتیں ملیں گی۔ میرے تجزیے کے مطابق جارج کی طرح مقتولہ بھی خواب آور گولیوں کے باعث مدہوش ہو گئی تھی۔ تمہیں یاد ہے کہ بیئر کی دونوں بوتلوں کے ڈھکن کمرے میں نہیں ملے تھے۔ وہ ڈھکن کہاں گئے؟ یقیناً یہ کراکس ہی تھا جس نے بار میں خود ہی بوتلیں کھولیں اور ان میں خواب آور گولیوں کا سفوف ڈال دیا۔ یہی سفوف اس نے لڑکی کے گلاس میں بھی ڈالا جس میں لڑکی کے لیے جن منگائی گئی تھی۔ اس کے بعد کراکس کو یقین ہو گیا کہ سفوف اپنا کام دکھا چکا ہوگا تو وہ جارج کے کمرے کی طرف آیا۔ اس نے اس سنہرے بالوں والی استقبالیہ کلرک سے ''ماسٹر کی'' حاصل کی جس کو کمرے کی تلاشی کے وقت تم نے کراکس کے کمرے میں دیکھا تھا۔ اس نے ماسٹر کی سے قفل کھولا اور دروازہ اتنا کھل گیا جتنی زنجیر میں گنجائش تھی۔ اس کے بعد اس نے سریع الاثر تیزاب زنجیر کے جوڑوں پر ڈال دیا اور پھر کچھ دیر تک تیزاب کے اثر کرنے کا انتظار کرتا رہا۔ تیزاب سے لوہا گل گیا لیکن کچھ قطرے قالین پر گر پڑے جس کی وجہ سے قالین میں چھوٹے چھوٹے کئی سوراخ بن گئے۔ تیزاب کے اثر سے زنجیر ٹوٹ گئی اور وہ خاموشی سے جارج کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے ٹوٹی ہوئی زنجیر کے اسکرو کھول کر اسے الگ کیا اور نئی زنجیر فٹ کر دی جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ زنجیر لگا دینے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تاکہ کوئی شک نہ کرے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لڑکی کو قتل کیا جو خواب آور گولیوں والی شراب پی کر اتنی بے خبر سو رہی تھی کہ چیخ بھی نہیں مار سکی۔ ممکن ہے اس نے لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ تم کل ہی جارج کے کمرے کا دوبارہ معائنہ کر سکتے ہو، وہاں یقیناً نئی زنجیر لگی ہوئی ملے گی۔ بہرحال کراکس قتل کرنے کے بعد فوراً کمرے سے نہیں گیا۔ پہلے تو اس نے ایسی تمام شہادتیں مٹا ڈالیں جو شراب میں خواب آور سفوف کی ملاوٹ ظاہر کر سکتی تھیں۔ اس نے بوتلوں کو دھویا لیکن گلاسوں کو یونہی پڑا رہنے دیا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ خواب آور سفوف جارج یا مقتولہ نے رضاکارانہ طور پر استعمال کیا تھا اور یہ کہ بوتلوں میں کوئی آمیزش نہ تھی۔ اس نے بوتلوں پر اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا ڈالے۔''

''لیکن آخر خواب آور سفوف کے استعمال کی ضرورت ہی کیا تھی؟'' ڈونالڈ نے پوچھا۔

''اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔'' ایڈگر نے اپنے کان کی لو مسلتے ہوئے کہا۔ ''پہلی یہ کہ کراکس کے کمرے میں گھسنے کی وجہ سے جارج اور مقتولہ بیدار نہ ہو جائیں اور دوسری یہ کہ جارج اس وقت تک سوتا رہے جب تک ہوٹل کی ملازمہ یا کوئی اور اسے لاش کے پہلو میں محو خواب نہ دیکھ لے۔ میرا خیال ہے کہ سونے سے قبل جارج نے سات بجے کا ہی الارم لگایا ہوگا لیکن کراکس نے اسے دس بجے پر لگا دیا اور پھر کمرے کے پردے اچھی طرح گرا دیے۔ تمہیں یاد ہے کہ ایک شخص نے رات کو سونے سے قبل جارج کے کمرے میں تاک جھانک کی تھی۔ گویا جارج اور لڑکی جب بیڈ پر لیٹے تو پردے پوری طرح گرے ہوئے نہیں تھے لیکن ہوٹل کی ملازمہ کا کہنا ہے کہ صبح کے وقت جب وہ کمرے میں گئی تو گھپ اندھیرا تھا اور سورج کی کوئی کرن اندر نہیں آرہی تھی۔ تم نے خود ہی دیکھ لیا کہ پردے پوری طرح گرے ہوئے تھے۔ الارم دس بجے کے وقت پر لگانے اور پردے گرانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ جارج قبل از وقت بیدار ہو کر لاش نہ دیکھ لے۔ اس صورت میں وہ فرار ہو سکتا تھا اس طرح کراکس کا یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا کہ ایک ہی تیر سے دو شکار کیے جائیں۔''

''یہ تو کچھ منطقی بات لگتی ہے۔'' ڈونالڈ بڑبڑایا۔ ''لیکن بقول آپ کے کراکس نے کمرے کے اندر ہی رہ کر نئی زنجیر لگا دی تھی، اس طرح وہ کمرے سے باہر کس طرح چلا گیا؟''

''یہ کوئی مشکل سوال نہیں۔'' بوڑھے ایڈگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے قتل ساڑھے دس بجے کے قریب ہوا۔ اس سے نصف گھنٹے قبل تاک جھانک کرنے والے آوارہ گرد نے جارج کے کمرے میں روشنی گل ہوتی ہوئی دیکھی اور اس کے کچھ دیر بعد گیارہ بجے جج اپنے کمرے میں آیا۔ اس طرح کراکس کو اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔ جج کا یہی کہنا ہے تاکہ وہ گیارہ بجے سونے کے لیے گیا؟''

''ہاں۔'' ڈونالڈ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''لہٰذا اس کے سونے سے قبل کراکس اس مشترکہ دروازے کے پاس بیٹھا رہا جو جارج اور جج کے کمروں میں کھلتا ہے۔ تمہارے نقشے کے مطابق وہ کرسی جس پر

بیٹھ کر جج ٹی وی کے پروگرام دیکھ سکتا ہے، اس دروازے کے مقابل پڑی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب جج نے ٹی وی بند کیا اور مشترکہ دروازے کا ہینڈل گھما کر دیکھا کہ دروازہ مقفل ہے یا نہیں۔ اس کے بعد وہ شب خوابی کا لباس پہننے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرائس نے مشترکہ دروازے کا قفل کھولا اور پھر ایک اور موقع کا منتظر رہا۔"

"لیکن یہ موقع کبھی نہیں آیا۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کرائس جج کے کمرے سے گزر کر فرار ہوا تو یہ نہ بھولیں کہ جج گیارہ بجے کے بعد کمرے سے نکلا ہی نہیں۔"

ڈونالڈ نے اعتراض کیا۔

"میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں گیا۔ ہمیں کمرے کی گنجائش اور وسعت کا خیال رکھنا ہوگا ویسے تم سونے سے پہلے کیا کرتے ہو؟"

"پاپا! مذاق مت کریں، میں بہت سنجیدہ ہوں۔" ڈونالڈ نے جھینپ کر کہا۔

"مذاق کی کوئی بات نہیں۔" ایڈگر مسکرا دیا۔

"بہر حال کرائس مشترکہ دروازے کا قفل کھول کر ایک اور موقع کا منتظر رہا تاکہ جج کے کمرے سے نکل کر راہداری میں نکل جائے۔

جج نے شب خوابی کا لباس پہنا اور ہر مہذب آدمی کی طرح ٹوتھ برش لے کر باتھ روم میں چلا گیا اور باتھ روم کا دروازہ دوسرے دروازوں کی طرح خودکار نظام کے تحت بند ہو گیا۔ گویا اب اس حصے میں کوئی نہ تھا جسے تم کمرا کہتے ہو۔ کرائس فوراً ہی مشترکہ دروازے سے جج کے کمرے میں آیا۔ اس نے مشترکہ دروازہ احتیاط سے مقفل کیا اور پھر جج کے کمرے سے نکل گیا۔ بعد میں جج واش روم سے باہر آیا اور حسب عادت دروازے پر زنجیر چڑھا کر سو گیا۔"

"میرے خدا۔" ڈونالڈ بڑبڑایا۔ "بالکل یہی ہو سکتا ہے۔"

"میں اپنی ایک سال کی پنشن کی شرط لگاتا ہوں کہ یہی ہوا ہے لیکن سنہرے بالوں والی استقبالیہ کلرک کو فراموش مت کر دینا، جو تلاشی کے وقت کرائس کے کمرے میں تھی۔ ممکن ہے اسی نے کرائس کو کمرے کی "ماسٹر کی" فراہم کی ہو۔"

ڈونالڈ فوراً ہی کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے، مجھے مسٹر کرائس سے مل لینا چاہیے۔"

☆☆☆

اگلی صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب ایڈگر باورچی خانے میں آیا جہاں ایلسی، ڈونالڈ کو کافی بنا کر دے رہی تھی۔ ڈونالڈ اپنے سسر کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر احترام کے جذبات تھے۔ "میں ابھی آیا ہوں پاپا۔"

"کرائس نے اقبالِ جرم کر لیا؟" ایڈگر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ایلسی دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"نہیں......لیکن اب اقبالی بیان سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔" ڈونالڈ نے کافی کا کپ ایڈگر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "سنہرے بالوں والی استقبالیہ کلرک نے سب کچھ اگل دیا ہے۔ کرائس نے اسے پورے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بے وفا بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اس سے شادی کر لے گا لیکن کرائس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لڑکی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے استقبالیہ کلرک کو صرف یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرنے کے لیے اس کی قابلِ اعتراض حالت میں تصویر بنانا چاہتا ہے۔ استقبالیہ کلرک کے بیان کے مطابق کرائس کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس ہوٹل میں آ کر لڑکے جارج کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔ چنانچہ اس نے بارمین رابرٹ سے دوستی کی جو تعطیلات گزارنے جا رہا تھا اور اسے اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ ہوٹل کے منیجر سے اس کی سفارش کر دے تاکہ رابرٹ کی عدم موجودگی میں وہ بارمین کا کام کرتا رہے۔ میں نے فنگر پرنٹ کی رپورٹ بھی حاصل کر لی ہے جس کے مطابق نئی زنجیر، مشترکہ دروازے کے ہینڈل اور جج کے دروازے کے ہینڈل پر کرائس کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ سنہرے بالوں والی استقبالیہ کلرک جب گواہوں کے کٹہرے میں کھڑی ہوگی تو اقبالی بیان کی ضرورت محسوس نہیں کی جائے گی۔ وہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہے۔"

"تم نے جارج کو رہا کر دیا؟" ایڈگر نے چونک کر پوچھا۔

"اوہ...... یہ تو میں بھول ہی گیا۔" ڈونالڈ ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ "میں ابھی اس کی رہائی کے لیے کہہ دیتا ہوں۔"

☆☆☆

فقیرانہ آئے

منظر امام

کسی نیکی کو چھوٹا سمجھنا چاہیے اور نہ ہی نیکی کا کوئی موقع گنوانا چاہیے... وقت خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو... استادِ محترم کبھی بھی التفات... عنایت اور نیکی کرنے کا موقع ضائع نہیں کرتے... اس مرتبہ ان کی نظرِ خاص ایک فقیر عورت پر مرکوز ہو چکی تھی... نیکی سے جڑے ایک جرم کا دلچسپ ماجرا...

مشکل محاوروں اور ثقیل جملوں سے سجی تحریر کی حسن آرائی......

اُستاد میرے پاس ایک بہت ہولناک خبر لے کر آ گئے تھے۔

اس خبر کی ہولناکی کا اندازہ ان کی حالت سے ہو رہا تھا۔ وہ پورے بدن سے کانپ رہے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے پانی طلب کیا اور چار پانچ گلاس پانی پی گئے۔

''خیر تو ہے اُستاد؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے آپ کو؟''

اس پر استاد نے مجھ پر اور اپنے آپ پر کرم فرماتے ہوئے بتایا۔ ''میں اجل رسیدہ بھکاری وگداگر ہوگیا ہوں۔ خونِ تازہ کی نمو میرے ہاتھوں میں دست خود دہان خود ہے۔ فرمائش قتل کردیا ہے کسی کا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں استاد۔ آپ نے کس کا قتل کردیا ہے؟''

''ہاں۔'' استاد اور بھی کانپنے لگے۔ ''یہ حرکتِ نادیدہ و چکیدہ سرزد ہوگئی ہے۔''

''خدا کے لیے استاد۔ یہ معاملہ سیریس لگ رہا ہے۔ آپ بتاؤ آپ نے کس کا خون کردیا؟''

اس پر استاد نے ایک لمبی چوڑی تقریر کے بعد انکشاف کیا کہ ان کے ہاتھوں ایک بھکاری کا قتل ہوگیا تھا اور اس کی لاش جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی ہے۔

یہ سن کر میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ استاد جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ ان کی حالت یہ ظاہر کررہی تھی کہ انہوں نے واقعی کسی کا خون کردیا ہے۔

''استاد۔ یہ...... یہ سب کیسے ہوگیا؟'' میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''ہاں، میں اب داستانِ صحرانورد وگرد باد ہونے والا ہوں۔ تم میرے ساتھ براجمان ہوجاؤ سوئے تھانہ و کچہری کے کہ میں خود کو مثالی خاک تھانہ کرجاؤں۔''

مطلب یہ تھا کہ استاد کو اب اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو تھانے جاکر پولیس کے سامنے سرینڈر کرنے والے تھے۔

میں نے بڑی مشکلوں سے استاد کو روکا۔ ''چلیں استاد، پہلے چل کر دیکھ لیں کہ واقعی ایسا کچھ ہوا ہے یا نہیں۔''

استاد اس طرح میرے ساتھ چل پڑے جیسے وہ بکرا جسے قربانی کے لیے لے جاتے ہیں۔ استاد نے جو مقام بتایا تھا، اس کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔

ایک پتلی سی سڑک تھی جس کے کنارے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ یہ ایک کچی سڑک تھی۔ جو سیدھی بس اسٹاپ کی طرف جایا کرتی تھی۔

اور وہیں جھاڑیوں کے پاس ایک لاش تھی۔ جو دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اردگرد بہت سے لوگ تھے۔ کچھ پولیس والے تھے۔ استاد جوش کے عالم میں آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا کررہے ہیں استاد، رک جائیں۔''

''وہ آدمی واصل چرخ بالا میری وجہ سے ہوا ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''میں اس کو سلاجیت اور سلاطین نہیں کرسکتا۔''

اب پتا نہیں سلاجیت اور سلاطین سے کیا مراد تھی لیکن یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ استاد کو اپنے جرم کا مکمل احساس ہے اور وہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے جارہے تھے۔

صورتِ حال بہت تشویشناک تھی۔ استاد جیسے بے ضرر انسان نے کسی کا خون کردیا تھا۔ جوان کے مزاج اور ان کی فطرت کے بالکل خلاف تھا۔

یہ درست تھا کہ انہیں بھی نہ بھی خود کو پولیس کے حوالے کردینا تھا لیکن اس سے پہلے میں استاد سے سارا ماجرا سننا چاہتا تھا تاکہ ان کے بچاؤ کا کوئی انتظام کیا جاسکے۔

میں استاد کو ان کے محل میں لے آیا تھا۔

''استاد! اب آپ دھیرے دھیرے بڑے سکون کے ساتھ یہ بتادیں کہ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ آپ ایسے آدمی تو نہیں ہیں پھر اسے کیوں ماردیا؟''

استاد نے اپنے جناتی اسٹائل میں بتانا شروع کیا۔

'میں کہ اس جانب سے روزانہ گزران گزرگاہ شیر فروش تھا کہ وہ ہاتھ پھیلائے دامنِ گیر ومحال ہوجاتا کہ ملبوس کون و مکاں کو کفن بردوش ہے اور پاپوش ہے جبکہ خرگوش ہے۔'

پتا نہیں استاد کیا بولے جارہے تھے لیکن اتنا پتا چل گیا تھا کہ استاد جب بھی اس طرف سے گزرتے، وہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوجاتا۔

استاد کی باتیں سمجھنے کی تکنیک یہی تھی کہ بس خاموشی سے سنتے چلے جاؤ اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔

''پھر ایک دن وہ گل بہ اندام پشیمان مرغزار ہوگیا۔ کہنے لگا کہ اگر میں بھی بھکاری ہوجاؤں تو خاطرِ احباب کو خزینہ بے بہا ہوجائے اور جبلت سیر طفیل سے عاری اور جاری ہو۔''

یعنی اس بھکاری نے استاد سے یہ کہا کہ وہ بھی اگر اس کے ساتھ بیٹھ کر بھیک مانگنا شروع کردیں تو ان کی آمدنی دگنی ہوجائے اور کچھ دنوں میں حالات بدل جائیں۔

''میں کہ خانوادۂ چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر ہوں۔'' استاد جوش کے عالم میں بولے چلے جارہے تھے۔ ''اور وہ فقیران تند و بے حال ایسی خرافات دلپذیر اور دستگیر کررہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے قلق، اے بلبل، سوختہ سامان ہوجا۔ تو نہیں جانتا کہ منکم آنم کہ خام دانم۔ میں غارت گر ہوش وایمان ہوں۔ اور کوہ نور کا وارثِ بے سکون

ہوں۔ لال قلعہ میرے اجداد کی نشانی اور کہانی ہے کہ عالم جادوانی ہے اور زنجیر لافانی ہے۔''

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ استاد نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور وہ کم بخت انہیں بھیک مانگنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

''پھر کیا ہوا استاد؟''

''پھر داخلِ سوختہ و اینٹ بے مول ہوگیا کہ پائندار رسید تھا۔ میں نے قریبا بالاخیر اہتمام کر کے اسے معروضِ بے بہار کر دیا اور وہ نوشتہ دیوار بے جان ہوگیا۔''

بہت دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ استاد کو اس بات پر اتنا غصہ آیا تھا کہ انہوں نے پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور اس کا انتقال ہوگیا۔

بہت ہی خطرناک پوزیشن ہوگئی تھی استاد کی۔ ان کے ہاتھوں ایک آدمی کا خون ہوگیا تھا۔ چاہے وہ بھکاری ہی کیوں نہ ہو اور اس نے کیسی ہی غلط بات کی ہو۔

ویسے یہ قتل ذہنی اشتعال کی وجہ سے ہوا تھا۔ جس کا افسوس استاد کو بھی ہو رہا تھا اور ان کا صاف اور معصوم ضمیر انہیں پولیس کے پاس جا کر اعتراف کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

واردات واقعی ہوگئی تھی۔ کیونکہ لاش میں خود دیکھ آیا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں استاد کو مشورہ دینے لگا۔

''استاد! جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں۔ آپ کو کسی نے ایسی واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بس خدا سے معافی مانگتے رہیں۔ آپ کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ کیونکہ آپ نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا۔''

میرا خیال ہے کہ اتنی دیر میں خود استاد کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا تھا اس لیے انہوں نے میرے مشورے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا تھا۔

پولیس اس بھکاری کے قاتل کو تلاش کر رہی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس طرف استاد نے میری جان کھا رکھی تھی۔ ''میں سپنے میں عندلیب خواب ہو رہا ہوں۔'' ایک دن انہوں نے بتایا۔ ''چراغ کینہ کی طرح وہ بھکاری بھوت خانہ بن کر تارِ عنکبوت ہو جاتا ہے اور فروغِ شام کو قاتلِ دستِ ہوس ہو جاتا ہے۔''

مقصد یہ تھا کہ وہ بھکاری خواب میں بھوت بن کر بابا کو پریشان کرنے لگا ہے۔

اب وہ بھکاری بھوت بن کر استاد کو پریشان کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ استاد کی طرف سے پریشانی

سیاسی پارٹیاں

آپ ذرا تھوڑا سا ماضی میں جھانکیے کیا کیا نام سامنے آتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی، جناح عوامی لیگ، عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی مسلم لیگ، جسٹس پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور نہ جانے کیا کیا پارٹیاں تھیں۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر
یہ پارٹیاں اس طرح ٹوٹیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہ رہا حالانکہ ان میں سے بعض برسر اقتدار بھی رہیں۔ مگر دیکھیے، مٹے ناموں کے نشان کیسے کیسے۔ وہ جو غالب نے کہا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
چنانچہ پارٹیاں بنتی بھی رہیں اور ٹوٹتی بھی رہیں۔ پھر ان میں سے نئی نئی پارٹیاں جنم لیتی رہیں۔ مارشل لا کے دور میں کیا کیا پارٹیاں وجود میں آئیں، کیسے کیسے حمایتی پیدا ہوئے، لیکن وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب وہی لوگ جمہوریت کے گن گا رہے ہیں، جمہوریت کی خوبیاں گنوا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مارشل لا والے بھی جمہوریت کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری قوم کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور چلا آرہا ہے۔ لاکھ روغن بادام ملو، چاہے جتنا خمیرہ گاؤزبان عنبرین کھلاؤ، کتنا ہی شربت انار پلاؤ، اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے۔ چلیے حساب صاف ہوگیا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹیاں ٹوٹی ہی نہیں بنی بھی ہیں۔ ایک ایک پارٹی سے کئی کئی بنی ہیں۔ اب مسلم لیگ ہی کو دیکھ لیجیے۔ کتنی لیگیں بن گئیں۔

اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل

لاحق ہوگئی تھی کہ وہ کہیں پولیس کے پاس نہ پہنچ جائیں۔
لیکن شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔
ایک دن استاد نے میرے پاس آکر کہا۔ ''تم ذرا میرے ساتھ سمندِ ناز تو کرو۔'' یعنی میرے ساتھ چلو۔
''وہ کیوں استاد؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کہاں لے جا رہے ہیں۔''
''ابتلائے گلے خانہ فرماں روائے مقامِ وارداتِ قلبی کے پاس۔'' استاد نے فرمایا۔ ''میرا مشاہدہ دل گیر ہے کہ اس مرحوم و مغفور اور رنجور کی بیوی نفاست زیبا ہو رہی ہے۔''
''خدا کے لیے استاد۔ ایسے موقع پر تو اردو بول لیا کریں۔''
پھر بڑی مشکلوں سے استاد یہ سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ وہ مجھے اس جگہ لے جانا چاہتے تھے جہاں انہوں نے اس بھکاری کا خون کیا تھا۔ کیونکہ اس جگہ اب بھکاری کی بیوہ بیٹھا کرتی تھی۔ استاد اسے پہچانتے تھے اسی لیے استاد اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔
یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جس سے کوئی خطرہ ہوتا اسی لیے میں استاد کے ساتھ ہولیا۔
ٹھیک اسی جگہ اب ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ استاد نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دعائے رنجشِ مغفور کر دینا۔''
''کیا بولا صاحب؟''
''امتزاج مرحوم کو ایصالِ بدخشاں کر دینا۔'' استاد نے پہلے جملے سے بھی زیادہ مشکل بات کہہ دی۔
استاد مارے جوش کے اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے۔ اسی لیے میں استاد کو وہاں سے کھینچ لایا۔
اس دن کے بعد سے استاد کا وتیرہ ہوگیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس جگہ پہنچ جاتے اور اس عورت کو کچھ نہ کچھ دے آتے۔ اس عورت نے بھی استاد کو حاتم دوراں سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے آنے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔
ایک دن میں نے استاد سے پوچھا۔ ''استاد! آخر آپ کب تک اس کی مدد کرتے رہیں گے۔ اب چھوڑ دیں اس کو۔''
''یہی تو افشائے راز ہے۔'' استاد نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں کس طرح فقیہانِ اقبال وجدال سے چشم پوشی کر سکتا ہوں۔''
یعنی وہ کس طرح اس کی مدد کرنا چھوڑ سکتے تھے۔
ایک دن پھر استاد کو جوش چڑھا۔ اور وہ میرے پاس آگئے۔ ''بس اب بہت سیر چشمی ہو چکی۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں بکار خاص ہونے جا رہا ہوں۔''
''کیا مطلب استاد؟''
''میں ماجرائے دردِ دل اس عورت کے گوش گزار کر دوں گا۔'' استاد نے فرمایا۔
میں نے بہت سمجھایا۔ لیکن استاد کی کوئی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ وہ یہ تو جان گئے تھے کہ وہ پولیس کے پاس نہیں جائیں گے۔ لیکن ان کا فیصلہ تھا کہ وہ اس عورت سے ضرور اپنے اس جرم کی معافی مانگ لیں گے۔
میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔
بہرحال ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ عورت اسی جگہ موجود تھی۔ استاد نے اس کو دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''اے دل گرفتہ، دست بریدہ۔ میں مجبور و مقہور لرزہ بہ اندام کو شرمندگانِ عالیہ ہوں کہ تو جوہرِ حیات سے تقدیم و تاخیر ہو چکی ہے اور تیرا دردِ دل درِ جگر بن کو مغز سر میں گوشہ نشین ہو گیا ہے۔''
استاد کی اس بے مثال تقریر نے اس بھکارن کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے کبھی استاد کو دیکھتی کبھی مجھے۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''بابو صاحب، یہ پاگل آدمی کیا بول رہا ہے؟''
اس موقع پر میں نے اس بھکارن کی پریشانی دور کی۔ ''دیکھو، یہ صاحب پاگل نہیں ہیں۔ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ یہ تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے علم سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ تم بیوہ ہو چکی ہو۔ تمہارا شوہر کسی حادثے میں مر چکا ہے۔''
''ہاں جی ہاں۔'' اس عورت نے جلدی سے گردن ہلا دی۔ ''وہ مر گیا ہے جی، ہم بہت پریشان ہیں۔''
استاد نے فوراً اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں دس روپوں کی بہت اہمیت تھی آج کے پانچ سو سمجھ لیں۔
دس روپے پاتے ہی اس عورت کی دعاؤں کی مشین گن چل پڑی۔ اس نے استاد کے پورے خاندان کو دعائیں دے ڈالیں۔ استاد بہت ہی قلب مطمئنہ کے ساتھ وہاں سے واپس آئے تھے۔
اس دن کے بعد سے استاد نے اپنا یہ معمول بنا لیا۔ وہ ادھر سے گزرتے ہوئے اس عورت کو دس کا ایک نوٹ دے دیتے اور اس کی دعائیں لے کر واپس آجاتے۔

ایک دن استاد نے میرے پاس آ کر ایک روح فرسا انکشاف فرما دیا۔ ''میں اس عورت کو اسپغولِ عالم تاب کرنے جا رہا ہوں۔''

''کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

''فرمانروائے مملکت شاہانِ عظمت وگرفتہ۔'' استاد نے بتایا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

اس بار استاد نے بڑی مشکلوں سے آسان کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ وہ اس عورت سے شادی کرنے جا رہے ہیں۔

''کیا؟ میں تو یہ سن کر پاگل ہو گیا۔'' کیا فرما رہے ہیں استاد! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''بس یہی ایک رہ گزر جام و مینا اور سفینہ ہے۔'' استاد نے بتایا۔

مقصد یہ تھا کہ استاد نے اس عورت سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس کا شوہر استاد ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

''خدا کے لیے ایسا مت کرنا استاد۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ ایک بھکارن ہے۔ آپ اس کی مدد کرتے رہیں۔ آپ کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔''

استاد نے پھر کچھ نہیں کہا۔

ایک صبح وہ تشریف لائے تو بہت بوکھلائے ہوئے تھے۔ ''وہ...... وہ فرستادہ براجمان گوشہ کنارہ ہو رہا ہے۔'' استاد نے بتایا۔ ''وہی جو ماوالنہر ہو گیا تھا اور خاکِ عالم سے بقائے دوام کو چلا گیا تھا۔''

استاد کی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ استاد نے اسی بھکاری کو اس عورت کے پاس دیکھ لیا تھا۔ جس کو وہ مار چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی استاد۔ وہ کوئی اور ہو گا۔''

''نہیں۔ میں اتنا بھی بے ہوش و گمان نہیں ہوں۔ چشم ساقی سے دیکھ کر تشریف فرما ہو رہا ہوں۔'' مطلب یہ تھا کہ وہ پاگل نہیں تھے اور خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ کر آ رہے تھے۔

صورتِ حال جاننے کے لیے خود وہاں پہنچ گیا۔ استاد قریب نہیں گئے تھے۔ وہ اس وقت سخت خوف زدہ ہو رہے تھے۔ وہ عورت چونکہ مجھے پہچاننے لگی تھی۔ اسی لیے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ استاد نے جس کو مارا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

''یہ کون ہے تیرا؟'' میں نے عورت سے اس بھکاری کے بارے میں پوچھا۔

''یہ میرا بھائی ہے جی۔'' اس عورت نے بتایا۔

''تم یہاں پہلی بار آئے ہو؟'' میں نے اب اس آدمی سے پوچھا۔

''نہیں جناب، پہلے میں ہی یہاں کھڑا ہوتا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک بندے سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اس ظالم نے میرے سر پر اینٹ مار دی۔ میں بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ برادری والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر اپنے گاؤں چلا گیا۔ اور اب واپس آیا ہوں۔''

''تو تم مرے نہیں تھے۔'' میں کچھ حیرت اور کچھ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

''نہ جی۔ میرا بھائی کیوں مرنے لگا۔ ہاں اسی ٹیم اسی جگہ اپنی برادری کے ایک بندے کا خون ہو گیا تھا کسی نے اسے چھری مار دی تھی۔''

''اوہ خدا۔ میں نے ایک گہری سانس لی تو معاملہ کچھ یوں تھا۔ بے چارے استاد خود کو گنہگار اور مجرم سمجھتے رہے تھے جبکہ مرنے والا ہٹا کٹا سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا شوہر کسی حادثے میں مر چکا ہے۔''

''ہاں جی، تو اس میں کون سا جھوٹ ہوا۔ وہ بے چارہ گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔''

اب ساری باتیں واضح ہو چکی تھیں۔

میں نے جب استاد کو یہ سب کچھ بتایا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''یہ تو مقامِ تشکر و منجاب ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''بے مایہ بے حساب ہے اور آفتابِ عالم تاب ہے۔''

''ہاں شکر کریں۔ آپ کی جان اور عزت دونوں بچ گئیں اور آپ بھی خوامخواہ اس عورت کو اتنے دنوں تک پیسے دیتے رہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہی بہانہ میری نجات کا ہو گیا ہو۔''

استاد نے یہ جملہ انتہائی رواں اور شستہ اردو میں فرمایا۔ ''استاد آپ تو سیدھی زبان بھی بول لیتے ہیں۔''

''ہاں۔'' استاد مسکرا دیے۔ ''بس فرونہ وار دافتخار مینا سے جب جنگ در یاب دہان تازہ تازہ نمودار واردات باغیچہ اور غالیچہ ہوتا ہے تو......''

استاد بولتے رہے اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 39

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بناتے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پادر کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولودش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولودش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولودش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولودش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولودش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو بھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج

اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہوجاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کرلیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچادیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدنگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو چھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جادا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جادا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام چھلگری کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شیزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغواء کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شیزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شاہنواز خان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ مکروہ چہرے پر فتح مندی کے آثار اسے اور بھی منحوس صورت بنا رہے تھے۔ عقوبت خانے جیسا منظر پیش کرنے والے کمرے میں ہونے کے باعث شاہنواز کے چہرے کے چیچک زدہ گڑھوں میں پھنسے پسینے کے ننھے قطرے، عجیب سا تاثر پیش کر رہے تھے۔

آنے والے اس کے حواری نے شکیلہ اور ارم کے دونوں بچوں کے دھر لیے جانے کی اطلاع بہم پہنچائی تھی اور

گہری تشویش سے میرا چہرہ ست کر رہ گیا تھا جبکہ خود ارم بھی بری طرح متوحش نظر آنے لگی تھی۔ شاہنواز اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے آنکھیں سکیڑے مجھے گھورے جارہا تھا۔

شکیلہ کا ہتھے چڑھنا ہم سب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ طلسم نور ہیرا اسی کے پاس تھا اب شکیلہ کا اس بدبخت زمیندار کے ہتھے چڑھنے کا مطلب تھا کہ ہیرا بھی گیا۔

اسی وقت ایک چھوٹے اور موٹے سے جسم والا اجرک پوش شخص اندر داخل ہوا اور پورے جوش کے ساتھ مؤدبانہ ہوکر زمیندار شاہنواز خان سے بولا۔

''سائیں وڈا...... ! شکار حاضر ہے...... آگے کیا حکم ہے......؟''

''تینوں کو ادھر ہی لے آؤ۔'' زمیندار نے تحکمانہ کہا۔

چند ثانیے بعد ہی میری پرتشویش نظروں کے سامنے شکیلہ اور دونوں بچے تھے۔ شکیلہ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے جبکہ ارم کے دونوں بچے بری طرح خوف زدہ نظر آرہے تھے اور رونے کے انداز میں ہولے ہولے ''ٹھسک'' رہے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ انہیں بری طرح ڈرا دھمکا کے رونے چلّانے سے باز رکھا گیا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ شکیلہ ان کے قبضے میں کیسے آگئی تھی، پھر جلد ہی مجھے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آئی کہ ممکن تھا کہ دونوں معصوم بچوں کی ذمے داری اس کے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئی ہو۔ پھر اس علاقے سے ناآشنا بھی تھی، کہاں جاتی۔ کہاں تک بھاگتی، بچتی؟

بچے اپنی ماں کو وہاں موجود پا کر ''اماں...... اماں......'' کہتے ہوئے اس کی طرف لپکے اور ممتا کی ماری ارم نے فوراً ہی انہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے یوں اپنے بازو پھیلا دیے۔ جیسے مرغی شکرے کو دیکھتے ہی چوزوں کو اپنے پروں تلے ڈھانپ لیتی ہے۔ وہاں تو ایک نہیں کئی شکرے موجود تھے۔

میری وہاں موجودگی شکیلہ کے لیے شاید غیر متوقع تھی، مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر مستزاد مجھے بھی اپنی طرح رسن بستہ پا کر اس کا چہرہ اُتر سا گیا تھا۔ اس کے بکھرے بال اور کپڑے گرد و غبار سے اٹے تھے، چہرے پہ خراشوں کے نشان بھی نمایاں تھے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور لگتا تھا کہ اس نے شاہنواز کے بھیڑیا صفت اور اسلحہ پوش حواریوں کا بغیر ہتھیار کے مقابلہ کرنے کی اپنے تئیں پوری کوشش کی تھی۔

میں نے دیکھا زمیندار شاہنواز خان، شکیلہ کو بڑی خونخوار اور گرسنہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے سر کو مخصوص انداز میں خفیف سی جنبش دی۔ دونوں مسلح حواریوں نے شکیلہ کو دبوچے ہوئے آگے دھکیل دیا، وہ لڑکھڑاتی ہوئی شاہنواز کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

''اس کی تلاشی لی ہے تم لوگوں نے؟'' شاہنواز اپنے حواریوں کی طرف دیکھتے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

''ہاؤ سائیں وڈا...... ! پر اس سے کچھ نہیں ملا......''

کوڑا خان نے جواب دیا۔

''ہم......'' شاہنواز نے ایک گونجدار سا ہنکارا بھرا اور شکیلہ سے بڑے کرخت لہجے میں بولا۔

''چھوکری...... ! کیا نام ہے تیرا......؟''

''شکیلہ......''

''وہ ہیرا کدھر ہے......؟''

''کون سا ہیرا......؟ کیسا ہیرا......؟'' شکیلہ نے ایک دم انجان بننے کی اداکاری کی مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ یہ بدبخت شاہنواز اب تک ہمارے بارے میں بہت سے درست اندازے قائم کر چکا تھا۔ لہٰذا اس کا شکیلہ کے جھانسے میں آنے کا امکان کم ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہنواز خان بھتّائے ہوئے انداز میں اپنی چار خانوں والی تہبند سنبھالتے ہوئے مونڈھے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر اس نے شکیلہ کے بکھرے بکھرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ تکلیف کے سبب شکیلہ کے منہ سے کراہ نما چیخ سی برآمد ہوئی تھی اور اسی انداز میں اس کا دہن بھی وا ہوگیا تھا اور وہیں شاہنواز اپنا بھیانک چہرہ لاتے ہوئے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

''چھوکری...... ! اُدھر دیکھ...... اُس طرف......'' اس نے مٹھی میں جکڑے ہوئے بالوں سے شکیلہ کا چہرہ بے دردی کے ساتھ میری طرف گھمایا۔

''ایک تیرا یار یہاں میری گرفت میں ہے اور باقی دونوں اس وقت تھانے میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ یہ میری جاگیر ہے اور یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ بس...... ! آخری بار پوچھ رہا ہوں اب اگر جھوٹ بولا تو دوبارہ میں تیرے منہ سے سچ سننے میں بھی وقت ضائع نہیں کروں گا...... جواب دے...... وہ ہیرا کہاں ہے؟''

بلند چھت والی اس اوطاق نما کمرے میں سسکتی سی خاموشی طاری ہوگئی۔ میں اب طیش اور اُبال کی کیفیات سے نکل کر تشویش اور فکرمندی کے حصار میں مقید ہو چکا تھا اور اس گمبھیر صورت حال سے نمٹنے کی تدبیر سوچنے میں گم تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ شکیلہ طلسم نور ہیرے کے متعلق کچھ بھی نہیں بتائے گی۔ جانتی تھی وہ اس ہیرے کی قدر و قیمت کو اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ اس ہیرے کے حصول کے لیے میں کتنے کٹھن مراحل سے گزرا تھا اور کتنی پُرمصائب منزلیں طے کی تھیں۔ اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس ظالم اور جابر شخص کی کسی درندگی کا شکار ہو جبکہ موجودہ گھڑیاں مجھے یہ باور کروا چکی تھیں کہ ہم پر نازل ہونے والی یہ مصیبت معمولی نہ تھی۔ جس نے ہم سب کو آن کی آن میں بے بس اور لاچار سا کر دیا تھا۔ لہٰذا...... شکیلہ کے بولنے سے پہلے ہی میں نے اس سے کہہ ڈالا۔

''شکیلہ! ہیرے کے بارے میں اسے سب سچ سچ بتا دو...... جو میں نے تمہارے حوالے کر رکھا تھا......''

یہ کہتے ہوئے میرا چہرہ شکست خوردہ سا نظر آنے لگا تھا۔ آواز اور لہجہ بھی ہارے ہوئے جواری جیسی مثل پیش کر رہا تھا۔ جس سبب شاہنواز کے بدہیئت ہونٹوں پہ بڑی زہرخندسی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ فتح کے نشے نے اسے سرتاپا فرعون بنا دیا تھا۔ وہ اپنے جبر و زور سے جو بازی کھیل رہا تھا، اس میں اسی کی جیت ہو رہی تھی۔ ناانصافی اور زور و زبردستی سے حاصل کی ہوئی جیت شاہنواز جیسے انسانوں کو ہمیشہ فرعونیت ہی عطا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

میری بات پر شکیلہ جیسے ایک کڑے امتحان سے آزاد ہوگئی تھی لیکن جب وہ اٹکتے ہوئے لہجے میں شاہنواز کے سوال کا جواب دینے لگی تو اس کی آواز بھی میری آواز سے ہم آہنگ ہی محسوس ہوتی تھی۔

''وہ...... وہ...... ہیرا، میں نے وہاں گرا دیا تھا۔''

''کہاں......؟'' شاہنواز نے ایک بار پھر اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے شکیلہ کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

''وق...... قبرستان والی جگہ میں......''

اس جواب پر میری شکر ہے ایسی چست نظروں نے شاہنواز کے چہرے پر یکلخت اُلجھن آمیزی کا جال سا تنتے دیکھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شکیلہ اب بھی سچ بول رہی تھی یا پھر نجانے کس اُمید اور کیا سوچ کر اس کے ساتھ بلف کر رہی تھی۔ تاہم لگ تو ایسا رہا تھا کہ اس نے جب دیکھا کہ وہ اب شاہنواز خان کے حواریوں سے نہیں بچ سکتی تو اس نے ہیرے کو ان کے قبضے میں جانے سے بچانے کی خاطر وہیں کہیں چھپا دیا تھا یا کسی اندھے گڑھے میں پھینک دیا تھا تاکہ حالات سازگار ہوتے ہی وہاں سے بہ آسانی دوبارہ برآمد کر لیا جائے، مگر یہاں کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے فی الحال یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

شاہنواز نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے شکیلہ کے سر کو ایک آخری بار زور سے جھٹکا دیتے ہوئے چھوڑا اور گرج کر بولا۔

''وہ بخشل......!''

''حاضر سائیں وڈا......!''

''تم اِدھر رکو اور اوطاق میں بیٹھے ان دونوں سپاہیوں کو رخصت کر دو۔ اس پر کڑی نظر رکھنا......''

''برابر سائیں......! ایسا ہی ہوگا۔'' بخشل نے فدویانہ انداز میں اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے خم ہو کے کہا۔ اس دوران میں شاہنواز کوڑا سے بولا۔

''اڑے بابا جلدی کرو...... گاڑی نکالو اور اس چھوکری کو بھی ساتھ لے لو۔ ہیرا ملا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو بھی وہیں کسی پرانی قبر میں گاڑھ دیں گے۔''

اس نے آخر میں شاید شکیلہ کو ہراساں کرنے کی خاطر اپنا لہجہ خوفناک اور سفاک بناتے ہوئے کہا تھا۔ کوڑا خان فوراً حرکت میں آ گیا۔ ساتھ کھڑے وہ دونوں حواری بھی نکل گئے جو کوڑا خان کے ساتھ شکیلہ کو لائے تھے۔

میں بے بسی سے اپنے ہونٹ چباتا رہ گیا۔ ان سب کے جانے کے بعد اب بھی وہاں تین مسلح حواری موجود تھے۔ بخشل انہیں مقامی زبان میں کچھ ہدایت دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پھر جلد ہی لوٹ بھی آیا۔

اندیشوں اور وسوسوں بھری رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ ارم اپنے دونوں بچوں کو لیے ایک شکستہ سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ بخشل اپنے تین مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود رہا۔ بخشل نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا اور وہ باہر چلا گیا۔

اس کے بعد بخشل خود اسی مونڈھے پر براجمان ہو گیا جہاں کچھ دیر پہلے زمیندار شاہنواز خان بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی، اس نے ماچس نکال کر سلگالی۔ ایک گہرا کش لگاتے ہوئے اس نے سامنے کھڑے اپنے دونوں ساتھیوں

میں سے ایک کی جانب ڈبی ماچس سمیت بڑھا دی۔ وہ دونوں بھی اپنے لیے سگریٹ منتخب کرنے لگے۔

باہر رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ بخشل مقامی زبان میں ہولے ہولے اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

احاطے کا منظر پیش کرنے والی کھڑکی میرے سامنے تھی اور وہاں سے ہلکی روشنی آتی دکھائی دیتی تھی۔ شاہنواز وغیرہ جا چکے تھے اور مجھے شکیلہ کی فکر کھائے جارہی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہیرا نہ ملا یا کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا تو کہیں یہ جنونی اور مشتعل مزاج درندہ صفت وڈیرا شکیلہ کو جان سے ہی نہ مار دے۔

انہی اندیشوں اور وسوسہ انگیز ساعتوں میں وقت کی چادر تھوڑا اور سرکی تو دفعتاً ہی مجھے کھڑکی سے پرے ایک سائے کی جھلک دکھائی دی۔ یہی سمجھا تھا میں کہ ان کا ہی کوئی ساتھی ہوگا مگر اس سائے کی حرکات و سکنات میں مجھے چوروں کی سی خاموشی اور محتاط آمیزی محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی میں اندر سے بُری طرح چونکا تھا۔

اچانک رات کے سناٹے میں گولی چلنے کا دھما کا سنائی دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی تلے اُوپر رائفلوں کے دو برسٹ بھی فائر ہوئے۔ میں تو چونکا ہی تھا مگر مجھ سے زیادہ یہ تینوں بری طرح بدک کر اُچھلے تھے۔ ان کا چونکنا اور بے چینی سمجھ میں آتی تھی۔ ظاہر ہے رات کے اس سمے، شاہنواز خان جیسے جاگیردار کی حویلی کے اریب قریب اس طرح گولیاں چلنا معمولی بات کہاں ہوسکتی تھی۔

وہ تینوں ہتھیار سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے۔ بخشل کے ہاتھ میں بھی ایک پستول نظر آرہا تھا مگر ابھی یہ لوگ باہر احاطے میں کھلنے والے دروازے سے محض دو تین قدم ہی پیچھے ہوں گے کہ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا۔ دونوں نے اپنے ہتھیار سیدھے کرنے چاہے تھے کہ ایک کان پھاڑ برسٹ فائر ہوا، وہ دونوں کھڑے کھڑے رقصِ اجل کرتے ہوئے گرے، بخشل چالاک اور بیدار مغز ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا یہ حشر دیکھتے ہی دروازے سے ہٹ کے سیدھے ہاتھ کی طرف جست لگائی۔ دو خطرناک قسم کے بھاری ڈیل کی جسامت والے ڈھاٹا پوش دھواں اُڑاتی رائفلوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور ایک نے بخشل کی جانب برسٹ فائر کیا۔ جس دوسرے دروازے کی طرف اس نے جست بھری تھی وہ شاید حویلی کے کسی اندرونی گوشے کی طرف کھلتا تھا۔ جہاں سے ابتدا میں زمیندار شاہنواز خان داخل ہوا تھا۔ بخشل اپنی چابک دستی کے ساتھ اس دروازے سے پار ہو چکا تھا، برسٹ دروازے پر لگا اور وہ تختہ تختہ ہوگیا۔

دوسرے نے اپنی بے رحم گن کا رخ میری جانب موڑ دیا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا اور پل کے پل مجھے گیہوں کے ساتھ گھُن پس جانے کا محاورہ یاد آ گیا۔ سیاہ ڈھاٹے کے اُفق سے اس کی جھانکتی ہوئی آنکھوں میں مجھے خوں ریزی کی جھلک صاف دکھائی دی تھی۔ اس کا ساتھی تو بخشل کے تعاقب میں دوڑ لگا چکا تھا۔

''مم...... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں...... تم دیکھ سکتے ہو کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بندھی ہوئی ہیں۔''

کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے میں نے چلّا کر اس سے کہا، زبان میری ظاہر ہے غیر مقامی تھی لیکن بہرحال...... ٹوٹی پھوٹی اردو تو یہ لوگ بھی جانتے ہی ہوں گے۔

اس طرح کی غلط فہمی میں مارے جانے کی دہشت سے چند لمحے کے لیے اچھے اچھوں کا پتّا آب ہوجایا کرتا ہے، کیونکہ میری تیز نظروں نے رائفل پر اس کی اُنگلی کو جنبش کرتے دیکھ لیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت اس کے دو مسلح ساتھی اور بھی اندر داخل ہوئے۔ وہ شاہنواز کے حواریوں کی لاشوں کو پھلانگ کر اندر در آئے تھے۔ ان کے جسم خاصے گٹھیلے اور جاندار نظر آتے تھے جبکہ آخر الذکر دو میں سے ایک اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ قد آور اور بھاری جسامت کا حامل تھا اس نے بھی اگرچہ اجرک کا ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کے اُفق سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں مجھے وحشت سی ہلکورے لیتی محسوس ہوئی تھی۔ تاہم مجھ پر اور ارم سمیت اس کے دونوں معصوم بچوں پر نگاہ پڑتے ہی اس نے اپنے ساتھی کی گن پر ہاتھ رکھ کر اسے جھکا دیا۔

''کون ہو تم دونوں......؟ اور یہ تمہارے ہاتھوں میں بندھی ہوئی ہتھکڑیاں تو پولیس والوں کی نظر آتی ہیں۔'' اس نے گونجیلی سی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ اس کا لہجہ بھاری اور کھردرا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

''اس وڈیرے نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے، پہلے یہاں کے تھانے دار کو اپنے ساتھ ملایا اور ہمیں ایک جھوٹے جرم میں بے گناہ پھنسانے کے بعد تشدد کرنے کی غرض سے یہاں لے آئے......''

''ہم......'' اس نے اپنے حلق سے ایک گونجیلی سی

ہمکاری خارج کی اور اپنے ساتھیوں سے تحکمانہ بولا۔

''ان پر ابھی نظر رکھو...... میں آتا ہوں......''

وہ شاید ان کا کوئی سرغنہ تھا اور مجھے یہ لوگ اپنی مخصوص وضع قطع سے کوئی خطرناک ڈاکوؤں کا ٹولا نظر آتا تھا جبکہ مجھ سے مخاطب ہونے والا قدآور شخص ان کا سرغنہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی روسی ساختہ گن دبی ہوئی تھی۔ یقیناً باہر بھی ان کے ساتھی گھات لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔

بہرحال...... وہ تیزی کے ساتھ اسی دروازے کی طرف بڑھا تھا جو حویلی کے اندرونی گوشے میں کھلتا تھا اور جہاں بخشل کے تعاقب میں ان کا ایک ساتھی روانہ ہوا تھا۔ دروازہ ٹوٹ چکا تھا، وہ غائب ہوگیا۔ ذرا ہی دیر بعد حویلی کے اندر سے رونے اور چلانے کی گھٹی گھٹی سی آوازیں اُبھریں اور اس کے بعد خاموشی چھاگئی۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہیں سرغنہ اور پہلے سے اندر گھسے بیٹھے اس کے ساتھی نے خوں ریزی تونہیں پھیلانی شروع کردی تھی۔ ظالم تو یہ بھی دکھائی دیتے تھے، یہ الگ بات تھی کہ چور کو مور پڑے ہوئے تھے۔ کم سفاک لوگ وڈیرا اور اس کے حواری بھی تو نہیں تھے۔ شاید آج سیر کو سوا سیر ٹکرا گیا تھا۔ مگر میرے لیے امر واقعہ یہ تھا کہ میں ان سے اپنی اور ارم سمیت اس کے دونوں بچوں کی جان کس طرح چھڑا سکتا تھا؟ کچھ اُمید تو ہو چلی تھی کہ شاید زمیندار شاہنواز خان کے ساتھ کسی پرانی دشمنی کی خار میں وہ ہمیں آزاد کردے۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کا ایک اور ڈھاٹا پوش ساتھی اندر داخل ہوا اور وہاں موجود اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے بولا۔

''سردار سائیں کدھر ہے؟'' ساتھ ہی اس نے ہم پر بھی ایک نظر ڈالی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''اُوپر گیا ہے، ابھی آتا ہے۔ باہر تو خیریت ہے ناں......'' وہ مقامی زبان میں باتیں کر رہے تھے، کچھ سمجھ آرہی تھی، کچھ نہیں۔

''ہم نے پتا چلا لیا ہے، وہ مردود وڈیرا کہیں گیا ہوا ہے مگر ان کا ایک اہم ہتھیار بند ساتھی حویلی کی پچھلی دیوار سے بھاگ جانے میں کامیاب ہوچکا ہے۔''

ابھی اس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ اسی ٹوٹے ہوئے دروازے سے سرغنہ اور اس کا ساتھی نمودار ہوئے مگر یہ دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا کہ سرغنہ کے ساتھ ایک جواں سال اور نازک اندام لڑکی بھی تھی۔ اس نے مخصوص علاقائی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک خوبصورت سی نقشین کڑھائی والی چادر اس نے کچھ اس طرح اوڑھ رکھی تھی جس کا تیر نما نقاب سا آگے کا ڑھ رکھا تھا، وہاں سے اس کی دلکش اور گہری پلکوں تلے کجراری سی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

پھر اس نے شاید سرغنہ کے اشارے پر تیر نما نقاب کو ذرا آگے کرکے گھونگھٹ بنالیا۔ جس کے باعث وہ کمرے میں موجود لوگوں کو دیکھنے سے قاصر تھی۔ وہ سرغنہ کے ایک ساتھی کے ساتھ فوراً ہی باہر نکل گئی۔

اچانک مجھے یاد آیا تھا کہ جس وقت مجھے یہاں لایا گیا تھا تو اس بلندوبالا حویلی کی بالائی منزل کے دریچے سے پردہ ہٹا کر کسی نے نیچے جھانکنے کی کوشش چاہی تھی، تو کیا یہ وہی لڑکی تھی؟...... بہرکیف...... مجھے اس پراسرار معاملے سے کیا لینا دینا تھا۔

''مقصد پورا ہوچکا ہے ہمارا...... اب اس وڈیرے کے پاس جیتے جی مرجانے کے سوا کچھ نہیں بچا ہے۔ اب نکل چلو یہاں سے......'' اسی وقت سرغنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا تو میں نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''پلیز...... آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ ہمیں بھی اس قید سے آزاد کرتے جائیں۔''

سرغنہ نے خاصی معنی خیز مگر گھورتی نظروں سے میری جانب دیکھا اور گویا خودکلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہمم...... کہیں باہر کے علاقے کے دکھتے ہو تم...... موٹی آسامی بھی معلوم ہوتے ہو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس آدمی کو بھی اسی طرح ساتھ لے چلو......'' یہ کہہ کر وہ لڑکی کو جو بلاشبہ شاہنواز کی بیٹی ہی معلوم ہوتی تھی، لیے پلٹا تو ایک ساتھی نے فوراً کہا۔

''اور اس چھوکری کا کیا کریں؟'' اس کا اشارہ ارم کی طرف تھا۔ اس کے دونوں بچے اپنی ماں سے چمٹے ہوئے سراسیمہ نظروں سے ان کی طرف تکے جارہے تھے۔

سرغنہ رکا اور پلٹا۔ ایک گھورتی نظر ارم پر ڈالی اور بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں......'' کہتے ہی وہ باہر نکل

گیا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کہہ نہ پایا۔ اس کے دو مسلح ساتھی میری جانب بڑھے۔ میں سخت تشویش کا شکار ہوگیا۔ جب وہ مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے تو ارم اُٹھ کر ان سے داد فریاد کرنے لگی کہ مجھے ساتھ نہ لے جائیں مگر تب تک وہ مجھے لیے باہر نکل آئے تھے۔ باہر رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔

وہ جواں سال خوبصورت لڑکی ویسے ہی سرغنہ کے ہمراہ تھی۔ وہ بار بار میری جانب عجیب سی نگاہوں سے تکتی جاتی تھی، ادراک تو اب تک مجھے ہو چلا تھا کہ یہ دوشیزہ زمیندار شاہنواز خان کی بیٹی ہی ہو سکتی ہے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے یہاں شب خون مارا تھا۔ حیرت بھی تھی کہ اس سارے ''گھن چکر'' میں لڑکی کی اپنی مرضی بھی شامل محسوس ہو رہی تھی۔

بہرحال وہ اپنا کوئی دیرینہ ''کام'' نمٹا کر رخصت ہونے لگے تھے۔ یہ سب پہلے سے سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا ہی شاخسانہ لگتا تھا۔

میں اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ مجھے آخر کس مقصد کے لیے ساتھ لے جایا جا رہا تھا؟ جبکہ بقول اسی کے ہی کہ وہ اپنا مقصد پورا کر چکے تھے۔ لیکن اس سرغنہ کے بڑبڑاتے ہوئے مجھے ''موٹی آسامی'' کہنے پر میرا دل کسی اندیشناک خیال تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔ باہر ان کے اور بھی ہتھیار بند ساتھی موجود تھے۔ یہ سب سیاہ اور سفید رنگ کے گھوڑوں پہ سوار تھے۔ ایک مشکی گھوڑے کی رسی کسی نے تھام رکھی تھی۔ سرغنہ لڑکی کو لیے اسی گھوڑے کی طرف بڑھا تھا اور اس نے سہارا دے کر پہلے لڑکی کو سوار کرایا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا جبکہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے بھی ایک دوسرے خالی گھوڑے پر سوار کرا دیا گیا بلکہ گھوڑے پر ''ڈال'' دیا گیا کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ پیٹ کے بل مجھے اس طرح گھوڑے پر لادا گیا تھا کہ میرا سر ایک طرف اور ٹانگیں دوسری جانب جھولنے لگیں۔ اس کے بعد ڈاکوؤں کے اس ٹولے نے ہوائی فائرنگ کی اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے تاریکی کی راہ لی۔

گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور میں خود کو ایک چوہے دان سے نکل کر دوسرے میں پھنستا محسوس کرنے لگا۔ گویا آسمان سے گرا کھجور میں جا اٹکا تھا۔

میرے گھڑسوار نے مجھے بھی ایک ہاتھ سے تھامے رکھا تھا کہ کہیں میں اس ''دگڑمستی'' میں گر نہ پڑوں، کیونکہ میں ہنوز رسن بستہ حالت میں تھا۔ جھٹکے بڑے طوفانی تھے۔ اس طرح کی ''گھڑسواری'' میرے لیے پہلا تجربہ تھی، جس کے باعث دل و دماغ عجیب سی گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ نیز یوں پیٹ کے بل پر پڑے رہنا میری آتی جاتی سانسوں کی ڈور کو بھی اُلجھائے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی میرا اپنا دم بھی یوں بری طرح پھولنے لگا جیسے گھوڑے کے ساتھ میں خود بھی دوڑ رہا ہوں۔

بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا میں...... میری ساری منصوبہ بندی اور آئندہ کے پروگرام اپنے بظاہر مربوط لائحہ عمل سمیت سبوتاژ کر دیے گئے تھے۔ ساتھی بکھر گئے تھے۔ ارم اپنے دونوں بچوں سمیت حویلی میں پڑی رہ گئی تھی۔ شکیلہ پہلے ہی اس درندہ صفت وڈیرے شاہنواز خان کے قبضے میں تھی اور جانے اس بے چاری کا اس پرانے قبرستان میں کیا حشر ہوا ہو، کمیل دادا اور راول خیر، اس خبیث اور راتب خور انسپکٹر رجب دین کے چنگل میں داخلِ زندان کر دیے گئے تھے۔ اور خیر سے...... میں ڈاکوؤں کے اس ٹولے کا شکار ہو کر ایک اور ہی پُراسرار چکر کا زندانی بننے لگا تھا۔ ایک اور اہم اور انتہائی تشویش ناک پہلو کو شاید میں نظرانداز کر رہا تھا اور وہ تھا طلسم نور ہیرا...... وہ بھی ہاتھ سے اب جاتا ہوا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

گویا سب کچھ بکھر چلا تھا اور تشویش طلب امر تو یہ تھا کہ ہم سب ہی خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ انڈیمان کی پُرمصائب اور خطرناک مہم سے واپسی پر میں نے سوچا تھا کہ اب کچھ دن حالات کی پیش آمدہ کشاکشی سے نجات کی صورت میں گزریں گے اور نئے حالات کے بارے میں آرام اور تفصیل سے غور و فکر کرنے کا موقع ملے گا مگر یہاں تو جیسے ایک کے بعد ایک جاری رہنے والی مصیبت نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ نئے حالاتِ دگرگوں جیسے کوئی تارِ عنکبوت تھا جس سے جتنا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا اُتنا ہی پھنستا چلا جاتا تھا اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے یہ بھی میرے لیے انڈیمان جیسی پُرخطر اور دشوار گزار مہم ثابت ہونے والی تھی۔ ایک خیال پچھتاوے کی صورت میں یہ بھی آتا تھا کہ کہیں اس سلسلے میں میرے اپنے ہی کسی غلط اقدام کا دخل تو نہیں تھا؟

غور کرنے پر اپنے کئی اقدام پر میں دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا۔

گھوڑوں کا یہ سفر مجھے کسی ویسٹرن اسٹائل کی انگلش موووی سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں جیسے خود کو کاؤبوائز یا

ریڈ انڈینز کے جنگل میں پھنسا ہوا ہی محسوس کر رہا تھا۔ نصف گھنٹے کے اس بیہودہ اور نامعقول سفر نے میرے رسن بستہ وجود کو شکستہ و ریختہ کر کے رکھ دیا تھا۔

گھوڑوں کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی تھی اور اب وہ جیسے ڈلکی سی چال چلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے بھی کچھ سکون کی سانس لی تھی کہ ان طوفانی جھٹکوں سے نجات ملی تھی۔ تاہم میرے جسم کی چولیں تک ہل چکی تھیں اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ مجھ میں اب دوبارہ زمین پہ کھڑے ہونے کی سکت باقی رہی ہوگی۔

میرے کانوں سے اب جھینگروں اور کہیں دور آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں ٹکرانے لگی تھیں۔ ساتھ ہی جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے مجھے اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ ہم کسی گھاٹے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ خدا جانے یہ بھی کون سا علاقہ تھا، میں اس سے یکسر نابلد تھا۔

بالآخر ایک مقام پر گھوڑا رک گیا۔ میری آنکھوں سے پہلے پٹی کھولی گئی، جو کافی دیر تک بندھی رہنے کے بعد کھلی تو کچھ دیر تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا طاری رہا، اسی دوران مجھے بیدردی سے گھوڑے کی پیٹھ پر سے کھینچ کر اُتارا گیا تو وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا، یعنی میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہی نہ ہو پایا تھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میرے نتھنوں میں بھربھری مٹی کے ذرے اور چھدری خودرو جھاڑیوں کے سخت اور خشک تنکے گھس گئے تو چھینکوں نے میرا مزید برا حال کر دیا اور فوراً ہی الرجی کی صورت میں میری ناک سے رطوبت بھی خارج ہونا شروع ہو گئی۔ میری اس قابلِ رحم ہیئت کذائی پر ڈاکوؤں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے جو مجھے اس سمے نہایت کریہہ اور نفرت انگیز لگے۔

تب ہی ایک رعب دار سی سنجیدہ آواز اُبھری۔ جیسے کسی نے انہیں تحکمانہ انداز میں ڈانٹا ہو...... کیونکہ اس کے بعد ہی فوراً سب کے قہقہوں کو ایک ساتھ بریک لگ گئے تھے۔ یہ بارعب آواز اسی سرغنہ کی تھی۔ پھر اس نے اور بھی کچھ کہا تھا۔ مجھے کسی نے سنبھالا دے کر کھڑا کر دیا تھا۔

میری آنکھیں لحہ بہ لحہ کچھ دیکھنے کے لائق ہونے لگی تھیں۔ گردوجوار میں اندھیرا تھا۔ جنگل تھا اور لمبے گھنے درخت تھے۔ علاقہ کچے کا ہی معلوم ہوتا تھا جس کی زمین پر ریت اور مٹی کی آمیزش تھی، نیز سطح بھی کہیں کہیں سے اُونچی نیچی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا اور پورے چاند کے ساتھ تارے بھی جگمگا رہے تھے۔ انہی کی ملگجی روشنی میں مجھے سرکنڈوں کے کچھ جھونپڑ نظر آئے۔ وہاں اسی طرح کے کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان کے چہروں پہ ڈھاٹے نہیں تھے۔ ان میں کئی ایک کے ہاتھوں میں کیروسین لیمپ تھمے ہوئے تھے، کچھ جھونپڑ کے اندر بھی اسی طرح کی روشنی لرزتی نظر آتی تھی۔ ایک دو جگہ چولہے سلگ رہے تھے اور وہاں کچھ عمر رسیدہ قسم کے افراد کھانا وغیرہ بنانے میں مصروف تھے۔

بلاشبہ مجھے یہ، ان لوگوں کا کوئی خفیہ ''جنگل ڈیرا'' ہی محسوس ہوا تھا۔ مجھے ساتھ لانے والوں نے اپنے چہروں سے ڈھاٹے اُتار لیے تھے۔ میری آنکھیں بھی مکمل طور پر دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔

ان کے چہرے میرے لیے اجنبی ہی تھے، جن سے وحشتیں اور خونخواری مترشح ہوتی تھی۔ لمبی اور چوڑی قلمیں تھیں، گھنی مونچھوں کے علاوہ کسی کے چہرے پر سیاہ داڑھی بھی تھی۔ سرغنہ کے چہرے کا البتہ میں نے کچھ غور سے جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ گھنی مونچھوں کے علاوہ اس کے چہرے پر چھدری سی داڑھی بھی تھی۔ چہرہ چوڑا تھا اور صحت قابلِ رشک تھی۔ اس کا جسم خاصا کسرتی اور مضبوط نظر آتا تھا۔

بلاشبہ وہ ڈاکوؤں کے اس متوقع ٹولے کی سرداری کے لائق سمجھا جانا چاہیے تھا، لیکن جس بات نے مجھے کچھ چونکنے پر مجبور کیا تھا، وہ اس کی عمر تھی جس کا اندازہ کسی بھی طرح بیس بائیس سال سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ اتنی کم عمری میں اس غلط راستے کا انتخاب اپنی جگہ مگر اس پر مستزاد وہ ان کا ''سردار سائیں'' تھا۔ جس کا مطلب تو یہی نکلتا تھا کہ وہ اسی طرح کے ''کارہائے نمایاں'' ہی انجام دینے کے بعد اس ''حیثیت'' تک... پہنچا ہوگا۔ مجھے اتنی کم عمری میں اس کی یہ روش اختیار کرنے پر اندر ہی اندر افسوس بھی ہوا تھا۔ تاہم ان سب باتوں کے باوصف...... اور اس کے ڈیل ڈول سے قطع نظر، مجھے اس کے چہرے سے وہ خونخواری اور وحشتیں عنقا ہی محسوس ہوئی تھیں جو ان جیسے لوگوں کی خاص پہچان ہوتی ہے اور جو اس کے دیگر ساتھیوں کے بشروں پہ بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لڑکی اس کے ساتھ کھڑی تھی وہ بھی مجھے خاصی دلیر اور بےخوف سی دکھائی دیتی تھی۔ چادر کے تیر نما نقاب سے اس کی جھانکتی ہوئی نگاہوں میں کسی قسم کا کوئی ملال یا خوف و پریشانی کی اِک ذرا جھلک تک بھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس کے برعکس وہ مطمئن اور خاصی خوش بھی دکھائی دیتی تھی۔

سرغنہ نے اُونچی آواز میں کچھ کہا تھا اور اسی وقت ایک پاس کی جھونپڑی کے اندر سے دو عمر رسیدہ عورتیں برآمد ہوئیں، مجھے کچھ حیرت سی ہوئی، گویا یہاں خواتین بھی تھیں۔ سرغنہ نے انہیں تحکمانہ انداز میں کچھ کہا اور پھر لڑکی سے بھی دھیمی نیچی آواز میں کچھ بولا۔ لڑکی نے بھی اس کی طرف مسکراتی سی نگاہ ڈال کر ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی اور پھر وہ ان دونوں عورتوں کے ساتھ مذکورہ جھونپڑی کی طرف بڑھ گئی۔

سرغنہ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ ہم دونوں ایک ہی قد و قامت کے حامل تھے۔ فقط عمروں میں ایک دو سال کا تفاوت آتا تھا۔ اس کے بعد اس نے شاید اپنے کسی ساتھی کو کوئی مخصوص اشارہ کیا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

دو ڈاکو میری طرف بڑھے اور بازو سے دبوچ کر ایک طرف کو لے چلے۔ چند گام چلے تھے، سامنے ملگجی سی تاریکی میں سوکھے کیکر کے ایک درخت کے پاس جہاں زمین قدرے ڈھلوان تھی، ایک چھوٹی سی مڑھی ٹائپ جھونپڑی دکھائی دی، جو خاصی شکستہ اور جگہ جگہ سے گرد کی موٹی تہوں سے اٹی پڑی نظر آتی تھی۔ اس کی چھت بھی ایک طرف سے پچکی ہوئی تھی۔ داخلی راستے پر پیوندزدہ سا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہاں عرصے سے انسانوں نے رہنا چھوڑ دیا تھا یا پھر یہ قیدیوں اور مغویوں کے لیے ہی استعمال کی جاتی تھی۔ مجھے اسے دیکھ کر ہی ہول آ گیا اور یہ اندازہ کرتے ہی مجھے اس کا مکیں بنایا جانے والا تھا، میں وہیں دروازے پر ہی رک گیا۔

”پہلے یہاں صفائی اور روشنی کا تو بندوبست کرو..... اندر سانپ یا بچھو نہ ہوں.....“

”ہاہا..... ہاہا..... یہاں کے سانپ بچھو سب اپنے یار ہیں.....“ ایک ڈاکو نے جیسے میرے اعتراض سے حظ اُٹھاتے ہوئے قہقہہ خارج کر کے کہا۔ ”ہم ان سے کہہ دیں گے کہ تمہیں نہ کاٹیں۔“ مجھے اس کی بات نہایت بیہودہ لگی تاہم میں نے بھی مصلحتاً انہی کے انداز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے یہ تمہارے یار ہوں..... مگر میرے ساتھ شاید لحاظ نہ کریں.....“

اسی وقت دوسرے ڈاکو نے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر روشن کر دی اور سنجیدگی سے بولا۔ ”ابھی اس سے کام چلاتے ہیں، بعد میں روشنی کا بھی بندوبست کر دیا جائے گا۔ چلو اب ہمارا وقت ضائع مت کرو۔“

ٹارچ کی روشنی جھونپڑی پر پڑی تو میں بدکا، اندر سے میں نے دو تین موٹے تازے جنگلی چوہوں کو بھاگتے نکلتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ایک لاغر سا کتا بھی، جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی، لنگڑاتا ہوا نکل کر ایک طرف کو لپکا تھا۔

”میں اس گندی جگہ میں داخل نہیں ہوسکتا..... پہلے یہاں کی صفائی کرو.....“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”یہاں ایک لمحہ بھی رہنے پر میں موت کو ترجیح دینا پسند کروں گا۔“

مگر اسی وقت مجھے پہلے والے ڈاکو نے زور سے دھکا دیا اور میں گرتا پڑتا اندر جا پڑا۔

اُف..... اندر گھستے ہی جیسے میرے دماغ کی نسیں تک پھٹنے کے قریب ہونے لگی تھیں۔

گندگی اور تعفن زدہ سی بدبو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا تھا جس نے آن کی آن میں مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور مجھے ایک تانیے کے لیے یوں لگا جیسے میں خود بھی گندگی کی پوٹ بن کر رہ گیا ہوں..... ٹارچ کی روشنی میں اندر آوارہ جنگلی جانوروں کے فضلے بکھرے ہوئے نظر آئے۔ کچھ نشانیاں یہاں انسانوں کے بھی حوائجِ ضروریہ کی نظر آتی تھیں۔

نفرت کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی جس نے مجھے ہوش و حواس سے یکسر بیگانہ کر دیا۔ ہتھکڑیاں میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی تھیں۔ میں اپنی آنکھوں میں وحشتِ خوں رنگ جذبوں کے شعلے دہکائے ان کی طرف پلٹا۔ ان دونوں کے چہروں پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جس نے میرے اندر کی آتشِ لہو رنگ مزید بڑھکا دی۔ ان دونوں کا فاصلہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا، میں نے دانستہ سر جھکا کے یوں حرکت کی جیسے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاشنا چاہ رہا ہوں اور اسی طرح میں ان کے خاصے قریب ہو گیا، یہی وہ وقت تھا جب ایک ڈاکو اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں میں بندھی ہتھکڑیوں کی پروا کیے بغیر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور ایک ڈاکو کو جس کی کسی حد تک میری جانب پشت ہو چکی تھی، زور سے اپنے کاندھے کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔

ان کے لیے شاید میری یہ حرکت اچانک اور غیر متوقع تھی، اسی سبب وہ اپنے ساتھ کھڑے ساتھی سے اس زور کے ساتھ ٹکرایا کہ دونوں کو خاصا زور کا جھٹکا لگا۔ دوسرا تو اپنا

توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا جبکہ پہلا والا لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے وجود میں اس وقت جیسے قہر وغضب کی بجلیاں سی دوڑنے لگی تھیں۔ میں نے اس کے رائفل والے ہاتھ پر لات رسید کر دی۔ وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر تاریکی میں کہیں جا گری، دوسری لات میری اس کے سینے پر پڑی، وہ اُچھل کر پرے جا گرا۔

میں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے میں نے راہِ فرار اختیار کرنا چاہی تھی کہ برسٹ فائر ہوا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ مجھ پر فائر کیا گیا تھا اسی لیے میں نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ لیکن اتنے قریب سے اگر مجھ پر برسٹ فائر کیا جاتا تو میں کہاں بچ سکتا تھا اور یہیں میں اپنی اس لمحاتی بے وقوفی سے مار کھا گیا۔ دشمن کا مجھے خوف زدہ کرنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور جب میں نے بندھے ہوئے ہاتھوں سے کسی حد تک سہارا لیتے ہوئے بہ مشکل اپنے گھٹنے سکیڑ کر اُٹھنے کی کوشش چاہی تو اسی وقت ایک نال میری کنپٹی سے آن لگی۔ ساتھ ہی ایک خونخوار سی غراتی آواز بھی میرے کان سے ٹکرائی۔

”بھیجا اُڑا دوں گا اگر اب کوئی حرکت کی تو......“

میں پھولی پھولی سانس میں ہانپتا ہوا وہیں پڑا رہ گیا۔ اسی وقت وہاں کئی لوگ دوڑے چلے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں کیروسین آئل والے لیمپ اور ٹارچیں بھی تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے یہ......“

میں ان کے سرغنہ کی آواز پہچان گیا تھا۔ میں نے سر گھما کر بڑی شعلہ فشاں نظروں سے سرغنہ کی طرف دیکھا تھا، اور اپنی ہی کوشش سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ لڑکی بھی آ گئی، اس کے ہمراہ دو عورتیں بھی تھیں۔ وہ میری طرف اپنی غزال چشم آنکھوں سے دیکھتی ہوئی سرغنہ کے قریب جا کھڑی ہوئی جس نے اس کے کاندھے پر اپنا ایک بازو رکھ کے اپنے اور قریب کر لیا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر اب کوئی نقاب نہیں تھا۔ لیمپس کی روشنی میں اس کا چہرہ بھی مجھے کسی الاؤ کی طرح دہکتا ہوا نظر آ رہا تھا اور آنکھیں شاعرانہ تصور لیے ہوئے تھیں۔

”سردار سائیں! اس بدبخت نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔“ ان دونوں پٹے ہوئے ساتھیوں میں سے ایک نے... میری شکایت کرتے ہوئے سرغنہ سے کہا تو میں نے سرغنہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”میں انسان ہوں اور ایک کلمہ گو مسلمان بھی...... کیا تم لوگوں کی انسانیت اس قدر مر چکی ہے کہ مجھے ایک ایسی جگہ پر قید کر کے رکھا جا رہا ہے جو اس قدر غلیظ اور گندی ہے کہ وہاں صرف جانوروں کو ہی رکھا جا سکتا ہے، انسانوں کو نہیں۔“

للکار سے مشابہ میری آواز کو سرغنہ نے بڑے غور سے سنا تھا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنے ان دونوں پٹے ہوئے ساتھیوں کو دیکھنے لگا پھر گمبھیر آواز میں بولا۔

”اس نے تم دونوں پر حملہ کیا تھا؟“

”ہاؤ سردار سائیں!“ دوسرا بولا۔ ”یہ یہاں اس جھونپڑی میں داخل ہونے سے انکار کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا یہاں جانوروں اور انسانوں کا فضلہ پھیلا ہوا ہے، میں یہاں رہنے پر مرنے کو ترجیح دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں اور پھر اس نے ہم پر اچانک حملہ کر دیا۔“

جنگل کی فضا جیسے ایک دم ہی تھم چکی تھی۔ ڈاکوؤں کا یہ ٹولا گنیں اور لیمپس تھامے جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا تھا۔ سرغنہ اور لڑکی کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ مجھ سمیت ان کے ساتھی ڈاکو یہی سمجھ رہے تھے کہ بس! اب سردار سائیں کی گن کا برسٹ چلے گا اور میں خون کی چھپڑی میں پڑا تڑپ رہا ہوں گا۔

سرغنہ نے لڑکی کو دھیرے سے پرے کیا اپنی گن کو دونوں ہاتھوں میں تھامے میرے قریب آیا اور بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے وہ اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے عجیب انداز میں مجھے گھورتا رہا اس کے بعد سپاٹ لہجے میں مگر تحکمانہ بولا۔

”اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دو۔“

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ موت مجھ سے چند ہی فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میری اس دلیرانہ وار حرکت اور اسے للکارنے کے انداز نے اس کا دماغ گھما کے رکھ دیا ہو۔ تاہم میں نے اپنے ہتھکڑی بندھے ہاتھوں کو سر سے فضا میں بلند کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے سرغنہ نے اپنی گن کی نال میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان جھولتی آہنی ہتھکڑیوں کی کڑی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور میرے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ میرے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے تھے مگر مجھ سے زیادہ وہاں کھڑے لوگوں کے مارے حیرت کے منہ کھلے رہ گئے تھے۔

”اب کیا کہتے ہو؟“ سرغنہ نے اپنی گن نیچے کرتے ہی مجھ سے کہا۔

''میں تمہارا شکریہ ہی ادا کرسکتا ہوں...... لیکن میں پھر بھی اس گندی جھونپڑی......''

میری آواز حلق میں رہ گئی۔ کیونکہ اسی وقت سرغنہ نے بہ آواز بلند سب کو وہاں سے جانے کا حکم دیا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ......'' بعد میں اس نے مجھ سے کہا اور پلٹا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے مجھ پر اتنی جلدی بھروسا کیسے کرلیا تھا؟ میں اس کے ساتھیوں کے لوٹ جانے سے اس پر پیچھے سے حملہ بھی کرسکتا تھا۔ اب تو میرے دونوں ہاتھ بھی آزاد ہو گئے تھے۔ یا پھر اسے اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا۔ میں نے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں ان دونوں کے پیچھے چلتا ہوا ایک نسبتاً کشادہ جھونپڑے میں آ گیا۔

اندر سے اس جھونپڑے کی شان دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے انڈیمان کی ''بلیک کوئن'' بار بہ کے جھونپڑے کا منظر گھوم گیا۔ ضرورت کی کیا شے وہاں موجود نہ تھی۔ زمین پر صاف ستھرا فرشی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف روم کولر رکھا ہوا تھا۔ چھوٹے سائز کا فریج تھا۔ آرام دہ گدے تھے۔ دو تکیے تھے۔ بلب کی روشنی تھی۔ بجلی کا انتظام یقیناً کسی قریب ہائی ٹینشن لائنوں سے کنڈا ڈال کر ہی لیا گیا ہوگا۔ ایک طرف بھانت بھانت کا ہتھیار رکھا ہوا تھا۔ دو بڑے موبائل فون سیٹ پڑے تھے۔

''ادھر بیٹھ جاؤ......'' اس نے ایک تکیے کے پاس بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا اور ساتھ ہی دوسرا تکیہ اس نے میری طرف اُچھال دیا۔ لڑکی اس کے قریب پاؤں سکیڑ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ہلکے سرخ رنگ کا علاقائی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ اس وقت میرے سامنے بالکل بے پردہ تھی۔ میں کن انکھیوں سے اس کے ملکوتی سراپا کا جائزہ لے سکتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ سرغنہ کی ''پسند'' لاجواب تھی۔ لڑکی بلاشبہ ملکوتی حسن کا شاہکار نظر آتی تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا اور امارت بھری زندگی نے اس کے حسن و شباب کو دوچند کر دیا تھا لیکن میرے لیے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ایک نازو نعم میں پلی بڑھی لڑکی نے ایک جنگل کے باسی شخص کا انتخاب کیوں کر کیا تھا؟ کیا محبت اتنی ہی سرپھری ہوتی ہے کہ بس! جس پر دل آ گیا تو پھر پیچھے مڑ کر کیا دیکھنا؟ کہ کون کیا ہے اور کیسا ہے؟

''میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں اور تمہاری جی داری مجھے اچھی لگی۔ مجھے تم نسلی (خاندانی) آدمی لگتے ہو...... نام کیا ہے تمہارا......؟'' سرغنہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام شہزاد احمد خان ہے، عرفیت شہزی رکھتا ہوں......'' میں نے جواب دیا۔

''واہ......'' سرغنہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''جیسے مجھے پریل چانڈیو عرف...... پرودھاڑیل کہتے ہیں......'' وہ ہنسا۔ ''جانتے ہو...... دھاڑیل کسے کہتے ہیں......؟''

''نہیں......'' کچھ اندازہ ہونے کے باوجود میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''ڈاکو کو......'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی وہ عجیب سی وحشیانہ چمک مزید گہری ہو گئی جو رہ رہ کر اس کی آنکھوں میں بجلی کی طرح چمک جاتی تھی۔

''تمہارا شکریہ دوست......!'' میں نے سلسلۂ جنبانی جاری رکھنے کی غرض سے ہولے سے کہا اور غیر ارادی طور پر میری نظر اس کے پاس بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ پہلی بار میں نے اس کی شاعرانہ سی آنکھوں کو مسکراتے ہوئے محسوس کیا، نہ صرف یہ بلکہ...... اس کے عنابی لبوں پہ غیر محسوس سی مسکراہٹ بھی تھی۔

''دوست......؟'' وہ جیسے بناوٹی انداز میں بولا۔ ''جانتے بھی ہو کہ دوست کسے کہتے ہیں؟''

میں نے جواب میں اپنا دایاں ہاتھ سینے کے بائیں حصے پر مارا تو میری کلائی میں بندھے فولادی کڑے سے منسلک ٹوٹی ہوئی ہتھکڑی کی زنجیر ہولے سے بج اٹھی تھی۔

میرے اس جگری انداز پر اس کی آنکھیں پھیل گئیں...... پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایک پُرجوش سی جذباتی آواز میں بولا۔

''تمہارے بارے میں میرا اندازہ ٹھیک جا رہا ہے...... تم عام آدمی ہرگز نہیں ہو سکتے...... اپنے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ گے کہ کون ہو تم اور یہ سب کیا چکر تھا؟''

اس نے میرے دونوں ہاتھوں میں بندھی ٹوٹی ہوئی ہتھکڑی کے جھولتے ہوئے فولادی کڑوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ کر بے اختیار مسکرا دیا اور اس کی بات کا جواب معنی خیز انداز میں اسی سوال سے دیا، تاکہ اس کا بھی ''معاملہ'' جان سکوں۔

''کچھ ایسا ہی اندازہ میں نے تمہارے بارے میں بھی لگایا ہے...... کم از کم وڈیرے شاہنواز خان کی حد تک اس کی جاگیر اور اس کے جنگل کے کالے قانون کی ناانصافی کا میری طرح تم بھی شکار رہے ہو......''

میری بات نے اسے چونکا دیا۔ وہ اپنی آنکھیں سکیڑ

کر بولا۔ ''آدمی ذہین معلوم ہوتے ہو......لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی......تم اس علاقے کے تو نہیں لگتے، پھر اس رذیل وڈیرے کے ظلم کا کیسے شکار ہوئے؟ کیا اس کی طاقت جاگیر سے باہر بھی زور پکڑنے لگی ہے؟''

''وہ صرف کمزوروں پہ زور چلانے کا عادی ہے۔ جی داروں سے اس کی ٹکر پہلی بار ہوئی ہے......'' میں نے کہا اور آگے بولا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ شاہنواز خان میرے ایک مرحوم دوست ہشام چھنگڑی کی جوان اور خوبصورت بیوہ کو ستا رہا تھا اور اس کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا......اور میں نے اس کی بیوہ کو اپنی بہن کہا تھا اور پنجاب سے اس کی جان چھڑانے کے لیے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ یہاں لاڑکانہ آیا تھا لیکن افسوس کہ دھوکے میں مار کھا گئے ہم......''

میں نے طلسم نور ہیرے کا ذکر ابھی گول کیے رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

اِدھر چونکہ پریل اور وہ لڑکی ساتھ ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ اسی لیے پریل سے باتوں کے دوران میری لامحالہ نظر اس کے چہرے پر بھی پڑ جاتی، اسی سبب جب میری اس بات پر لڑکی کے چہرے پر غیر ارادی نگاہ پڑی تو میں نے اس کی کاجل سی سیاہ آنکھوں میں اچانک ہی کچھ عجیب سے تاثرات محسوس کیے اور تب ہی اس نے اپنا چہرہ پریل عرف پرودھاڑیل......کی طرف کرتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ جسے سن کر پریل نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''تمہارے دوست ہشام چھنگڑی کی بیوہ کا نام کیا تھا؟''

''ارم......''

''ہم......'' کہتے ہوئے اس نے لڑکی سے کچھ کہا تھا اور ساتھ ہی اس نے اثبات میں بھی اپنے سر کو جنبش دی پھر مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو کے بولا۔

''اتفاق سے......ارم نامی وہ عورت......سونہڑیں کی بچپن کی سہیلی ہے......''

''سونہڑیں......کون......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے پرودھاڑیل کی طرف دیکھا تو وہ اپنے ساتھ بیٹھی اس جواں سال اور نازک بدن لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ سونہڑیں ہے......اس خبیث وڈیرے شاہنواز......کی بیٹی......''

اگرچہ مجھے اس کا اندازہ پہلے ہی ہو چکا تھا بلکہ ان کی آپس کی معاملہ داری کا بھی، اسی لیے میں نے اس بارے میں اسے زیادہ کریدنا مناسب خیال نہ کیا البتہ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ سونہڑیں نے اس وقت ارم کو کیوں نہیں پہچانا تھا جب وہ اپنے باپ کی حویلی سے نکل رہی تھی۔ بہرحال اب مجھے یہاں سے اپنی نجات کی اُمید اور بھی سوا ہو چلی تھی۔ تاہم میں نے برسبیلِ تذکرہ کہا۔

''یہ خوشی کی بات ہے مگر حیرت ہے کہ سونہڑیں بھی اپنی سہیلی کی مصیبت کم نہ کر سکی؟ حالانکہ یہ شاہنواز خان کی ہی بیٹی ہے۔''

میں نے ایک نازک بات کر دی...جس پر پرودھاڑیل بھڑک سکتا تھا۔

''ایک جابر باپ کے گھر میں اس کی بیٹی خود مظلوم ہو تو وہ بھلا کسی اور کی کیا مدد کر سکتی ہے؟'' پرودھاڑیل تلخی سے بولا۔ ''ایک بیٹی اور اپنے ہی باپ کے گھر میں مظلوم......؟'' میں نے دانستہ اپنے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ اندازہ تو مجھے ان دونوں کے بارے میں بہت سی باتوں کا ہو چلا تھا تاہم پورے قصے کا جاننا ضروری تھا۔

میری بات پر وہ ہولے سے زہریلے انداز میں ہنسا اور بولا۔

''یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت......لیکن......''

وہ کہتے کہتے رکا۔ کیونکہ سونہڑیں اس کی طرف ایک بار پھر کچھ کہنے کے لیے جھکی تھی۔ وہ براہِ راست ہماری گفتگو میں حصہ نہیں لے رہی تھی......شاید اسے اردو بولنا نہیں آتی تھی یا پھر کوئی اور وجہ ہو......ورنہ اردو تو عام فہم زبان تھی۔ ٹی وی ڈرامے اور الیکٹرانک میڈیا نے اردو کو ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا تھا۔

''یہ سونہڑیں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔'' پرودھاڑیل نے اپنی بات فوراً ہی قطع کرتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے سونہڑیں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے ڈالی تو اس کی مترنم، دھیمے سروں میں ڈھلی آواز میری منتظر سماعتوں سے ٹکرائی۔

''شہزاد صاحب! جب ارم کے لیے میں کچھ نہ کر سکی تو میں نے پس پردہ اس کی مدد کرنے کی غرض سے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اگر اس علاقے سے چلی جائے اور کسی دوسرے شہر میں جا کر رہے تو میں اس کی مالی مدد کر سکتی ہوں، مگر وہ پھر بھی نہیں مانی تھی۔''

''وہ اپنے شوہر کی طرح ایک خوددار خاتون ہے......

محترمہ سونہڑیں صاحبہ......!'' میں ہولے سے مسکرا کر بولا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ بالکل صاف اور شستہ لہجے میں اردو بول رہی تھی اور پرو کے مقابلے میں خاصی پڑھی لکھی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا لہجہ بہت میٹھا اور دھیما سا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی آواز کا فسوں جگاتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... لیکن اُسے اپنے دو چھوٹے معصوم بچوں کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ جب آپ کو حویلی میں لایا جا رہا تھا تو میں نے اُوپر سے جھانک کے دیکھا تھا۔ بابا جانی (شاہنواز خان) ارم کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی ٹچی ہو رہے تھے۔ اسی لیے مجھے کھد بد تو ہوئی کہ ضرور کوئی گہرا معاملہ ہے، تب سے میں بابا جانی اور ان کے حواریوں کے ساتھ ہونے والی باتیں چھپ کر سنتی رہتی تھی۔''

''جی ہاں!'' میں نے مختصراً کہا اور ساتھ ہی میرے دل کو خدشہ لاحق ہونے لگا کہ اگر یہ سب اتنا کچھ جانتی تھی تو یقیناً اُس ہیرے سے متعلق بھی اسے بھنک ضرور پڑ چکی ہو گی۔ اب وہ یہاں اس کا بھانڈا نہ پھوڑ ڈالے جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔

''وہ میری رازداں سہیلی بھی تھی۔'' وہ آگے بتانے لگی۔ میرا دل دھڑک کے جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ اب خاموش ہو جائے......

''کسی قیمتی ہیرے کا کوئی چکر تھا۔ جسے بابا جانی پہلے بھی ہتھیا چکے تھے، مگر وہ ارم کا شوہر ہشام ان کے قبضے سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بابا جانی کو سزا بھی ہوئی تھی مگر وہ بعد میں رہا کر دیے گئے۔ اب پھر وہی منحوس چکر کی لپیٹ میں آ گئے اور یہی ہیرا ارم اور اس کے بچوں کے لیے مصیبت بنا جس کے باعث اس کا شوہر ہشام بھی مارا گیا۔''

بالآخر اس نے بھانڈا پھوڑ ڈالا......

''آپ اس ہیرے کے بارے میں کیا جانتے ہیں......؟'' آخر میں اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ کہیں اس کے باپ کی طرح اب اس کا یہ محبوب ڈاکو بھی میرے گلے نہ پڑ جائے...... تاہم میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

''اگر آپ اتنا کچھ جانتی ہیں تو یقیناً یہ بھی جانتی ہوں گی کہ وہ ہیرا اصل میں وطنِ عزیز کی ایک قومی امانت ہے اور اسی کی خاطر ہشام نے اپنی جان قربان کر دی تھی مگر اب ایک بار پھر وہ قومی امانت خطرے میں پڑتی نظر آ رہی ہے۔''

''وہ ہیرا اب ہے کس کے پاس......؟'' پرودھاڑیل نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

مجھے اس سے اسی سوال کا ڈر تھا۔ لیکن اب جبکہ سونہڑیں نے بھانڈا خود ہی پھوڑ دیا تھا تو جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''ہیرا میرے قبضے میں ہی تھا اور میں اسے سرکار کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ ہشام کی بیوی ارم ایک قومی اعزاز کی حق دار تھی۔ کیونکہ اس نے ایک قومی امانت کو بچانے کی خاطر ہی اپنی جان دی تھی۔ لیکن افسوس یہاں شاہنواز خان کو ہماری بھنک پڑ گئی اور وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے مختصراً اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دیا۔ یہ بھی بتایا کہ اب وہ ہیرا ایک بار پھر خطرے میں تھا۔ میں نے کہتے ہوئے اُسے آخری پیش آمدہ حالات کے بارے میں بتا دیا اور ساتھ ہی عاجزانہ سی درخواست بھی ان دونوں سے ہی کر ڈالی۔

''میرا یا میرے ساتھیوں کا اس ہیرے سے کوئی لالچ نہیں ہے، ماسوائے اس قومی فریضے کہ وہ امانت وطن عزیز کے سپرد کر دیا جائے۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ دونوں اس سلسلے میں میری مدد کریں......؟''

میں نے دیکھا کہ پرودھاڑیل کے چہرے پر عجیب طرح کی مسکراہٹ اُبھری تھی جبکہ سونہڑیں کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات ثبت تھے۔ تب ہی پرو نے معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ سونہڑیں کی طرف سے دیکھتے ہوئے اس سے مقامی زبان میں کچھ کہا تھا جس پر سونہڑیں نے اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہا تھا جس پر پرودھاڑیل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا اور سونہڑیں بھی ہولے سے اپنا سر جھٹک کر مسکرا دی۔ تب ہی اس نے شستہ اردو میں مجھ سے کہا۔

''شہزاد صاحب! اس قومی امانت کو بچانے کا فرض ہم سب پر ہی عائد ہوتا ہے۔ آپ......'' اس کی بات اُدھوری رہ گئی۔ ایک ڈاکو ساتھی اندر داخل ہوا اور اس نے پرودھاڑیل سے کچھ کہا۔ جس پر وہ ایک دم اپنی گن سنبھالے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم سے فقط اتنا کہہ کر فوراً ہی جھونپڑے سے نکلتا چلا گیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہے۔

جھونپڑے میں اب سونہڑیں اور میں رہ گئے تھے۔ پرودھاڑیل اپنے ڈاکو ساتھی کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ رات شاید اپنے نصف پہر کے سفر میں تھی۔ فضا میں جنگلی نباتات کی بو رچنے لگی تھی۔ جھونپڑ کا دروازہ وا تھا۔ باہر سے

ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔

میں سونہڑیں کے ساتھ خود کو یہاں بیٹھا عجیب سا محسوس کرنے لگا مگر پھر اچانک خیال آیا کہ پرودھاڑیل کی غیر موجودگی میں ذرا کھل کر مجھے سونہڑیں سے باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔ لہٰذا اسی گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سونہڑیں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اس سلسلے میں، آپ کے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں...... سونہڑیں صاحبہ! اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی...... میری مدد کرسکتی ہیں اور ضرور کریں گی...... کیونکہ یہ معاملہ اب آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہے...... مگر پرودھاڑیل......'' میں نے اسے کچھ کہنے کے لیے اُکسانے پر دانستہ آخر میں اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا اور اس کے گل رخ چہرے پر اپنی بھانپتی ہوئی نظریں جمادیں۔

یہ سب ضروری تھا۔ مجھے کسی پر تو ایسی مشکل گھڑی سے نجات پانے اور مدد کے سلسلے میں بھروسا کرنا ہی پڑتا، اب جبکہ وہ ہیرا ابھی خطرے میں تھا۔ تنہا میں کیا کرسکتا تھا۔ ان کی مدد میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتی تھی۔ کچھ موقع محل پاتے ہی میں نے سونہڑیں سے کہا۔

''میں آپ کے دلی جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ایک بات پوچھنا چاہوں گا آپ سے...... کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے میں اس قیمتی ہیرے کا ذکر کر کے کہیں آپ نے کوئی غلطی تو نہیں کردی......؟ میرا مطلب ہے......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولی۔

''میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں...... یہ راز صرف ہم تینوں تک محدود رہے گا۔ پریل پر تم مکمل بھروسا کرسکتے ہو۔ اس کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... پریل کو اس ہیرے سے کوئی لالچ نہیں ہے۔''

''پریل بھی تو ایک ڈاکو ہے...... اتنے قیمتی ہیرے کو دیکھ کر اس کی نیت نہیں بدل سکتی؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

''کہا نا...... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں...... وہ ایسا نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''ابھی اس ہیرے کے ذکر پر اس نے مجھ سے مذاق میں یہی کہا تھا کہ وہ شاہنواز خان کی حویلی سے اصلی ہیرے کو اُڑا لایا ہے...... اب اس ہیرے کے سامنے دنیا کے تمام ہیرے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ بھیدوں بھری مسکراہٹ ابھری تھی اور شرم کی لالی اس کے دہکتے گالوں کو مزید فروزاں کر گئی...... پریل کی محبت کا فخر اور دیوانہ وار محبت کرنے والوں کا ساروایتی غرور اس کے کھنکتے لہجے سے صاف عیاں ہورہا تھا...... میں اس کے اور پریل کے بیچ معاملے کو کسی خیال تحت جانچنے کی غرض سے مسکرا کر بولا۔

''یہ بہت اچھی بات ہے کہ پریل آپ سے اور آپ اس سے سچی محبت کرتی ہیں۔ لیکن کچھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ آپ اتنے بڑے خاندان کی ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں اور پریل ایک ڈاکو......''

''وہ پہلے ایک شریف انسان تھا۔'' سونہڑیں اسی جوشِ محبت تلے بولی۔ ''وہ ایک غریب ہاری کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مگر اس تلخ حقیقت سے واقف بھی تھا کہ ہمارا میل نہیں ہوسکتا، وہ مجھ سے دور ہونے لگا۔ اس کی وجہ بھی میں ہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے جیسی نازونعم میں پلی بڑھی لڑکی کو اپنی خواہش پر قربان کر کے محل سے نکال کر جھونپڑی میں لے آئے۔ لیکن میرے دل میں اس کی محبت گھر کرتی چلی گئی۔ وہ مجھ سے جتنا دور ہونے کی کوشش کرتا میں اتنا ہی اس کے قریب کھنچتی چلی گئی...... بالآخر ہمارے عشق کا یہ راز مشک کی طرح پھیل گیا اور میرے بابا جانی کو اس کی بھنک پڑگئی۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی۔ جس پر مجھے ہمیشہ ہی ندامت ہوتی رہی تھی کہ میں ایک ایسے شخص کی بیٹی تھی جو ایک جابر اور ظالم شخص تھا۔ آئے دن غریب ہاریوں پہ ظلم کرنا، ان کے حقوق غصب کرنا اور ان کے حقوق کی آواز کو جبر تلے کچلنا بابا جانی کا شیوہ بن چکا تھا۔ پریل سے میرے عشق کی بھنک پڑتے ہی اُنہوں نے اپنے حواریوں کے ذریعے اس کے گھر کو آگ لگادی۔ جس میں اس کے غریب ماں باپ اور ایک جوان بہن مرگئی، خود پریل زخمی ہو کر مرتے مرتے بچا اور گوٹھ سے راہِ فرار اختیار کرلی۔ اس کے بعد اس کی زندگی کا ڈھب بدل گیا۔ لیکن...... میں نے بھی اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ایسی حویلی میں رہنے کے بجائے میں اس کے ساتھ جھونپڑی میں رہنا پسند کرلوں گی جس حویلی کی بنیادوں میں بے گناہوں اور غریبوں کا خونِ ناحق بھرا ہوا تھا۔ سو میں نے اپنا یہ وعدہ پورا کرلیا......''

وہ اتنا بتا کر چپ ہوگئی۔ مجھے اس کی روایتی داستان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ میں تو یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا پریل پر ہیرے کے سلسلے میں مجھے کس قدر بھروسا کرنا چاہیے تھا، نیز اُسے واقعی سونہڑیں سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس ''ہیرے'' (اپنی محبت) کے سامنے دنیا

کی ساری دولت کو واقعی ہیچ سمجھتا ہو...؟ سچی بات تھی کہ مجھے اب بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوا پایا تھا بجز اس کے کہ ان کڑے حالات میں پریل پر بھروسا کرنا میری مجبوری تھی......

ٹھیک اسی وقت اس کی طرف تکتی ہوئی میری آنکھوں کو داہنی جانب کسی کی حرکت کا شائبہ گزرا...... میں نے ایک ذرا آنکھیں گھما کر جھونپڑی کی سیدھے ہاتھ والی دیوار کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے باریک رخنوں میں کسی کا دبا دبا سایہ حرکت کرتا محسوس ہوا، میں ایک دم اُٹھ کر باہر نکلا اور اسی جانب بڑھا تو ایک گٹھیلے جسم کے آدمی کو وہاں سے اُٹھ کر ایک دم نکلتے دیکھا......

ہلکی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ مجھے گھورتا ہوا ایک طرف کو بڑھ گیا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں مجھے غضب کا کینہ بھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔ صورت بھی اس کی کرخت اور ناپسندیدہ سی تھی۔ وہ پریل کے ہی گروہ کا آدمی لگتا تھا۔ میں اس سے یہ کہنے کی ہمت نہ کرسکا تھا کہ وہ یہاں چھپا ہماری باتیں کیوں سن رہا تھا؟ ممکن تھا کہ ایسا اُسے پریل نے حکم دے رکھا ہو...... جو اچانک ہی کسی وجہ سے اُٹھ کر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔

میں واپس پلٹا تو ٹھٹک کر رکا...... وہاں سونہڑیں کھڑی تھی۔ ہم اندر آگئے۔

''تم یوں اچانک اُٹھ کر کہاں چل دیے تھے؟'' وہ بولی۔ ''میں سمجھی تم شاید بھاگ رہے ہو......''

''اب ایسی بے وقوفی تو میں بھی نہیں کرسکتا......'' میں نے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اندر داخل ہوکر وہ میرے آگے چلتی ہوئی ذرا رکی، پیچھے مڑ کر اس نے میرے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی، کیروسین کے لیمپ کی مدھم مدھم تھرکتی سی روشنی میں اس کے دہکتے رخسار پر مسکراہٹ کا ایک گڑھا پڑا جو مجھے بہت بھلا محسوس ہوا۔

''اُمید تو مجھے بھی تم سے ایسی نہیں تھی...... مگر......'' اس نے خود ہی اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور آگے بڑھ کر واپس تکیے کے پاس جا کے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور میں نے بھی اپنی فرشی نشست سنبھال لی۔

''شاید باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا تھا۔'' بالآخر میں نے اسے بتایا۔

''وہ لائق ماچھی تھا......'' سونہڑیں نے بتایا۔

بعض مشاہیر

کی عادات عجیب وغریب ہوتی ہیں مثلاً ______

- مشہور فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو، گھر میں داخل ہوتے اور جونہی ذہن میں کوئی خیال آتا، لکھنا شروع کردیتے اور صفحات کو ادھر ادھر زمین پر گراتے جاتے۔
- امریکہ کے ایک صدر جیمس گارفیلڈ یونانی زبان، بائیں ہاتھ سے اور لاطینی زبان دائیں ہاتھ سے تحریر کرتے تھے۔
- مشہور برطانوی داستان نویس سرزیلبرٹ پارکر اپنے سیکریٹری کو زبانی ٹائپ کرواتے اور آنکھوں کو رومال سے بند کرلیتے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کے خیالات مجتمع رہتے ہیں۔
- بیتھوون جو ایک بہت عظیم موسیقار گزرے ہیں، موسیقی کے اشارات اخبارات کے کناروں پر لکھتے تھے اور ہر وقت ان کاغذات کو جیب میں ٹھونسے رہتے تھے۔

''لائق ماچھی......؟''

''ہاں! پریل کے گروہ میں اسے نائب کی حیثیت حاصل ہے۔'' اس نے جواب میں کہا اور آگے بولی۔ ''میں جب اُٹھ کر تمہارے پیچھے دروازے پر آئی تھی تو میں نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اچھا ہوا تم نے اس سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی...... وہ خاصا غصہ ور اور اکھڑ مزاج آدمی ہے۔''

''لیکن...... مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری باتیں سن رہا تھا اور اس نے ہیرے سے متعلق ہماری گفتگو بھی سن لی ہے۔'' میں نے کہا۔ میرے لہجے سے تشویش آمیز پریشانی ہویدا تھی۔

''فکر مت کرو اس کی...... یہ پریل کا قابلِ بھروسا آدمی ہے...... گروہ میں پہرا لگانے کی ذمے داری اسی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے پریل جلدی میں کہیں آگے چلا گیا ہے۔'' وہ بولی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مجھے کسی اور جگہ جا کر بیٹھنا چاہیے۔''

''نہیں، پریل نے تمہیں یہاں سے جانے کا نہیں کہا تھا، ابھی اِدھر ہی بیٹھے رہو۔''

میں چپ ہو رہا۔ وہ میرے سامنے قالین پر کوئی چند

فٹ ..... کے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اس میں اب وہ پہلے والا شرمیلا سمٹا پن عنقا ہونے لگا تھا۔ وہ خاصی پھیل کر بیٹھی تھی۔ اب تو اس نے اپنے سیدھے ہاتھ پر رکھے تکیے پر بھی اپنی ایک کہنی ٹکا دی تھی۔ مجھے اسے دیکھنے کا بھرپور موقع مل رہا تھا۔ جسم پہ لپٹی ہوئی چادر۔ بھی اس کے گل بدن وجود سے کافی ڈھلک گئی تھی۔ مقامی لباس میں بھی اس کے جسم کے پیچ وخم جیسے تراشیدہ لگتے تھے۔ میرے دل کو اس وقت لائق ماچھی کی طرف سے پریشانی لگ گئی تھی۔ لیکن پھر سونہڑیں کے یہ کہنے پر کہ وہ پریل کا نائب اور اس کا بھروسے کا آدمی تھا تو بھلا اس کا اندازہ سونہڑیں کو کیونکر ہوسکتا تھا؟ ممکن تھا پریل کے ساتھ اس کے خفیہ تعلق کے دوران اس نے ذکر کیا ہو اور ملایا بھی ہو، مگر باوجود اس کے میرے دل کو بے چینی سی لگ گئی تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سونہڑیں کچھ سمٹ گئی۔ میں یہی سمجھا پریل لوٹ آیا ہے مگر وہ لائق ماچھی تھا۔ اس نے ایک کڑوی سی نظر میرے چہرے پر ڈالی، میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، پھر وہ سونہڑیں سے نہایت ادب سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بھاجائی! (بھابھی) بھوک لگی ہے تو مانی ٹکر (روٹی وغیرہ) لادوں......؟''

''پریل اچانک کہاں چلا گیا ہے؟ اس نے کچھ کھایا پیا ہے؟'' سونہڑیں نے جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''بھاجائی! سردار سائیں، جنگل ڈیرے سے باہر ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سونہڑیں بولی۔ ''مجھے تو بھوک نہیں ہے..... مگر مہمان سے پوچھ لو۔'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

''مہمان......؟ کون مہمان......؟'' لائق ماچھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری چست نظروں نے فوراً اس کے چہرے اور لہجے سے جھلکتا مصنوعی پن تاڑ لیا تھا۔ وہ دانستہ انجان بن گیا تھا۔

''یہ مہمان......'' اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ اور...... مہمان......؟ کیا کہتی ہو بھاجائی......؟ یہ تو قیدی ہے قیدی...... پتا نہیں سردار سائیں نے اسے یہاں کیوں بٹھایا ہے......'' لائق ماچھی نے میری طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی اندر کو دھنسی آنکھوں اور لہجے سے کینہ اور بغض کا چھپا ہوا زہر صاف نظر آرہا تھا۔

''لائق...... تمیز سے بات کرو......'' سونہڑیں نے اچانک اسے جھڑک دیا۔ ''کیا پریل اتنا بے وقوف ہے کہ ایک قیدی کو یہاں بٹھائے گا؟ یہ اب پریل کا مہمان بن چکا ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''آپ نے شاید اب تک کچھ نہیں کھایا ہوگا...... آپ کے لیے کچھ منگوادوں......؟''

''نہیں...... نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔ شکریہ......'' میں نے کہا تو لائق ماچھی اس بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر ذرا اکھڑے لہجے میں بولا۔

''تم باہر آجاؤ، بھاجائی صاحبہ نے آرام کرنا ہوگا...... میں تمہیں دوسرے جھونپڑے میں......''

''یہ اِدھر رہے گا۔ جب تک پریل نہیں آجاتا......'' سونہڑیں نے اس کی بات کاٹی تو میں نے یک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے یہ مناسب رہے گا۔ پریل کے آنے تک میں دوسری جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں لائق ماچھی کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر میرے لیے ابھی تک ناگواری کے تاثرات مترشح ہورہے تھے۔

''آجاؤ......'' اس نے مجھ سے کہا اور میں اس کے پیچھے چل دیا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے کہ ایک پرائی چھوکری کے ساتھ رات کے اس وقت جھونپڑے میں اکیلے بیٹھے ہو......'' جھونپڑے سے باہر آتے ہی لائق ماچھی نے جیسے اپنے اندر کا زہر اُگلا...... میں نے بھی کوئی رعایت نہیں کی اور سرد لہجے میں اسے جواب دیا۔

''تھوڑی دیر پہلے پریل مجھے خود ہی یہاں لے کر آیا تھا اور دوستانہ ماحول میں میرے ساتھ باتیں کی تھیں، پھر اچانک اسے کہیں جانا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر چلا گیا، حالانکہ بعد میں، میں نے سونہڑیں سے کہا بھی تھا کہ میں کہیں اور جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔''

ماچھی نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ لیے ایک دوسرے جھونپڑے میں آگیا۔ وہاں سگریٹ اور چرس کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی وہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور ان کی مٹھیوں میں شاید چرس بھرے سگریٹ دبے ہوئے تھے۔ ان میں وہ دونوں ڈاکو بھی موجود تھے جن سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔

''اِدھر بیٹھ جاؤ.....'' لائق ماچھی نے جھونپڑے کے ایک تاریک سے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس گدلے اور پراگندہ سے ماحول میں میرا بیٹھنے کو تو کیا لحہ بھر کے لیے کھڑے ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''میرا تو یہاں دم گھٹ جائے گا..... بہتر ہوگا کہ میں باہر ہی کہیں بیٹھ جاؤں..... مجھے کوئی دری شری لا دو.....''

میری بات پر وہاں جھونپڑے میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ خود ماچھی کا چہرہ بھی.....طنز کی صورت اختیار کر گیا۔ اسی وقت تاش کھیلتے اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے لائق ماچھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چھوٹے سائیں! صاحب کو باہر مسہری بچھا دو..... جنگل کی تازہ ہوا میں تشریف فرما ہونا چاہتے ہیں۔''

''ہاہاہا..... ہاہا.....'' اس کی بات پر ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا..... لائق ماچھی بھی ان کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔

''میرا خیال ہے میں خود ہی باہر جا کر اپنے لیے کہیں جگہ بنا لیتا ہوں.....'' کہتے ہوئے میں جھونپڑے سے باہر نکلنے لگا تو لائق ماچھی نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔

''تم اب یہاں سے باہر نہیں جا سکتے ..... یہ میرا حکم ہے اور وڈے سردار سائیں کے بعد گروہ میں میرا ہی حکم چلتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی جارحانہ چمک نمودار ہوگئی۔ میرا اپنا دماغ بھی اس کی ڈھٹائی اور میرے ساتھ مسلسل ایسا سلوک روا رکھنے پر گھومنے لگا، لیکن میں اس کینہ پرور آدمی سے کسی قسم کا کوئی جھگڑا کر کے اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''تم مجھے کسی قید خانے سے نکال کر یا قیدی کی حیثیت سے یہاں نہیں لائے ہو..... جو مجھ پر اس طرح کا حکم چلا رہے ہو..... راستہ چھوڑو میرا..... میں باہر ہی کہیں بیٹھ جاتا ہوں.....'' یہ کہہ کر میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس کے کاندھے سے اپنا شانہ ٹکراتا ہوا..... جھونپڑے سے باہر آ کر کھڑا ہوگیا۔ قریب ہی جٹادار درخت کی جڑ اس طرح بنی ہوئی تھی کہ میں اس پر ٹک کر بیٹھ سکتا تھا۔

پیاس اور نیند سے میرا برا حال ہونے لگا تھا۔ پریل اگر کہیں نہیں جاتا تو شاید وہاں کھانے پینے کا دور چلتا..... تاہم مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ پریل کی غیر موجودگی میں اس کی محبوبہ کے ساتھ جھونپڑے میں یہ رات گزارتا..... عجیب سی صورتِ حال تھی اور تھکن کے مارے برا حال ہو رہا تھا میرا..... ابھی مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ موٹے موٹے جنگلی مچھروں نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اب میں کبھی اپنے گال پہ چانٹا رسید کرتا تو کبھی گردن پر..... لگتا ایسا ہی تھا جیسے باقی کی نصف رات اسی ''مارا ماری'' میں گزرے گی۔ ایک گھنٹا مجھے ہو چلا تھا..... میں سخت بیزار ہو رہا تھا۔ پریل بھی ... پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ اگر ہوتا تو کہیں آرام کی سبیل بنتی.....

ایک بار تو جی میں یہ آئی بھی کہ بھاگ نکلوں۔ ہاتھ تو میرے یوں آزاد ہو چکے تھے مگر پھر یہ سوچ کر اب بات کچھ اور نہج پر آ گئی تھی۔ پریل سے میرے دوستانہ روابط کی اُمید ہو چلی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس کی محبوبہ بھی اپنی دکھیاری سہیلی ارم کی وجہ سے میری ہم خیال ہونے لگی تھی..... جس طرح لوہے کو لوہا اور زہر کو زہر کاٹتا ہے اسی طرح پریل کا یہ ڈاکو ٹولا شاہنواز خان کے مقابلے میں میری فل سپورٹ کر سکتا تھا۔ اگر میں فرار ہو جاتا تو کہاں جاتا؟ کیا کرتا بھلا.....؟ اُلٹا انہیں بھی اپنا دشمن بنا لیتا.....

اسی وقت میں نے جھونپڑے سے اندر تاش کھیلتے ڈاکوؤں کو ہنستے قہقہے لگاتے باہر نکلتے دیکھا، مجھ پر انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور آگے بڑھ گئے تھے۔

میں نے ان کی تعداد پر غور کیا..... وہ دو افراد (جن سے میری ہاتھا پائی ہوئی تھی) اور لائق ماچھی ہنوز اندر تھے۔ شاید یہ ان کا جھونپڑا تھا یا وہ ادھر ہی آرام کرتے تھے۔ اچانک میں نے لائق ماچھی کو جھونپڑے سے باہر نکلتے دیکھا تو میں نے کچھ سوچ کر فوراً جڑ سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ لیکن ایک باریک جھری سے اس طرف دیکھنے بھی لگا۔

وہ جھونپڑے سے باہر نکل کر وہیں رک گیا تھا اور میری طرف گھورتا جاتا تھا۔ چند سیکنڈوں بعد وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ میں نے جھونپڑے کی روشنی مدھم ہوتے دیکھی..... اس کی سرکنڈوں کی مشرقی دیوار پر چھپر نما کھڑکی کی چوکھٹ نظر آتی تھی جو خاصے عقبی کونے میں تھی اور جہاں سے ان تینوں کے سائے لرزتے نظر آنے لگے تو مجھے کچھ کھٹکا ہوا..... میں تو یہی سمجھا تھا کہ یہ تینوں بھی اب آرام کرنے کی غرض سے روشنی گل کر کے سو جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ تب ہی میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔

''کیا یہ تینوں رات کے اس سمے سر جوڑے بیٹھے تھے.....؟ کیوں.....؟''

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جنگل ڈیرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ جھینگروں اور مچھروں کی سمع خراش بھنبھناہٹ کے شور سے دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ میں دھیرے سے سیدھا ہوا اور اسی طرف کو رینگ گیا جہاں مجھے ان تینوں کے سائے چھپر سی کھڑکی کی چوکھٹ سے کیروسین کی ہلکی روشنی میں لرزتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنا بھی دھیان کر رکھا تھا کہ کہیں اندر بیٹھے یہ تینوں میرا سایہ نہ دیکھ لیں...... تاہم جھونپڑی کے اس طرف چھوٹی بڑی خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی، میں اسی طرف کو سینے کے بل پر رینگ گیا اور قدرے قریب میں جا دبکا۔ کھڑکی ظاہر ہے ہوا خوری کے لیے کھلی رکھی گئی تھی اور میں اس دیوار کے سہارے تھوڑا اُونچا ہوا اور کھڑکی کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

وہ تینوں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے، میں ان کی بولی تو سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن...... ان کے اندازِ گفتگو اور حرکات و سکنات سے کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بہت رازداری کے متقاضی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ جب میں ان کی زبان کا ایک لفظ بھی اُچکنے یا سمجھنے سے قاصر رہا تو اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ایک خیال آیا کہ سونہڑیں کے پاس جا کر اسے ان کی باتیں سناؤں...... وہ ہی سمجھ سکے گی یہ تینوں آپس میں کیا گفتگو کر رہے تھے۔ ناکام ہونے کے بعد میں پلٹ کر واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک ایک خیال کے تحت میں دوبارہ اپنی جگہ سے ہلا اور اسی جھونپڑے کے اندر داخل ہو گیا۔

وہ تینوں مجھے دیکھ کر چونکے...... تینوں ہی چونکہ مجھ سے خار کھائے ہوئے تھے اسی لیے میری آمد پر انہوں نے بڑی ناگواری سے گھور کر دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ماحول کا گدلا پن اب ویسا نہیں رہا تھا۔ نفری کم ہوتے ہی جھونپڑ کی فضا کچھ کھلی کھلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''اڑے او...... اندر کیوں آ گیا ہے......؟ وہیں باہر بیٹھ...... جا چلا جا...... باہر...... ہم ضروری باتیں کر رہے ہیں۔'' لائق ماچھی نے میری طرف گھور کر زہر خند لہجے میں کہا۔

''باہر مچھر ہیں بہت...... سو نہیں پا رہا۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''تم لوگ بے شک آپس میں باتیں کرو...... مجھے کون سا تمہاری زبان سمجھ میں آ رہی ہے......؟''

اسی وقت باہر کچھ کھڑبڑاہٹ ہوئی...... وہ تینوں اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے یک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میرا دل انجانے خدشات تلے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسی وقت انہی جیسے دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں روسی ساختہ کلاشنکوفیں دبی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا اُن کے چہرے جوش سے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ انہی کے ساتھی تھے۔ لیکن ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔ وہ وہی تھا جس کے ساتھ پریل اچانک کہیں نکل گیا تھا۔ اُس وقت میں، پریل اور سونہڑیں آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے، یہی وہ شخص تھا جو ایک دم اندر آیا تھا اور پریل کے کان میں جھک کر کچھ کہا تھا جس کے بعد پریل ایک دم ہی اُٹھ کر اس کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔

بہرکیف...... مجھ پر ان کی نظر پڑی تو اُن کے چہرے جیسے تاریک پڑ گئے اور وہ دونوں جیسے سوالیہ نظروں سے لائق ماچھی کی طرف دیکھنے لگے اور ساتھ ہی ان میں سے ایک نے لائق ماچھی سے کچھ کہا بھی تھا۔ جس کا مختصر جواب لائق ماچھی نے میری جانب ایک نگاہ ڈالنے کے بعد انہیں دیا تھا۔ صاف لگا تھا مجھے کہ انہوں نے میرے متعلق ہی چند گھڑی...... آپس میں کوئی گفتگو کی تھی، اس میں ''سردار سائیں'' کے الفاظ ان پانچوں نے ہی دو تین بار دہرائے تھے۔ اس کے بعد ماچھی نے ان سے کچھ پوچھا تھا جس کا جواب ان دونوں نو وارد افراد نے جوش اور فتح سے مسکراتے ہوئے دیا تھا۔

اب وہ پانچوں ہی خاصے پُرجوش اور خوش نظر آرہے تھے۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں ان کے چہروں پر مرکوز تھیں اور تب ہی پل کے پل مجھے کسی پُراسرار گڑبڑ کا احساس ہوا، یوں، جیسے اندر ہی اندر کوئی خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہو...... کوئی خفیہ کھیل جس میں کشت و خون اور لہو رنگ جذبات کی بُو آتی ہو...... لیکن اب فتح مندی اور خوشی جیسے جذبات کے علاوہ ان کی آنکھوں اور چہرے سے ایک اور رنگ بھی شعلہ فسوں ہو رہا تھا جس میں سفاکیت اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ ایکا ایکی میری چھٹی حس پھڑکنے لگی...... اور پھر مجھے...... ''خطرہ...... خطرہ......'' کا ایک نامعلوم سا احساس دلانے لگی۔ مگر میں فوراً ہی ان کے معاملے سے بظاہر لاتعلق ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھا، جیسے مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو...... لیکن مجھے احساس تھا کہ یہ لوگ اب دھیمی دھیمی آواز میں میرے ہی بارے میں آنکھوں سے اشارہ کر کے باتیں کر رہے تھے۔ پھر جیسے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئے اور یک بیک میری طرف دیکھنے لگے......

"کھڑے ہو جاؤ......" دفعتاً ہی لائق ماچھی نے حکم دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"خیریت تو ہے...... کیا کوئی گڑ بڑ ہوئی مجھ سے......؟" میں نے کہا اور پھر اسی ڈاکو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "سردار سائیں پریل تمہارے ساتھ ہی گیا تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟"

میری بات پر لائق ماچھی کی اندر کو دھنسی ہوئی کینہ پرور آنکھوں میں سفاکی کی لہر اُبھری اور اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ رقصاں ہوگئی جبکہ جس سے میں مخاطب ہوا تھا، میری بات پر اس کے چہرے پہ کئی رنگ آکر گزرے تھے۔ اس نے کچھ خاص اسرار بھری نظروں سے لائق ماچھی کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن اس نے مجھے کوئی جواب دیے بغیر اپنے انہی دونوں ساتھیوں...... جن سے میری ہاتھا پائی ہو چکی تھی، ایک سے کچھ بولا۔ وہ جیسے مجھ پر پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھا تھا، فوراً چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور ایک مضبوط سی رسی اُٹھا لایا...... یکلخت میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں...... سنسنی کی اس تیز لہر نے جو سرتاپا میرے اندر سرایت کرتی چلی گئی تھی، پل کے پل مجھے باور کرا دیا کہ کچھ ایسا ہو چکا ہے جسے "سازش" کہا جاتا ہے۔ یہ سب...... یعنی پانچوں کے ہاتھوں میں اس وقت گنز دبی ہوئی تھیں جبکہ میں نہتا تھا...... لیکن نہیں...... میرے ہاتھ اگر ایک بار باندھ دیے جاتے تو پھر میں کسی بھی بڑی مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔ ایک اور لرزتا ہوا خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

"سونہڑیں......" اسی لڑکی کا خیال ایک متوقع خدشے تلے آیا تھا میرے ذہن میں کہ کیا اب وہ بھی کسی قسم کی سازش یا خطرے کا شکار ہونے والی تھی؟ بازی میرے ہاتھ میں آتے آتے پھسلنے لگی تھی۔ تقدیر ساتھ دیتے دیتے پلٹنے لگی تھی۔ پھر یہی وہ وقت تھا جب میرے اندر کا "پاور ایجنٹ" ایک بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہوا...... میں جھونپڑے کے دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ دونوں نووارد اندر آکر وسط میں کھڑے تھے۔ لائق ماچھی اور اس کا ایک ساتھی ان کے آمنے سامنے تھے جبکہ ایک ڈاکو اپنے ہاتھوں میں رسی اُٹھائے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے ایک خاص زاویے سے ان کے اور اپنے درمیان سماتے پایا، میرے پیروں میں جیسے پارا دوڑ گیا۔

سوال

اسپتال کی تعمیر کے لیے بنیاد کھودی جا رہی تھی۔ قصبے کی میونسپل کمیٹی کا چیئرمین بھی معائنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک حاضر جواب لڑکے نے اس سے پوچھا۔ "یہ گڑھے کس لیے کھودے جا رہے ہیں؟"

چیئرمین لڑکے کو پہچان کر مسکرایا اور بولا۔ "ان گڑھوں میں قصبے کے سارے بدمعاشوں کو ڈال دیا جائے گا۔"

لڑکے نے برجستہ کہا۔ "اگر سارے بدمعاش ڈال دیے جائیں گے تو ان پر مٹی کون ڈالے گا؟"

ساہیوال سے محمد اکرام کا استفسار

جنرل شرمن کے اعزاز میں ایک تقریب ہو رہی تھی۔ جنرل نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں جہنم اور ٹیکساس دونوں کا مالک ہوتا تو ٹیکساس کو کرائے پر دے دیتا اور جہنم میں رہنا پسند کرتا۔"

ٹیکساس کا ایک باشندہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "آپ نے بالکل درست فرمایا۔ ہر شخص اپنے وطن میں رہنا پسند کرتا ہے۔"

کراچی سے نور العین کا تعاون

جاپانی کہاوت

"تم جوانی سے جتنا دور ہوتے جاؤ گے، ورزش کے لیے تمہیں اتنا ہی زیادہ پیدل چلنا پڑے گا۔"

"تمام پیدائشی احمق یہی سمجھتے ہیں کہ وہ پیدائشی عقلمند ہیں۔"

"بیماریِ دل کا علاج یہ ہے کہ کسی اور کی بیماریِ دل کا علاج کیا جائے۔"

"وہ جو اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرتا ہے مزدور ہے۔ وہ جو دماغ سے کام کرتا ہے سائنس داں یا سیاست داں ہے...... مگر وہ جو صرف دل سے ہدایت لے کر کام کرتا ہے شاعر ہے، عاشق ہے یا احمق ہے۔"

ڈھاکا سے نہال خرم کا مطالعہ

میں نے اسی وقت ایک جست بھری اور دروازے سے باہر جا پڑا...... گرتے ہی میں نے فوراً اُٹھ کھڑے ہونے کی بے وقوفی نہیں کی تھی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جھونپڑے سے مجھ پر برسٹ چلایا جائے گا، مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، نچلا میں پھر بھی نہیں بیٹھا تھا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل زمین پر ''کرولنگ'' کرتا ہوا بائیں جانب کی گھنی جھاڑیوں کی طرف نکلتا چلا گیا۔ تاہم اس دوران میں نے ان پانچوں کو جھونپڑے کے اندر سے نکلتے ضرور دیکھا تھا۔ لائق ماچھی تو اپنی گن سنبھالے وہیں کھڑا رہا تھا مگر اس کے باقی ساتھی میری تلاش میں پھیل گئے تھے۔ مجھے ابھی تک اس بات پر حیرت تھی کہ انہوں نے مجھ پر فائرنگ کیوں نہیں کی تھی؟

میں ایک دو جھونپڑیوں کے عقب سے اسی طرح آگے بڑھتا ہوا ایک جگہ دبک کر ٹھہر گیا، ایسا میں نے کچھ سوچ کر کیا تھا کیونکہ میرے تعاقب میں ایک ڈاکو آ رہا تھا۔ بیشتر جھونپڑوں پہ سناٹا طاری تھا۔ ساری رات غل غپاڑا کرنے کے بعد وہ سب شاید بے سدھ سو رہے تھے۔ یہاں معاملے کی گمبھیرتا کی بُو میں نے سونگھ لی تھی۔

وہ ڈاکو ٹارچ کی روشنی ڈالتا ہوا میرے قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی اسی رازداری کے ساتھ اس گہری سازش سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا...... وہ ڈاکو ٹارچ کا چمکارا جھاڑیوں میں مارتا ہوا جیسے ہی میرے قریب آیا، میں چیتے کی طرح اُچھل کر اس پر پل پڑا اور سب سے پہلے اس کی گن پر ہاتھ مارا، وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا ہوتا بھی تو پھر بھی مار کھا جاتا، میرا حملہ ہی ایسا خطرناک اور چابک دست تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری تو ٹارچ بھی دوسرے ہاتھ میں نہ رہی، تب تک میں نے اپنا دایاں بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کر کے ایک مہیب جھٹکے کے ساتھ اس کا منکا توڑ ڈالا۔ اس کا وجود زندگی کی روح سے خالی ہوتے ہی ڈھیلا پڑ گیا، میں نے اس کی لاش گھسیٹ کر ایک طرف کھڈ میں ڈال دی اور گن اُٹھالی۔ ٹارچ بھی اٹھا کر میں نے بجھا دی تھی اور اسے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑس لی تھی۔ گن سنبھالے میں اسی لائق ماچھی والے جھونپڑے کی طرف پلٹا۔ میں شکاری چیتے کی طرح جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا جھونپڑے کے قریب پہنچا تو وہاں لائق ماچھی ہنوز اسی طرح کھڑا دکھائی دیا۔

میں چند ثانیے اپنی جگہ دبکا اس کی حرکات وسکنات کا اندازہ کرتا رہا۔ وہ جلدی جلدی سگریٹ پی رہا تھا اور اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا تھا، تب ہی جب میں نے اس پر جھپٹنے کا ارادہ کیا تھا تو وہ جلدی سے ایک طرف کو بڑھ گیا۔ میں بھی تاریکی میں جھاڑیوں کی آڑ لیے اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کا رخ سونہڑیں کے جھونپڑے کی طرف تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دروازے پر پہنچا، میں بھی چھپتا چھپاتا آگے بڑھا، ٹھیک اسی وقت جب وہ سونہڑیں والے جھونپڑے کے اندر قدم رکھ چکا تھا، مجھے اپنے عقب میں جھاڑیوں کی تیز سرسراہٹ سنائی دی۔ میں جنگلی بلے کی طرح بدک کر پلٹا اور اسی وقت ایک شخص نے خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے جھپٹتے ہی میں بھی لپکا اور ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس نے کلاشنکوف کا کندا میری کنپٹی پر مارنے کی کوشش چاہی تھی، یہ کوشش اگر کامیاب ہو جاتی تو میں گیا تھا، میں نے اس کا ہاتھ روکا مگر پھر بھی کندے کا بھاری وار میرے شانے پر پڑا، ایک لمحہ کو وہ مجھے چٹختا ہوا لگا، نتیجے میں میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی مگر اس تکلیف کے ساتھ میرا دماغ بھی بھنا گیا تھا۔ تکلیف ایسے ہی جوش کو مہمیز کرنے کا سبب بنتی ہے، میں نے اس کے جبڑے پر مکا رسید کر دیا۔ اول تو اسے مجھ سے شاید اس قدر زور آزمائی کی توقع نہ تھی، دوسرے میرے مکے کی ضرب نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میں نچلا رہنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ تکلیف سے گھٹی گھٹی آواز میں چیخا اور تب ہی مجھے اس کے چہرے کو قریب سے بغور دیکھنے کا موقع ملا تو میں ٹھٹکا، یہ وہی تھا جو پر نیل کو اپنے ساتھ لے کر کہیں گیا تھا۔

پل کے پل کچھ سوچ کر میرے ذہن نے پلٹا کھایا اور اسے مارنے یا اُنٹا غفیل کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں نے اس پر قابو پانے کا فیصلہ کیا اور پھر میرے ہاتھ پاؤں میں بجلی دوڑ گئی، میں نے سب سے پہلے اسے کلاشنکوف جیسے خطرناک ہتھیار سے محروم کیا۔ مگر اس کوشش میں اسے میرے پیٹ پر کہنی رسید کرنے کا موقع مل گیا، دوبدو لڑائی کے ایسے موقعوں پر کہنی کی پہلو یا پیٹ میں پڑنے والی ضرب بڑی جاں کش ہوتی ہے اور چند ثانیوں کے لیے وہ بندے کو ڈھا دیتی ہے۔ اسی سبب میں سب سے پہلے اس مہیب وار کا خیال رکھتا تھا۔ اسی لیے اپنے پیٹ کو میں سخت کر دیا کرتا تھا۔ اس کی کہنی کی ضرب میرے پیٹ پر پڑی تھی اور یقیناً اسے بھی اس ''سختی'' کا احساس ہوا ہوگا، مگر میں اس پر جلد قابو پا کر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا اور

یہی میں نے کیا۔ کہنی کی مہیب تکلیف کو معمولی کرنے کا گُر آزمانے کے بعد میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔

اس کی شاید دانتوں تلے زبان آ گئی تھی یا پھر کوئی دانت ٹوٹ گیا۔ کیونکہ دو ثانیوں بعد ہی اس کے منہ سے بھل بھل خون بہہ نکلا تھا۔ ساتھ ہی وہ گھٹے گھٹے انداز میں کراہنے بھی لگا، میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس کا دایاں ہاتھ گھما کر اس طرح مروڑ ڈالا کہ اسے پشت کے بل ہو جانا پڑا اور اس پر سوار ہو گیا۔

اس کا بازو ٹوٹنے کے قریب ہو گیا اور اس نے منہ کھول کر چیخنا چاہا تو دوسرے ہاتھ سے... اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس کا چہرہ بھربھری مٹی والی زمین کے ساتھ لگا دیا۔ اس کی چیخ نہ صرف گھٹ کر رہ گئی بلکہ منہ سے خارج ہونے والی ہوا کے باعث مٹی اُڑ کر اس کی اپنی ہی آنکھوں میں پڑ گئی۔

''مجھے ایسا ویسا آدمی سمجھنے کی غلطی مت کرنا......'' میں اس کی پشت پر سوار ہو کر اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔ ''تمہارے ایک ایک ساتھی جو اس سازش میں شریک ہیں میرے ہاتھوں انجام کو پہنچ رہے ہیں، اپنی جان کی بخشش چاہتے ہو تو سچ سچ بتاؤ......تم نے سردار سائیں کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

وہ جواب دینے کے بجائے غراہٹ سے مشابہ آوازیں خارج کرنے لگا تو میں نے ایک ہاتھ سے اس کا مروڑا ہوا بازو مزید گھمایا اور ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ مٹی میں بھی دبایا۔ وہ تکلیف اور دم گھٹنے سے خرخرا کر رہ گیا۔

''بازو ٹوٹنے کے بعد تمہاری گردن کی باری آئے گی......اس سازش سے میں پردہ تو اُٹھا ہی لوں گا کیونکہ اس کا یقین ہو چکا ہے۔ مگر تُو جان سے جائے گا...... آخری بار پوچھ رہا ہوں......''

میں نے اس کے بازو پر دباؤ کم کیا اور بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اُٹھایا۔

''جواب دو......''

ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ سنائی دی اور پھر پہلے اس سے کہ میں سنبھلتا...... میرے سر پر بھاری اور کند شے کا وار ہوا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا......

☆☆☆

ہوش آیا تو پہلا احساس مجھے شور کا ہوا...... کھلتی آنکھوں کے سامنے پہلے تو تارے سے ناچتے رہے، اس کے بعد سر کے پچھلے حصے میں درد کا احساس ہوا اور بے اختیار چوٹ سہلاتے ہوئے میرے منہ سے تکلیف کی کراہ خارج ہو گئی۔ سر کے پیچھے مجھے گومڑ کا احساس ہوا۔ اس میں شدید دکھن ہو رہی تھی اور جس نے پورے وجود کو تھکا مارا۔ سستی اور نقاہت کا احساس الگ ستانے لگا تھا۔ وجہ اس کی میرا بھوکا پیاسا ہونا تھا۔ حلق میں تھوراُگے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے چاہا سر جھٹک کر آنکھوں کے گرد طاری اندھی لہروں کو ہٹا دوں، مگر یہ سوچ کر ہمت نہ کر سکا کہ اس طرح گومڑ کی دکھن اور سوا ہو جائے گی۔ ایک خوش کن احساس ہوا تھا کہ میں شاید رسن بستہ نہیں تھا، لیکن یہ میری خام خیالی ہی رہی جب میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو میرے ایک پاؤں میں سنگل ڈلی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا زمین میں گڑے آہنی کلے سے بندھا ہوا تھا۔ جبکہ ٹوٹی ہوئی ہتھکڑیوں کے کنڈے ہنوز اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔

اپنے اطراف کے جائزے سے لگتا تھا میں ابھی تک ڈاکوؤں کے چنگل میں ان کے جنگل ڈیرے میں ہی تھا اور یہ تنگ سا جھونپڑا تھا جہاں صرف زمین، جھونپڑے کی چھت اور صرف میں ہی تھا۔ کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ نکاسی کی راہ میں کوئی گن بردار بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ باہر مجھے صبح کاذب کی روشنی بھی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

مجھے پیاس اور بھوک کے مارے چکر آنے لگے، ہونٹوں پہ پپڑیاں جم گئی تھیں، سوکھے حلق سے آواز تک برآمد نہیں ہو پا رہی تھی نہ ہی کچھ سوچنے سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کا ذہن میں یارا ہو رہا تھا۔ نقاہت کی ایک اور وجہ شاید میرے سر کا زخم بھی تھا، جہاں چوٹ لگنے کے بعد کافی سارا خون بھی بہہ گیا ہو گا۔ تاہم پھر بھی میں نے حلق سے بہ بمشکل آواز نکالی۔

''پپ...... پانی...... کک......کوئی ہے......؟ پانی پلا دو مجھے......''

اتنی سی ہی آواز نکال کر میں زمین پر پڑا ہانپنے لگا۔ تب ہی میں نے دیکھا اس شخص کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی گن سنبھالتے ہوئے گردن گھما کر میری طرف دیکھا تھا پھر اندر آنے کے بجائے وہ غائب ہو گیا۔

میں یہی سمجھا تھا کہ وہ پانی لینے گیا ہو گا مگر اس کی واپسی پانی کے بجائے چند افراد کے ساتھ ہوئی۔ یہ چار کی

تعداد میں تھے اور میرے شناسا بھی۔ انہیں دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سی سانس خارج ہوگئی۔ یہ لائق ماچھی تھا اور باقی اس کے وہی ساتھی تھے۔

میرا ذہن رفتہ رفتہ اب کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہونے لگا تھا۔ میں کس طرح ان کے دوبارہ نرغے میں آگیا تھا۔

''پپ...... پانی...... خدا کے لیے مجھے ایک گلاس پانی پلا دو......'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ لائق ماچھی نے غصے سے اپنے دانت بھینچتے ہوئے میرے پہلو میں اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ میں پہلے ہی جسمانی تکلیف، کمزوری اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا، پہلو میں پڑنے والی اس جاں کش ضرب نے گویا میری رہی سہی طاقت بھی ختم کردی۔ مجھ میں تو اب درد سے چیخنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ بڑا برا پھنسا تھا میں...... گویا ایک دلدل سی تھی کہ جس قدر ہاتھ پاؤں چلاتا تھا اُتنا ہی اندر دھنستا چلا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی ڈوبتی ساعتوں میں لائق ماچھی کی غراتی ہوئی آواز گونجی۔

''صرف میرے سوالوں کا جواب دو...... تمہیں کیسے ہماری سازش کا پتا چلا......؟ تم تو ہماری زبان بھی نہیں جانتے تھے؟''

''مم...... مجھے کچھ نہیں معلوم...... مم...... تو محض ایک اندازہ قائم کر رہا تھا...... اور تمہارے سامنے ہی تو تھا'' میری یہ دلیل شاید اس کی سمجھ میں آگئی اور پھر وہ ایک پُرغرور سا قہقہہ خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ہاہا...... ہاہا...... تم خاصے ذہین ہو...... واقعی میں ایک سازش کے تاروپود بُن رہا ہوں اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوچکا ہوں......''

''مم...... مجھے تم لوگوں کے اندرونی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے...... بس...... میری جان چھوڑ دو اور...... مجھے یہاں سے جانے دو......'' میں نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا تو وہ انتہائی زہریلے لہجے میں بولا۔

''ایسے کیسے تجھے جانے دیں گے ہم...... جب تک کہ وہ ہیرا ہمارے قبضے میں نہیں آجاتا......''

''ہیرا......؟'' میں دانستہ انجان بن گیا۔ ''کیسا ہیرا......؟ کک...... کونسا ہیرا......؟''

اچانک ہی مجھے اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ اُگلتے سنائی دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا ایک پاؤں میری گردن پر رکھ دیا اور اس پر دباؤ بڑھانے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے اس کے بھاری پاؤں کے جوتے تلے دباؤ سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے، زمین پر پڑے اپنے لمبے چوڑے وجود کو کسمسانے کی کوشش چاہی مگر بے سود...... ایک ذرا ناکام سی حرکت کے بعد میں ساکت ہو گیا۔

''مجھ سے چالاکی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی......'' وہ اپنی آنکھوں میں نفرت و غیظ کا سارا زہر سموتے ہوئے بولا۔ وہ مجھ پر خاصا جھک آیا تھا۔

''میں اسی ہیرے کی بات کررہا ہوں جس کے بارے میں رات تم، پریل اور اس کی محبوبہ کے جھونپڑے میں باتیں کررہے تھے۔''

''اگر...... یہ بات ہے تو پھر تم نے یہ بھی ضرور سن لیا ہوگا کہ وہ ہیرا اب میرے بجائے کس کے پاس ہے......'' میں نے بالآخر سچ اُگل دیا۔ میرے اندر مزید زخم سہنے کی تاب نہ تھی۔

''خ خ...... خدا کے لیے اب مجھے پانی پلا دو اور یہ ٹانگ میری گردن پر سے ہٹا دو...... میں سانس نہیں لے پارہا ہوں......''

اس ذلیل شخص نے اتنا تو رحم کیا مجھ پر اور اپنا پاؤں میری گردن سے ہٹا دیا۔ مجھے کھانسی کا ٹھسکا لگ گیا اور میں دو تین بار کھانس کر رہ گیا۔ میں ہانپنے لگا۔ تب ہی لائق ماچھی کو...... اپنے کسی ساتھی سے کچھ کہتے سنا۔ ''پاڑیں'' کا لفظ ہی سمجھ پایا تھا۔ جو یقیناً ''پانی'' ہی ہوسکتا تھا۔

''میں نے تم لوگوں کی باتیں سن لی تھیں......'' وہ اس بار انسانوں کی طرح میرے پاس اکڑوں بیٹھ کر بولا۔ ''وہ ہیرا تمہاری کسی ساتھی لڑکی کے پاس تھا جس کے پیچھے وڈیرے شاہنواز نے اپنے آدمی دوڑائے تھے۔ خیر...... میں دیکھتا ہوں......''

یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ جھونپڑے میں ایکا ایکی سناٹا طاری ہوگیا۔ پتا نہیں یہاں اب ان لوگوں کے درمیان آپس میں کیا کھچڑی پکنے لگی تھی۔ مجھے اس کا کچھ زیادہ اندازہ نہیں ہو پارہا تھا۔ البتہ ہیرے...... کی مصیبت یہاں تک آپہنچی تھی، دولت چیز ہی ایسی ہوتی ہے...... ایک کے بعد ایک فتنہ کھڑا کرتی ہے...... ایسے ہی تو نہیں اس روئے زمین پر زن...... زر اور...... زمین کو سب سے بڑے فتنے کی جڑ کہا گیا ہے۔

تھوڑی دیر میں اس کا وہی ساتھی جو باہر پہرے پر بیٹھا تھا جست کے ٹیڑھے میڑھے جگ میں پانی لے

آیا...... میں اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے جگ مجھے تھما دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے جگ لیتے ہی اپنے منہ سے لگا لیا اور غٹا غٹ چڑھانے لگا، یہاں تک کے خوب سیر ہو گیا۔ صحیح کہا گیا ہے کہ بھوک سے زیادہ پانی کی طلب پریشان کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پانی پیتے ہی میری جان میں جان آ گئی اور میں کچھ سوچنے سمجھنے اور ہلنے جلنے کے قابل ہو سکا...... پانی کی کمی نے تو جیسے میرے پورے بدن کی طاقت ہی چھین لی تھی۔ لیکن نقاہت اپنی جگہ تھی۔ حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے اسے پھر آواز دی۔

''اب کیا ہے......؟ چپ ہو کے پڑے نہیں رہ سکتے تم......؟'' اس نے مجھے باہر سے ہی بیٹھے جھڑک دیا۔

''یار......! کچھ کھانے کو نہیں مل سکتا......''

''مل جائے گا...... تیار ہو رہا ہے......'' اس نے کہا۔

مجھے کچھ تسلی ہوئی، میں نے پھر اسے پکارا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارا سردار سائیں واپس لوٹ آیا ہے......؟''

''بس! اب خاموش پڑے رہو...... ورنہ کھانا نہیں دوں گا......'' اس نے درشت لہجے میں دھمکی دی...... مجھ میں بھی اب زیادہ بولنے کی سکت کہاں رہی تھی۔

پریل دھاڑیل المعروف سردار سائیں کے ساتھ ضرور کچھ ہو چکا تھا...... ورنہ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک روا نہ رکھا جاتا۔ مجھے سونہڑیں کی بھی فکر ہوئی...... وہ ارم کی سہیلی تھی۔ اس کی مدد کرنا چاہتی تھی، لیکن اس غریب کو بھلا کیا معلوم کہ وہ خود تقدیر کے چکر میں آ گئی تھی۔

وہ بے چاری تو پریل کے عشق میں اپنا سب کچھ تیاگ کر یہاں چلی آئی تھی اور اب سونہڑیں کا واحد سہارا پریل تھا لیکن اب اگر خدانخواستہ پریل کے ساتھ کچھ ایسا ویسا ہو چکا تھا تو...... میں کڑے دل سے سوچنے لگا کہ اس غریب کا کیا ہو گا...... یہ تو پھر نہ اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی...... یاممکن ہے وہ گھر لوٹا دی جائے، مگر بدطینت اور شیطان صفت لائق ماچھی سے ایسی انسانیت کی رتی بھر بھی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہیرے کے راز سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ ہر شخص کی نیت اس کے لیے خراب ہو رہی تھی۔

وقت انہی وسوسہ انگیز اور اندیشناک لمحات کے جلوؤں میں بڑھتا رہا۔ اتنے میں ایک بڑے سے چھابے میں وہی آدمی میرے لیے کھانے یا ناشتے کے نام پر کچھ لے آیا۔

میں اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ ایک مگ میں چائے تھی۔ پراٹھا تھا اور اس پر مصالحے دار آلو رکھے تھے، جبکہ مجھے دو تین پراٹھوں کی تو بھوک تھی ہی...... خیر اس پر بھی میں نے شکر کیا کہ ملا تو سہی کچھ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے...... سو وہ منٹوں میں چٹ کر گیا۔ بھوک اور پیاس سے جان چھوٹی تو میں نے مفر کی راہ پر غور کرنا شروع کر دیا۔

میری عقابی نظروں اور زیرک دماغ نے فوراً تاڑ لیا کہ میں بیک وقت چالاکی اور ہمت سے اس سنگل سے نجات حاصل کر سکتا ہوں، جو ''سنگل'' ہی تھی۔ ہاتھ میرے آزاد تھے۔ میں نے ایک نظر اس آدمی کی طرف دیکھا، وہ کھلے دروازے کی طرف پشت کیے دوسری طرف دیکھ رہا تھا اور سگریٹ بھی پیے جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ بھی تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ اپنی صرف گردن موڑ کر میری طرف دیکھ کر میری موجودگی کی تسلی کر لیا کرتا تھا۔

میں نے اسی دوران ہی پہلے سنگل کے اس کڑے کا ہاتھ پھیر کر جائزہ لیا جو میری داہنی ٹانگ کے ٹخنے والی جگہ پر بندھا ہوا تھا، وہ خاصا مضبوط نظر آتا تھا، دوسرے میں نے ذرا آگے بڑھ کر اس ''کلّے'' کا جائزہ لیا جو زمین میں گڑھا ہوا تھا، سنگل کا دوسرا سرا اسی کلے سے منسلک تھا۔ یہ مجھے گھوڑوں کو باندھنے والا ہی سنگل اور کلا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کلے کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے اُکھیڑنے کی معمولی سی کوشش کر کے دیکھا اور پھر ٹانگیں سکیڑ کر مایوس چہرے کے ساتھ بیٹھا رہا۔

کیونکہ اسی وقت کھلے دروازے کے باہر موجود ڈاکو نے حسبِ سابق اپنی گردن موڑ کر میری طرف ایک ذرا نظر سے دیکھا تھا۔ جب اس نے اپنی تسلی کرنے کے بعد میری طرف سے اپنا چہرہ گھما لیا تو میں نے اس بار کلے کو اکھیڑنے کی باقاعدہ کوشش شروع کر دی۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ تک نہیں ہل سکا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ زمین میں کافی گہرائی تک گاڑا گیا تھا۔ بے بسی کے مارے میں جھلا سا گیا۔ میں نے اس کلے سے منسلک فولادی کڑے کا بھی جائزہ لیا۔ وہ بھی مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ہتھوڑے چھینی کے بغیر اس کا ٹوٹنا ممکن نہ تھا۔

کھا پی کر کچھ جان میں جان آ چکی تھی۔ ذہن سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر اور گزری، صبح کی سحر خیزی تیز دھوپ اور بلا کی گرمی میں بدلتی جا رہی تھی۔ اس جھونپڑے میں پنکھے وغیرہ کا کوئی بندوبست

نہیں تھا۔ میں مسلسل سوچ بچار میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہ سب چکر کیا ہے...... لائق ماچھی تو پریل ڈاکو کا قریبی تھا۔ مگر اب اس کارروائی نے بے چین کر رہا تھا۔

میرے قیاسات اور تجزیے مسلسل جاری تھے۔ میں نہایت باریک بینی اور حالات کو آبزرو کر کے ہی یہ محتاط اندازے قائم کیا کرتا تھا۔ اب یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کے سردار سے میری دوستی ہوتے ہی اس سازش کے تاروپود کھینچ دیے گئے تھے۔ پریل غائب تھا یا کر دیا گیا تھا، میں ایک بار پھر ان کی قید میں تھا اور سونہڑیں بے چاری کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کس حال میں تھی......؟

اچانک مجھے باہر کہیں شور کی آواز سنائی دی، میں ٹھٹکا...... اسی کے ساتھ دو تین فائر ہوئے اور ایک برسٹ چلا...... میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا کہ نجانے اب کیا نیا ماجرا ہو چلا تھا......؟ پہرے دار کو بھی میں نے اچھل کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے ایک گردن موڑ کر ایک نظر میری طرف ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ اب خاموشی چھائی رہی۔ کئی لمحات اسی طرح نامعلوم اور اندیشوں بھرے وسوسوں تلے بیت گئے۔ نصف گھنٹے بعد میں نے اسی پہرے دار کو واپس آتے دیکھا۔ وہ کافی خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھائی۔

''لو...... نئے سردار کی خوشی میں سگریٹ پیو......'' وہ خاصا ترنگ میں تھا۔ لوگ نشے کی پینک میں تو بہکتے ہی ہیں مگر خوشی کا نشہ بھی کم نہیں ہوتا۔ اس میں بھی انسان ترنگ میں آ جاتا ہے۔ یہ فتح اور غرور کا نشہ ہوتا ہے۔ میں نے بھی اسے اسی نشے میں بہکنے دیا اور شکریہ کہہ کر اس سے سگریٹ لے کر اپنے ہونٹوں میں داب لی۔ اس نے دیا سلائی جلائی اور جھک کر میری سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہی حرکت کر ڈالی...... جس کے بارے میں پہلے ہی میں ارادہ کیے ہوئے تھا اور ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک طرح سے میرے دونوں ہی ہاتھ آزاد تھے۔ پیروں کو بھی ایک حد تک حرکت دے سکتا تھا۔ البتہ کام رسکی تھا...... میری اس خطرناک مہم جوئی کے دوران ان کا کوئی بھی ساتھی یہاں آ سکتا تھا۔ اسی سبب مجھے یہ ''کام'' فوری طور پر نمٹانا تھا۔ میرے فیصلے کی قوت تھی کہ میں سوچتا اور اس پر عمل کر ڈالتا تھا۔ زیادہ غور کرنے سے کئی سقم از خود پیدا ہونے لگ جاتے ہیں...... میرا تجربہ تھا کہ وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً فیصلہ کن قدم اٹھا لینا چاہیے

اور...... میں نے یہی کیا تھا۔ میں نے اس کی جھکی ہوئی گردن پر جھپٹا مار کر دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی...... اور دباتا چلا گیا۔

یہ سب تیزی سے کرنے کا متقاضی تھا اسی لیے میں نے اسے سنبھلنے کا ایک ذرا بھی موقع دیے بغیر جھٹکا دے کر اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا۔ وہ جھول گیا، میں نے اسے ایک طرف پھینکا اور گن قبضے میں کر لی۔ اسے سنبھال کر میں نے سنگل شاٹ پر اسے ایڈجسٹ کیا اور نال سنگل پر رکھ کر فائر کر دیا۔

جھونپڑے میں گولی چلنے کی دھماکے دار آواز ابھری، گرد و غبار کا بادل سا اڑا اور سنگل ٹوٹ گئی۔ میں جانتا تھا کہ گولی کی آواز پر کوئی ادھر متوجہ ہو سکتا تھا اسی لیے میں صرف ایک دو لمحات کے درمیان ہی جھونپڑے سے نکل کر ایک طرف کی گھنی جھاڑیوں میں بھاگا...... ان کی یہ خفیہ پناہ گاہ جو ''جنگل ڈیرے'' سے منسوب کی گئی تھی۔ خاصے گھنے جنگل میں تھی۔ یہاں موٹے چوڑے تنوں والے گھنے درختوں، سرکنڈوں اور قد آدم خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی، سورج کی کرنیں بھی چھن کر آ رہی تھیں، کہیں تو دن میں بھی اندھیروں کا گماں ہونے لگتا تھا۔

میں انہی جھاڑیوں میں دبک کر چند ثانیے کے لیے اطراف کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی ابھی تک کوئی ردِعمل یا گولی کی آواز پر کسی قسم کی ذرا بھی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔ ممکن تھا یہاں اس طرح کی اِکا دُکا گولی چلنا عام بات رہی ہو...... یا پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شور اور فائرنگ بھی ہوتی رہی تھی۔ وہ کیا معاملہ تھا مجھے ابھی اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا...... اس طرف بڑھا جہاں سونہڑیں یا پریل دھاڑیل کا جھونپڑا تھا۔ اچانک ہی میں ایک آواز پر ٹھٹک گیا۔ اپنے سیدھے ہاتھ کے ذرا عقب میں مجھے چار افراد دکھائی دیے، انہوں نے دو آدمیوں کی لاشیں اٹھا رکھی تھیں جو خون میں لت پت نظر آ رہی تھیں۔

وہ اسے شاید کہیں ٹھکانے لگانے جا رہے تھے۔ میری پیشانی پر پُرسوچ سی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ نجانے کیا کھچڑی پک رہی تھی یہاں...... میں نے انہیں گزر جانے دیا اور دوبارہ حرکت کی۔

کچھ ہی سیکنڈ کے بعد میں اپنے مطلوبہ جھونپڑے کے نزدیک جا پہنچا۔ اس کا پچھواڑا میرے سامنے تھا۔ وہاں میں نے کچھ مسلح ڈاکوؤں کو دیکھا۔ سامنے نظر آنے والے

ان ڈاکوؤں کی تعداد چار پانچ تھی۔ کتنے جھونپڑے کے سامنے کے رخ پر تھے۔ مجھے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اندھا دھندان سے جا بھڑنا، بے وقوفی ہوتی۔ یہ یہاں پر پورے گروہ کی صورت میں تھے اور میں ان کی کمین گاہ میں تھا۔

میں چند ثانیے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ ساتھ ہی میں اس بار اپنے گردوپیش سے بھی پوری محتاط تھا۔ گزشتہ شب میری اسی معمولی سی غلطی نے مجھے نقصان پہنچایا تھا اور کسی نے مجھ پر اچانک پیچھے سے وار کر دیا تھا۔ میں دم سادھے وہیں پڑا رہا۔ کلائیوں میں ٹوٹی ہوئی ہتھکڑیوں کے کڑوں سے مجھے اب سخت اُلجھن ہونے لگی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب دائیں پاؤں میں سنگل کا آہنی کڑا بھی پھنسا رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ جھولتی سنگل کا کچھ حصہ بھی منسلک تھا۔ گویا یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ ابھی ٹوٹی ہوئی ہتھکڑیوں سے جان نہیں چھوٹی تھی کہ یہ سنگل بھی گلے کو بلکہ پاؤں کو آ لگی تھی۔ شکر تھا کہ آزاد تھا۔

میں نے داہنی جانب حرکت کی اور بے آواز سرکتا ہوا اس طرف کو رینگ گیا۔ میں جھونپڑے کے سامنے کے رخ کا بھی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ایک مناسب جگہ پر مجھے رکنا پڑا۔ یہاں سے اگرچہ ہنوز سامنے کے رخ کا منظر میری نظروں سے اوجھل تھا مگر میرے یک دم رکنے کی وجہ دو جڑواں تنوں والے گھنے درخت تھے جنہوں نے اپنی چھتنار سی شاخوں سے مذکورہ جھونپڑے کے اُوپر چھاؤں کر رکھی تھی۔ اس کے غیر معمولی پھیلاؤ اور جھونپڑے کی عین چھت تک رسائی کو دیکھتے ہی میرے ذہن طباع میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال کلک ہوا تھا۔ میں نے پہرے دار ڈاکو کی کلاشنکوف کو کاندھے پر منتقل کیا اور درخت پر چڑھنے لگا، پھر اس کی گھنی شاخوں سے ہوتا ہوا ایک موٹی شاخ پر کسی سانپ کی طرح لیٹا رینگتا آگے سرکنے لگا۔

وہ موٹی شاخ میرے وزن تلے جھولنے لگی مگر اس میں غیر معمولی لچک اور مضبوطی کا میں پہلے ہی اندازہ کر چکا تھا اسی لیے رکا نہیں اور آگے سرکتا رہا۔ پھر اگلا قدم اُٹھانے سے پہلے میں ٹھہر گیا۔ جھونپڑے سے قدرے اُونچائی پر آ کر اب مجھے سامنے کا بھی منظر کسی حد تک دکھائی دینے لگا تھا۔ وہی مسلح افراد جھونپڑے کے گرد مٹرگشت کرنے کے انداز میں غالباً پہرا دے رہے تھے۔

میں وہیں چند لمحے موٹی شاخ پر کسی اژدھے کی طرح لیٹا رہا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ سورج کی کرنیں درخت کی گھنی شاخوں پر پڑ رہی تھیں۔ گرمی اور حبس کی کیفیات سے سانس بھی ٹھیک طریقے سے نہیں لی جا رہی تھی۔ میں بہت احتیاط کر رہا تھا۔ چہ جائیکہ شاخ ہولے سے بھی مزید جھک کر ہلکی سی بھی کڑکڑاہٹ پیدا کرتی تو وہ چونک سکتے تھے۔

میں نے چھت کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ قائم کرنے لگا کہ اس پر جھکے ہوئے درخت کا فاصلہ کتنا ہو سکتا تھا نیز، اگر میں چھلانگ لگاتا تو کس قدر آواز پیدا ہو سکتی تھی۔ جلد ہی مجھے اس کا ادراک ہو گیا کہ دونوں ہی کام خطرناک اور ناممکن تھے۔ جب تک کہ پہرے دار ادھر اُدھر نہیں ہو جاتے، جو ظاہر ہے نہیں ہو سکتے تھے۔ مجھ پر مایوسی غلبہ پانے لگی۔ اس قدر کوشش کے باوجود میں لبِ بام شکست خوردہ سا ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی حل رہ گیا تھا کہ میں اسی طرح ٹہنی پر لیٹے ہوئے پورا دن گزار دوں اور رات کا انتظار کروں، ممکن تھا کہ تب کوئی سبیل پیدا ہو جاتی۔ لیکن بات پھر وہی تھی۔ اول تو ابھی کچھ دیر بعد ہی پورے جنگل ڈیرے میں پوری شد و مد کے ساتھ میری تلاش شروع ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ اس میں وقت کا زیاں بھی ہوتا اور تب تک خدا جانے حالات مزید کس خطرناک اور نازک نہج پر پہنچ جاتے۔ میں نے ایک بار پھر اپنی شکرے ایسی چست آنکھوں کو سکیڑ کر اس جھکی جھکی موٹی ٹہنی اور جھونپڑ کی چھت کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگاتے ہوئے تھوڑا مزید غور کیا کہ اگر میں ٹہنی کے آخری سرے تک پہنچ جاتا ہوں تو وہاں پہنچتے ہی ٹہنی میرے وزن کے سہارے بہت حد تک نیچے جھول سکتی تھی اور یوں چھت کا از خود ہی درمیانی فاصلہ کم ہو جاتا اور میں کوئی آواز پیدا کیے بغیر ہی چھت پر کود پڑتا۔ لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ وہ شاخ آخری حد تک میرے لمبے چوڑے وجود کو سہار سکتی تھی؟ کیا خبر وہ دھیرے دھیرے جھولنے کے بجائے ایک دم ہی تڑاخ سے ٹوٹ جاتی اور وہ آواز نیچے موجود مسلح پہرے دار سن لیتے...... اور نیچے کھڑے کھڑے ہی میری طرف اپنی گنوں کا رخ کر کے گولیوں کی بوچھاڑ کر ڈالتے...... لیکن...... میں یہ خطرناک کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چنانچہ...... میں نے بہت آہستہ آہستہ، کسی شکار کی جستجو میں اسے ہڑپ کرنے کے لیے، ایک صبر آزما اژدھے کی طرح موٹی شاخ پر رینگنا شروع کر دیا...... ساتھ ہی میں یہ بھی اندازہ لگاتا جاتا تھا کہ آگے جا کر شاخ میرے وزن سے کس حد تک نیچے جھکتی جاتی تھی...... فرق پڑ رہا تھا...... مگر غیر محسوس سا...... میں نے اللہ کا نام لیتے ہوئے اپنی سی

کوشش جاری رکھی اور بالآخر وہ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا...... میں چھت پر اُترنے لگا اور شاخ بھی کافی حد تک نیچے جھول گئی تھی۔

نیچے تین مسلح پہرے دار ایک دوسرے کی سگریٹ سلگانے میں مصروف تھے۔ باقی دو جھونپڑے کے گرد چکر لگا رہے تھے، ٹھیک اسی وقت جب میں چھت پر اُترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ان آخرالذکر ڈاکوؤں میں سے ایک نے سر اُٹھا کے جھونپڑے کی چھت کی جانب دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا...... میں یہی سمجھا کہ شاید میں دیکھ لیا گیا ہوں، ڈاکو نے بہ نگاہ غائر ہی اُوپر چھت کی سمت دیکھا تھا اور میں نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی تھی، مبادا کوئی پتا ہل جاتا اور اُسے شک ہو جاتا۔ کیونکہ ہوا بالکل بند تھی، ماحول میں سناٹا طاری تھا۔ پتا کھڑکا، دل دھڑکا والی صورتِ حال تھی۔ اسی سبب میں بالکل نہیں گھبرایا تھا اور دم سادھے پڑا رہا تھا۔ وہ ڈاکو متر گشت کے انداز میں ایک طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے میں نے دیکھا کہ ان میں دو ڈاکو آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک طرف کو جا رہے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ غائب ہو گئے۔ اب شاید صرف تین ہی وہاں موجود تھے، ان میں سے بھی دو ہی نظر آ رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے حرکت کی، کچھ اور آگے کو سرکا۔ میں نے دل تھام کر اپنا ایک پاؤں جھونپڑ کی چھت پر رکھا اور پھر دوسرا۔ اس کے بعد نہایت آہستگی سے شاخ چھوڑ دی۔ میرے وزن سے خالی ہوتے ہی شاخ تھوڑا اُوپر کو اُٹھ گئی تھی جبکہ میں چھت پر آتے ہی سینے کے بل اس سے چپک کر لیٹ گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے ایک ڈاکو کی آواز سنائی دی...... اس نے چلا کر اپنے کسی ساتھی سے کچھ کہا تھا۔

کسی خدشے تلے میرا دل تیزی سے دھڑ دھڑانے لگا۔ میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ ان سے درانہ وار جا بھڑتا۔ میں وہیں ساکت رہا۔ تب ہی کسی کے قدموں کی تیز تیز چاپ سنائی دی۔ اس کے بعد دو ڈاکوؤں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔

ان کی زبان سے میں نابلد تھا۔ پتا نہیں وہ دونوں آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے؟ میں نے سر اُٹھا کر آوازوں کی سمت دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے دوبارہ سر جھکانا پڑ گیا اور فوراً ہی اپنی اس خطرناک غلطی کا احساس ہوا، وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے چھت کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت ایک کو میں نے قدرے بلند آواز میں کچھ کہتے سنا۔ نجانے اس نے کیا کہا تھا، لیکن ان دو لمحات کے درمیان مجھے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے جھونپڑے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ابھری ہو۔ میں دھک سے رہ گیا۔

''کیا کوئی اُوپر آ رہا تھا......؟'' ایک اندیشہ ناک خیال میرے ذہن میں ابھرا اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ نجانے مجھ سے کہاں غلطی ہوئی تھی کہ ان کو شاید جھونپڑے کی چھت پر کسی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اب میں یہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ جھونپڑے کی چھت پر آنے کے لیے جو ڈاکو کمربستہ ہوا تھا، وہ کس رخ سے اُبھرے گا؟ یہ بہت خطرناک صورتِ حال تھی، مگر میں نے اپنے حواسوں کو منتشر نہ ہونے دیا، اب کسی خطرے کا انتظار کرنا اسے آواز دینے کے مترادف ہوتا لہٰذا ایک محتاط اندازے کے تحت میں نے جھونپڑے کی چھت پر اس جانب رینگنا شروع کر دیا جہاں نیچے کی دیوار سے کھڑکی بنی ہوئی تھی۔

مجھے یہ کھڑکی اور اس کا رخ اسی لیے یاد رہا تھا کہ گزشتہ شب میں اور پرودھا ڈیل اسی کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں اس طرف کو بڑھا اور چھت کے سرے پر آیا تو ٹھہرنا پڑ گیا۔ وہاں ایک ڈاکو گن تھامے پہرے پر کھڑا تھا۔ میں نے دانتوں تلے ہونٹ بھینچ لیے۔ چھت پر میرے آنے کا یہی مقصد تھا کہ کچھ دیر یہاں ستا کر اس جانب اُترنے کی کوشش کروں گا۔ یا پھر شاید چھت پر کوئی ایسا سوراخ یا رخنہ دکھ جاتا جس سے جھونپڑے کے اندر داخل ہونے کی سعی کرتا۔ میں تیزی سے رینگنے کے انداز میں ہی پلٹا۔ کسی وقت بھی ایک ڈاکو چھت پر پہنچنے والا تھا اور میرے لیے مفر یا چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں دوسرے سرے کی جانب سرکا تو پل کے پل میرا دل مسرت کے بے پایاں احساس سے دھڑکا۔ اسی جانب مجھے ایک روشندان سا نظر آ گیا۔ روشندان کیا تھا، بس ایک چوکور سا کھلا سوراخ تھا۔ میں نے جلدی سے سینے کے بل آگے سرک کر نیچے جھانکا اور ایک کونے میں کسی کو رلی اُوڑھے سوتے پایا۔ اندازہ یہی تھا میرا کہ یہ سونہڑیں کے سوا بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟ میں اپنے جسم کو سمیٹ کر اندر کود گیا۔ رلی پوش سویا نہیں تھا، لیٹا تھا، دھمک کی آواز پر یک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ سونہڑیں ہی تھی، مگر اس کی ہیئت کذائی بتاتی تھی کہ وہ کن پیش آمدہ کڑے حالات سے دوچار رہی ہوگی۔ اس کی آنکھیں متورم سی ہو رہی تھیں، آنسوؤں کی خشک لکیریں چہرے کو پژمردہ بنائے ہوئے تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے خزاں رسیدہ چہرے پر مسرت آمیز حیرت کا شائبہ سا بہار

کے جھونکے کی طرح لہرایا۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا اور تیز سی نگاہ جھونپڑے کے نکاسی والے راستے پر ڈالی۔ اسی وقت مجھے چھت پر کسی کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ سرکنڈوں کی جھونپڑی ہلتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار سر اُٹھا کے چھت کی طرف دیکھا تھا اور اسی وقت باہر کسی کے چلا کے بولنے کی آواز بھی ابھری تھی جسے سونہڑیں فوراً سمجھ گئی اور مجھ سے نیچی آواز میں بولی۔

''اس طرف چھپ جاؤ...... جلدی...... کسی کو تم پر شبہ ہوا ہے۔'' ساتھ ہی اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں روم کولر رکھا تھا۔ میں اس کے پیچھے جا کر سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا مگر پوری طرح چھپ نہ سکا تو سونہڑیں نے پھرتی سے اُٹھ کر اس طرف جہاں سے میرے وجود کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا تھا، وہاں پر کچھ دوسرا چھوٹا موٹا سامان رکھ دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے کسی کے اندر در آنے کی آہٹ سنی اور سونہڑیں واٹر کولر سے پانی نکال کر پینے لگی، وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے بھی تھوڑی سی جگہ پا کر اس طرف کو دیکھنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ مسلح ڈاکو پہلے تو بڑی متلاشی نظروں سے جھونپڑے کا جائزہ لینے لگا اس کے بعد قدرے درشت سے لہجے میں سونہڑیں سے کچھ کہا تھا جس کا جواب بھی سونہڑیں نے اسی درشتی اور نفرت سے دیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے ان کے بیچ بہت گہری ٹھنی ہوئی تھی۔

اس کے بعد وہ شخص بکتا جھکتا چلا گیا۔

''تم ابھی اِدھر ہی چھپے رہو......'' اس ڈاکو کے باہر نکلتے ہی سونہڑیں نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

''سونہڑیں......! تم کیسی ہو......؟'' میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور آگے بولا۔ ''میں یہاں کسی اور ہی معاملے کی بُو محسوس کر رہا ہوں...... کیا میرا یہ خیال صحیح ہے کہ پریل کے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے؟''

میری بات نے جیسے اس کے ضبط کے بندھن کھول ڈالے...... وہ پہلے تو مجھے حیرت سے تکتی رہ گئی تھی۔ اس کے عنابی لبوں پہ اَن کہے جملے آتے آتے رہ گئے تھے۔ پھر میری بات پہ مر جیسے وہ سسک پڑی اور بولی۔

''شکر ہے اللہ سائیں کا کہ تم زندہ ہو...... ورنہ...... ورنہ تو میں سمجھی تھی کہ تمہیں بھی پریل کی طرح......'' رقت کے باعث وہ ..... اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور رو دی۔

میں دھک سے رہ گیا۔ پھر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھو سونہڑیں......! پریل نے میرے ساتھ دوستی کا دم بھرا تھا اور میں اس دوستی کو نبھاؤں گا...... لیکن...... خدا کے لیے مجھے تھوڑی سی تفصیل بتا دو...... کہ ہوا کیا ہے آخر......؟ کیونکہ میں تو اب تک کچھ ہی باتوں کا اندازہ لگا سکا ہوں...... اس سے زیادہ نہیں......''

اس نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھے اور پھر دھیرے دھیرے بتانے لگی۔

''اس مردود لائق ماچھی پر پریل کو ہی نہیں، مجھے بھی بہت بھروسا تھا بلکہ وہ واقعی ایسا تھا بھی، کیونکہ کئی مواقع پر اس نے پریل کی جان بچائی تھی۔ لیکن...... افسوس! کہ دولت کا لالچ انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ چوری کے ایک مال کی حصے داری کے سلسلے میں لائق ماچھی، پریل سے بددل ہونے لگا تھا۔ جس کا پریل کو بھی اندازہ تھا، مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔ دونوں کے درمیان یہ خلیج بڑھتی گئی اور لائق ماچھی نے اندر ہی اندر جانے کب سے پریل کے خلاف گروہ میں پھوٹ ڈالنی شروع کر دی۔ وہ گروہ کے جمع شدہ مال پر ہاتھ صاف کرنے کی سوچ رہا تھا اور دیگر افراد کو بھی اس کا لالچ دے کر رفتہ رفتہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، بالآخر اس مارِ آستین نے اسی رات جب تم، پریل اور میں اس جھونپڑے میں دوستانہ ماحول بنائے بیٹھے باتیں کرنے میں مصروف تھے تو اس قیمتی ہیرے سے متعلق لائق ماچھی نے ہماری باتیں سن لی تھیں، جس کا بعد میں تمہیں بھی شبہ ہوا تھا، تاہم اسی دوران اس خبیث لائقو نے اپنی سازش کے تحت دھوکے سے پریل کو کہیں بھیج دیا اور پریل سے یہ کہا گیا کہ دادو کا کوئی ہندو سیٹھ ہے جو اُن کے مال کی خرید کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات پریل اور لائقو (لائق ماچھی) ہی طے کیا کرتے تھے، مگر اس روز اس سازشی لائقو نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔

پریل دو ساتھیوں کے ساتھ گیا، جو درحقیقت لائقو کے ہی آدمی تھے۔ پریل کو کسی ویرانے میں ہلاک کر کے......''

یہ سب بتاتے ہوئے سونہڑیں اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی اور سسک پڑی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ پریل ہلاک کر دیا گیا ہے؟'' میں نے چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔

''اس بدبخت لائقو اور عارب خان نے بتایا ہے، جو اُسے دھوکے سے لے کر گیا تھا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ پریل جیسا آدمی اس طرح

آسانی سے دھوکا کھا کر اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت سونہڑیں سے کہا اور وہ یک دم یوں چونک کر میرے چہرے کی طرف تکنے لگی جیسے میں نے اسے پریل کے زندہ ہونے کی خوش خبری سنادی ہو......ایک دم بولی۔

''اللہ سائیں تمہاری زبان مبارک کرے...... سچی بات تو یہی ہے کہ خود مجھے بھی ابھی تک پریل کی موت کا یقین نہیں آرہا ہے۔ میرا پریل ایک ڈاکو ضرور تھا مگر وہ ایسا ہمیشہ سے نہیں تھا۔ اسے میرے ظالم باپ کے جبر نے اس حال تک پہنچایا تھا اور وہ غریب کسانوں یا متوسط لوگوں کو نہیں بلکہ امیروں، سیٹھوں اور اسی طرح کے جاگیرداروں کو لوٹا کرتا تھا اور اسی رقم سے وہ غریبوں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ وہ بہت بہادر تھا...... کیا واقعی میری طرح تمہارا دل بھی یہی کہتا ہے کہ پریل زندہ ہوگا......؟'' وہ بالکل معصوم بچی کی طرح خوش اُمیدی سے بولی تو مجھے بے اختیار اس پر ترس آگیا۔

اس کی بات سن کر مجھے اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی سلطانہ ڈاکو کی کہانی یاد آگئی۔ پتا نہیں وہ ایک فرضی یا روایتی کردار تھا یا سچا...... لیکن اس سے قطع نظر...... میں نے پنجاب کے بھی چند ایسے بدنام زمانہ ڈاکوؤں کے بارے میں سن رکھا تھا، جو امیروں کو لوٹتے تھے اور ان کے مال سے غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ عموماً یہ ایسے ڈاکو ہوتے تھے، جو انہی کی طرح حالات کے مارے اور وڈیروں چوہدریوں کے ستائے ہوئے ہوتے تھے۔

سونہڑیں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پریل کو اپنے ساتھیوں سے محبت تھی۔ وہ ان کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی کو حصہ داری پر ذرا بھی اعتراض ہوتا تو وہ اپنے حصے سے دے کر اس کا اعتراض فوراً دور کر دیا کرتا تھا مگر بدطینت لائق ماچھی تو کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ وہ خود گروہ کا سردار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

بہرکیف میں پریل کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں سونہڑیں کو کسی قسم کی خوش فہمی میں تو نہیں رکھنا چاہتا تھا، بس ایک دل کی بات تھی جس کا میں نے اظہار کر دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سونہڑیں! سنا تو یہی ہے کہ دل جس شے کی گواہی دے، وہ جھوٹی تو نہیں ہوتی لیکن...... انسان کا دل بھی ایک سمندر ہے۔ یہ اپنے اندر بہت گہرائی رکھتا ہے۔ یہ سمجھنے نہ سمجھنے والی بات ہے۔ تم نے عارب خان نامی جس آدمی کا نام لیا تھا میں نے اس پر قابو پانے کی کوشش چاہی تھی۔ مگر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو دھوکے سے پریل کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔''

''تم نے عارب خان کو کیسے پہچان لیا......؟'' سونہڑیں نے پوچھا۔ وہ شاید ناساعد حالات کی پریشانی کے سبب بھول گئی تھی تب میں نے اسے یاد دلایا کہ اسی شب عارب ہی تو تھا۔ جو جھونپڑے میں داخل ہوا تھا اور پریل کو ساتھ لے گیا تھا۔

''اب ہمیں آگے کا سوچنا ہوگا۔'' بالآخر میں نے اس سے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ...... تمہارے سلسلے میں ان خبیثوں نے کیا ارادہ کر رکھا ہے؟''

''لاتقو بے حد لالچی آدمی ہے۔'' سونہڑیں نے جواب دیا۔ ''اس نے آج میرے بابا جانی (شاہنواز خان) سے میرے سلسلے میں رابطہ کیا ہے، وہ میری واپسی کے سلسلے میں بابا جانی سے بطور تاوان کے بھاری رقم کا مطالبہ کرنا چاہتا ہے۔''

''میرا خیال ہے، اگر ایسا ہے تو تمہارے لیے ان حالات میں یہی بہتر ہوگا کہ تم اب اپنے گھر لوٹ جاؤ......'' میں نے اسے نیک مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ بات تلخ اور مشکل ضرور تھی لیکن سونہڑیں اس وقت بدقسمتی سے خطرناک اور غیر یقینی حالات کا شکار ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میری بات پر اس کے حسین اور معصوم چہرے پر یک دم خوف و ہراس کے تاثرات اُمڈ آئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

''نن...... نہیں...... نہیں...... میں اب دوبارہ حویلی نہیں جاسکتی، وہاں اب میرے لیے کچھ نہیں بچا...... میں بدنصیب تو اپنی کشتیاں جلا کر وہاں سے پریل کے ساتھ نکلی تھی۔''

میں اس کے فطری خوف کی وجہ جانتا تھا۔ پوچھا۔

''کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟''

''ہاں......!''

''بس، پھر تمہیں ضرور واپس گھر لوٹ جانا چاہیے۔''

''میرے بابا جانی مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔''

''کیوں......؟''

''میں نے اُن کی عزت داغ دار کر ڈالی ہے۔'' وہ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''تم انہیں نہیں جانتے...... وہ غیرت اور انا کے معاملے میں اپنی اولاد، خصوصاً عورت کے معاملے میں کسی رشتے، جذبے کو

خاطر میں نہیں لاتے......''

میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو سونہڑیں......! ماں باپ کے لیے اولاد، اولاد ہی ہوتی ہے۔ چاہے جیسی بھی سہی، وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ تم ان سے معافی مانگ لینا...... ورنہ تم خود بتاؤ...... اگر خدانخواستہ پریل بھی دنیا میں نہیں رہا تو تمہارا اس بھری دنیا میں کون سہارا بنے گا......؟''

''تم مجھے بس! ان کی قید سے کسی طرح نکال دو...... میں اپنے پریل کو خود ہی تلاش کرلوں گی...... یہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔'' وہ مجھ سے درد بھرے لہجے میں التجا کرتے ہوئے بولی۔ یہ سب کہتے ہوئے وہ بے بس نظر آرہی تھی۔ وہ معصوم تھی، ابھی اسے زمانے کے سرد و گرم کا ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ انسان نما درندوں کے اس جنگل میں وہ ایک ہراساں ہرنی کے مانند بھٹکتی رہے گی، مگر اس کے ہاتھ رسوائیوں اور ذلتوں کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا میں نے اسے بڑے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مسئلہ یہاں تمہیں نکالنے کا نہیں ہے سونہڑیں! میری بات کو ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کرو۔ یہاں سے نکلو گی تو کہاں جاؤ گی؟ کدھر پریل کو تلاش کرو گی؟ مت بھولو کہ تم ایک عورت ذات ہو، جوان اور خوبصورت ہو۔ یہاں قدم قدم پر تمہیں انسان نما بھیڑیے ملیں گے۔ پریل کو ڈھونڈنا تو ایک طرف رہا، تمہیں کہیں اپنی زندگی اور عصمت کے لالے نہ پڑ جائیں...... اس سے زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنے گھر کی چہار دیواری میں واپس لوٹ جاؤ...... یہ سمجھ کر کہ تقدیر نے تمہارے اور پریل کا بس، اسی قدر ساتھ رکھا تھا۔ حویلی میں تمہارے اپنے لوگ ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تمہیں برا بھلا کہیں گے اور بس......''

میری بات شاید اس کی سمجھ آئی یا نہ آئی تاہم وہ بے چاری بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ ڈھانپ کے رو پڑی۔

میں نے اسے خاموش کرایا اور ایک احتیاط بھری نظر نکاسی کے راستے پر پھینکی اور اس سے کہا۔ ''یہ شکر کرو کہ لائق ماچھی تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر اغوا برائے تاوان کے بدلے سہی...... یہ خیریت تمہارے بابا جانی کے حوالے کرنے کا ارادہ تو کر چکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بابا جانی بلا دیر اسے تاوان کی رقم دے کر تمہیں اس کے پنجے سے چھڑا لیں گے۔''

''اور...... اور...... پریل......! اس کا کیا ہوگا......؟'' سونہڑیں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

''میں اب تمہاری طرف سے بے فکر ہونے کے بعد اس کی تلاش کی کوشش کروں گا، مگر اس کے لیے یقین سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سچی بات ہے کہ تمہاری طرح میں بھی اس کی جانب سے کچھ زیادہ پر اُمید نہیں ہوں۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں اسے تلاشنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا، پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرے اپنے ساتھیوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہوئی ہیں...... میرے کچھ ساتھی پولیس کے اور کچھ تمہارے بابا جانی کے نرغے میں ہیں، مجھے ان کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔ پریل تھا تو مجھے اُمید ہوئی تھی وہ میرا یہ کام آسان کردے گا...... مگر......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

سونہڑیں نے میری ساری بات سننے کے بعد ہولے سے سسکتے ہوئے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ میں نے بھی ایک بھنچی بھنچی سی سانس خارج کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا، میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ مجھے تمہارے پاس دیکھ لیں اور تمہارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کر ڈالیں......''

''تم جا رہے ہو......؟'' اس نے ایک عجیب سی تڑپ کے ساتھ پوچھا۔

''میں ابھی کہیں نہیں جا رہا...... مجھے عارب کی تلاش ہے، میں پہلے اس سے پریل کے بارے میں حقیقت اُگلوانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آیا، میں نے سونہڑیں سے پوچھا۔

''اس مردود لائقو نے تمہیں کیا بتایا تھا......؟''

''یہی کہ...... اب میں پریل کو بھول جاؤں اور اپنی فکر کروں......'' وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

''میں اس مردود کی بات پر صدمے کے مارے چلّا اُٹھی تھی، اس ظالم نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کر ڈالا تھا اور کہا کہ مجھے اس بات کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ مجھے اپنے کسی انتقام کا نشانہ بنانے کے بجائے...... بابا جانی کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس پر میں نے اس سے التجا کی تھی وہ مجھے پریل کے پاس پہنچا دے تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ اس کے لیے مجھے مرنا پڑے گا اور میں اس بے رحم انسان کی بات سن کر بے ہوش ہوگئی تھی۔'' وہ اتنا بتا کر سسک کر رونے لگی تو میں

نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
"تم اللہ سے پریل کی زندگی کے لیے دعا کرو...... میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں پریل کو کسی بھی حالت میں اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں چین سے نہیں بیٹھوں گا اور تمہیں ضرور اس کی اطلاع بھی دینے کی کوشش کروں گا، ورنہ پریل جس حال میں بھی ملا، میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔"

اسے کچھ حوصلہ ہوا اور اُمید بھی، وہ اسی لہجے میں مجھ سے بولی۔ "تت...... تم اس خبیث عارب خان کو قابو کرنے کی کوشش کرو...... وہ اور اس کا ایک ساتھی، جس کا نام مجھے معلوم نہیں، وہ ہی اسے لالفو کے کہنے پر دھوکے سے کہیں ساتھ لے گئے تھے۔"

"تم بے فکر رہو...... میں دیکھتا ہوں......" میں نے کہا۔

اس کے بعد میں نے سونہڑیں کو اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھنے کو کہا اور خود نکاسی والے راستے کی طرف بڑھا اور ذرا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے کی کوشش چاہی تو مجھے وہاں صرف ایک ہی آدمی کھڑا دکھائی دیا جو سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ زیادہ اُبھر کر یا باہر نکل کے دیکھنے میں، دیکھ لیے جانے کا احتمال تھا۔

میں پلٹا اور دبے پاؤں کھڑکی کی طرف آیا وہاں بھی کپڑے کا ایک ٹکڑا جھول رہا تھا۔ میں نے اسے ہٹا کر دیکھا اور تو بری طرح چونک پڑا۔ وہاں میں نے جس ڈاکو کو چھت کی سمت گھورتے پایا تھا وہ عارب خان تھا۔ یہی میرا شکار تھا اور گزشتہ شب میرے چنگل میں آنے سے یہ مردود بال بال بچا تھا۔

"یہی ہے میرا شکار......" بے اختیار فرطِ جوش تلے میرے منہ سے خود کلامیہ برآمد ہوا تھا۔

"کیا ہوا......؟" مجھے عقب سے سونہڑیں کی سرگوشی سے مشابہ آواز سنائی دی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اس کی طرف پلٹا اور بولا۔

"مجھے اپنا شکار نظر آ گیا ہے...... لیکن میں اس کھڑکی کے راستے دوسری طرف نہیں نکل سکتا۔ لیکن دروازے کے باہر جو آدمی کھڑا ہے...... وہ عارب خان ہے۔ میں اسے چہرے سے پہچانتا تھا جو گزشتہ رات پریل کو دھوکے سے ساتھ لے کر گیا تھا۔ تم بھی ایک نظر ذرا اُسے دیکھ لو......"

میری بات پر سونہڑیں فوراً اس طرف کو لپکی اور ایک نگاہ کھڑکی سے باہر ڈالنے کے بعد پلٹ کر اس نے فوراً اثبات

آپ کا خط

ایک افسر کو بات بات پر گالی دینے کی عادت تھی۔
ایک دن اس کا اردلی ایک خط لایا اور وہ خط اپنے صاحب کو دیا۔

صاحب نے پوچھا۔ "کس الو کے پٹھے کا خط ہے؟"
اردلی نے جواب دیا۔ "آپ کا سر۔"
افسر صاحب بہت بھنایا اور زور سے بولا۔ "کس کمینے نے بھیجا ہے؟"
اردلی نے ادب سے جواب دیا۔ "حضور آپ کے والد صاحب نے۔"

پنڈ دادن خان سے حسین حیدری کا پروانہ،

ترمیم شدہ محاورات

دیواروں کے دونوں طرف کان ہوتے ہیں۔ (ایک سننے کے لیے اور دوسرا......)
ناچ نہ جانے ڈسکو ڈانسر
خیالات کی جنگ میں مضبوط جلد والی کتابیں ہتھیاروں کا کام دیتی ہیں۔
اونٹ رے اونٹ آج کل سیدھی طرح بیٹھ۔
تیل دیکھو اور تیل کا اچار دیکھو۔
ایک کلو مچھلی سارے گھر کو گندا کر دیتی ہے۔
جوق در جوق (مذاق مذاق میں)
مریض بڑھتے گئے جوں جوں دعا کی۔

☆☆☆

میں آپ کے کثیر الاشاعت ماہنامے کی معرفت اردو ادب کے کرتا دھرتاؤں کی توجہ اس صریح غلطی کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا ارتکاب مسلسل ڈیڑھ ہزار برس سے ہو رہا ہے۔ اس ناچیز کی رائے ہے کہ اب تک کی تمام کتابیں ضبط کر لی جائیں یا بڑے پیمانے پر اشتہار بازی کی جائے تا کہ عوام الناس اپنے پاس موجود نسخہ جات میں اس لفظ کی تصحیح کر لیں۔ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ معروف و مشہور شخص "حاتم" جو قبیلہ "طے" کا رہنے والا تھا۔ وہ مرد تھا، لیکن اکثر سننے اور پڑھنے میں آیا ہے کہ لوگ اسے تائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لہٰذا حاتم کے جاننے والے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ آئندہ اسے "تایا" کہہ کر پکاریں۔

ایمن کا کراچی سے انکشاف

میں اپنا سر ہلا دیا۔

میں نے اسے دوبارہ اپنی جگہ جانے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ پردے کا ایک کونا ذرا ہٹا کر باہر جھانکا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا وہاں کوئی نہ تھا اور میں نے ایک لحہ بھی ضائع کیے بغیر باہر قدم رکھ دیا، پھر بڑی سرعت کے ساتھ گردوپیش کا جائزہ لینے کے بعد میں جھونپڑے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اسی جانب کو سرکتا چلا گیا جہاں عارب کھڑا چھت کی طرف دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

دیوار کے سرے پر اب مجھے بیک وقت دونوں جانب محتاط سی نگاہ رکھنا پڑ رہی تھی۔ نیز میرا یہاں زیادہ دیر رکنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، میرے دیکھ لیے جانے کا مطلب دھاکے سے کم نہ ہوتا، میں نے جھک کر ایک ڈھیلا اُٹھایا اور سامنے عارب کے عقب میں جھاڑیوں کی طرف اُچھال دیا۔ شکار کو جُل دینے کا میرا یہ نشانہ بے خطا نہیں گیا، حسبِ توقع وہ بری طرح بدکا اور اپنی کلاشنکوف تھامے اسی جانب کو محتاط قدموں کے ساتھ بڑھتا چلا گیا اور میں نے بھی بہ سرعت اپنی جگہ سے حرکت کی...... میں اس کے بالکل عقب میں نہیں لپکا تھا بلکہ ذرا فاصلے سے اس کے دائیں جانب سے نیچے جھکا جھکا جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

پتا نہیں اب یہ شکار کو جلد از جلد چھاپ لینے کی فطری عجلت کا شاخسانہ تھا یا پھر کوئی غلطی مجھ سے سرزد ہوئی تھی کہ میرا پاؤں ایک جھاڑی میں رپٹ گیا۔ میں منہ کے بل گرا، چلچلاتی دھوپ زدہ گرمی اور سناٹے میں جھاڑیوں کی کھڑبڑاہٹ کا شور کسی بھرے مجمع کے احتجاج سے کم ثابت نہ ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب مجھ سے صرف چند قدموں کے فاصلے سے دائیں ہاتھ پر موجود عارب بالکل چوکس انداز میں کلاشنکوف ہاتھ میں تھامے ہوئے موجود تھا، وہ بری طرح بدکا اور میری طرف مڑا جبکہ ادھر میں بھی اپنی اس غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا لہٰذا گرتے ہی میں نے عارب کی جانب لوٹ لگائی تھی، وہ مجھ پر اپنی کلاشنکوف سیدھی کرتے ہی رہ گیا تب تک میری قینچی کی طرح حرکت کرتی ہوئی ٹانگیں اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرا چکی تھیں، وہ اُچھل کر میرے بالکل قریب گرا اور کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر چکی تھی، عارب نے سنبھلنے کی کوشش کے دوران ہی میرے جبڑے پر مُکا رسید کرنا چاہا تھا لیکن میں نے اپنے چہرے کو جھکائی دے کر اس کی ضرب سے اپنا چہرہ بچایا اور اس کی کنپٹی پر اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا بھرپور طاقت کے ساتھ رسید کردیا۔ وہ ہلکی سی کراہ نما اوغ کی آواز نکالتا ہوا دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگیا، یہی میں چاہتا تھا۔ میں اپنے زیردست شکار پر کسی شکاری چیتے کی طرح پنجہ گاڑے چند ثانیے وہیں دم سادھے ہوئے گردوپیش کی ممکنہ سن گن لیتا رہا اور پھر تسلی ہونے کے بعد میں نے بے ہوش عارب کی گن اپنے قبضے میں کی اور پھر اس کے بے سدھ وجود کو کاندھے پر ڈال کر ایک طرف کو ہولیا۔

☆☆☆

لائق ماچھی اور عارب خان وغیرہ کی بغاوت کے باعث میرا اپنا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ ورنہ تو پریل سے میرے دوستانہ مراسم استوار ہو چکے تھے، جس کے باعث میرا اور میرے ساتھیوں کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں، وہ میری بھرپور مدد کرسکتا تھا۔ مگر اب صورتِ حالات اور تھی۔ لہٰذا میں اب خود بھی اس معاملے کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ آخر پتا تو چلے کہ قصہ آخر کیا ہے؟

بے ہوش عارب کو کاندھے پر اُٹھائے میں ایک ایسی جگہ پر پہنچا جو میرے تئیں محفوظ تھی۔ یہاں چھدری چھدری جھاڑیوں کے علاوہ کچھ ریت اور مٹی کی ٹیکریاں بھی تھیں۔ مگر یہ علاقہ گرمی اور دھوپ سے تپ بھی رہا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور سانسیں پھول گئی تھیں۔ میں نے عارب کے بے سدھ وجود کو اس جگہ پر پھینکا اور پھر اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ جس کے لیے مجھے صرف اس کی ناک اور منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا اور ہلکے چانٹے مارنے پڑے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور نیم غنودہ سی آوازیں حلق سے خارج کرنے لگا، میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی اور اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

''یہاں اس تپتے ہوئے بنجر ویرانے میں تمہیں کوئی بھی بچانے نہیں آئے گا۔ اسی لیے میرے سوال کا بلاتاخیر جواب دینا ہوگا......''

اس نے ڈیلے گھما کر اطراف میں دیکھنا چاہا تو میں نے اس کی ''آسانی'' کی خاطر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ جان گیا کہ یہاں لانے کا میرا کیا مقصد ہوسکتا تھا، باوجود اس کے وہ تڑپا اور میری گرفت سے اس نے نکلنے کی کوشش چاہی تھی۔ مجھے اس کے ڈھیٹ پنے پر طیش آگیا، پہلے ہی اس کم بخت کو اس گرمی اور سخت دھوپ میں لاد کر یہاں تک لانے پر میری اپنی حالت طیش ناک سی ہورہی تھی۔ اس حرکت پر میں نے بھنا کر اس کے چہرے پر اپنے بھاری ہاتھ کا تھپڑ

رسید کر دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا چہرہ، سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج کی طرف کر دیا۔ اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں، وہ منہ پھاڑ کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں شاید گالیاں دے رہا تھا کہ میں نے ریت مٹی کی مٹھی بھر کر اس کے منہ میں ڈال دی۔ اس کی گرمائش اور گھٹن سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔

''عارب! میں تمہیں پہچان چکا ہوں...... اور تمہیں زندہ چھوڑنے کا ارادہ میرا بالکل بھی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک بار ناکام ہونے کے بعد اس بار دوبارہ تم پر قابو اسی لیے ہی پایا ہے۔'' میں نے اسے نفسیاتی طور پر خوف زدہ اور مرعوب کرنے کے انداز دوحشت خوں رنگ لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں بہت اذیتیں دے کر مار ڈالوں گا، بشرطیکہ مجھے سچ سچ بتا دو پریل کا تم نے کیا کیا ہے؟''

وہ کھانس رہا تھا، میں نے اسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔

''خبردار! اب کی بار کسی ڈھٹائی سے کام مت لینا۔ تمہاری لاش گدھ اور چیل نوچ ڈالیں گے اور میں آگے نکل جاؤں گا...... اب تک تو تم بھی جان ہی چکے ہو گے کہ میں عام آدمی نہیں ہوں......''

''مم...... میں نے پپ...... پریل کو۔ لل...... لل...... لائق ماچھی کے کہنے پر......'' وہ اتنا بتا کر رکا اور کھانسنے لگا۔ میں نے اسے موقع دیا تا کہ وہ گرم ریت اور مٹی اپنے منہ سے کھانس کر تھوک ڈالے اور میرے سوالوں کے جوابات بہ آسانی دے سکے۔

''بولتے رہو...... میں اس وقت تمہارے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میں بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

''مم...... میں نے پریل کو ہلاک نہیں کیا ہے...... اُسے مرنے کے لیے ایک ایسی اندھی کھائی میں باندھ کر چھوڑ آیا ہوں جہاں رات کو بھوکے جنگلی کتّے اور لگڑ بھگے ڈیرا ڈالتے ہیں۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی اور ہانپنے لگا۔ میں اندر سے ہول گیا۔ وہ سیاہ رات تو کب کی گزر چکی تھی۔ پتا نہیں اب تک ان بھوکے کتوں اور لگڑ بھگوں نے پریل کا کیا حشر کیا ہو گا...... میں نے نفرت وطیش کے مارے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچنے لگا۔ وہ گھٹن کے مارے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور زہر خند لہجے میں بولا۔

''لعنت ہو تم پر! تمہیں اپنے ہی سردار سائیں کے خلاف یہ غداری کرتے ہوئے شرم نہیں آئی...... اگر اُس سے کسی قسم کی کوئی ناراضی اور اختلاف تھا تو تمہیں اس کا اظہار کرنا چاہیے تھا، بلکہ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اپنے حصے سے نکال کر بھی اپنے ساتھیوں کو نواز دیا کرتا تھا۔ پھر...... پھر تم نے کیوں اس کے ساتھ غداری کی......؟''

میری بات پر عارب شرمساری کی اداکاری کرتے ہوئے بولا تھا یا پھر واقعی اس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی تھی۔

''مجھے خود بھی اس کا بعد میں افسوس ہوا تھا...... مگر......'' وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا اور ہانپنے لگا۔ میں اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

''اگر تمہارا ضمیر واقعی ملامت کر رہا ہے تو اس کی سچائی کا ثبوت دو...... مجھے اسی وقت وہاں لے چلو جس گڑھے میں تم نے اُسے دھوکے سے باندھ کر پھینکا تھا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں......'' وہ اپنی سانسوں کو معمول پہ لاتے ہوئے بولا۔

''لیکن...... کیا وہ ابھی تک زندہ ہو گا......؟''

''خدا کرے ایسا ہی ہو......'' میں نے کہا۔

''لیکن...... تم اُسے وہاں زندہ چھوڑ آئے تھے اور اس طرح کسی کو مردہ تصور کر لینا مناسب نہیں جب تک کہ آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔'' میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ عارب کو جانے کیا ہوا وہ بھوں...... بھوں...... کر کے رو دیا۔ ایک خونی ڈاکو کو...... اس طرح روتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور کچھ عجیب سا بھی لگا۔ پتا نہیں وہ ڈراما کر رہا تھا یا نہیں۔ میں نے اس سے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''کیا ہوا......؟ کیوں رو رہے ہو تم......؟''

''مجھے اپنے آپ پر شرم آرہی ہے۔ میں نے کتنی نیچ اور گری ہوئی حرکت کی ہے۔ اس مردود لاکھو کے کہنے پر میں نے اپنے ہی سردار سائیں کے ساتھ غداری کر ڈالی...... صد حیف ہے مجھ پر......''

''اب تم یہ ساری باتیں چھوڑو......'' میں نے کہا۔

''......اور چلنے کی تیاری کرو......''

''چلو...... میں تیار ہوں......'' وہ بولا۔ میں نے ایک نظر بہ غور اور بھانپتی ہوئی سی اس کے چہرے پر ڈالی اور اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

مجھے یہاں، اس علاقے میں بسنے والوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ نہ ہی علاقوں اور مقامات کا...... کسی حد تک نشریاتی

(مراد، خبریں وغیرہ) اور کتابی معلومات ضرور رکھتا تھا۔ اس کی گن میرے قبضے میں تھی اور وہ میں نے اب اس پر تانی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے ایک طرف کو اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی اور پریل جیسے آدمی کو اتنی زیادہ دور دھوکے سے لے جایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تاہم عارب اور اس کا دوسرا ساتھی شمن نے مل کر پریل کو پہلے دھوکے سے پانی میں کوئی نشہ آور شے پلا دی اور اس کے بے ہوش ہو جانے کے بعد ہی وہ اسے ایک ہولناک گڑھے میں ڈال کر چلے آئے کہ کل صبح تک صرف اس کا پنجر ہی پڑا ملے گا۔

عارب خان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا۔ میں اس کی بھوں...... بھوں اور ضمیر کی للکار جیسی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا اور اس پر بھروسا کرنے کی خطرناک غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا، چہ جائیکہ میرا بھی کہیں یہ بدبخت، پریل چانڈیو جیسا حشر کر ڈالے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ہی جھرجھری سی آجاتی تھی کہ نجانے اب تک پریل کا بھوکے جنگلی جانوروں نے کیا حشر کیا ہوگا؟ بس ایک خوش اُمیدی کے سہارے اور کچھ آنکھوں اور دلی تسلی کے لیے کہ کیا خبر اسے میری کسی مدد کی ضرورت ہو، اس کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

ہم دونوں جھلسا دینے والی دھوپ، گرمی اور لوؤں کے گرم تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ موقوف ہونے لگا تھا، بلکہ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی جگہ خشک مٹی کی ڈھیریوں اور گہرے کھڈوں کی بہتات نظر آنے لگی۔ ان گہرے کھڈوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ریتی بجری مافیا کے لوگ یہاں بھی خاصے سرگرم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں چند ہی کھڈ قدرتی ہوں گے باقی مٹی کھود کے لے جانے والوں کا شاخسانہ تھا۔

''کتنی دور رہ گیا ہے اب وہ گڑھا......؟''

بالآخر میں نے ایک جگہ رک کر ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس چلچلاتی دھوپ اور لوؤں کے ریگ زار خار میں زیادہ دیر پیدل چلنے کی میری ہمت جواب ہی دینے والی تھی۔ عارب نے تو تیز دھوپ سے بچنے کے لیے اپنے سر پر اجرک کا رومال سا بنا کر ڈال لیا تھا جبکہ میرا سر خالی تھا۔ میں اس کے ساتھ اجرک کے اس بڑے رومال کا ''شیئر'' بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پیاس کی شدت بڑھنے لگی تھی۔

''وہ سامنے دیکھ رہے ہو......'' اس نے میری بات پر اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی کے اشارے سے کہا اور میں اس کی سمت دیکھنے لگا۔

''اُس طرف دو برابر میں بنی ہوئی ٹیکریوں کے درمیان ایک گہرا گڑھا ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا تم...... وہاں جنگلی کتوں اور لگڑ بھگوں کی بہتات ہوتی ہے...... یہ بڑے مکار جانور ہوتے ہیں، انہیں انسانوں سے لڑائی کا خوب تجربہ ہے کہ کب ان کی آگ اُگلتی گنز خالی ہو کر خاموش ہو جاتی ہیں اور کب یہ بے بس ہو کر خالی گنز کو لاٹھی کی طرح سے استعمال کرنے پر مجبور ہو رہے ہوتے ہیں۔ بس...... وہی لمحہ ان پر پل پڑنے اور چیر پھاڑ ڈالنے کا ہوتا ہے۔'' عارب اتنا بتا کر خاموش ہو رہا۔ اس نے بڑے ہولناک انداز میں اس بنجر ویرانے کا ایسا خوفناک نقشہ کھینچا تھا کہ ایک لمحہ کو تو خود میں بھی لرز سا گیا تھا۔ گن صرف میرے پاس تھی۔ اس میں بھی کتنی گولیاں تھیں مجھے اس کا ٹھیک سے کوئی اندازہ نہ تھا۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ اگر جنگلی کتوں اور لگڑ بھگوں کے غول نے حملہ کر دیا تو... کتنوں کو میں مار گراؤں گا اور کتنوں کا مقابلہ کر پاؤں گا؟

''مگر میں نے تو سنا ہے کہ یہ لوسی کتے اور لگڑ بھگے ایک ہی فائر کی آواز پر دور بھاگ جاتے ہیں اور دوبارہ قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے......؟'' میں نے اس سے کہا تو عارب خان میری بات پر ٹھٹھا مار کے ہنسا تھا۔

''کیا بات کر رہے ہو سائیں......! یہ کوئی لوسی کتے ہیں؟ جنگلی ہیں جنگلی کتے! انہیں انسانوں سے مقابلے کرنے کا نسلی تجربہ ہے۔ لوسی کتے تو شہر کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والے ہوتے ہیں۔ جنگلی کتے تو دوسرے کتوں سے زیادہ ہی خونخوار اور چالاک ہوتے ہیں، شکار کا انہیں خاص تجربہ ہوتا ہے۔''

''میرا خیال ہے اس وقت وہ اپنی کھوؤں میں آرام کر رہے ہیں ہوں گے۔ آؤ......'' میں نے کہا اور آگے قدم بڑھا دیا۔ عارب خان بھی آگے چلتا رہا۔ میں نے اس کے چہرے سے اُلجھن اور پریشانی کے تاثرات تاڑ لیے تھے، جس کا مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا پایا تھا کہ آیا وہ جنگلی کتوں اور لگڑ بھگوں سے خوف زدہ تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی اس کی پریشانی کی......؟

اچانک ایک آواز پر ہم دونوں ہی بُری طرح چونکے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

پہلی غلطی

تمکین رضا

جیسے ہی موسم کے تیور بدلتے ہیں... برسات کی جھڑی لگتی ہے تو درختوں کے نیچے گھنا سبزہ ان بارشوں کا پانی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے... یہی قدر اور عمر رسیدہ گھنے درخت تندو تیز اندھیوں کا زور توڑنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں... یوں یہ زمینی دوست اپنی دوستی کا حق ادا کر دیتے ہیں... ہماری زندگی میں یہی کردار بزرگ ہستیاں ادا کرتی ہیں... جیسی بھی شکست و ریخت ہو... سختی ہو... ترشی ہو... وہ ہمارے لیے سائبان بنے رہتے ہیں... ایک ایسے ہی سرپرست کی کہانی... جو ہمہ وقت اپنی ذمے داری نبھانے کے لیے تیار تھا۔ وہ اپنی اولاد کو غلط اور مجرمانہ کاموں سے بچانا چاہتا تھا۔

اس پہلی غلطی کا احساس..... جو آنے والے دنوں پر بھاری تھی.....

اس سہ پہر میری ملاقات ساحل پر بیٹھے ہوئے کلے اسٹاک برج سے ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور وہ مجھے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ہم کافی عرصے بعد مل رہے ہیں۔''

گو کہ ہم ایک دوسرے سے کئی میل کے فاصلے پر رہتے ہیں لیکن میں اسے عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ وہ اور میرا باپ ایک ساتھ ہی پلے بڑھے اور وہ دونوں اسکول کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میں بال ٹیم میں بھی کھیلتے تھے۔ اس کی بیوی کا چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا اور جب میں جنگ سے واپس آیا تب سے ہی وہ یہاں سمندر کے کنارے رہ رہا تھا۔ اس کی بیٹی ایلس بھی یہیں کہیں رہتی تھی۔

ایک گھنٹا پہلے اس نے فون کر کے کہا تھا کہ میں تیس میل کی مسافت طے کر کے اس سے ملنے آجاؤں جہاں وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔ عام طور پر جب کوئی مجھے بلائے تو میں اس کی وجہ پوچھتا ہوں لیکن کلے کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ میرے لیے گھر کے فرد جیسا ہے۔

''میں اس معاملے میں پولیس کو شامل کرنا نہیں چاہتا، ڈیوڈ۔'' اس نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔''

اس نے میرا چہرہ دیکھا اور مجھے اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم ایلس کو تلاش کرو۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ یہاں نہیں ہے؟''

''اس نے گزشتہ شب مجھے فون نہیں کیا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی ہے اور جس ٹریلر میں وہ رہ رہی ہے اس کے برابر میں رہنے والی عورت نے بتایا کہ نصف شب کے قریب ایک آدمی آیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔''

''اپنے ساتھ لے گیا۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''اس نے اپنی کار وہیں احاطے میں چھوڑی اور اس آدمی کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔''

''وہ ایک جوان عورت ہے کلے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں......''

''ایک منٹ صبر کرو۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا پھر وہ مجھے جھونپڑی کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ اس نے ایک تختہ اٹھا کر گیلا کینوس کا تھیلا اٹھایا جس پر ریت لگی ہوئی تھی۔ اس نے ڈوری کھولی اور مجھے مکھن کی تین بوتلیں دکھائیں۔

''انہیں پکڑے رکھو۔'' میں نے کہا اور جھک کر ان بوتلوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے انہیں چھوا تھا؟''

''میں نہیں چاہتا کہ ان پر میری انگلیوں کے نشان آئیں، یہ ہے کیا؟''

دو بوتلوں میں مائع سے بھری ہوئی شیشیاں تھیں جبکہ تیسرے میں سرخ بیر تھے جن پر سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی پولیس ٹریننگ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً پہچان لیا کہ یہ ایبرین ABRIN نامی ایک زہریلا مادہ ہے۔

''ان بوتلوں کو مت کھولنا۔'' میں نے کہا۔ ''ان میں زہر ہے۔ میرا مطلب ہے کہ انتہائی خطرناک زہر۔''

وہ تھیلا اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ ''اسے واپس اپنی جگہ پر رکھ دو اور جو کچھ ان شیشیوں میں ہے، اسے بالکل ہاتھ مت لگانا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''اسی لیے میں نے پولیس کو فون نہیں کیا۔'' وہ بولا۔ ''اور تم سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔''

اس نے وہ تھیلا واپس فرش کے تختے کے نیچے رکھ دیا پھر ہم باہر آ گئے۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''وہاں سے۔'' اس نے ایک کھاڑی کے پار اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک بوئے کے اندر رکھا ہوا تھا جو سمندر میں راستہ بتانے کے کام آتا ہے۔''

''تم اسے ہاتھ مت لگانا۔''

''میں نہیں جانتا تھا کہ ان بوتلوں میں کیا ہے لیکن کسی چیز کو اس طرح نہیں چھپایا جاتا جب تک کہ اس کی کوئی قیمت نہ ہو۔''

''بلیک مارکیٹ میں اس کی قیمت لاکھوں میں ہے اور جو کوئی بھی اسے بنانے، بیچنے یہاں تک کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی کوشش کرے گا، اسے ساری عمر جیل میں گزارنا ہوگی۔''

''میں اسے سمندر میں چھپا سکتا ہوں۔''

''اس طرح تم بھی شریکِ جرم سمجھے جاؤ گے۔ بالآخر تمہیں اسے نکالنا ہی ہوگا۔ ان بوتلوں پر تمہارے علاوہ دوسرے لوگوں کی انگلیوں کے نشانات بھی ہوں گے۔ ایلس اس معاملے سے کس طرح جڑ گئی؟''

اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ وہ سر جھکا کر ریت میں انگلیاں پھیرنے لگا پھر اس نے نظریں اوپر اٹھائے بغیر کہا۔ ''صرف میری خاطر اسے تلاش کرو ڈیوڈ۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔ تمہیں اس کا معاوضہ دوں گا۔ اسے یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیے کہ میں نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔''

''لیکن وہ اس معاملے میں ملوث ہو چکی ہے۔''

''صرف میری خاطر اسے تلاش کرو۔ وہ اچھی لڑکی

ہے۔ البتہ اس نے ساتھ رہنے کے لیے غلط آدمی کا انتخاب کیا۔''

''کیا وہ کسی کے ساتھ رہ رہی ہے؟''

''اس کا نام اسٹیو نائٹ ہے۔ وہ گاؤں کے باہر پلیزنٹ ایونیو پر ایک ٹریلر پارک میں ہیں۔''

جب میں اس کے پاس سے رخصت ہوا تو سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ایلس اسے ہمیشہ فون کیا کرتی تھی جیسا کہ اس نے بتایا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے ہی اپنی بیٹی کی پرورش کی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کا محافظ سمجھتا تھا لیکن اب مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ باپ بیٹی کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہیں اور وہ بیٹی سے بچھڑنے کا خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ وہ اب بھی اسے ایک لڑکی ہی سمجھ رہا تھا لیکن وہ اٹھائیس سال کی ہو چکی تھی۔ ممکن ہے کہ میرے دوست نے اپنی بیٹی کے طرز زندگی پر ایک دو مرتبہ اظہار ناپسندیدگی کیا ہو اور وہ اس سے بیزار ہو گئی ہو۔

پورٹ لینڈ واپس آنے کے بعد میں نے اپنے بالائی کمرے میں پہنچ کر کمپیوٹر آن کیا۔ میں زہریلے مادوں ریسین RICIN اور ایبرین ABRIN کے بارے میں اپنی معلومات کو تازہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اسٹیو نائٹ کا بھی گزشتہ ریکارڈ دیکھا۔ وہ نوجوانی میں دو مرتبہ کسی دوسرے کی گاڑی بلا اجازت چلاتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور ایک مرتبہ اسے کشتیوں کے پروپیلر چرانے کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔ پولیس کو مختلف اوقات میں دو مختلف عورتوں کی جانب سے اس کے خلاف زیادتی کی شکایات موصول ہوئی تھیں لیکن عدم ثبوت کی بنا پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ اس نے میگا مور کلب کی جانب سے مڈل ویٹ کے مقابلے میں بھی حصہ لیا تھا۔

''میں اس کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔'' میرے ذریعے نے بتایا۔ ''کہ وہ ایک گندہ فائٹر تھا۔ جب اسے ایک نوجوان باکسر سے شکست ہوئی تو اس نے باکسنگ کو خیرباد کہہ دیا۔''

''اس کی عمر کتنی ہوگی؟''

''میرے حساب سے چالیس کے قریب۔ اگر یہ وہی ہے جس کے بارے میں ہم بات کر رہے ہیں۔''

کوئی شخص ممنوعہ مال کو بوئے کے نیچے چھپا کر کیوں رکھے گا۔ پولیس سے بچنے کے لیے یا خفیہ طریقے سے کسی کو دینے کے لیے؟ میں نے اس سلسلے میں پورٹ لینڈ پولیس ڈپارٹمنٹ سے رابطہ کیا۔ میرے ایک قریبی دوست

لیفٹیننٹ میرون جوسی آئی ڈی کا سربراہ بھی تھا۔ اس نے مجھے ایک پیرول آفیسر سے رجوع کرنے کے لیے کہا جس نے بتایا کہ اسٹیو نائٹ کارٹر فرنیچر اسٹور میں کام کرتا ہے لیکن اسٹور منیجر کا کہنا تھا کہ نائٹ کو وہاں سے کام چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا ہے اور وہ نہیں بتا سکتا کہ نائٹ کہاں ملے گا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس بالا خانہ کی طرف روانہ ہو گیا جو ایک ویئر ہاؤس کے اوپر واقع تھا۔ جب میں بیرونی زینے کے ذریعے کچن میں داخل ہوا تو وہاں پھیلی ہوئی بو دیکھ کر یاد آیا کہ میں نے کھانے کے برتن سنک میں ہی چھوڑ دیے تھے۔ ابھی میں ایک پلیٹ دھو رہا تھا کہ میرے دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔

''میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔'' میں نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ کمرا میرے بیڈروم اور دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

''یہ واقعہ ہیلی نیکس میں پیش آیا ہے۔'' مائیک نے کہا۔ ''اس کا تعلق فیڈرل سے ہے۔ اس لیے اوگستا نے مجھے اس معاملے سے الگ رکھا ہے۔ تم اس میں کیسے شامل ہو گئے؟''

''اس کا تعلق میرے ایک دوست سے ہے اور وہ اس وجہ سے بہت پریشان ہے۔''

''اس کا کوئی نام تو ہوگا؟''

میں نے کلّے کا نام بتانے کے بعد کہا۔ ''کیا تم میری کچھ رہنمائی کر سکتے ہو؟''

''تم اسٹینلے مورگن کو جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح۔''

''میرا نام مت لینا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مورگن ایک پناہ گزین تھا جس کی پرورش ایک یتیم خانہ میں ہوئی تھی۔ میں نے اسے مونومنٹ اسکوائر کے چوراہے پر ایک خاتون کا پرس چھینتے ہوئے پکڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''تمہاری وجہ سے میری زندگی کے دو سال ضائع ہوئے۔''

اس وقت وہ کمبرلینڈ ایونیو میں واقع ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم جیل سے باہر آنے کے بعد سدھر گئے ہو؟''

''کام بتاؤ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''مجھے ایک خچر کی تلاش ہے۔''
''کھیتی باڑی شروع کررہے ہو۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
''اس کے کینیڈین سے رابطے ہوں۔ وہ یورپین بھی ہوسکتا ہے اور شاید کشتی سے سفر کرتا ہے۔''
وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس کیوں آئے ہو؟''
''میں تمہاری مدد کو استعمال کرسکتا ہوں۔''
اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ وہاں سے روانہ ہوتے وقت مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے ایک زرخیز بیج بو دیا ہے۔
سلویا کے ساتھ ڈنر کرنے اور فلم دیکھنے کے بعد میں نصف شب کے قریب گھر پہنچا۔ میں نے بیرونی زینے کے قریب اپنی گاڑی کھڑی کی۔ وہاں بالکل تاریکی تھی۔ اچانک مجھے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں فوراً ہی گھٹنوں کے بل جھک گیا تاکہ گولی کا نشانہ بننے سے بچ سکوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور اس میں سے اپنا بریٹا نکال ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے سر پر ہاتھ مارا۔ میں نے پلٹ کر حملہ آور کے کپڑے پکڑ لیے اور اسے گھسیٹتا ہوا زینے سے دور لے جانے لگا۔ کوسٹ گارڈ کی کشتی سے آنے والی روشنی میری عمارت پر پڑی تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور وہ غراتا ہوا گلی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرا شخص میرے قریب سے دوڑتا ہوا گیا اور تاریکی میں گم ہوگیا۔ میں نے گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے گوداموں کے درمیان دوڑ لگائی اور ایک سفید رنگ کی ایس یو وی کار کی نمبر پلیٹ پڑھنے میں کامیاب ہوگیا جو مشرق کی جانب کمرشل اسٹریٹ پر مڑ رہی تھی۔
دوسرے دن اس نمبر پلیٹ کی مدد سے میں اسٹفنی رابنسن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جو مونجوئے ہل پر واقع ایک اپارٹمنٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر رہتی تھی۔ وہ ایک خوش شکل عورت تھی۔ عمر بیس اور پچیس کے درمیان، قد پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب۔ وہ سفید قمیص اور سفید پتلون میں ملبوس تھی۔ وہ مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی اور مذاق کے انداز میں بولی۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔''
''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ حیران ضرور ہوں کہ تم گزشتہ رات کیا کرنا چاہ رہی تھیں؟''
''اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم غلط دروازے پر آگئے ہو۔''
''تم اسٹفنی رابنسن نہیں ہو؟''
''میں نہیں جانتی کہ تم کیا چاہتے ہو لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''
''گزشتہ شب تمہاری کار میرے احاطے میں تھی۔''
وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''میری کار؟''
میں نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ بعض اوقات لوگ اسے واپس کردیتے ہیں لیکن اس نے وہ کارڈ رکھ لیا اور میری طرف بڑھنے لگی۔
''میں تمہارا ہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
وہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور پیچھے ہٹتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔
میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔ وہ فون پر کسی سے چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ ''تم نے میری کار کے ساتھ کیا کیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ تم نے اسے کیوں دی؟ ابھی ڈیوڈ نامی ایک شخص میرے دروازے پر آکر الزام تراشی کررہا تھا۔ تم نے میرے لیے مسئلہ کھڑا کردیا۔''
پھر قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے گاڑی واپس لے کر آؤ اور باسٹن سے کہہ دینا کہ یہ کار میری ہے اور دوبارہ مجھ سے گاڑی مت مانگنا۔''
میں نے جیپ میں سوار ہونے سے قبل پریس ہیرالڈ میں ایک خاتون دوست کو فون کرکے باسٹن کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ''مجھے چند منٹ درکار ہوں گے۔''
گھر آنے کے بعد اس کے فون کے انتظار میں، میں اپنی ڈاک دیکھنے لگا۔ اس میں چند بلوں کے علاوہ کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری دوست نے فون پر بتایا۔
''ڈائریکٹری میں ایسے تین نام ہیں۔ ان میں دو عمر رسیدہ بہنیں ہیں جو بیڈفورڈ کے علاقے میں سی ویو پر رہتی ہیں جبکہ تیسرے شخص ریڈ باسٹن کی کانگریس اسٹریٹ پر بیریز، کے نام سے سینڈوچ شاپ ہے۔ وہ مونجوئے ہل میں رہتا ہے۔''
جب میں سینڈوچ شاپ پہنچا تو ایک دبلی پتلی لڑکی نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اس کے سینے پر سینڈی، کا ٹیگ آویزاں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ میں بول پڑا۔
''میں مسٹر باسٹن سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ موجود ہیں؟''
وہ یہ سوال سن کر چونک گئی اور بولی۔ ''وہ......''

''لیکن وہ یہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے بتادو کہ ایک آئرش اس سے ملنا چاہتا ہے۔''

وہ کوئی بحث کیے بغیر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے عقب میں بغیر آستینوں والی قمیص پہنے ایک اور شخص بھی تھا۔

''پیچھے سے گھوم کر آؤ۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں ایک دروازہ ہے۔''

میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی شخص گھات لگائے میرا انتظار کررہا ہوگا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ باسٹن نے سبز رنگ کا دروازہ کھولا اور میں اس میں سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''محکمۂ صحت کی پابندی کی وجہ سے میں تمہیں کچن میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' اس نے میرا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ اس نے ایک نظر ڈالنے کے بعد اسے ایک فریم شدہ تصویر کے سامنے رکھ دیا جس میں ایک عورت اور دو چھوٹی لڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے اسٹفنی کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ باسٹن نے اسے سفید ایس یو وی کار دی تھی لیکن تصویر والی عورت اسٹفنی نہیں تھی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' باسٹن نے پوچھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ اسٹیو نائٹ تمہارے لیے کام کرتا ہے۔''

''اسٹیو نائٹ۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یاد آیا۔ وہ اوپر کے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس نے میرے ہاں بھی کچھ مرمت کا کام کیا تھا لیکن وہ میرا ملازم نہیں ہے بلکہ ٹھیکے پر کام کرتا ہے۔ تم اس سے فون پر بات کرلو۔ اب اس نے کیا کردیا؟''

''میں نے سوچا کہ وہ تمہارے پاس کام کرتا ہوگا کیونکہ وہ سفید ایس یو وی چلا رہا تھا جو تم نے ایک سال پہلے کمبرلینڈ فورڈ سے خریدی تھی۔''

یہ سنتے ہی اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ مجھے دیر تک دیکھتا رہا پھر غصے سے بولا۔ ''اگر یہ بلیک میلنگ ہے تو تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس نے کرسی کو پیچھے دھکیلا اور کھڑا ہوگیا۔

''میں اسٹیو نائٹ کو تلاش کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارے پیسوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''اور تم بھی یہاں سے چلے جاؤ۔''

یہ صرف بلیک میلنگ کا خوف نہیں تھا۔ وہ اس سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ لہٰذا میں نے باہر رک کر انتظار کیا۔ چند منٹ بعد ہی باسٹن اپنی کیڈی لک میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ میں بھی مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کا رخ شمال کی جانب تھا پھر اس نے گرجے کی طرف گاڑی موڑی اور کنٹری روڈ پر ہولیا۔ سڑک پر جا بجا موڑ ہونے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب رہا۔ جب میں سفیدے کے درختوں کے گرد چکر کاٹ کر ابھری ہوئی سطح پر آیا تو میں نے دیکھا کہ باسٹن کی کار چوتھائی میل کے فاصلے پر ایک گڑھے کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی جیپ ایک صاف جگہ پر کھڑی کی اور گڑھے کے کنارے لیٹ کر اندر جھانکنے لگا۔ وہ ایک سوراخ پر سے مٹی ہٹا رہا تھا۔ پھر اس نے کھدائی روک کر اپنی مٹھی اس جگہ رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کھڑے ہوکر اپنے گھٹنوں پر سے مٹی صاف کرنے لگا۔ ایک نظر ادھر اُدھر دیکھا پھر کار کی طرف چل دیا۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا تاکہ میدان صاف ہوجائے۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد میں مڈل اسٹریٹ پر واقع پولیس اسٹیشن میں مائیک کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کس کے لیے یہ کام کررہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن وہ ایجنٹ بیک فائر کرسکتا ہے۔''

''اس کا بھی کوئی نتیجہ نکلے گا۔''

''اس میں تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔ اس نے جو عورت اس پارٹمنٹ میں رکھی ہوئی ہے، پہلی بات تو یہ کہ وہ کینیڈین ہے اور دوسرے وہ اسے استعمال کررہی ہے۔''

''باسٹن کو؟ مگر کس لیے؟''

''میں اتنا جانتا ہوں کہ اس عورت کا باپ فارماسسٹ ہے اور وہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ امیر ہے۔ پورے امریکا میں اس کی لاتعداد گولیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ہوم لینڈ سیکیورٹی اور ایف بی آئی نے اس پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں تم کیوں دلچسپی لے رہے ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے الگ ہوجاؤ۔''

گویا وہ جانتا تھا کہ کیا ہورہا ہے لیکن اس کی خواہش تھی کہ میں اس معاملے میں نہ پڑوں۔ دوسرے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے میں لیفٹی کے ڈائنر میں ناشتا کررہا تھا جب

مجھے کوسٹ گارڈ کے پیٹی آفیسر وینڈل ہومز کا فون آیا ہے۔ ہم دوست نہیں تھے لیکن وہ کبھی کبھی اپنی کشتی پر سے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا کرتا تھا۔

''میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔'' اور چند لمحوں بعد وہ میرے ساتھ آخری بوتھ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نیواورلینز کا رہنے والا سیاہ فام تھا اور گزشتہ دو برس سے مین میں تعینات تھا۔

میں نے اس کے لیے کافی منگوائی تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کوئی سرکاری معاملہ نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کے بارے میں معلومات ظاہر کررہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ کیا بات ہے۔''

اس نے ایک بار پھر خالی اسٹولوں کی جانب دیکھا اور میز پر انگلیوں سے طبلہ بجانے لگا جیسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہو۔ ''میرے ایک جاننے والے نے مانٹریال سے فون کرکے تمہارے بارے میں پوچھا تھا، ایک دفعہ اس سے تمہارا ذکر ہوا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اگلے گھاٹ پر ایک پرائیویٹ سراغ رساں رہتا ہے۔''

''میرے بارے میں پوچھا تھا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''کوئی ذاتی بات نہیں۔ کچھ لوگ ایک جھینگے پکڑنے والے کے بارے میں بات کررہے تھے۔ وہ ہمارے ساحل کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی اسمگلنگ کا معاملہ ہے۔''

''اس جھینگے پکڑنے والے کا کوئی نام تو ہوگا؟''

''تمہارے علاوہ اس نے ایلس کا نام لیا تھا۔ کیا تم کسی ایلس کو جانتے ہو؟''

''پرستان میں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ تم کسی معاملے میں ملوث ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن جو کچھ اس نے سنا۔ اس سے یہی لگتا ہے کہ یہاں کچھ ہورہا ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔''

''اس نے تمہیں فون کیوں کیا؟''

''وہ برطانیہ کے کسی میڈیا گروپ سے وابستہ ہے اور کسی کہانی کی تلاش میں ہے۔''

''لیکن اس نے تمہیں ہی فون کیوں کیا؟ کیا اس میں کوسٹ گارڈ بھی ملوث ہے؟''

''اوہ نہیں۔ یہ ذاتی گفتگو تھی۔ اگر سرکاری ہوتی تو میں تم سے بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو۔''

میں بہت جلدی بات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتا لیکن اگر کوئی جھوٹ بول رہا ہو تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔ اگر کینیڈین مین کے ساحل پر کسی جھینگے پکڑنے والے کی نگرانی کررہے تھے تو اس میں کوسٹ گارڈ کی شمولیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یہاں مجھ سے کچھ معلوم کرنے آیا تھا۔ شاید اسے اس کے کمانڈنگ آفیسر نے یہ سمجھ کر بھیجا ہو کہ ہم دونوں دوست ہیں۔ غالباً اس نے ہمیں ایک دوسرے کو ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا ہو۔

''بہرحال میں اس اطلاع کے لیے تمہارا شکرگزار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''گویا کینیڈا میں کوئی شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ میں کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث ہوں۔ انہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم کچھ دیر بیٹھے اس معاملے پر غور کرتے رہے لیکن کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ گوکہ بوتھ سے باہر جاتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مایوس ہوکر گیا ہے۔

کوئی شخص یہ جاننا پسند نہیں کرتا کہ اس کے بارے میں تفتیش ہورہی ہے لیکن اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میرے کام میں ایسا ہوتا ہے۔ اگر کینیڈ۔سنتر کے پاس میرا نام تھا تو محض کلے کے ساتھ ساحل پر بیٹھا دیکھ کر انہیں یہ معلوم نہیں ہوا ہوگا۔

میں گاڑی چلاتا ہوا کلے کے پاس پہنچا۔ وہ تہ خانے میں کرسی پر پاؤں رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ مجھے اس کا عقبی دروازہ کھلا دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ وہ رات میں مقفل ہوتا ہو۔ تہ خانے میں دیوار کے ساتھ کچھ باکس اور ایک شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔

''کیا شکار کی تیاری ہے؟'' میں نے اس کے قریب جاکر کہا۔

اس نے گن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے تیل دے رہا ہوں۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کینیڈ۔سنتر تمہاری اور ایلس کی نگرانی کررہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس آیا تھا۔ وہ میرا نام بھی جانتے ہیں اور یہ معلومات انہیں تمہاری فون کال کی مانیٹرنگ سے ملی ہوں گی۔''

اس نے سگریٹ بجھاکر میری طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

''مجھے بتاؤ کلئے کہ کیا ہو رہا ہے ورنہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔''

''آؤ اوپر چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

کچن کی میز پر ہم آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''ممکن ہے کہ ایک کسان یہ سمجھتا ہو کہ اس بوئے کے ساتھ کوئی چیز لٹکا سکتا ہے اور یہ توقع کرے کہ وہ اسی جگہ رہے گا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔''

''اس میں اینکر نہیں تھا؟''

''بالکل تھا۔ ایک جال کو پرانی موٹر کے ساتھ باندھ دیا گیا جو پندرہ فٹ نیچے چٹانوں پر رکھی ہوئی تھی۔''

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا پھر بولا۔ ''وہ ایلس کی موٹر تھی اور میری جھونپڑی میں مقفل تھی۔ میرے علاوہ اس کی چابی صرف ایلس کے پاس تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جھونپڑی کا دروازہ ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔''

''اسٹیو نائٹ یا کوئی اور وہ چابی لے سکتا ہے۔''

''اس نے انہیں وہ چابی نہیں دی ہوگی۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔''

''لہٰذا تم اس کے ٹریلر پر گئے؟''

''وہ ٹریلر اسٹیو کا ہے۔ میں نے اس کی پڑوسن سے بات کی تھی۔''

''میں بھی اس سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''تم جو چاہو کرو۔'' اس نے کہا۔ ''بس ایلس کو ڈھونڈ لاؤ۔ وہ مجرم نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس چکر میں پھنس گئی ہے۔''

مجھے اسٹیو نائٹ کا ٹریلر تلاش کرنے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت لگا۔ میں اس کی پہلی سیڑھی پر کھڑا دروازے پر دستک دے رہا تھا کہ ایک عورت چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔

''تم جانتی ہو کہ ایلس کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''تم جانتی ہو کہ وہ کب واپس آئے گی؟''

وہ متجسس ہونے کے ساتھ کچھ پریشان بھی تھی۔ اس نے میرا چہرہ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کی طرف سے آئے ہو یا دوسرے لوگوں کی طرف سے؟''

''میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم کن دوسرے لوگوں کی بات کر رہی ہو؟''

''تم اس سے کیا چاہتے ہو؟''

''دیکھو۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے نقصان پہنچانے نہیں آیا لیکن شاید تم ایسا سمجھ رہی ہو، کیوں؟''

''اسٹیو۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تمہارا خیال ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہے؟''

''اسے ایک اجنبی سفید کار میں لے کر گیا تھا۔ میں نے اسٹیفن کو گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا۔ میں اندھیرے میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔''

''وہ اسٹیو نہیں تھا؟''

''نہیں، وہ لمبے قد کا تھا لیکن اسٹیو بھی اس کے بعد سے یہاں نہیں آیا۔ کیا تم پولیس والے ہو؟''

''میں پولیس والا تو نہیں لیکن ایلس کا ہمدرد ضرور ہوں۔ اسٹیو کتنے عرصے سے یہاں رہ رہا تھا؟''

''شاید تین ہفتوں سے۔''

''اس سے پہلے وہ کہاں رہتا تھا؟''

''مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں۔''

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟''

''شاید وہ کرتی ہو لیکن اسٹیو اس کے ساتھ بُری طرح پیش آتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات دیکھے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا جیسے اس کا مالک ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کے ساتھ کیسے رہ رہی تھی۔''

''جب تم نے ایلس کے چہرے پر نشانات دیکھے تو پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟''

''کس لیے؟ وہ کچھ بھی نہ کرتے اور وہ میرے پیچھے لگ جاتا۔ اور شاید میرے بچوں کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔''

کافی دیر ہو چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ ٹاؤن آفس بند ہو چکا ہوگا۔ اس لیے میں ایک اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر میں چلا گیا اور وہاں بیٹھی ہوئی عورت سے پوچھا کہ ''کیا ریڈ باسٹن اپنی جائداد فروخت کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ یہ گیر ٹروڈز کارنر پر واقع ہے۔''

''تم نے کہاں سے سنا؟'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام میری مارٹن ہے۔'' پھر اس کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر حرکت کرنے لگیں۔ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ریڈ باسٹن۔ کنٹری روڈ فائیو، ہم اسے ڈیئر ہل بھی

کہتے ہیں۔''

وہ چند سیکنڈ اسکرین کو دیکھتی رہی پھر دیوار پر لگے ہوئے نقشے پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ جگہ ہائی وے سے دس میل کے فاصلے پر ہے لیکن وہ غیر آباد ہے کسی جنگل کی طرح۔ میں تمہیں اس سے اچھی دکھا سکتی ہوں۔''

''اس سڑک پر کوئی سائن بورڈ ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ''چیس سیوز'' کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جا سکتی ہوں۔''

''شکریہ! میں اسی طرف جا رہا ہوں، تلاش کر لوں گا۔''

''تمہیں وہاں درختوں اور دلدل کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گیا۔ اس سڑک پر چوتھائی میل فاصلہ طے کرنے کے بعد صنوبر کے درختوں کے پیچھے مجھے روشن کھڑکیاں نظر آئیں۔ میں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کر دیں اور ایک خالی جگہ سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے سے کاٹیج تک پہنچ گیا جس کے قریب ہی ایک کیڈلک اور ایک سفید رنگ کی ایس یو وی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں جیپ سے اتر کر کاٹیج کے قریب گیا اور ایک کھڑکی میں جھانکنے لگا۔ ایک آدمی جسے میں نہیں جانتا تھا پورچ میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا آدمی بھی سیڑھیوں سے اترا۔ اس کی چپٹی ناک اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تم ہی اسٹیو ہو؟'' میں نے کہا۔

اندر سے کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''اسے اندر لے آؤ۔''

ریڈ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر ٹانگیں پھیلائے...... کھڑا تھا۔ ''تم پولیس والے ہو لیکن کسی وارنٹ کے بغیر مداخلتِ بے جا کے مرتکب ہو رہے ہو۔''

میں اس آدمی کی طرف مڑا جو اسٹیو کے ساتھ اندر آیا تھا۔ ''وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم نے اسٹیو کے ٹریلر سے اٹھایا تھا؟''

وہ جواب دینے کے بجائے باسٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم اسے سفید رنگ کی ایس یو وی کار میں لے گئے تھے۔'' میں نے کہا۔

''اسی وقت اسٹیفی رابنسن کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم!'' اس نے کہا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہاں کیوں آئے؟

ریڈ نے اپنی جیکٹ سے پستول نکالا اور بولا۔ ''ابھی تمہاری پریشانی ختم ہو جائے گی۔''

میں اسٹیفی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ دوسرے کمرے سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر اسٹیو کو دوسرے آدمی کی طرف دھکیلا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اندھیرے میں اپنی جیپ تک پہنچا اور ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے اپنی گن نکال کر واپس آ گیا۔

اسٹیو اور دوسرا آدمی ایلس کو پورچ کی طرف دھکیل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اس نے عقبی کھڑکی سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اس کے چہرے پر خون نظر آ رہا تھا۔

ریڈ نے جالی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسے کمرے میں اکیلا کیوں چھوڑا؟''

''کیری گن کہاں ہے؟'' اسٹیفی نے پوچھا۔

''وہ جا چکا ہے۔''

چاروں کمرے میں آ گئے۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑا ایلس کو دیکھ رہا تھا جو گھٹنوں پر ہاتھ رکھے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ریڈ نے آگے بڑھ کر ایلس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''اٹھو، یہ شخص پولیس کو لے کر دوبارہ آ سکتا ہے۔ تم بتا دو کہ وہ مال کہاں چھپایا ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جائیں گے ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ میں بقیہ زندگی جیل میں نہیں گزارنا چاہتا۔''

''اسے بتا دو کہ تم نے وہ سامان اٹھایا تھا، میں نے نہیں۔'' اسٹیو نے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے بتایا مسٹر باسٹن۔ یہ ضرور میرے پیچھے اس گڑھے تک گئی ہوگی۔''

''مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ مال اسی کے پاس ہے اور وہ مجھے چاہیے۔''

ایلس اپنی جگہ سے اٹھی اور پتھر کے بت کی طرح ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ جیسے ہی ریڈ نے اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''کوئی حرکت نہ کرنا۔''

پھر میں نے ان تینوں سے کہا کہ وہ اوندھے منہ فرش پر لیٹ جائیں لیکن اسٹیفی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اچانک ہی ریڈ نے اسے اپنی جانب کھینچا۔ اسٹیفی نے اپنی کہنیاں اس کے گرد لپیٹ دیں اور فرش پر پھسلتی چلی گئی۔

میں نے ریڈ کے چہرے کا نشانہ لیا اور اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیفی ایلس کی جانب رینگ رہی تھی۔ ریڈ نے مجھ سے دور ہوتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی حرکت نہ کرنا۔“

وہ بدتمیزی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا کرلوگے؟“

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور میں نے گولی چلا دی۔ وہ اسٹیفی پر جا گرا۔ اس کا بازو اور چہرہ کرسی سے ٹکرایا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ ایلس نے کرسی سے چھلانگ لگائی۔ اسٹیفی نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کی اور اسٹیو باہر کی طرف بھاگا۔ دوسرا آدمی میرے راستے میں آگیا جب میں پورچ میں آیا تو دیکھا کہ اسٹیو کیڈلک میں جا رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے مجھے ایک طرف ہٹایا اور چلاتے ہوئے کہا۔ ”رکو۔“

میں جلدی سے واپس اندر آیا۔ اسٹیفی، ایلس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی اور ایک پستول فرش پر پڑا ہوا تھا جو غالباً اس نے ریڈ کی جیکٹ سے نکالا ہوگا۔ میں نے وہ پستول اٹھا لیا اور دوسرے آدمی کے پیچھے گیا لیکن وہ جا چکا تھا۔

”تمہارے پاس فون ہے؟“ میں نے ایلس سے پوچھا۔

”میرا فون اس بیگ میں ہے۔“ اسٹیفی نے ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے تروپ بی بیرکس میں اپنے ایک دوست کو فون کیا تو وہ بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ جگہ کہاں ہے۔ تم وہیں ٹھہرو۔“

انہوں نے دوسرے آدمی کو ہائی وے سے گرفتار کیا جب وہ برونس وک کی طرف پیدل جا رہا تھا جبکہ اسٹیو نائٹ کی تلاش سرگرمی سے جاری تھی۔ اس نے کیڈی لک ایک سپر مارکیٹ کی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دی تھی اور وہاں سے ایک فورڈ پک اپ لے کر بھاگ گیا تھا۔ ان سب باتوں کا علم مجھے بیرکس کے کانفرنس روم میں ہوا۔

ایلس کو اسپتال لے جایا گیا جہاں اسے ایک رات پرائیویٹ روم میں رکھا گیا۔ ایک پولیس والا اس کے دروازے پر پہرا دیتا رہا۔ آگستا سے ایک ایف بی آئی ایجنٹ آیا اور اسٹیفی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے ریڈ پر گولی چلانے کا اعتراف کرلیا اور مجھے رات بھر حوالات میں تفتیش کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ صبح ہونے پر مجھے ایک چھوٹے سے دفتر میں لے جایا گیا۔

ایف بی آئی ایجنٹ ایڈاموس ایک میز پر بیٹھی لیپ ٹاپ سے کھیل رہی تھی۔ اسے میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس

بے وقوف بچہ

چھوٹا بچہ حجام کی دکان میں داخل ہوا۔ حجام نے بچے کو دیکھتے ہی اپنے گاہک سے آہستہ سے کہا۔

”یہ لڑکا دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ دیکھو ابھی تمہارے سامنے ثبوت پیش کرتا ہوں۔“

حجام نے اپنے ایک ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ رکھا اور دوسرے ہاتھ میں، دو روپے کی ریزگاری رکھی اور بچے کو بلا کر کہا۔ ”بیٹا کون سے ہاتھ والے پیسے لوگے؟“

بچے نے دو روپے کی ریزگاری لی اور دکان سے نکل گیا۔

”دیکھا میں نے کیا کہا تھا... یہ بے وقوف کبھی بھی کامیاب نہیں ہوگا اپنی زندگی میں۔“ حجام نے اپنے گاہک سے کہا۔

گاہک بال کٹوا کر باہر نکلا تو اس نے بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے پایا۔ اپنی معلومات کے لیے اس نے بچے کو روک کر پوچھا۔ ”بیٹے! تم نے دس روپے کے بجائے دو روپے کی ریزگاری لی، ایسا کیوں کیا؟“

بچے نے آئسکریم کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ”جس دن میں نے دس روپے کا نوٹ اٹھالیا اسی دن یہ کھیل ختم ہوجائے گا۔“

(امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے)

سبب

غریب باپ کا نکما بیٹا میٹرک کے امتحان میں فیل ہوا تو اسے بیٹے پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا کیونکہ اسی محلے کی ایک لڑکی اسی امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی۔

”اس لڑکی کو دیکھو... اس نے اپنے گھر اور خاندان کا نام روشن کردیا... اور ایک تم ہو، نکمے، آوارہ اور جاہل۔“ باپ غصے میں آکر بیٹے کو بار بار یہی طعنے دے رہا تھا۔

اسی لعنت ملامت میں دو روز گزر گئے۔ تیسرے دن بیٹے نے باپ کی زبان سے یہی سب سنا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے جل کر کہا۔ ”ابا! میں اس لڑکی کو اور کتنا دیکھوں۔ سال بھر اسی کو دیکھتے رہنے کے چکر میں پڑ کر میں امتحان میں فیل ہوا ہوں۔“

(کوئٹہ سے حسن سردار کی بے بسی)

نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولی۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

''ایلس تو ٹھیک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اس کے برعکس کچھ نہیں سنا۔'' وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ریڈ باسٹن پر گولی کیوں چلائی؟''

''وہ مسلح تھا اور دو عورتوں کو دھمکا رہا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت میں گولی چلائی۔''

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کمپیوٹر پر ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس بارے میں صبح سماعت ہو گی۔ جب تم سو رہے تھے تو ہماری ایلس کے باپ سے بات ہوئی۔ تم دونوں دوست ہو۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ایلس اسٹاک برج تمہاری دوست ہے اور تم اسے عرصہ دراز سے جانتے ہو اور تمہیں پورا یقین ہے کہ اس نے وہ ممنوعہ سامان نہیں چرایا جو ہمیں اس کے باپ کی جھونپڑی سے ملا۔ اس پر کلّے کی انگلیوں کے نشانات تھے لیکن ایلس کے نہیں۔ اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟''

''اس کا مطلب ہے کہ اس نے ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''شاید وہ جانتی ہو کہ ان بوتلوں میں کیا ہے اور اس نے دستانے پہن رکھے ہوں جبکہ اس کے باپ کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔''

صاف ظاہر تھا کہ کلّے نے میرے مقابلے میں انہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔

''وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ان بوتلوں میں جو کچھ ہے۔ وہ اس نے چرا کر پیراک بوئے میں چھپا دیا تھا۔ اس طرح وہ جھوٹ بول کر اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے؟''

''میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے مجھ سے اپنی بیٹی کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔''

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ریڈ باسٹن کے کاٹیج میں ہے؟''

''یہ مجھے وہاں جا کر پتا چلا۔''

''تم وہاں اس لیے گئے تھے کہ چند گواہوں کو خاموش کر سکو۔''

''کیا تم یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہو؟''

''تم پر فی الحال کوئی الزام نہیں ہے مسٹر کیری گن۔ یہ محض ایک غیر رسمی تفتیش ہے۔''

''لیکن تم ایلس اور اس کے باپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو۔''

''نہیں، اسے صرف گواہ کے طور پر روکا گیا ہے۔ تاہم اسے نائٹ کے ٹریلر پر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ البتہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ٹھہر جا سکتی ہے۔''

''کیا تم اسے تحفظ فراہم کر رہی ہو؟''

وہ مسکرائی اور لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہاری خدمات کس لیے حاصل کی گئی تھیں۔''

☆☆☆

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔'' اس شام سلویا نے میرے بستر کی چادر بدلتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایلس کو چارے کے طور پر چھوڑ رہے ہیں۔''

''وہ ایسا نہیں کریں گے۔''

''تم بہت سادہ لوح ہو۔ اب معاملہ مختلف ہو گیا ہے۔ وہ محض زہر نہیں بلکہ ہتھیار ہے۔ اسٹیو نائٹ پر بغاوت کا جرم عائد ہو سکتا ہے۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے سب کچھ کریں گے۔ یہ ایک جنگ ہے ڈیوڈ اور ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایک عورت کی زندگی خطرے میں ڈالیں گے؟''

''پھر تم اسے پکڑو۔''

ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر میں سماعت کئی گھنٹوں تک جاری رہی اور اس کا اختتام میرے حق میں ہوا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ میں نے جو کچھ گولی چلانے کے بارے میں بتایا۔ وہی بیان ایلس اور اسٹفی نے بھی دیا۔ انہوں نے میرا یہ موقف بھی تسلیم کر لیا کہ میں ممنوعہ اشیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور مجھے ایک پرانے دوست نے اپنی بیٹی کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔

''کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ایلس نے وہ زہر چوری کیا تھا؟'' میں نے بوٹی سمپسن سے پوچھا جو میرے ساتھ سگریٹ پینے باہر آئی تھی۔

''تم کبھی نہیں جان سکتے کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کیا سوچ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اس بوئے تک جا سکتی ہے جہاں وہ کلّے کو ملا۔ جھینگے پکڑنے والے کبھی وہاں نہیں جاتے۔ کیا وہ وہاں کوئی چیز چھپا سکتے ہیں؟''

ایلس کو وہ جگہ معلوم تھی۔ اس نے اسکول کے زمانے میں جھینگوں کی تلاش میں کھاڑی کا چپا چپا چھان مارا تھا۔ اس کی اپنی کشتی بھی تھی۔ میں سیدھا اس کے پاس آیا۔ کلّے

آتش دان کے پاس اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا اور ایلس اخبار پڑھ رہی تھی۔

''تمہارا خیال ہے کہ انہوں نے تمہاری بات کا یقین کرلیا؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا۔ بس اتنا کہا کہ مجھے گواہی دینا ہوگی۔''

''یہ ان کی بہترین گواہ ہے۔'' کلے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے یہ بھی میری ہی غلطی ہے کہ انہوں نے اس کی حفاظت پر کسی کو مامور نہیں کیا۔

''میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔'' میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''دیکھ لینا۔ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔'' کلے نے کہا۔

''یہ میں نے اسی کے لیے کیا تھا۔'' ایلس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ بدقسمتی ہے۔''

اس نے ایف بی آئی کو بتایا کہ اسٹیو نے اسے پیرس لے جانے اور پرتعیش زندگی گزارنے کا جھانسا دیا تھا لیکن یہ وہ کیسے کرے گا۔ وہ تو قلاش ہو چکا تھا۔ باسٹن نے اسے معاملات سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی لیکن اسٹیفی نے شیخی بگھارتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا۔

''میں خوف زدہ ہوگئی تھی۔'' اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جانے دے گا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں صرف اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''تم اس سے محبت کرتی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکتی۔ کبھی کبھی میں چاہتی تھی کہ اس سے نجات حاصل کرلوں۔''

''جب اس نے پہلی بار مارا تو تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟''

''میں نہیں جانتی لیکن میں صرف اسے بچانے کے لیے ایسا کر رہی تھی۔ شاید مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ شاید میں اس کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ میں احمق تھی۔ مجھے ان کی بات سننی چاہیے تھی۔'' اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آئے گا؟''

''میں یہ توقع نہیں کرسکتی کہ تم ہر رات میری حفاظت کے لیے آتے رہو گے۔''

''پولیس اسے تلاش کرلے گی۔ اب زیادہ دیر روپوش رہنا ممکن نہیں۔''

چوتھی شام میں کلے کے گھر جانے والی سڑک پر جا رہا تھا کہ میری نظر ایک کار پر پڑی جو جھاڑیوں میں آدھی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی جیپ اس طرح کھڑی کی کہ اسے نکلنے کا راستہ نہ مل سکے۔ میں نے اپنی بریٹا گن نکالی اور جنگل میں داخل ہو کر اس راستے پر چل پڑا جو کاٹیج کی طرف جاتا تھا۔ میں ایک کھڑکی کے باہر کھڑا ہوگیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اسٹیو صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور کلے کی شاٹ گن اس کے زانو پر رکھی ہوئی تھی۔ کلے آتش دان کے پاس بیٹھا ہوا تھا جبکہ ایلس کرسی پر بیٹھی اسٹیو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوف ٹپک رہا تھا۔

میں اسٹیو کا موڈ نہ جان سکا اور نہ ہی یہ سمجھ میں آیا کہ وہ ایلس سے کیا کہہ رہا تھا۔ اگر میں مداخلت کرتا تو شاید وہ یہ سمجھ کر ایلس کو گولی مار دیتا کہ پولیس نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔ چنانچہ میں کاٹیج کے عقبی حصے کی طرف گیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ پھر میں دبے پاؤں چلتا ہوا لیونگ روم کے دروازے پر پہنچا۔ جیسے ہی اسٹیو کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور شاٹ گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ میری گولی اس کے سینے کے وسط میں لگی۔ گن اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس نے جھک کر اٹھانا چاہا لیکن فرش پر گر پڑا۔

صبح ہوتے ہی کمرے میں فارنسک ٹیکنیشن مقامی ڈاکٹر اور دو پولیس سراغ رساں آ گئے۔ رسمی کارروائی کے بعد لاش کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ دن میں یا اگلے روز ہم سے پوچھ گچھ ہوگی۔

ایلس نے کہا کہ وہ رات بھر نہیں سوسکی۔ وہ مجھے اور کلے کو کچن میں لے گئی اور ہمارے لیے کافی بنائی۔ ''میں نہیں رہوں گی تمہارے پاس۔'' اس نے اپنے باپ سے کہا۔ ''یہ نہیں جانتی کہ کب تک لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' کلے نے پوچھا۔

''تم مجھے کام کرنے سے نہیں روکو گے۔''

''منظور ہے لیکن تم بھی کسی ایسے شخص سے دوستی نہیں کرو گی جو مجھے پسند نہ ہو۔''

''میں یہ غلطی دوبارہ نہیں دہراؤں گی۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ یہ غلطی نہ کرتی تو ہم بھی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے۔

☆☆☆

آسان مشکل

مظہر سلیم ہاشمی

فتح کا نشہ تو کچھ دیر بعد اُتر جاتا ہے... مگر شکست کے بعد جو زخم لگتے ہیں... وہ جلد ٹھیک نہیں ہوتے... ایک ایسے ہی خونیں جرم کی روداد... جو نہایت آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا...

خبر کی تلاش میں سرگرداں ایک ٹی وی رپورٹر کا کارنامہ......

سان فرانسسکو کے ایک نواحی قصبے میں آج صبح سے ہی غیر معمولی چہل پہل تھی۔ یہاں کے اکلوتے تھانے میں چیف نارمن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ ذہین اور قابل افسر تھا لیکن اپنی ایمان داری کی پاداش میں اس جگہ تعینات کیا گیا تھا۔ زندگی بڑی بیکاری گزر رہی تھی کیونکہ یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے اور زیادہ سے زیادہ شکایت بھی کسی کی نشے میں غل غپاڑا کرنے کی آجاتی تھی، لیکن آج صبح سے وہ اس قتل کی واردات پر غور کر رہا تھا۔

''کل رات پچھلے پہر قصبے کے سب سے امیر لینڈ لارڈ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔'' ٹی وی پر ایک زنانہ آواز گونجی اور وہ اپنی سوچ کے دھارے سے باہر نکل آیا، غالباً اس کے نائب گراہم نے آواز اونچی کر دی تھی۔ وہ بھی نوجوان رپورٹر کی رپورٹ غور سے دیکھنے لگا۔

''چیف نارمن کے مطابق پولیس نہایت جانفشانی سے معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے مگر ابھی تک تفتیش کا دائرہ نامعلوم افراد کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ آپ تک تازہ ترین اپ ڈیٹ ہم پہنچاتے رہیں گے، میں ہوں شیلی ریورز......''

رپورٹ کے باقاعدہ اختتام سے پہلے ہی گراہم نے آواز بند کر دی۔

چیف نارمن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ لینڈ لارڈ مسٹر ہیمپٹن کا دو منزلہ مکان نظر آ رہا تھا جہاں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

''یہاں کے لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے کہ سارا دن جائے وقوعہ پر گھومتے پھر رہے ہیں......''

''نہیں چیف۔'' گراہم بولا۔ ''بس ایک چھوٹا سا کیسینو ٹائپ کلب ہے وہاں چلے جاتے ہیں۔''

''وہ بھی بڑی بکواس جگہ ہے، کام دھندا کچھ کرنا نہیں ہوتا ان لوگوں نے اور الزام انتظامیہ پر کہ وہ کرپٹ ہے۔'' چیف نارمن نے نخوت سے کہا۔

''چیف، وہ کلب میرے بھتیجے کا ہے جی۔'' گراہم کے لہجے میں اب دبا دبا احتجاج تھا۔

''اچھا زیادہ بحث نہ کرو اور مجھے ایک مرتبہ پھر سے اب تک اکٹھے ہونے والے حقائق بتاؤ۔'' چیف نارمن نے جھینپ مٹانے کے لیے ڈانٹ کر کہا...... وہ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

''چیف، ہمیں مسٹر ہیمپٹن کی لاش اُس کے گھر کے ڈیپ فریزر سے ملی، جب ڈاکیا چارلس یہ اطلاع لے کر آیا کہ گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ عام طور پر جمی ہوئی لاش ملنا ایک اچھی خبر ہوتی ہے......''

یہ کہہ کر گراہم ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ ''معافی چاہتا ہوں، میرا مطلب تھا کہ پولیس کے لیے اچھی خبر کہ کوئی ثبوت ضائع نہیں ہوتا......''

''کام کی بات کرو گراہم...'' نارمن نے ایک بار پھر ٹوکا۔

''اوہ چیف، میرا مطلب یہ ہے کہ جمی ہوئی لاش ثبوتوں کے حوالے سے اچھی خبر ہوتی ہے پر اس کیس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی بھاری چیز سر پر مار کر قتل کیا گیا ہے اور لاش کو فریزر میں ڈال دیا گیا۔ اس سے زیادہ کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ لاش فریز ہو جانے کی وجہ سے پوسٹ مارٹم میں قتل کے وقت کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گھر کی بھی تلاشی لی ہے، ڈکیتی کا کوئی نشان تک نہیں ملا ہے۔ ملزمان کے بیانات بھی لے لیے ہیں، میرا مطلب ہے اس سے رابطہ رکھنے والے لوگوں کے بیان......''

آخری بات اس نے چیف نارمن کے گھورنے پر بدلی تھی۔

''ہمارے پاس مسٹر ہیمپٹن کے بیٹے ڈون، بیٹی جیسیکا، دوسری بیوی ایرن اور چارلس ڈاکیے کے بیان موجود ہیں۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو......'' گراہم نے اپنی بات مکمل کی۔

چیف نارمن کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہم کوئی اہم تفصیل نظر انداز کر رہے ہیں...... ایک بار پھر سب کو بلاؤ، میں اس بار سب سے خود بات کرنا چاہتا ہوں۔'' نارمن یہ کہہ کر کیس کی فائل کی جانب متوجہ ہو گیا جبکہ گراہم نے نظر بچا کر اس کو زبان دکھا دی۔ کام کرنے سے اس کی جان جاتی تھی اور اُدھر چیف نے کام دگنا کر دیا تھا۔

☆☆☆

''میرا باپ قصبے کا امیر ترین شخص تھا، کوئی بھی اُس کی دولت کے لیے اس کو مار سکتا ہے...... آپ کے خیال میں، میں نے اپنے باپ کو مارا ہے؟'' ڈون کے انداز میں برہمی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ ''پچھلے اتوار کو ہی ہم نے اکٹھے ڈنر کیا تھا اور رات میں نے حویلی میں ہی گزاری تھی، ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے...... اور جب سے میں نے اپنا بزنس شروع کیا ہے وہ تب سے مجھ پر فخر کرتے تھے۔'' لفظ تعلقات پر ڈون نے زور دے کر اپنی بات مکمل کی۔

''اپنا بزنس کیا تم نے اپنے باپ سے بھاری قرضہ لے کر شروع نہیں کیا؟'' چیف نارمن نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، لیکن ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے۔'' ڈون گڑبڑا کر بولا۔

''اچھی بات ہے...... کیا ان اچھے تعلقات کی وجہ سے تم اکثر اپنے باپ سے ملنے آتے تھے؟'' چیف نارمن نے ایک اور سوال کیا۔

''پہلے میں اکثر ہر ہفتے شہر سے ملنے آتا تھا، پر جب

سے اس کمینی...... میرا مطلب اس ایرن سے انہوں نے والدہ کی وفات کے بعد دوسری شادی کی ہے میرا آنا جانا کم ہوگیا ہے۔ وہ ان کی دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئی ہے۔ اب تو انہوں نے قرضہ بھی......'' ڈون بولتے بولتے رک گیا۔

''واپس مانگ لیا ہوگا۔'' چیف نارمن نے بات پوری کر دی۔ ''آپ جا سکتے ہیں پر ابھی آپ قصبہ نہیں چھوڑ سکتے۔'' چیف نارمن نے یہ کہہ کر اسے چلتا کیا۔

☆☆☆

''مجھے یقین نہیں آ رہا وہ مر چکے ہیں۔'' جیسیکا کی آنکھوں سے وہ آنسو بہنے لگے جن کا بیان دینے سے قبل نام و نشان تک نہ تھا۔ ''میں اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔''

''اچھا...... تو آپ پچھلے اتوار کو ان سے ملنے یہاں آئی تھیں فیملی ڈنر کے لیے؟'' چیف نارمن نے پوچھا۔

''نہیں، جب سے انہوں نے ایرن سے شادی کی ہے، فیملی ڈنر تب سے لڑائی جھگڑے کی جگہ بن چکے ہیں۔ ایرن اور ڈون کی آپس میں بالکل بھی نہیں بنتی اور اکثر اوقات بات تلخ کلامی سے بڑھ جاتی تھی۔ اس لیے میں نہیں آئی۔'' جیسیکا نے انکار میں جواب دیا۔

''آپ کی اس بارے میں بات ان سے کب ہوئی؟'' اس بار سوال گراہم نے کیا۔

''سوموار کی رات بات ہوئی تھی، وہ بتا رہے تھے کہ اتوار کو ڈنر پر ایرن اور ڈون کی وجہ سے بہت بدمزگی ہوئی۔ ڈون تو چلا گیا تھا صبح ہی بغیر ناشتا کیے لیکن ایرن نے دماغ کھایا ہوا ہے، اس کو بھی کل صبح اس کی بہن کے ہاں سان ڈیاگو بھجوا دیں گے۔'' جیسیکا بولی۔

''اس کے بعد پھر کوئی بات ہوئی؟'' چیف نارمن نے پوچھا۔

''ہاں اس منگل کی شام کو میں نے پھر فون کیا تھا۔ بڑے افسردہ محسوس ہو رہے تھے، ایرن کے جانے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔'' اس نے گلوگیر ہوتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے آپ سے اپنے قتل کے بارے میں تو کوئی بات نہیں کی؟'' گراہم کے اس سوال پر چیف نارمن نے سر پیٹ لیا۔

''دیکھیں جی...... آپ کو لگ رہا ہوگا کہ مجھے ایک بہت بڑی جائداد ملنے والی ہے اس لیے میں نے اپنے باپ کا قتل کر دیا تو ایسی کوئی بات نہیں...... جتنا مجھے ملے گا اس سے دگنا ڈون کو ملے گا...... اور تو اور اس نے ایک بہت بڑی رقم بھی بطور قرض لے رکھی تھی ڈیڈی سے...... آپ اس پر تحقیق کریں، میری جان بخش دیں......'' اس کے انداز میں درشتگی آ گئی تھی۔

چیف نارمن نے گراہم کو اشارہ کیا کہ وہ جیسیکا کو باہر تک چھوڑ آئے۔

☆☆☆

ایرن کے چہرے پر بظاہر افسردگی تھی مگر آنکھوں کی مسکراہٹ چیف نارمن کی تیز نگاہوں میں آ گئی تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی چونتیس پینتیس سالہ خوبصورت نقوش والی عورت تھی۔ مسٹر ہیمپٹن کا اس سے دوسری شادی کرنا بنتا تھا جبکہ پہلی بیوی بھی اگلے جہان روانہ ہو چکی تھی۔

''مسٹر ہیمپٹن تو مجھ قسمت کی ماری سے بڑی محبت کرتے تھے، پر یہ رزیل ڈون ہی آ کر ان کے کان بھرتا تھا۔'' اس نے سمع خراش لہجے میں کہا۔ خوبصورتی اس میں صرف دکھائی دیتی تھی، سننے میں اس کی آواز بہت بری تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ خاموش رہتی تو بہت اچھی لگتی۔

''باپ کا اتنا پیسہ کھا لیا پر چین نہیں آیا اس کمینے کو...... مار دیا آخر۔ چیف...... آپ اس کو گرفتار کر لو۔ اتوار کی رات بھی وہ مسٹر ہیمپٹن کو بڑی باتیں سنا کر اپنے کمرے گیا تھا۔ ادخدیا! اب میرا کیا ہوگا؟'' آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا نقلی غم اصلی خوف میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو اس نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کیا تو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

اس سب رونے دھونے میں چیف نارمن کو مزید کام کی صرف اتنی بات معلوم ہو سکی کہ ڈرائیور چھٹی پر تھا تو صاحب نے اسے ائرپورٹ چھوڑنے کے لیے ٹیکسی منگوا دی تھی اور اس بات پر ان کی بحث بھی ہوئی تھی۔ چیف نارمن نے اس کو روانہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''کیا محبت بھرا خاندان ہے، اب ڈاکیے کو بلا لوں؟'' گراہم کے استفسار پر چیف نارمن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں مزید گہری ہو گئی تھیں۔

''چیف...... مجھ غریب کو کیوں پکڑ لیا آپ نے؟ میں نے تو الٹا آپ کو اطلاع دی تھی کہ کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے مسٹر ہیمپٹن کے گھر میں۔'' چارلس ڈاکیے کے انداز میں خوف تھا۔

''پکڑا نہیں ہے، بس تھوڑی سی معلومات چاہیے تھی، ایک بار پھر سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔'' چیف نارمن نے نرمی سے کہا۔

''مسٹر ہیمپٹن جناب اس کے بڑے شوقین تھے، کیا بولتے ہیں جناب آن لائن شاپنگ کے۔ جب بھی ان کا سامان آتا تھا وہ پہلے سے گیٹ پر موجود ہوتے تھے۔ منگل والے دن بھی میں سامان لے کر گیا تھا۔ اس وقت وہ مسز ہیمپٹن سے تو تکار کر رہے تھے اور ایک ٹیکسی بھی گیٹ پر موجود تھی۔ پھر مسز ہیمپٹن بھی لڑتی جھگڑتی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔ اس دن ہیمپٹن صاحب نے پیکٹ لینے کے بعد کوئی انعام بھی نہیں دیا تھا مجھے۔ پر آج صبح جب میں پیکٹ لیکر پہنچا تو وہ گیٹ پر نہیں تھے۔ میں نے بیل بھی بجائی پر کوئی نہیں آیا۔ مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا میں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔'' چارلس نے اپنا بیان مکمل کیا۔

چیف نارمن کے کہنے پر گراہم نے چارلس کو باہر بٹھا دیا اور خود واپس آ کر بیٹھ گیا۔

''ایک گوشہ نشین مقتول، جو خال خال ہی کسی سے رابطہ کرتا ہے، کئی لوگوں سے اس کی دشمنی ہے، قتل کرنے کے بھی کئی محرک موجود ہیں، کوئی گواہ نہیں، کوئی ثبوت نہیں اور میری جان اس گورکھ دھندے میں پھنس گئی۔'' نارمن نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کیس کا مکمل تجزیہ کر ڈالا۔

''چیف..... خود پر بھروسا رکھیں، کچھ نہ کچھ تو جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔'' گراہم نے دلاسا دیتے ہوئے کہا، انداز میں اس کے بھی بے یقینی سی تھی۔

''یہ کیس تو چوں چوں کا مربا بن گیا ہے..... کیسے حل کیا جائے اس کو؟ کوئی بھی نہیں جانتا کہ مسٹر ہیمپٹن کی موت کب ہوئی..... اب کیا کیا جائے؟'' اس نے شکایتی انداز میں پھر گراہم سے پوچھا۔

''چیف..... لنچ ٹائم ہو رہا ہے..... اس کے بعد کچھ اور غور کرتے ہیں۔'' گراہم بولا۔

یہ بات نارمن کے دل کو لگی چنانچہ وہ اٹھ کر قریبی ریستوران کی جانب روانہ ہو گیا۔ کوشش کر کے اس نے کیس کی تفصیلات کو دماغ سے نکالا اور ساری توجہ کھانے کی جانب مرکوز کر دی۔ اسے یاد آیا تھا کہ اگر ایک معاملے پر سے دھیان ہٹا لیا جائے تو اس سے جڑی کچھ باتیں لاشعور سے شعور تک آسانی سے پہنچ جاتی ہیں۔ برگر اور فرائز کھاتے ہوئے ایک بات جو اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی، واضح ہو گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ پولیس اسٹیشن واپس پہنچ کر اس نے گراہم کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ایک بار پھر سے شکایات کا پٹارا کھولنے کے بجائے اس نے سوچا کے اپنے ذہن میں امڈنے والے

سیڑھی سے گرے ہیں..... بیچارے دیوار میں کیل ٹھونکنے چڑھے تھے!

خیالات کے بارے میں اس سے مشورہ کر لے۔

''اگرچہ یہ کوئی واضح ثبوت نہیں پر ہم ہوشیاری سے کام لیں تو قاتل کو گھیرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' چیف نارمن نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد بات کے لیے تمہید باندھی۔

''چیف..... گھیرنے کو تو آپ کسی کو بھی گھیر سکتے ہیں۔'' گراہم نے قدرے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے میں سر پہ کوئی چیز دے ماروں گا۔'' چیف نارمن کا انداز تنبیہی تھا، یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ میز پر دھرے کاغذات پر موجود پیپر ویٹ کی جانب بڑھ گیا۔

''سوری چیف.....'' گراہم نے مزاج کی تبدیلی محسوس کرتے ہی معذرت پیش کر دی اور پھر مزید کہا۔ ''آپ بتائیں کہ کس سراغ کی بات کر رہے ہیں؟''

''ایک شخص نے اس کیس کے بارے میں انکشافانہ انداز میں ایک بات کہی ہے، اگر میرا اندازہ صحیح نکلا تو ہم یہ کیس وقت سے پہلے حل کر لیں گے۔''

''کیا بات کہی ہے؟ کس نے کہی ہے؟'' گراہم نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھو، ڈاکیا کہتا ہے کہ وہ اپنی ڈاک وصول کرنے کے لیے گھر پر ہی ہوتا تھا، صحیح؟'' چیف نارمن نے بات شروع کی۔

''بالکل صحیح۔''

''اور آخری بار اس کا کسی سے کنفرم رابطہ ہوا تو وہ اس کی

بیٹی کا منگل کی شام کو کیا گیا فون ہے۔ لاش منجمد ہو چکی ہے اور ایسی حالت میں ہے کہ ہم تعین ہی نہیں کر سکتے کہ اس کو تین گھنٹے پہلے مارا گیا ہے کہ تین دن پہلے۔ اب بتاؤ قتل کا وقت کیا ہوگا؟'' چیف نارمن نے بات پوری کرنے کے بعد سوال داغ دیا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' گراہم کے لہجے میں تحیر تھا۔'' منگل کی شام سے لے کر ڈاکیے کے لاش ڈھونڈنے کے موقع تک کوئی بھی وقت ہو سکتا ہے۔'' وہ محتاط انداز میں بولا۔

''ہم اس کیس کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے ہیں، اور قتل کے وقت بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائے جبکہ......'' وہ گراہم کو تفصیل سے اپنے دماغ میں آنے والے انوکھے خیال کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆☆

نک سک سے تیار شیلی ریورز اس وقت تھانے میں چیف نارمن کے سامنے بیٹھی تھی۔ گراہم نے اس کو کیس کے بارے میں اہم پیش رفت سے آگاہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔ ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں وہ میک اَپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے فرسودہ ماحول میں بالکل الگ ہی نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر سجی دل آویز مسکراہٹ کئی دل جلوں کی جان لینے کے لیے کافی تھی۔

''مس ریورز ...... آپ کا اس کیس پر معلومات کا ذریعہ کون ہے؟'' چیف نارمن نے رسمی سلام دعا کے بعد مدعا بیان کیا۔

''آپ ہی تو ہیں۔ آپ بھول بھی گئے، آپ نے ہی مجھے لاش کی دریافت کے بعد سب کچھ بتایا تھا۔ جو کہ آپس کی بات ہے کچھ زیادہ نہیں تھا۔'' شیلی ریورز نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔ اس کی دلکش آواز میں شکایت در آئی تھی۔

''صحیح، مجھے یاد ہے اچھی طرح، بس میں آپ سے اس بات کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ میرے علاوہ تو کوئی اور آپ کو اس کیس پر معلومات نہیں دے رہا۔'' یہ کہتے ہوئے چیف نارمن نے کن انکھیوں سے گراہم کی جانب دیکھا جو یہ سن کر ہوشیار ہو گیا۔

''نہیں، اور تو کوئی بھی نہیں ہے۔ جو آپ نے بتایا وہی میں نے رپورٹ کر دیا۔'' مس ریورز نے سادگی سے جواب دیا اور پھر تجسس سے بولی۔'' کیا کوئی نئی معلومات ہیں جن کو میں رپورٹ کر سکوں؟''

''ہاں ہمیں ایک مشتبہ شخص کے بارے میں اطلاع ملی ہے، کیا تم نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ مسٹر ہیمپٹن کو کل رات کے کسی پہر قتل کیا گیا ہے؟'' چیف نارمن نے اس کے سوال کا جواب دیتے ساتھ ہی اپنا ایک سوال کر دیا۔

''بالکل کہا ہے۔'' مس ریورز نے جواب دیا۔

''کون سے پہر؟ کیا رات کے آخری پہر میں؟'' چیف نارمن نے اگلا سوال کیا۔

''ہاں جی...... اوہ...... شٹ۔'' اب کی بار شیلی روانی میں جواب دیتے دیتے گڑبڑا گئی۔

''ہمم...... شٹ کہیں یا لعنت بھیجیں مس ریورز...... مسٹر ہیمپٹن کی آخری بار کسی سے بات ہوئی تو وہ اس کی بیٹی تھی اور رات بھی منگل کی۔ قتل کا ٹائم معلوم کرنا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ لاش کو کسی نے فریزر میں ڈال کر اس کی قلفی ہی بنا دی ہے۔ ہم بہترین اندازہ بھی لگائیں تو قتل کا وقت منگل کی رات سے لے کر آج صبح تک کا کوئی لمحہ ہوگا۔ پر ایسا لگتا ہے کہ آپ کو پوری معلومات تھی کہ کب موت ہوئی...... میں نے جب پہلی بار آپ کو رپورٹ کرتے سنا تو مجھے شک ہوا...... خیر تھوڑی دیر بعد شک ہوا کہ جو تفصیل آپ بتا رہی ہو وہ اس معاملے میں کسی انجان شخص کی ہو ہی نہیں سکتی۔''

تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اب اعتراف جرم کر لو کیونکہ جو کچھ کہا وہ ابھی ریکارڈ کر لیا گیا ہے اور ٹی وی رپورٹ کی ریکارڈنگ حاصل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔''

چیف نارمن جیسے جیسے بات مکمل کرتا جا رہا تھا ویسے ویسے مس ریورز کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور چمکتا رنگ گراہم کے ہاتھ میں موبائل کیمرا دیکھ کر مزید زرد پڑ گیا۔

''لعنت ہو اس قصبے پر...... چینل والوں نے مرغوں کی لڑائی یا گھوڑوں کو نہلانے والی مزید رپورٹیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔'' وہ پھٹ پڑی۔'' مجھے نوکری سے نوٹس مل چکا تھا...... کسی اصل خبر کی تلاش میں، میں مر رہی تھی، پھر مجھے خیال آیا کہ میں ہی کیوں مروں؟ کوئی اور مرے گا تو خبر بنے گی اور رات میں ایک تنہا بڈھے کو مارنا کون سا مشکل کام ہے؟'' وہ ہذیانی انداز میں بولتی جا رہی تھی۔ یہ اس کا اعتراف جرم تھا۔

چیف نارمن کے اشارے پر گراہم اس کو لاک اَپ میں بند کرنے لے گیا۔ وہ تاسف سے اس حسین پیکر کو چلاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو خبر بنانے کے چکر میں خود خبر بن گئی تھی۔

☆☆☆

ممنوعہ علاقہ

تنویر ریاض

ماضی سے جڑی کئی داستانیں آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہیں... ان کا پُراسرار حصار اس قدر قوی ہے کہ مکین اس سے نکل ہی نہیں پاتے... کرۂ ارض کے ایک ایسے ہی خطے سے تعلق رکھتی کہانی... پہاڑوں اور چٹانوں کی گہرائیوں میں کئی انہونی قصے سانس لے رہے تھے... آثارِ قدیمہ کے ماہر کی تلاش و جستجو کا سفر جاری تھا... مگر کوئی اَن دیکھی مخلوق انہیں اس علاقے سے نکلنے پر مجبور کر رہی تھی...

پُراسرار سرزمین سے وابستہ تحیر انگیز واقعات کی بازگشت

میں گریٹ وال کافی شاپ میں اکیلا بیٹھا نیم گرم کافی کی چسکیاں لے رہا تھا جبکہ سڑک پار لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ان دکانوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں کسی یورپی ملک غالباً سوئٹزرلینڈ سے کوئی نئی کھیپ آئی تھی۔ میرا نام ال یونگ ہے اور انگریزی میں اس کا مطلب فرسٹ ڈریگون ہے۔ میرے ڈیڈی امریکن اور ماں کورین تھی۔ اس لیے باپ نے میرا امریکی نام رکھا لیکن ماں کا اصرار تھا کہ میرا کورین نام بھی ہونا چاہیے۔ ڈیڈی کا ارادہ تھا کہ وہ میرے چھوٹے بھائی کا نام سیکنڈ ڈریگون رکھیں گے لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا کیونکہ اس سے پہلے ہی میرے والدین میں طلاق ہو گئی۔ بہرحال میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو امریکی نہیں سمجھا۔ میرے ڈیڈی امریکی فوج میں نان کمیشنڈ افسر تھے۔ اس لیے ہمیں دنیا کے کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارا زیادہ وقت کوریا میں گزرا۔ لہٰذا میں انگریزی اور کورین زبان بڑی روانی سے بول لیتا ہوں اور اب میرا قیام بیجنگ میں ہے جہاں میں گزر اوقات کے لیے سراغ رسانی بالخصوص گمشدہ

افراد کی تلاش کا کام کرتا ہوں۔ میرا کوئی باقاعدہ دفتر نہیں ہے کیونکہ اس طرح چینی حکام مجھے تلاش کر کے بھتہ مانگنا شروع کر دیں گے۔ وہ اس رشوت کو ٹیکس کا نام دیتے ہیں۔ گاہکوں کو تلاش کرنے کے لیے مجھے ماؤتھ پبلسٹی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے میں ان گاہکوں کے انتظار میں زیادہ وقت کافی شاپ میں گزارتا ہوں۔

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گاہک کو آنے میں بیس منٹ کی تاخیر ہوگئی تھی۔ میں مایوس ہو کر وہاں سے اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کافی شاپ میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس نے ایک نظر خالی شاپ پر دوڑائی اور میرے پاس آکر بولی۔

''کیا تم انگریزی میں بات کر سکتے ہو؟''

میں نے ہاں میں سر ہلایا تو اس نے پوچھا۔ ''تم ال یونگ ہو؟''

میں نے ایک بار پھر سر ہلایا تو وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں ملی کورم ہوں۔''

ایک چینی ویٹرس ہمارے قریب آئی تو کورم نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ منہ بناتے ہوئے چلی گئی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' مسز کورم نے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم قابلِ بھروسا ہو اور انگریزی بھی بول لیتے ہو۔ اس کے علاوہ باڈی گارڈ کے طور پر بھی کام کر چکے ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں میرے کندھوں اور بازوؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ ''تم خاصے مضبوط نظر آتے ہو۔''

اس کی بات سن کر میں مسکرا دیا۔ ''تمہاری فیس کتنی ہے؟'' مسز کورم نے پوچھا۔

میں نے اپنی فیس بتادی جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے مزید کہا۔ ''نقد۔ آدھی فیس پیشگی۔''

وہ کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم نقد ادائیگی نہیں کرتے۔''

''ہم کون؟'' میں نے پوچھا۔

''میری کارپوریشن۔ کورم انٹرنیشنل۔ تم نے یہ نام ضرور سنا ہوگا۔''

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے واقعی میں نے وہ نام سن رکھا ہے۔

''اس کا ایک بہت بڑا اسکینڈل بن گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اپنے پہلے شوہر انڈی کورم سے طلاق کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا جس نے اس کمپنی کی بنیاد رکھی تھی۔ میں نے اس کے آدھے اثاثوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پر وہ اتنا پریشان ہوا کہ اسے دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ طلاق کی کارروائی مکمل ہونے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔''

''اور تمہیں ورثے میں پوری کمپنی مل گئی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یاد آگیا کہ میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تھی۔''

''ہاں، اسی لیے اس کا خاندان مجھ سے نفرت کرتا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر ہال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایک جہاز ائرپورٹ پر میرا انتظار کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ ''تم میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟''

میں کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''اگر اس کام میں سفر بھی کرنا ہے تو میری فیس میں پچاس فیصد کا اضافہ کرلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور کافی شاپ سے باہر نکل گئی۔ میں اپنا پاسپورٹ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا اور اپنی کل جمع پونجی بھی چمڑے کی پیٹی کے ساتھ باندھ رکھی تھی جو اس وقت تقریباً چھ سو ڈالر سے بھی کم تھی اسی لیے میں نے فوراً ہی مسز کورم کی پیشکش قبول کرلی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا اس لیے ہم بہ آسانی اپنے پاسپورٹ دکھا کر سیکیورٹی پوسٹ سے گزر گئے۔ رن وے پر ایک پرائیویٹ جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ پائلٹ، معاون پائلٹ اور وردی میں ملبوس دو فضائی میزبان ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ تعظیماً جھک گئے۔ ایک فضائی میزبان نے مسز کورم کا سفری بیگ پکڑ لیا جبکہ میرے پاس ایسا کوئی بیگ نہیں تھا۔

ہم نے اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ جہاز کے دروازے بند ہوئے اور انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ میں نے مسز کورم کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

وہ یہ سوال سن کر کچھ پریشان ہوگئی اور بولی۔ ''میرے شوہر کو تلاش کرنے۔''

''مسز کورم۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی چند منٹ پہلے تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''پھر ہم اسے کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟''

''کیونکہ وہ گم ہوگیا ہے۔''

میں نے اپنے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''وہ گم نہیں ہوا مسز کورم، وہ مر چکا ہے۔''

''تم میرے پہلے شوہر کی بات کر رہے ہو تو وہ واقعی مر چکا ہے۔''

''پھر تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''میرا دوسرا شوہر بیری ابریسٹن۔ میں نے اپنے پہلے

شوہر کے مرنے کے بعد اس سے شادی کرلی تھی۔‘‘

کچھ دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ میں نے ایک فضائی میزبان سے پانی مانگا جب وہ آئی تو میں نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔ ’’ہم کہاں جارہے ہیں؟‘‘

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ ’’تم نہیں جانتے؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں۔‘‘

’’یولان باتار۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’تمہارا مطلب ہے منگولیا؟‘‘

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں منگولیا۔ تمہیں اور کچھ چاہیے؟‘‘

’’نہیں شکریہ۔‘‘ میں نے کہا۔

ائرپورٹ پر ایک شخص پلے کارڈ لیے کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ منگولین کسٹم آفیسر ہے۔ اس نے ہمیں فرسٹ کلاس سروس دی اور پاسپورٹ چیک کرنے کے بعد بذاتِ خود ہمیں وی آئی پی ٹرمنل تک لے کر گیا۔ میں نے شیشے کی کھڑکی سے دیکھا۔ کچھ افسروں نے جہاز کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

’’یہ کیا کررہے ہیں؟‘‘ میں نے مسز کورم سے پوچھا۔

’’یہ جہاز کا معائنہ کررہے ہیں اور سامان کا بھی۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔‘‘

’’لیکن میرے پاس کچھ سامان ہے۔‘‘

جہاز سے کچھ سامان باہر آیا اور کنویئر بیلٹ پر لڑھکنے لگا۔ وہ دو مضبوطی سے بندھے ہوئے کرمچی تھیلے تھے۔ ان کے پیچھے دو پیٹھ پر لادنے والے تھیلے تھے۔ پندرہ منٹ میں سامان کا معائنہ مکمل ہوگیا اور اسے دوبارہ جہاز میں رکھ دیا گیا۔ ہم بھی واپس اپنی نشستوں پر آگئے۔ اب ہماری منزل مغربی منگولیا کا شہر ہووڈ تھا۔ یہ تین گھنٹے کی پرواز تھی۔ وہاں اترنے کے بعد ہمیں کسٹم کے مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا۔

’’یہاں سے ہم ٹرین میں سفر کریں گے۔‘‘ مسز کورم نے کہا۔

’’تیس منٹ بعد ہم ٹرین کے ایک فرسٹ کلاس کیبن میں تنہا بیٹھے تھے۔ ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور دو منٹ میں شہر کے مضافات سے نکل گئی۔ مسز کورم نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور سیل فون کان سے لگالیا پھر منہ بناتے ہوئے بولی۔ ’’سگنل نہیں آرہے۔‘‘

’’یہ تو بہت اچھی بات ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اب تمہارے پاس میرے سوالوں کا جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔‘‘

’’کیسے سوال؟‘‘

’’تم نے کہا کہ اپنے شوہر کو تلاش کرنے یہاں آئی ہو۔‘‘ میں بولا۔ ’’لیکن تم نے شروع میں یہ بات نہیں بتائی تھی۔ کیا تم اس کی وضاحت کروگی؟‘‘

اس نے ایک گہری سانس لے کر فون اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ دیا اور بولی۔ ’’وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں میرا ہم جماعت تھا لیکن گریجویشن کے بعد ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ وہ پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگا اور میں نے ہارورڈ بزنس اسکول سے ماسٹرز کرنے کے بعد وال اسٹریٹ میں ملازمت کرلی۔ میں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور مجھ پر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی دھن سوار تھی جبکہ بیری میوزیم میں جاکر قدیم انسانی ڈھانچوں پر تحقیق کررہا تھا۔ یہ وہ منزل نہیں تھی جس کی میں نے آرزو کی تھی پھر میری ملاقات انڈی کورم سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بیس برس بڑا اور ایک مختلف کلچر سے تعلق رکھتا تھا لیکن ذہانت اور صلاحیت میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے قدم پھسل گئے۔‘‘

’’اور تم نے اس سے شادی کرلی؟‘‘ میں نے کہا۔

’’شروع میں سب کچھ بہت اچھا تھا۔‘‘ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ’’لیکن پھر اس کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ ایک روایتی بیوی کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کام کروں اور خاندان والے بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بالآخر میں اس صورتِ حال سے تنگ آگئی۔ میں باہر نکل کر دوبارہ اپنا کام شروع کرنا چاہ رہی تھی۔‘‘

’’بیری کے بارے میں کیا کہوگی؟‘‘

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’وہ بہت ہی پیارا اور معصوم انسان ہے اور اب بھی ڈھانچوں پر کام کررہا ہے۔ اس سے میری ملاقات نیویارک کی ایک سائنس کانفرنس میں ہوئی اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔‘‘

’’وہ کب سے لاپتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’کیا وہ منگولیا آیا تھا؟‘‘

’’ہاں، دارالحکومت کی مخالف سمت میں التائی پہاڑیوں کے پاس ایک دورافتادہ گاؤں تساگان گول ہے۔ وہ وہیں سے لاپتا ہوا ہے۔‘‘

’’اور اب ہم وہیں جارہے ہیں؟‘‘

’’ہاں، وہ اپنے ایک ساتھی سائنس داں رک بینی کے ساتھ وہاں گیا تھا پھر انہوں نے پہاڑوں پر چڑھنا شروع کردیا۔ انہیں وہاں ایک مہینا قیام کرنا تھا لیکن تین مہینے ہوچکے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔‘‘

''کیا مقامی انتظامیہ نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی؟''
''ہاں کی ہے لیکن وہ پہاڑی سلسلہ بہت وسیع ہے اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس طرف گئے ہوں گے۔''
''کیا انہوں نے کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا؟''
''ہے مگر وہ کچھ مبہم سا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پہاڑ کی پہلی چوٹی سر کرنے کے بعد وہ اس جگہ کا سروے کریں گے اور پھر فیصلہ کریں گے کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں آثارِ قدیمہ تلاش کیے جائیں۔''
''گویا وہ ان پہاڑیوں میں کہیں بھی ہو سکتے ہیں؟''
''ہاں۔''
''انہیں کس چیز کی تلاش تھی؟'' میں نے پوچھا۔
''آثارِ قدیمہ اور انسانوں کی بنائی ہوئی کچھ چیزیں۔''
''مثلاً؟''
''پتھروں کے اوزار اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔ یہ بیری کا خاص مضمون ہے۔ وہ ہومی نیڈ پر ریسرچ کر رہا تھا۔ انہیں جدید انسان کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ یہ انسانوں سے پہلے کی نسل ہے۔''
''ہمیں ایک ترجمان کی بھی ضرورت ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اس کا کوئی انتظام کیا ہے؟''
''کیا ہے۔ اس کا نام بوسوکی ہے۔ وہ ہمیں اولگی کے اسٹیشن پر ملے گا۔''
''وہاں سے وہ گاؤں کتنی دور ہے؟''
''تقریباً دو سو میل یا اس کے لگ بھگ۔ وہاں ہمیں سڑک کے راستے سے جانا ہوگا۔ اولگی اسٹیشن پر ایک گاڑی ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔ فکر نہ کرو۔ میں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔''
اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ نیند کی آغوش میں چلی جاتی، میں نے کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ''مجھے بیری کے کام اور ہومی نیڈ کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔''
''زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کچھ سائنس دانوں نے خیال ظاہر کیا کہ موجودہ انسان سے ہم وجود والا آخری ہومی نیڈ کی نسل تیس ہزار سال پہلے معدوم ہوگئی تھی۔ گزشتہ عشرے میں مزید باتیں دریافت ہوئیں انڈونیشیا کے جزیرے فلوریس آئی لینڈ کے ایک غار میں ملنے والے ڈھانچوں اور دیگر اشیا سے پتا چلا کہ وہ چھوٹے قد کے لوگ تھے اور ان کی لمبائی بمشکل تین فٹ تھی اور بارہ ہزار سال پہلے تک بھی ان کا وجود تھا جبکہ کچھ نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ ابھی تک فلوریس آئی لینڈ کے جنگلوں میں موجود ہیں۔ چین کے ریڈ ڈیئر غار میں ان کی ایک اور قسم دریافت ہوئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ساڑھے گیارہ ہزار سال پہلے تک اس کا وجود تھا۔ منگولیا سے قریب سائبیریا میں ڈینی سوون کے نام سے ان کی ایک اور قسم ملی، اس کا ایک ہی دانت ملا جس کے ڈی این اے ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ کم از کم ان کی ایک جینز موجودہ انسانوں میں سے کسی ایک گروپ کو ورثے میں منتقل ہوئی ہے جس نے انہیں بلندی پر رہنے کی صلاحیت دی ہے۔ بیری کا خیال ہے کہ اس بارے میں مزید دریافت ہو سکتی ہے۔ اس نے مغربی منگولیا کا جغرافیہ دیکھا ہے اور اس جگہ کی نشاندہی کر لی ہے جہاں اسے کام کرنا تھا۔''
''اور یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ لاپتا ہوا۔'' میں نے کہا۔
''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اب ہم وہیں جا رہے ہیں۔''
وہ رات ہم نے ٹرین میں سو کر گزاری اور اگلے روز سورج نکلتے ہی اولگی پہنچ گئے۔ وہاں ایک آدمی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے اپنا تعارف بوسوکی کے طور پر کروایا وہ ہمیں ایک پرانی لینڈ روور تک لے گیا۔ دو مزدوروں نے ہمارا سامان اس میں رکھا اور بوسوکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''پہلے ہم بلو نامی گاؤں کی طرف جائیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد تسا گان گول۔''
ہم بڑی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ بے حد ناہموار اور کچا تھا۔ بار بار جھٹکے لگنے سے میری کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ راستے میں دو جگہ رک کر بوسوکی نے گاڑی کے پیچھے بندھے ہوئے جیری کین میں سے پیٹرول ڈالا۔ بالآخر نصف شب کے قریب ہم تسا گان گول پہنچ گئے۔ صرف چند گھروں میں مٹی کے تیل کے لیمپ روشن تھے۔ گاؤں کے وسط میں اینٹوں سے بنی ایک عمارت تھی جہاں برقی روشنی تھی۔ بوسوکی نے اسی عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ میں نیچے اترا اور اپنے جسم کو سیدھا کر کے اس جانب دیکھنے لگا۔ جہاں سے ڈیزل جنریٹر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ رات سرد تھی اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کچھ کم تھا۔ میں نے مسز کورم کو گاڑی سے نیچے اترنے میں مدد دی اور ہم ایک ساتھ عمارت میں داخل ہوگئے۔
وہ ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ ہمیں دیکھ کر خاکی وردی میں ملبوس ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تعظیماً جھکتے ہوئے خیر مقدمی انداز میں بولا۔ ''مسز کورم۔''
''میرے شوہر کا کچھ پتا چلا؟''
''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' وہ برہم ہوتے ہوئے بولی۔
اس کے سینے پر سینگم کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی اور میں نے اندازہ لگالیا کہ وہی مقامی پولیس کمانڈر ہے۔ ''ہمیں ایک لاش ملی ہے۔'' ایک مقامی شخص اسے لے کر آیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ تم اسے شناخت کرلو۔''

''نہیں۔ میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''پلیز۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''اس طرف چلو۔''

وہ ہمیں ایک عقبی کمرے میں لے گیا۔ جہاں ایک کاکیشیائی شخص لکڑی کی بینچ پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ یا گیارہ انچ اور عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے پر درجن بھر زخم تھے۔ لگتا تھا جیسے کسی کند چیز سے ضربیں لگائی گئی ہوں۔ میں نے قریب جاکر لاش کو بغور دیکھا۔ اس کے ہاتھوں اور کہنی سے کلائیوں تک بھی زخم تھے۔ جن سے لگتا تھا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے جدوجہد کی تھی لیکن زیادہ دیر حملہ آور کا مقابلہ نہ کرسکا۔

کمانڈر سینگم نے اس کی لاش کو پلٹا تو اس کی کمر کے نچلے حصے میں مزید زخم دکھائی دیے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مسز کورم اب مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ چہرے پر رکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے سہارا دیا اور چند لمحوں بعد پوچھا۔ ''کیا یہ تمہارا شوہر ہے؟''

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''یہ اس کا معاون ہے۔ جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔ رک بمنی۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ رونے لگی۔

وہ رات ہم نے ایک گنبد نما خیمے میں گزاری جسے خاص طور پر ہمارے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک منگول عورت نے ہمارے لیے لکڑی کے چولھے پر کھانا بنایا جو ابلے ہوئے گوشت پر مشتمل تھا۔ صبح تک مسز کورم پوری طرح غم سے نجات پاچکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ گاڑی میں سے وہ دو تھیلے لے آؤں جو خیموں کے علاوہ تھے۔ ہم نے جب انہیں کھول کر دیکھا تو ان میں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ بوٹ، برف میں پہننے والے جوتے، ٹارچ اور فرسٹ ایڈ بکس وغیرہ۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے کپڑے دیکھ کر ہوئی۔ ان میں ایک بھاری بھرکم جیکٹ بھی تھی جسے میں نے فوراً ہی پہن لیا۔

''تمہیں میرا سائز کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ تم جیسے لمبے چوڑے آدمی کے لیے یہی سائز موزوں رہے گا۔'' پھر اس نے میز پر ایک نقشہ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرف۔'' اس نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں سے ہم ان چوٹیوں کو دیکھ سکتے ہیں جن کے دامن میں ایک طویل وادی ہے۔ مقامی شکاری بعض اوقات وہاں تک جاتے ہیں لیکن اس سے آگے نہیں۔''

''کوئی وہاں کا سفر کیوں کرے گا؟'' میں نے کہا۔ ہم تو اپنے آپ کو اس جگہ بھی بے آرام محسوس کررہے تھے۔

''کوئی بھی نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بظاہر وہاں جانے کی کوئی وجہ نہیں لیکن ہزاروں سال پہلے منگولیا کا موسم گرم تھا۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ قدیم انسان نے اس علاقے میں پناہ لی ہوگی تاکہ یہاں سے وہ نیچے رہنے والوں اور شکاریوں پر حملے کرسکیں۔''

''وہ وہاں محفوظ ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''بہت زیادہ۔'' اس نے کہا۔ ''لہٰذا بیری نے سیٹلائٹ فوٹو دیکھے اور اس علاقے کو تلاش کے لیے منتخب کیا۔'' اس نے نقشے پر بنے ہوئے ایک سرخ دائرے پر انگلی رکھی۔

''نقشے پر یہ چھوٹا دکھائی دے رہا ہے لیکن اگر پیمانہ درست ہے تو یہ کافی بڑا علاقہ ہے۔''

''ہاں، ایک ہزار مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے ہمیں یہ پتا لگانا ہوگا کہ اس گریجویٹ طالب علم کی لاش کہاں سے ملی تھی تاکہ وہیں سے ہم اپنی تلاش شروع کریں۔''

''ہاں۔'' مسز کورم اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ ''پہلے ہم وہاں جاکر اس جگہ کا معائنہ کریں گے اور پھر اس علاقے کا رخ کریں گے۔''

ہماری بوسوکی سے ملاقات پولیس اسٹیشن میں ہوئی۔ اس نے پہلے ہی دو آدمیوں کا انتظام کرلیا تھا جو ہمارا سامان پہاڑیوں تک لے جاتے۔ جب مسز کورم اپنی نگرانی میں لینڈروور سے وہ سامان اتروا رہی تھی تو میں چپکے سے کھسک لیا اور گاؤں میں اس جگہ پہنچا جس کے باہر بار کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں مرکزی دروازے سے داخل ہوکر اندر گیا۔ دس فٹ کے فاصلے پر بائیں جانب ایک اور دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی پھر میں نے اس پر ہلکے سے دستک دی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ اندر سے کسی نے غصے میں کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ بالآخر دروازہ کھل گیا اور ایک بھاری بھرکم شخص برآمد ہوا۔

''تم انگریزی سمجھتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
اس نے میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا۔ پھر میں نے چینی زبان میں پوچھا۔ ''تم چینی بول سکتے ہو؟''

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف منہ کرکے چلایا۔ ''نیان۔''

ایک نوجوان عورت باہر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''تم کیسی ہو؟''

اس نے چینی میں جواب دیا اور اس طرح ہماری گفتگو شروع ہوگئی۔ وہ مجھے اندر لے گئے اور میں نے ان کے سامنے کچھ رقم رکھ دی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے مشروب کی پیشکش کی لیکن میں نے منع کر دیا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ مرد کا نام ٹورل اور عورت کا نیان تھا جو جانتی تھی کہ قصبے میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ میری قومیت کے بارے میں متجسس تھے اور ان کا خیال تھا کہ میں کسی حد تک منگولین سے ملتا جلتا ہوں۔ اس کے بعد وہ کھل مل گئے اور مجھ سے پرانے دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ان سے وہ تمام سوالات پوچھ لیے جو اس وقت میرے ذہن میں آئے پھر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

مسز کورم میرے اس طرح غائب ہو جانے پر ناراض ہو رہی تھی لیکن میں نے اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ ایک بار پھر ہمراہ سفر شروع ہو گیا۔ ہم اس جگہ جا رہے تھے جہاں رک مینی کی لاش ملی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس کمانڈر کے کہنے پر دو دن سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ عقب میں ایک ٹیلا تھا جسے اس نے اپنا کیمپ بنا رکھا تھا۔ اس بوڑھے شخص نے اپنا نام کچلگ بتایا۔ یوسوکی نے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا۔

''اس کا کہنا ہے کہ وہ مارکیٹ جا رہا تھا کہ اس کی نظر پتھروں پر پڑی۔ وہ سمجھا کہ یہ ٹیلے سے پھسل کر گرے ہوں گے جب وہ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی ملبے کے ڈھیر پر پڑا ہوا ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے لاش کو اپنے چھکڑے پر ڈالا اور تسا گان گول چلا گیا۔ جب اس نے کمانڈر سینگم کو اس جگہ کی بابت بتایا تو اس نے حکم دیا کہ وہ وہیں واپس جائے اور انتظار کرے۔''

''لہٰذا یہ یہاں دو دن سے بیٹھا ہوا ہے؟'' مسز کورم نے پوچھا۔

''ہاں، اسے یہی حکم ملا تھا۔''

ہم نے اس بوڑھے سے کچھ مزید سوالات کیے۔ مثلاً یہ کہ کیا وہ اکثر اس جگہ سے گزرتا ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ہمارا دوسرا سوال تھا کہ کیا اس نے پہلے بھی کسی کو اس حالت میں پڑا ہوا دیکھا جس کا جواب اس نے نفی میں دیا۔ مسز کورم نے اس سے رک کے جسم پر آنے والے زخموں کے بارے میں پوچھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا بوڑھے نے اس سے پہلے بھی اس طرح کے زخم دیکھے ہیں۔ وہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نظر آرہا تھا لیکن یوسوکی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی سادہ لوح دیہاتی سے یہ توقع نہیں کرسکتیں کہ وہ زخموں کا تجزیہ کرسکے۔''

مسز کورم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی میں سننا چاہوں گی کہ یہ کیا کہتا ہے۔''

یوسوکی نے اس بوڑھے کے سامنے وہ سوال دہرایا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا ''ال مستی''۔

''دیکھو۔'' یوسوکی نے کہا۔ ''کیسی احمقانہ باتیں کر رہا ہے بلکہ اس سے بھی بُری۔ یہ تو توہم پرستی ہے۔'' وہ بوڑھا اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مسز کورم نے پوچھا۔

''یہ ال مستی کیا ہے؟''

''پرانی توہم پرستی۔ فرضی داستان۔ جنگلی شخص جو پہاڑوں پر رہتا ہے۔ ان دیہاتیوں کی سمجھ میں جب کوئی بات نہیں آتی تو یہ اس کا نام لے دیتے ہیں۔ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔''

''پھر بھی اسے بتا دو کہ میں اس کی رائے کی قدر کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مسز کورم نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور بوڑھے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا۔'' مسز کورم نے یوسوکی سے کہا۔ بوڑھے نے سیٹی بجا کر گھوڑے کو بلایا۔ اسے اپنے چھکڑے کے ساتھ جوتا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن ہم کچی سڑک کے اختتام تک پہنچ گئے۔ اس کے آگے چوٹیوں کے درمیان ایک خالی جگہ تھی جس کے بارے میں یوسوکی نے بتایا کہ اس کے آگے ایک اونچی وادی ہے پھر عمودی چٹانوں کی دو قطاریں ہیں اور پروفیسر بیری کو امید تھی کہ اسے یہاں کوئی ایسا ثبوت مل جائے گا کہ کسی زمانے میں ہومی نیڈ کے آباؤ اجداد یہاں رہتے تھے۔

یوسوکی ہمارے ساتھ خوش نہیں تھا لیکن کورم انٹرنیشنل نے اسے مسز کورم کی معاونت کرنے کے سلسلے میں بھاری معاوضہ دیا تھا۔ مجبوراً اس نے اپنی پشت پر ایک تھیلا، رسیاں اور دوسرا ضروری سامان لادا اور پہاڑیوں کی طرف ہماری راہ نمائی کرنے لگا۔ میں اور مسز کورم اس کے پیچھے اور ہمارے عقب میں دونوں مزدور بھاری سامان لے کر چل رہے تھے۔ ہم دن بھر چلتے رہے اور اندھیرا ہونے سے پہلے ایک جگہ کیمپ لگا لیا۔ یوسوکی اور میں ایک خیمے میں، دونوں مزدور دوسرے اور

مسز کورم کا الگ خیمہ تھا۔ چھوٹے ہیٹر خیمے کے وسط میں رکھ دیے گئے۔

ہم اس طرح تین دن تک سفر کرتے رہے۔ چوتھے روز سہ پہر میں مسز کورم نے نقشے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس اس پہاڑ کی چوٹی تک جانا ہے۔ انہی میں سے کوئی ایک سطح مرتفع ہے جس کے بارے میں میرے شوہر کو یقین تھا کہ ہومی نیڈ یہاں زندہ رہ سکتے ہیں۔''

''اب یہاں کوئی رہتا ہے؟'' میں نے بوسوکی سے پوچھا۔

''نہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ ایک الگ تھلگ جگہ ہے اور یہاں سوائے پہاڑی بھیڑوں کے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور دیکھا کہ ایک سفید کھال والی بھیڑ ہمیں گھور رہی تھی۔

''یہ ایک خطرناک چڑھائی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

مسز کورم بولی۔ ''لیکن ہم اسے سر کر سکتے ہیں۔ یہ مزدور ہماری مدد کریں گے۔''

اس کا خیال غلط نکلا۔ اگلی صبح دونوں مزدور غائب ہو چکے تھے۔

گاؤں میں بارٹینڈر ٹورل نے مجھے بتایا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کو ایک دن امیر بننے کی توقع تھی۔ اس علاقے میں کئی سالوں سے یہ کہانیاں گردش کر رہی تھیں کہ ان پہاڑوں میں تانبے کے بڑے ذخائر چھپے ہوئے ہیں۔ چند برس قبل روسی ماہر ارضیات کی ایک ٹیم نے یہاں کا سروے کیا تھا۔ جب وہ تساگان گول واپس آئے تو وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ روسیوں نے ٹورل کے بار سے بہت سی شراب خریدی۔ اس جشن کے نتیجے میں گاؤں کی بہت سی عورتیں حاملہ ہوگئیں جس کا ثبوت ان کے کچھ بچوں کے چہرے ہیں پھر روسی یہاں سے چلے گئے۔ چند مہینوں بعد جاپان سے ایک اور ٹیم آئی۔ یہ لوگ روسیوں کے مقابلے میں تجارتی ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے کسی عورت کو حاملہ نہیں کیا اور نہ ہی بار میں زیادہ پیسے خرچ کیے۔

کئی ماہ بعد بوسوکی نے انکشاف کیا کہ نہ تو روسی اور نہ ہی جاپانی واپس آ رہے ہیں۔ گو کہ تانبے کے ذخائر کی تصدیق ہوگئی تھی لیکن انہیں نکالنے اور اس دور دراز علاقے سے لے جانے کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ اس کے لیے سڑکیں، پل اور ہوائی اڈا بنانا پڑتا۔ اس لیے انہیں اس منصوبے میں کوئی کشش نظر نہیں آئی۔ یہ خبر سن کر لوگوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور یوں لگا جیسے ان کی قسمت میں امیر بننا نہیں ہے پھر چینی آ گئے۔

وہ جاپانیوں سے بھی زیادہ محتاط تھے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مکمل طور پر نظرانداز کیا اور خود ہی پہاڑوں میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی کسی کو خبر نہ ہوئی کہ چینیوں کے عزائم کیا تھے۔ یہ خبر بھی بوسوکی نے ہی سنائی کہ وہ اس علاقے کے معدنی حقوق خریدنا چاہ رہے تھے۔ وہ دارالحکومت میں حکام سے مذاکرات کر رہے تھے اور انہوں نے اس کے لیے بھاری رقم کی پیشکش کی تھی۔ وہ کان کنوں اور مائننگ مشینری لانے اور یہاں سے خام مال چین لے جانے کے لیے سڑکیں، پل اور ہوائی اڈا تعمیر کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔ وہ روسیوں اور جاپانیوں کے مقابلے میں زیادہ دوراندیش تھے اور اس منصوبے میں بھاری سرمایہ کاری کرنے کے خواہش مند تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آئندہ دس برسوں میں انہیں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس مل جائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ملک کی پھیلتی ہوئی صنعت کو خام مال مہیا کر سکیں گے۔

تاہم اس سلسلے میں مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ چینیوں کی جانب سے جو رشوت پیش کی گئی، وہ ناکافی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ منگولین افسروں نے دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے رشوت کی پیشکش ٹھکرا دی کیونکہ انہیں اپنے ملک کا مفاد عزیز تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ چین کی نظریں ہمیشہ سے ہی منگولیا کی قیمتی معدنیات پر رہیں۔ بہرحال منگولیا کی حکومت نے چین کی پیشکش ٹھکرا دی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے قبول کر لیا تو اس کا مطلب چین سے آئے ہوئے لوگوں کی لامحدود خواہشات اور غلبے کو قبول کرنا ہوگا جس کے نتیجے میں ایک دن وہ اپنا ملک گنوا دیں گے۔

''اس طرح ہم واپس وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔'' ٹورل نے مجھے بتایا۔

''کیا بوسوکی اب بھی چینیوں کے لیے کام کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پیسوں کی خاطر کسی کے لیے بھی کام کر سکتا ہے۔''

☆☆☆

''مزدور کیوں چلے گئے؟'' مسز کورم نے پوچھا۔

''توہم پرستی۔'' بوسوکی نے جواب دیا۔ ''ان کا ماننا ہے کہ ان پہاڑیوں کی رکھوالی ہو رہی ہے۔''

''کون کر رہا ہے؟''

''شیطانی روحیں۔ منگولیا کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ چنگیز خان کا مقبرہ اسی ملک میں ہے لیکن کوئی اس کے محل وقوع سے واقف نہیں۔ لیکن اس علاقے میں رہنے والے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مقبرہ انہی پہاڑیوں میں کسی دور دراز مقام پر ہے۔

شاید اسی سطحِ مرتفع یا اس کے پاس جہاں تمہارا شوہر تحقیق کر رہا تھا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اسی لیے اس کے معاون رک بینی کو قتل کیا گیا تاکہ اسے اس افسانوی مقبرے کو دریافت کرنے سے روکا جائے۔'' مسز کورم نے پوچھا۔

''عین ممکن ہے۔'' بوسوکی نے جواب دیا۔

''کیا اس مقبرے کی حفاظت شیطانی روحیں کر رہی ہیں یا وہ جنگلی لوگ جن کا ذکر اس بوڑھے نے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''دونوں۔'' بوسوکی نے جواب دیا۔ ''یہاں کے لوگ یہی سمجھتے ہیں گو کہ یہ احمقانہ باتیں ہیں۔''

''مزدوروں کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مسز کورم بولی۔ ''ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔''

ہمیں اس بلند ہموار مقام تک پہنچنے میں تین دن لگ گئے۔ وہ بالکل ویران اور بنجر جگہ تھی جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

''بظاہر یہی لگتا ہے کہ رک واپس جا رہا تھا جب اسے قتل کیا گیا ہے لیکن اس کے واپس جانے کی کیا وجہ تھی؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے کہ بیری زخمی ہو گیا ہو۔'' مسز کورم نے کہا۔

''اور رک اس کی مدد کے لیے لوگوں کو بلانے جا رہا ہو۔''

ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور آگے بڑھ گئے۔ اس میدان کو عبور کرنے میں ڈیڑھ دن لگ گیا۔ پھر ہمیں چٹانوں کی ایک قطار نظر آئی جن میں غار بنے ہوئے تھے۔ ہم نے بغور اس جگہ کا مشاہدہ کیا لیکن وہاں بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آئے۔

دو دن کی تلاش کے بعد محسوس ہوا کہ ہماری خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ بوسوکی نے واپسی کی تجویز پیش کی۔ اس پر مسز کورم بولی۔ ''تم دونوں جا سکتے ہو۔ میرے حصے کا راشن چھوڑ دو۔ میں بیری کی تلاش جاری رکھوں گی۔''

''اگر تم نے اپنی خوراک آدھی کر دی تو یہ ذخیرہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ دن چلے گا پھر تم کیا کرو گی۔ کھائے پیے بغیر تو واپس تساگان گول تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔'' میں نے کہا۔

''میں اسے تلاش کر لوں گی۔''

بوسوکی نے کہا۔ ''میں اپنے حصے کا راشن تم دونوں کے لیے چھوڑ کر واپس جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا سامان اٹھایا اور واپس جانے لگا۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' مسز کورم نے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' میں نے کہا۔

اگلے دن کے اختتام تک ہم بُری طرح تھک چکے تھے۔ اب مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے اس پاگل عورت کا ساتھ کیوں دیا۔ سورج غروب ہونے لگا تو ہم نے اپنے تھیلے زمین پر پھینکے اور خود بھی تھک کر لیٹ گئے۔ میری نظریں آسمان پر تھیں کہ میں نے سورج کی ڈوبتی ہوئی شعاع کو کسی دھات سے ٹکراتے دیکھا۔

''مجھے دوربین دینا۔''

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے دوبارہ کہا تو اس نے دوربین مجھے پکڑا دی۔ میں نے اسے آنکھوں سے لگایا تو وہ روشنی دوبارہ نظر آئی۔

''وہاں۔'' میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''غار کے دہانے کے سامنے دیکھو۔''

''کون سا غار؟'' اس نے دوربین پکڑتے ہوئے کہا۔

''نیچے کی جانب ایک چوڑا غار ہے۔ وہاں کوئی دھات نظر آ رہی ہے۔''

اس نے اپنا سانس روک لیا۔ روشنی ایک بار پھر دھات کی سطح سے ٹکرائی۔ ''میں دیکھ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''اب وہاں تک جانے کا وقت نہیں رہا۔'' میں نے کہا۔

وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم جا سکتے ہیں۔''

''بہت جلدی اندھیرا ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس ٹارچیں ہیں۔''

ابھی ہم نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتے رہے لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ کسی چٹان سے ٹکرا کر پیر نہ پھسل جائے بالآخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا اور میں نے کہا۔ ''ہم اس اندھیرے میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم میں سے کسی ایک کو بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ صبح کی پہلی کرن نمودار ہونے تک ہم یہاں رک جاتے ہیں۔''

ہم نے اپنے خیمے لگانے کی بھی زحمت نہیں کی اور اپنے سامان پر ہی لیٹ گئے۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ سخت سردی کے باوجود گہری نیند سو گیا پھر ایک چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ مسز کورم کی آواز تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس لیے ایک بیلچہ لے کر ہی آواز کی سمت چل دیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ آواز کم از کم سو گز کے فاصلے سے آئی تھی۔ اس نے صبح ہونے کا انتظار نہیں کیا اور خود ہی اس جانب چل دی جہاں اس نے روشنی دیکھی تھی۔ میں اندازے سے اسی سمت میں آگے

بڑھنے لگا پھر مجھے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔
''مسز کورم؟'' میں نے کہا۔
''میں یہاں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔
میں اس آواز کی سمت چل دیا۔ وہ ایک ٹیلے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی باہر آ گئی۔
''تم نے چیخ کیوں ماری تھی؟''
''میرا خیال ہے کہ میں نے کسی آدمی کو دیکھا تھا۔''
''یہاں؟'' میں نے تعجب سے کہا۔ ''کیا وہ کوئی منگول تھا؟''
''میرا خیال ہے کہ نہیں۔ وہ بے لباس تھا۔''
''پھر تو وہ سردی سے جم گیا ہوگا۔''
''ہاں لیکن اس نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا۔ وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔''
''کیا وہ تمہاری طرف بڑھا تھا؟''
''نہیں، وہ وہاں کھڑا رہا۔'' اس نے پہاڑی کے شمالی حصے کی جانب ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''اور جب تم چلائیں تو کیا ہوا؟''
''جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔''
''کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتی ہو؟''
''میں نے صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ اس کا قد عام منگولوں کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ سر پر بہت زیادہ بال تھے اور اس نے ہاتھ میں چھڑی پکڑی ہوئی تھی۔''
میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بولا۔ ''اگر مقامی لوگ یہ بات سن لیں تو یہی کہیں گے کہ تم نے کسی جنگلی انسان کو دیکھ لیا جسے وہ ال مستی کہتے ہیں۔''
اس نے اپنے آپ کو بھینچتے ہوئے کہا۔ ''ایسا مت کہو۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی اور ذہن پر بھی بوجھ ہے۔''
''گویا تم نے اس کا تصور کیا تھا؟''
''بالکل۔'' وہ بولی۔ ''ایسا ہی ہے۔ یہ یقیناً میرا تصور ہی ہوگا۔ چلو ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''
ہم نے بیٹری بچانے کے لیے ایک وقت میں ایک ہی ٹارچ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ میری جیب میں دو فالتو بیٹریاں بھی تھیں۔ میں غار میں داخل ہو کر چند فٹ اندر آ گیا۔ اچانک ہی کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئے۔ یہ آواز ہمارے دائیں جانب سے آئی تھی۔ اس کے اوپر چٹان میں قدرتی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مسز کورم نے ان سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اسے ایک گھنی داڑھی والے شخص پر جھکے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بخار سے متاثر تھیں لیکن وہ ہماری موجودگی سے باخبر تھا۔ وہی پروفیسر بیری ابرلیشن تھا۔ بالآخر مسز کورم نے ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔
ہم دونوں نے اسے غار سے باہر نکالا اور مسز کورم اپنے شوہر کے لیے پینے کا پانی لے کر آئی۔ پھر ہم نے اس کے گندے کپڑے اتارے۔ اس کا جسم صاف کیا اور اسے دوسرے کپڑے پہنائے جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہم غار کے دہانے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز کورم نے کہا۔ ''ہم اسے اس حالت میں واپس نہیں لے جا سکتے۔ میں اس کے پاس رک جاتی ہوں۔ تم مدد لے کر آؤ۔''
''میرے واپس آنے سے پہلے تم بھوکی مر جاؤ گی؟''
''کیا تمہارے پاس اس سے بہتر کوئی تجویز ہے؟''
''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔''
میری آنکھ ایک زوردار آواز سے کھل گئی۔ یوں لگا جیسے چند فٹ کے فاصلے پر کوئی کودا ہو۔ مسز کورم چلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیسی آواز تھی؟''
''مجھے نہیں معلوم۔ اپنی ٹارچ روشن کرو۔''
غار کے سامنے والے حصے پر کچھ نہیں تھا لیکن آگے چل کر کونے میں مجھے ایک مردہ جسم نظر آیا۔ میں نے جھک کر اسے چھوا۔ وہ ابھی تک گرم تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' مسز کورم نے پوچھا۔
''ایک پہاڑی بھیڑ۔'' میں نے کہا۔ ''یہ مر چکی ہے۔''
''ضرور یہ اوپر سے گری ہوگی۔'' اس نے کہا۔
''ہم خوش قسمت ہیں۔ کل کے کھانے کا انتظام ہو گیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
جب میں روانہ ہونے لگا تو اس نے مجھے ایک چیز دکھائی۔ ''مجھے تو یہ پتھر سے بنائی ہوئی دستکاری لگتی ہے۔''
''تمہارے خیال میں یہ کتنی پرانی ہوگی؟''
''ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ میرے شوہر کو اس غار میں ملی ہے اور یہ ہومی نیڈ کے پیچھے کا ایک یقینی ثبوت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم یہ اپنے ساتھ لے جاؤ اور کسی ایسے شخص کو دکھاؤ جو اس کی صحیح جانچ کر سکے۔''
میں نے اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ جب صحت یاب ہو جائے گا تو خود اس کی جانچ کر سکتا ہے۔''
واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں نے ان تمام واقعات پر غور کیا جو اب تک پیش آئے تھے۔ میں نے جو کچھ پولیس اسٹیشن میں دیکھا۔ بوسوکی نے جو بتایا اور جو کچھ ٹورل اور اس کی بیوی سے سنا۔ اس سے ایک ہی بات ذہن میں آئی کہ کیا کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ کوئی سائنس داں یا ماہرِ آثارِ قدیمہ اس

علاقے میں آئے۔ کیا اسی لیے رک بینی کو قتل کیا گیا۔ ٹورل کے کہنے کے مطابق ہمارے گائیڈ بوسوکی کو بے پناہ فائدہ ہوتا اگر چینی سرمایہ دار تانبا نکالنے کے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور وہ اب بھی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے لیکن اس وقت تک اس علاقے کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنا ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ وہاں تانبے کے علاوہ سونے یا یورینیم کے ذخائر بھی ہوں جس کا پتا روسی اور جاپانی نہ لگا سکے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس علاقے میں کسی کو بھی نہ آنے دیا جائے۔ چاہے وہ کوئی سائنس داں یا ماہرِ آثارِ قدیمہ ہی کیوں نہ ہو اسی لیے انہوں نے رک کو قتل کر دیا۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں کافی تھک چکا تھا۔ چنانچہ ندی کے کنارے رک کر اپنا منہ دھونے لگا۔ اچانک ہی بے خبری میں مجھ پر حملہ ہو گیا۔ مجھے لڑنے بھڑنے کا اچھا خاصا تجربہ ہے لیکن میں حتی الامکان لڑنے سے گریز کرتا ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ دونوں وہی مزدور تھے جو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے نیزے تھے جن کے سروں پر پتھر کی کوئی نوک دار چیز مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ یہ بالکل ویسا ہی پتھر تھا جو پروفیسر کو ملا تھا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے چاقو نکالا اور ان کے سامنے لہرانے لگا۔ انہوں نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں چاقو لہرا کر انہیں دھمکانے لگا۔

میں ندی سے صرف پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا جب میرا پاؤں ایک دو فٹ اونچے ٹیلے سے ٹکرایا، میں تیزی سے اس پر چڑھ گیا اور قریبی حملہ آور کے چہرے پر اپنا چاقو پھینک دیا۔ دوسرا میری طرف بڑھا تو میں نے جھک کر مٹھی بھر ریت اٹھائی اور اس کے چہرے پر پھینک دی پھر میں نے چھلانگ لگائی اور اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ نیچے گرا۔ میں نے اس کا نیزہ چھین لیا اور اسے فضا میں بلند کیا جیسے ہی دوسرا آدمی میری طرف آیا تو نیزے کی نوک اس کے پیٹ میں لگی پھر میں نے اس پر گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی اور وہ زمین پر گر گیا۔

میں نے جلدی جلدی ان دونوں کی تلاشی لی۔ ان کے پاس چاقو تھے جو میں نے ندی میں پھینک دیے۔ وہ دونوں ابھی تک سانس لے رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ زخمی وہ تھا جس کے پیٹ میں نیزے کی نوک لگی لیکن زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔

● دوسرے دن میں تساگان گول پہنچا۔ پولیس کمانڈر نے میری بات سنی لیکن میں نے غور کیا کہ وہ کچھ لکھ نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ان دونوں مزدوروں نے ہی غالباً بوسوکی کے کہنے پر رک بینی کو قتل کیا تھا۔ اس کا محرک یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ حملہ ال مستی نے کیا ہے۔ اس طرح مقامی آبادی میں خوف و ہراس پھیلایا جائے اور وہ کسی بھی سائنس داں کو اس علاقے میں نہ جانے دیں کیونکہ ان میں کچھ ماہر ارضیات بھی ہو سکتے ہیں جو تانبے کی صحیح مالیت اور دوسری دھاتوں کی موجودگی کا پتا لگا لیں گے جو بوسوکی نہیں چاہتا تھا۔ اسے چینی اسی بات کے پیسے دے رہے تھے کہ وہ اس علاقے میں کسی غیر ملکی کو نہ آنے دے اور انہیں اتنا وقت مل جائے کہ معدنی حقوق لینے کے لیے مقامی انتظامیہ کو قائل کر سکیں۔

میں نے پولیس کمانڈر سے مطالبہ کیا کہ مسز کورم اور پروفیسر کی جان بچانے کے لیے فوری کارروائی کی جائے۔ فوراً ہی نصف درجن رضا کار بھرتی کیے گئے اور ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں کورم کارپوریشن کی جانب سے معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ میں نے ٹورل کو بھی ساتھ لے جانے پر اصرار کیا اور ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم نے ایک اسٹریچر بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس بار یہ فاصلہ ڈیڑھ دن میں طے ہوا۔ رضا کاروں نے بڑی مہارت کے ساتھ پروفیسر کو اسٹریچر پر لٹا کر چٹان سے اتارا اور اسے رسیوں کے ذریعے دو گھوڑوں کے پچھلے حصے سے باندھ دیا۔ اس طرح ہم واپس بحفاظت گاؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ٹورل نے اپنے بار میں ہی مسز کورم اور اس کے شوہر کے لیے بستر لگا دیا پھر مسز کورم نے پولیس کمانڈر کے دفتر سے فون کر کے بیجنگ میں اپنے نمائندے سے رابطہ کیا جس نے وعدہ کیا کہ طبی سہولتوں سے آراستہ ایک ہیلی کاپٹر بارہ گھنٹے میں وہاں پہنچ جائے گا تاہم اسے آنے میں چودہ گھنٹے لگ گئے۔

”تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہے ہو؟“ مسز کورم نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اپنے کچھ کام نمٹانے ہیں۔“

مسز کورم نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یہاں کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”مجھے کچھ معاملات کو دیکھنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کورم انٹرنیشنل کو میرے بل کے ساتھ مکمل رپورٹ مل جائے گی۔“

ہم نے بوسوکی کو قصبے کے نزدیک ایک کیمپ میں تلاش کر لیا۔ ہمیں دیکھتے ہی کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو ٹورل ان پر روایتی انداز میں چلانے لگا۔ دونوں مزدور بھی ایک خیمے سے برآمد ہوئے۔ ان کے چہرے بری طرح زخمی تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر آواز لگائی۔ ”بوسوکی۔“

وہ ایک خیمے سے برآمد ہوا تو میں نے کہا۔ ”تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی؟“

''تم اس زمین پر چلے گئے تھے جس کی حفاظت عظیم خان کرتا ہے۔'' اس نے اپنا بازو لہراتے ہوئے کہا۔'' وہاں پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے کسی جگہ ہمارے خان کا مقبرہ ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ ہم اس کی حفاظت کریں گے اور ہمارے اتحادی ال مستی بھی اس کی نگہبانی کرتے ہیں۔''

''کیا تم نے کبھی کسی ال مستی سے بات کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی نہیں۔ انسان ان سے بات نہیں کر سکتے۔ البتہ عظیم خان ان سے مخاطب ہوتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ یہاں آیا اور اس نے انہیں طلب کیا۔ وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور اسے تحائف پیش کیے۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ اس کے مقبرے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں اور یہ کہ وہ ہمیشہ اس کی حفاظت کریں گے۔ وہ اس پر تیار ہو گئے۔ اس کے عوض خان نے وہ پورا علاقہ انہیں دے دیا۔ وہاں کوئی انسان نہیں جا سکتا اور یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ اس جگہ کی حفاظت کریں۔''

''وہاں کوئی ال مستی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔'' یہ محض ایک افسانہ ہے۔ تمہارے لوگوں نے ہی رک اور مجھ پر نیزوں سے حملہ کیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ ال مستی نے کیا ہے۔ تم صرف غیر ملکیوں اور اپنے ہم وطنوں کو خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔''

''ال مستی کا وجود ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''پھر وہ باہر سے آنے والوں کا پیچھا کیوں نہیں کرتے جیسا کہ انہیں خان نے حکم دیا تھا۔''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔'' وہ بچوں کی طرح ہیں اور انسانوں سے شرماتے ہیں اسی لیے ہم نے اس جگہ کی حفاظت کی ذمے داری اٹھائی ہوئی ہے۔''

جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے کہا۔'' اس کے عوض چینی تمہیں کیا دیتے ہیں؟''

وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ سب ہماری طرف بڑھنے لگے۔ ٹورل نے فوراً ہی شاٹ گن کا رخ ان کی جانب کر لیا۔

''تم نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے رک بینی کو قتل کیا۔ تم تینوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

میں ان کتوں کو بھول گیا تھا۔ اچانک ہی وہ ہماری طرف لپکے۔ ٹورل نے گولی چلا کر ان میں سے ایک کو زخمی کر دیا۔ میں نے دوسرے کتے کی ٹانگ پکڑ کر اسے گھمایا اور دور پھینک دیا۔ تیسرے نے ٹورل کی ٹانگ پر جبڑا مارا۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا لیکن اس وقت تک ٹورل کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے زخم کا معائنہ کیا۔ اس جگہ سے گوشت غائب تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اتاری اور اس کے استر کا کپڑا پھاڑ کر اسے مضبوطی سے زخم پر باندھ دیا تاکہ خون بہنا رک جائے پھر مجھے یاد آیا کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ میں نے شاٹ گن اٹھائی اور کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے ہی بوسوکی اور اس کے دونوں معاونین گھوڑوں پر فرار ہو چکے تھے۔

میں نے ٹورل کو اپنی کمر پر لادا اور ندی پر لے آیا جہاں ہم نے اپنے گھوڑے چھوڑے تھے۔ میں نے اسے اس کے گھوڑے پر سوار کرایا اور تساگان گول تک پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ اس کی بیوی نے زخم صاف کر کے اینٹی بایوٹک مرہم لگایا۔

پولیس کمانڈر نے بوسوکی اور دونوں مزدوروں کا تعاقب کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے خیال میں میرے فراہم کردہ ثبوت سنی سنائی پر مشتمل تھے اور ان کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اتنے وسیع علاقے میں ان تینوں آدمیوں کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی بوسوکی سے ملا ہوا تھا۔

واپسی کے سفر میں دو ہی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ اول تو یہ کہ وہ بھیڑ وہاں کس نے پھینکی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ دونوں مزدور ایک پہاڑی بھیڑ پکڑتے اور اسے کسی گن یا چاقو کے بغیر مار دیتے اور اگر انہوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تو کیا وہ اس کا گوشت ہمیں عطیہ کر سکتے تھے۔ یہ بات خلاف عقل تھی کیونکہ اس کے ایک دو دن بعد ہی انہوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اپنی جیب سے پتھر کا وہ ٹکڑا نکالا جو پروفیسر نے مجھے دیا تھا۔ وہ ایک انتہائی نفیس چقماق کے پتھر سے بنا ہوا تھا اور اس پر ایک انتہائی باریک کام کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا موازنہ ان پتھروں سے کیا جو ان مزدوروں کے نیزوں سے اتارے تھے۔ ان کی شکل ناہموار اور نوک کند تھی۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی ال مستی کا کوئی وجود ہے اور کیا اب بھی ان کے بچے کھچے آثار دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تحقیق کرنا پروفیسر آرنسٹن جیسے لوگوں کا کام ہے۔

میں بیجنگ واپس آ گیا۔ جہاں گریٹ وال کافی شاپ میں میری ملاقات ایک اور دراز قد سنہرے بالوں والی حسینہ سے ہوئی جو میرے لیے ایک ایسا کام لے کر آئی تھی جسے میں انکار نہ کر سکا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آئندہ کبھی بھی مجھے ایسا دلچسپ کیس نہیں ملے گا۔

☆☆☆

احتیاط

سلیم انور

کچھ جرم ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں... سلجھانے کی کوشش میں مزید الجھتے چلے جاتے ہیں... ایک ایسے ہی پیچیدہ کیس کے تفتیشی مراحل... حالات و واقعات اسے مجرم ثابت کررہے تھے... مگر اسے یقین تھا کہ اس کا مؤکل بے گناہ ہے...

نہایت احتیاط سے کھیلی گئی چالیں...... ہر مہرہ اپنی جگہ مستحکم تھا......

بالائی منزل کی راہداری میں پڑا ہوا قالین پرانا، بوسیدہ اور گرد آلود تھا گو کہ اس پر مٹی کی تہ نہیں تھی لیکن یہ اتنا دبیز تھا کہ اس پر چلتے ہوئے اوورکوٹ میں ملبوس مسلح شخص کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چھت میں لگے ہوئے بلب کی روشنی میں کمرے کا بوسیدہ رنگ، ادھڑا ہوا پلاستر اور کھڑکی کی شکستہ لکڑی صاف نظر آرہی تھی۔ کمرے سے آنے والی مردانہ آوازوں نے اس شخص کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے درمیانی دروازے پر زوردار لات ماری اور کمرے میں داخل ہوگیا۔

''خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔'' اس نے وہاں موجود تینوں آدمیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''تم میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا۔''

پھر وہ ان کے قریب آیا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور ان کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ ان میں ایک درمیانی عمر کا چھ فٹ طویل قامت شخص تھا۔ اس کے برابر میں اس سے قدرے چھوٹا لیکن مضبوط جسم والا آدمی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ ان کے بالمقابل بیٹھا ہوا شخص دیکھنے میں ہی سخت گیر لگ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارا لوٹ کا مال گم ہوگیا ہے۔'' مسلح شخص نے کہا۔ ''لیکن تم ایک دوسرے کو الزام دینا بند کرو اور پُرسکون ہوجاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے بلکہ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ وہ مجھے مل گیا ہے۔''

''وہ تمہارے پاس ہے۔'' ان میں سے ایک نے اٹھنا چاہا لیکن پستول کی نال کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کردیا۔

''بالکل اسی طرح جیسے تم نے اسے حاصل کیا تھا۔'' مسلح شخص نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب اس کے چار حصے ہوں گے۔ میں اپنے حصے کو فیس سمجھوں گا کیونکہ اسے میں نے تلاش کیا ہے۔''

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

☆☆☆

وہ مسلح شخص میں تھا۔ اس سے پندرہ گھنٹے قبل یعنی دس بجے صبح میں فالس کریک پہنچا جہاں کی آبادی کل دو ہزار نو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ میں اس سے پہلے بھی دو مرتبہ اس قصبے کے قریب سے گزر چکا تھا لیکن پہلی بار یہاں رکنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے وائٹ اوکس قبرستان کی تلاش تھی جس کا پتا مجھے اسٹیشن کے کاؤنٹر پر بیٹھنے والی عورت نے بتایا دیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی شیوی کی طرف بڑھ گیا۔ گزشتہ دو گھنٹے سے ہلکی برف باری ہورہی تھی اور میں نے اسی موسم میں شکاگو سے یہاں تک ایک سو دس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس قبرستان میں کوئی دفتر نہیں تھا لیکن اس وقت وہاں ایک قبر کھودی جارہی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر اس جگہ پہنچا تو اس آدمی نے اپنا کام روک کر مجھ سے پوچھا۔

''تم نئے پادری تو نہیں ہو؟''

''نہیں، مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔''

اس نے اپنے ہاتھ ڈانگری سے پونچھے اور جیب سے

احتیاط

وہسکی کی بوتل نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم پادری نہیں ہو۔''

''میں صرف حقائق تلاش کرنے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''گزشتہ ہفتے وینڈل سنیرٹ نامی ایک شخص کو یہاں دفنایا گیا تھا۔''

اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''قبر نمبر 137۔''

''میں اس کی تجہیز و تدفین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا اس سے پہلے دعائیہ تقریب ہوئی تھی؟''

''ہاں۔'' اس نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں موجود تھے؟''

اس نے ایک بار پھر آہستہ سے سر ہلایا۔

''تمہارا نام؟''

''براؤنی۔''

''تمہارے علاوہ اور کون آیا تھا؟''

''تابوت گاڑی آدھ گھنٹے تاخیر سے پہنچی۔ اس کی بیوہ۔ بہن، پادری اور ایک دوسرا کھدائی کرنے والا جیک کورے یہاں موجود تھے۔''

''کوئی سرکاری افسر یا جنازہ بردار نہیں آیا؟''

''نہیں، میں نے جیک اور پیپ کے ساتھ مل کر تابوت اتارا، اور ڈرائیور کی مدد سے اسے قبر میں رکھ دیا۔''

''یہ ولارڈ پیپ کون ہے؟''

''وہی تجہیز و تکفین کا انتظام کرتا ہے۔''

''مرنے والے کی بہن کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''ببرائل سنیرٹ، پہلے وہ ببرائل جانسن تھی پھر ببرائل ہوگ بنی اور اب اس نے دوبارہ اپنے نام کے ساتھ سنیرٹ لگا لیا ہے۔''

''تم اسے جانتے ہو؟''

اس نے کچھ سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھنے کی حد تک۔''

''یعنی وہ بھی فالس کریک میں رہتی ہے؟''

''ہاں، ہوگ کے مرنے کے بعد اس کی دولت سمیت پرانے سنیرٹ ہاؤس میں واپس آگئی تھی۔

''شکریہ۔'' میں نے اپنے پرس سے دس ڈالر کا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

اولڈ سنیرٹ ہاؤس ایک منزلہ مکان تھا جس کے سامنے پتھر کے ستونوں کا پورچ بنا ہوا تھا۔ میں ایک مرتبہ

اس کے سامنے سے گزرا تو میری نظر وہاں کھڑی ہوئی مرسیڈیز سیڈان پر گئی پھر میں نے اپنی گاڑی سامنے سڑک کے کنارے کھڑی کی۔

گھنٹی کی آواز پر ایک عورت نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر غائب ہوگئی البتہ اس کی لرزیدہ آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے؟''

''کیا تم ببرائل سنیفرٹ ہو؟''

''تم کون ہو؟''

''میرا نام آر جے کار ہے اور میں بیمہ کمپنی سے آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے فائیو اسٹار کمپنی کا کارڈ نکالا جس کے لیے میں کبھی کبھی کام کیا کرتا تھا پھر ایک چھوٹا سا ہاتھ باہر آیا اور اس نے مجھ سے کارڈ لے کر چند سیکنڈ بعد واپس کر دیا۔

''دراصل میں ایولین سنیفرٹ کو تلاش کر رہا ہوں۔ اس کے شوہر کی موت کے حوالے سے کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔''

''ایولین یہاں نہیں ہے۔''

''باہر جو کار کھڑی ہوئی ہے، کیا وہ اس کی نہیں ہے۔''

''ہاں لیکن وہ کار نہیں چلاتی۔ زیادہ تر وینڈل ہی ڈرائیونگ کیا کرتا تھا لہٰذا اس نے قصبے کے ایک شخص سے کہا کہ وہ دو دن کے لیے اسے اس کی بہن ایلا کے پاس چھوڑ آئے۔''

''اس کی بہن کہاں رہتی ہے؟''

''شمال کی جانب لیکن مجھے اس کا پتا ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ وہ آج سہ پہر تک واپس آجائے گی۔''

''کیا تمہیں اس کی واپسی کے وقت کا کچھ اندازہ ہے؟''

''تم اسے پریشان نہیں کرو گے۔''

''امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے صرف کچھ معلومات چاہئیں اور ایک فارم پر دستخط کروانا ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''اس نے کہا تھا کہ تین بجے سے پہلے اس کی واپسی کا کائی امکان نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سوا تین بجے دوبارہ آؤں گا۔'' میں نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا کہ ایک کار میری گاڑی سے سو گز پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ اس وقت میرا ذہن زیادہ ضروری مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ مثلاً یہ کہ لنچ کہاں کروں اور اس چھوٹے سے قصبے میں اگلے چار گھنٹے کیسے گزاروں گا۔

بہر حال مجھے ہر قیمت پر ہوٹل کی تلاش میں قصبے کے مرکز کی طرف آنا تھا۔ میں نے اپنی کار ایک ٹرک شاپ کے باہر روکی جہاں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ''کھانا یہاں کھائیں۔ گیس بھروائیں!'' میں نے کھانا کھانے میں کافی وقت لگایا اور بارہ بج کر پچیس منٹ پر فارغ ہوا اس کے بعد بھی میرے پاس ڈھائی گھنٹے تھے۔ میں ایک موہوم امید کے ساتھ پبلک لائبریری میں داخل ہوگیا۔ اینٹوں سے بنی ہوئی اس عمارت کا سائز اسکول کے ایک کمرے کے برابر تھا۔

تین منٹ بعد میں دوبارہ فٹ پاتھ پر آگیا اور اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے کانوں میں مختلف سمتوں سے سائرن بجنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن ان سب کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ ایسا نہیں کہ میں یہ آوازیں سن کر فوراً ہی عمارت سے باہر آگیا تھا بلکہ میری نظر آٹھ ضرب دس سائز کی اس تصویر پر چلی گئی تھی جسے لائبریری کے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ایزل پر لگایا گیا تھا۔ یہ ایک ستر سالہ عورت کی تصویر تھی جو وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''اس ماہ کے لیے لائبریری کی سرپرست۔'' اس کے نیچے چھوٹے حروف میں ببرائل سنیفرٹ (ہوگ) لکھا ہوا تھا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور سائرن کی آواز کے پیچھے چل دیا۔ اس امید پر کہ شاید میرا اندازہ غلط ہو جیسے ہی میں نے گاڑی کنٹری سائڈ روڈ پر موڑی تو مجھے اس کی رفتار کم کرنا پڑ گئی اور کچھ فاصلے پر جا کر میں رک گیا۔ دو سو گز کے فاصلے پر دو پولیس کاریں، ایک ایمبولینس اور آگ بجھانے والی گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور سنیفرٹ ہاؤس ان کی توجہ کا مرکز تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کے گلوو کمپارٹمنٹ سے دوربین نکال کر آنکھوں پر لگائی تو سارا منظر واضح ہو کر سامنے آگیا۔ ایک فربہ عورت وہیل چیئر پر بیٹھی رو رہی تھی اور اس کے قریب کھڑا ہوا مرد اسے تسلی دے رہا تھا۔ ایک میڈیکل ٹرانسپورٹ وین اس مرسیڈیز کار کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا البتہ اب اس کار کی ڈکی کھلی ہوئی تھی اور دو سوٹ کیس زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ جن میں سے کچھ کپڑے باہر گرے تھے۔ اس کار کے ساتھ ہی پولیس والے اور طبی عملہ ایک انسانی جسم پر جھکا ہوا تھا۔

میں نے اپنی کار پچاس گز آگے بڑھا کر روک دی

اور دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگالی۔ زمین پر پڑا ہوا جسم کسی عورت کا تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ عورت تھی اور یہی لگ رہا تھا کہ وہ مرچکی ہے بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ببرائل سنیفرٹ کو روتا ہوا دیکھ کر سمجھ گیا کہ مرنے والی ایولین سنیفرٹ ہے جس کی تلاش میں، میں فالس کریک آیا تھا۔ اب میرا یہاں رکنا بیکار تھا لہٰذا میں وہاں سے شکاگو واپسی کے لیے روانہ ہوگیا۔ مجھے اپنا کام کرنا تھا اور اس کے لیے میرے پاس بہت کم وقت تھا کیونکہ پولیس والے اور شاید قاتل بھی مجھے ڈھونڈنے اور اس کام سے روکنے کی کوشش کرتے۔

وہ جمعرات کا روز تھا۔ اس سے پہلے سوموار کے دن شام پانچ بجے ایک متوقع کلائنٹ ونس روز بلو کی جانب سے ایک فون کال موصول ہوئی جسے پولیس ہراساں کررہی تھی۔ ویسے تو یہ وکیل کا کیس تھا لیکن میں نے سوچا کہ اس کی بات سن لی جائے۔ وہ ایک چالیس سالہ طویل قامت شخص تھا اور کیتھولک ہائی اسکول میں ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام کررہا تھا۔ اس نے جو بتایا وہ کچھ یوں ہے۔

''اس کا آغاز سات جنوری کو ہوا۔ اس دن طوفان کی وجہ سے میں اسکول نہ جاسکا لیکن اوک پارک میں زندگی معمول کے مطابق تھی۔ بچے اسکول اور بیوی کام پر چلی گئی۔ میں گھر میں فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ موسم کی پیش گوئی لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہورہی تھی۔ چنانچہ میں نے راستے کی صفائی کا کام ملتوی کردیا جب تک برف باری نہ رک جائے۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ کام کرسکتا ہوں تو میں نے سنو بلوور نکالا اور گیرج کے اطراف کی گلی صاف کی پھر سڑک سے گھر تک آنے کا راستہ اور سامنے کا حصہ صاف کیا پھر ایک بیلچے کی مدد سے سیڑھیوں اور پورچ سے برف ہٹائی۔ میں تمہیں بیلچہ دکھاتا لیکن وہ پولیس کے پاس ہے۔ لہٰذا میں اسے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ یہ ایک بھاری بھرکم برف ہٹانے کا بیلچہ ہے اور اس کا بلیڈ چوبیس انچ سائز کا ہے۔ جب میں اپنا کام ختم کرچکا تو میں نے اسے گھر کے سامنے برف میں گاڑدیا اور بلوور کو گیرج میں رکھنے چلا گیا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''میں عقبی دروازے سے گھر میں گیا۔ مجھے باتھ روم جانا تھا اس کے بعد ایک ڈرنک لیا پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے میری بیوی بول رہی تھی۔ ہم نے کچھ معاملات پر گفتگو کی اور جب میں واپس گھر کے باہر آیا تو بیلچہ غائب تھا۔ البتہ مجھے برف میں وہ شگاف نظر آرہا تھا جہاں میں نے بیلچہ گاڑا تھا۔

میں نے پورچ سے باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھا پھر مجھے بلاک کے آخری کونے پر واقع اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے کچھ گڑبڑ نظر آئی۔ جب میں اپنی بیوی ہیتھ سے فون پر بات کررہا تھا تو میں نے اس سمت سے سائرن کی آواز سنی تھی لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ میں بیلچہ ڈھونڈتا ہوا اسی جانب بڑھ گیا اور جب میں نے سڑک پار کی تو کچھ لوگوں نے بتایا کہ عمارت کے داخلی راستے کے باہر ایک بوڑھے شخص کی لاش ملی ہے جس کے سر کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا ہے اور اس کی موت دس منٹ پہلے واقع ہوئی ہے۔

''میں گھبراہٹ میں آگے بڑھا اور پہلا پولیس والا جو مجھے نظر آیا، اس سے پوچھا۔ 'کیا اسے بیلچے سے قتل کیا گیا ہے؟' جب وہ پولیس والا مڑا تو میں نے دیکھا کہ وہ میرا ہی بیلچہ تھا اور اس بوڑھے شخص کو دیکھ کر مجھے اچانک یاد آیا کہ جب میں سنو بلوور گیراج میں رکھنے واپس جارہا تھا تو میں نے اس شخص کو سامنے والی فٹ پاتھ پر جنوب کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

میں اس جرم کی تفصیل ٹریبون میں پڑھ چکا تھا لیکن میں نے روز بلو کو بولنے دیا۔

''وہ پولیس والا مجھے اپنے ساتھی کے پاس لے گیا اور میں نے اسے اپنے چوری ہونے والے بیلچے کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس شام انہوں نے فون کرکے مجھے پولیس اسٹیشن بلایا جہاں میرا بیان اور فنگر پرنٹ لیے گئے۔

''دو دن بعد سادہ لباس میں ایک سراغ رساں مور میرے پاس آیا اور مجھ سے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں اسے اسی کمرے میں لے کر آگیا اور اس نے مجھ سے کچھ اس طرح کے سوالات کرنا شروع کردیے۔ 'میں وینڈل سنیفرٹ سے کب ملا؟ ہمارے درمیان کیا بحث ہوئی؟ میں اس کی نگرانی کیوں کررہا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ مجھ پر ہی اس کے قتل کا شبہ کررہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیلچے پر میری ہی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ اس کے بعد وہ چار مرتبہ پھر آیا اور ہفتہ کی رات مجھے پولیس ہیڈ کوارٹرز طلب کیا گیا جہاں مجھے تقریباً تین گھنٹے تک تفتیشی کمرے میں بیٹھنا پڑا۔ وہ مجھے صرف اس لیے ذہنی اذیت پہنچارہے تھے کیونکہ ان کے خیال میں، میں نے ہی اس بوڑھے کو قتل کیا تھا لیکن ان

کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے ایک جاننے والے وکیل سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ مجھے پولیس سے تعاون نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ کہنے کی حد تک آسان تھا جبکہ میرے ایک پڑوسی کا کہنا تھا کہ اگر میں نے ان سے تعاون نہیں کیا تو وہ مجھے ہراساں کرنے کے لیے تمام طریقے آزمائیں گے، وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

''میری ذہنی حالت دگرگوں تھی لیکن اس پڑوسی نے میری بہت مدد کی۔ وہ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے منیجر کے پاس گیا کیونکہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وینڈل سیفرٹ وہیں رہا کرتا تھا۔ منیجر نے بتایا کہ سیفرٹ اور اس کی بیوی تقریباً تین چار سال سے اس عمارت میں کرائے پر رہ رہے تھے۔ وہ ریٹائرڈ ہو چکا تھا اور ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا زیادہ وقت بوڑھوں کے مرکز میں گزرتا جبکہ وہ نرسنگ ہومز میں بھی رضاکارانہ خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کی بیوہ پہلے روز ہی کہیں چلی گئی۔

''بظاہر یہی لگتا ہے کہ کسی شخص نے موقع سے فائدہ اٹھا کر میرا بیلچہ اٹھایا اور اسے قتل کر کے فرار ہو گیا لیکن پولیس مجھ پر شک کر رہی ہے۔ میرے پڑوسی نے مجھے کسی پرائیویٹ سراغ رساں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا جو پہلے اس کی بیوہ اور پھر خاندان کے دوسرے لوگوں سے بات کرے اور وہ سب کچھ کرے جو اس کے خیال میں مناسب ہو۔''

''پہلی بات جو میں بتانا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات ختم ہونے پر میں نے کہا۔ ''اور وہ یہ کہ میں کبھی بھی پولیس کے مقابلے پر کسی قتل کی تحقیقات نہیں کرتا۔ البتہ ایک کام میں کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مرنے والے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لوں لیکن میں بلا معاوضہ کوئی کام نہیں کرتا۔''

''اور وہ معاوضہ کتنا ہوگا؟''

''پانچ سو پچاس ڈالر روزانہ۔'' میں نے اسے 1997ء والا معاوضہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''اگر شہر سے باہر جانا پڑا تو ساڑھے چھ سو۔ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔''

اگلے روز سہ پہر میں مجھے فرصت تھی۔ سب سے پہلے میں نے شکاگو پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک قریبی دوست ولیم کو فون کیا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اوک پارک میں وینڈل سیفرٹ نامی شخص کو بیلچے سے قتل کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیلات درکار ہیں۔ ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ چھوٹے قد کا بہتر سالہ شخص تھا۔''

''تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''اوک پارک پولیس بیلچے کے مالک پر شبہ کر رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اور مقتول کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''وہ اس شخص پر شبہ کر رہے ہیں جس کا بیلچہ چوری ہو گیا تھا؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اس لیے کہ بیلچے پر صرف اسی کی انگلیوں کے نشانات ہیں، کسی اور کے نہیں۔''

''وہ اتنے احمق نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ انہیں کوئی گم نام شخص نے اطلاع دی ہو۔ مثلاً کوئی پڑوسی وغیرہ۔''

''میں پوچھ لوں گا جب تک تم میرا کام کر دو۔''

اس سے بات کرنے کے بعد میں نے کمپیوٹر کھولا لیکن سیفرٹ کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ روز یلو کو معلوم ہوا تھا کہ سیفرٹ بوڑھوں کے مرکز جایا کرتا تھا چنانچہ میں نے اوک پارک سینئر سینٹر لکھ کر وہاں کی ویب سائٹ کھولی اور وہاں کا پتا معلوم کر لیا۔ بیس منٹ بعد میں وہاں کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس نے میری کہانی پر فوراً ہی یقین کر لیا۔ میں اس سے ایک فری لانس صحافی کے روپ میں ملا اور بتایا کہ مقتولین کی زندگی اور ان کے رشتوں پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سیفرٹ بوڑھوں کے مرکز میں بہت فعال تھا۔ اس نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ سیفرٹ نے کئی پروگراموں کا انتظام کرنے میں مرکز کی بہت مدد کی اور وہ ہر مہینے لوگوں کو دریا کے کنارے واقع کیسینو تک لے جانے کے لیے بس کا انتظام بھی کرتا تھا۔

''البتہ اس کی ایک بات ہمیں پسند نہیں تھی۔'' اس عورت نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ اس حادثے کے بعد مجھے یہ ذکر کرنا چاہیے یا نہیں۔ مسٹر سیفرٹ ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ ہم انہیں اس کی اجازت دے دیں۔ میں نہیں جانتی کہ اسے کیا نام دیا جائے۔ وہ ایک طرح کا جوا تھا یا لاٹری کی کوئی قسم، ہاں مجھے یاد آ گیا۔ اس نے نوٹس بورڈ پر ایک پمفلٹ بھی چسپاں کیا تھا جو لاٹری کے ٹکٹوں کی فروخت اور

قرعہ اندازی کے بارے میں تھا لیکن ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ دریا میں کشتی کی سیر ایک الگ معاملہ تھا۔ مسٹر سنیفرٹ مایوس تو ہوئے لیکن انہوں نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔''

بوڑھوں کے مرکز سے فارغ ہونے کے بعد میں اس عمارت میں گیا جہاں سنیفرٹ رہا کرتا تھا۔ وہ 1960ء کے آخر میں تعمیر کی گئی تھی۔ سنیفرٹ کی رہائش یونٹ نمبر 305 تھی چنانچہ میں نے 304 کی گھنٹی بجائی جس پر اے۔ میکنائر کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

''کون ہے؟'' ایک بوڑھی عورت نے انٹرکام پر پوچھا۔

''مسز میکنائر۔ میرا نام کار ہے اور میں اسٹار میگزین کے لیے سنیفرٹ کی موت پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ کیا تم لوگ اسے جانتے تھے؟''

''اوہ، ہاں۔''

''کیا تم اس کے بارے میں مجھے کچھ بتانا پسند کرو گی؟ ہم مرکزی ہال میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔''

''نہیں، تم اوپر آجاؤ۔ میرا بھانجا بھی آیا ہوا ہے۔''

''اس کا بھانجا تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا جبکہ اس کی خالہ ایک ذہین اور متحرک ستر سالہ عورت تھی۔ اس سے پندرہ منٹ کی گفتگو کے دوران صرف ایک ہی کام کی بات معلوم ہوئی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا اور لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر پہنچا اور وہاں سے آگ بجھانے والی سیڑھی کے ذریعے اتر کر سنیفرٹ کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔

جیسا کہ میرے کلائنٹ کے دوست نے بتایا تھا کہ سنیفرٹ ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بیڈروم کو اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کی میز، درازوں، الماری اور سیف کی تلاشی لی اور بالآخر مجھے اپنے مطلب کی چیز مل گئی۔ وہ سولہ بینکوں کی فہرست تھی جن میں سے دس الی نوئس اور چھ شکاگو میں تھے۔ ہر بینک کے نام اور پتے کے آگے ایک کوڈ نمبر درج تھا۔ اس کے علاوہ انکم ٹیکس گوشواروں کی فائل بھی تھی۔ سب سے آخری گوشوارے میں قابل ٹیکس آمدنی اڑسٹھ ہزار چار سو سولہ ڈالر ظاہر کی گئی تھی جو منافع اور حصص کی خرید و فروخت کے ذریعے حاصل ہوئی جبکہ پنشن، سود اور سوشل سیکیورٹی سے کچھ نہیں ملا۔ دیگر کاغذات میں الی نوئس میں واقع نرسنگ ہومز اور بوڑھوں کے مرکز کی ایک ڈائریکٹری اور دو بنڈل لاٹری کے پمفلٹ کے ملے۔ جس

کنسلٹنٹ

بل سرسبز پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کے بڑے سے گلے کو چرا رہا تھا۔ کچے راستے پر دور سے دھول اڑاتی ہوئی ایک شاندار جیپ نمودار ہوئی۔ بل کے قریب سے گزرتے ہی جیپ رک گئی۔ ڈرائیور نے اسے قدرے ریورس کیا اور انجن بند کر کے نیچے آگیا۔

وہ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس، قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ آنکھوں پر رے بین کا چشمہ جما ہوا تھا۔ اس نے بل سے کہا۔''اگر میں تم کو یہ بتادوں کہ اتنے بڑے ریوڑ میں تمہاری بھیڑوں کی تعداد کتنی ہے تو کیا تم ایک بھیڑ مجھے دے دو گے؟''

بل کو دلچسپی محسوس ہوئی۔''ہاں دے دوں گا۔''

نووارد نے اپنی جیب سے ٹیبلیٹ نکالا۔ اسے الیکٹرانک نوٹ پیڈ سے منسلک کیا اور انٹرنیٹ پر ناسا کا پیج نکالا۔ صفحہ ملتے ہی اس نے سیٹلائٹ سے چلنے والے جی پی ایس کو جوڑا، اس پر کھیلتے ہوئے اس نے بل کی چراگاہ کا تعین کیا، اس کا ڈیٹا بیس نکالا اور تقریباً 60 اسپریڈشیٹس پر پیچیدہ فارمولوں میں الجھے رہنے کے بعد اپنے چھوٹے سے پرنٹر پر ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ نکالی اور بل سے کہا۔''اس وقت یہاں 15862 بھیڑیں موجود ہیں۔''

''بالکل درست!'' بل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب تم ایک بھیڑ لے سکتے ہو۔''

وہ ریوڑ کے قریب گیا اور ایک جانور کو اٹھا کر اپنی جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔

وہ لوٹا تو بل نے کہا۔''اب اگر میں تمہارے پیشے کے بارے میں بتادوں تو کیا تم میرا جانور مجھے واپس دے دو گے؟''

نووارد راضی ہو گیا۔ بل نے کہا۔''تم کنسلٹنٹ ہو؟''

وہ حیران رہ گیا۔''بالکل درست... تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''بہت آسان سی بات ہے۔'' بل نے اطمینان سے کہا۔''تم بن بلائے میرے پاس آئے... دوسری پہچان یہ تھی کہ تم ایک ایسے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے جس کا جواب میں پہلے سے جانتا تھا اور اس کے معاوضے میں ایک بھیڑ کے طلب گار تھے... تیسری اور آخری پہچان یہ تھی کہ تمہیں یہ تک پتا نہیں تھا کہ یہاں کون کون سے جانور ہیں... تم نے بھیڑ کے بجائے میرا کتا اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا ہے... مہربانی کر کے اب اسے واپس کر دو۔ وہ بہت بے ضرر ہے... صرف بھٹکنے والی بھیڑوں پر غراتا ہے۔''

(جان محمد کی جامشورو سے حاضر دماغی)

میں لوگوں کو بڑے انعامات کا لالچ دے کر اس کا ممبر بننے کی ترغیب دی گئی تھی اور نئے ممبر بنانے کی صورت میں کمیشن دینے کا لالچ بھی دیا گیا تھا۔ اس کی ممبر شپ فیس چونسٹھ ڈالر اور اس کے بعد چار ڈالر ہفتہ تھی۔

میں یہ تاثر لے کر وہاں سے باہر نکلا کہ ایولین سینفرٹ ان چیزوں کے بارے میں متوقع سوالات سے بچنے کے لیے وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس کی پڑوسن مسز میکنائر نے مجھے اس کا عارضی پتا دے دیا تھا جس کے مطابق وہ اوک پارک کے قلب میں واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چلی گئی تھی لیکن جب میں نے اسی روز تقریباً ساڑھے تین بجے اس ہوٹل کے منیجر سے بات کی تو اس نے بتایا کہ ایولین سینفرٹ ایک ہفتہ قبل ہی ہوٹل سے جا چکی تھی اور اس نے اپنے اگلے ایڈریس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کچھ پیسے خرچ کرنے کے بعد منیجر نے مجھے اس کا روم رجسٹریشن کارڈ دیکھنے کی اجازت دے دی۔ اس فہرست میں انیس سو پچانوے ماڈل کی گرے رنگ کی مرسڈیز کار، سیف میں موجود ذاتی اشیا اور اسٹور میں رکھے ہوئے دو سوٹ کیس شامل تھے۔

جب میں نے تفصیل جاننا چاہی تو اس نے بتایا کہ ذاتی اشیا میں جیولری باکس اور ایک بھاری پارسل شامل تھا جبکہ اسٹور میں رکھا ہوا سامان اس کے قیام کے دوران ہی کہیں منتقل کر دیا گیا تھا۔

اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ اب تک کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ میں نے منیجر سے پوچھا۔

''کیا تمہیں مسز سینفرٹ کے بارے میں کوئی ایسی بات یاد ہے جس سے اس کے مستقبل کے منصوبے کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکے؟''

منیجر نے کہا کہ نہیں لیکن اس کے پیچھے کھڑا ہوا ڈیسک کلرک اچانک ہی بول پڑا۔

''کیا تمہیں یاد نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اسے اپنے شوہر کے گھر جانا ہے۔ اس کا مطلب تھا تدفین میں شرکت کرنے کے لیے۔''

میں نے کورونر آفس فون کر کے اس مردہ خانے کا پتا معلوم کیا جہاں سینفرٹ کی لاش رکھی گئی تھی۔ اس کے لیے مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا کہ میں مرنے والے کا دور کا رشتے دار ہوں۔ دوسرا فون میں نے مردہ خانے میں کیا جہاں سے مجھے معلوم ہو گیا کہ سینفرٹ کو فالس کریک کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔

اگلے روز میں نے کلائنٹ سے بات کی اور اسے بتایا کہ اس معاملے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے لیکن مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک دن کے لیے شہر سے باہر جانا ہو گا۔

''کہاں؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اسے فالس کریک کے بارے میں بتا دیا۔

اسی رات مجھے ولیم کی جانب سے منفی جواب موصول ہوا لیکن جب میں نے اسے لاٹری کے بارے میں بتایا تو اس نے بتایا کہ وہ دوبارہ کوشش کرے گا اور اس دھاندلی کا پتا لگائے گا۔

دوسرے دن میں نے اپنی بیوی گنی کو فون کیا۔ وہ اسی وقت کہیں باہر سے آئی تھی۔

''ہیلو، میں ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی ہوں۔''

''حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں، فون نیچے رکھ دو اور باہر جا کر دیکھو کہ کوئی کار میں بیٹھ کر ہمارے مکان کی نگرانی تو نہیں کر رہا۔ اس کے بعد ہی ہم بات کر سکتے ہیں۔''

میری بیوی نے باہر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا۔ ''آر جے، مطلع صاف نظر آ رہا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اور اسٹیو جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔ تم دونوں رات کے لیے ایک ایک بیگ تیار کر لو۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''احتیاط ضروری ہے گو کہ میں قتل کی تحقیقات میں فالس کریک کی پولیس کو مطلوب نہیں ہوں لیکن یہ ممکن ہے یا قاتل ہی میرا پیچھا کرتا ہوا آ جائے گو کہ میں جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔ وہاں سے صرف گزرا ضرور ہوں لیکن اس سے پہلے میں نے وہاں کا راستہ پوچھا تھا اور مقتولہ سے بات کی تھی۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ اس دوران تم سامان پیک کر کے منی وین کے ذریعے اسکول جاؤ اور وہاں سے اسٹیو کو لے کر نارتھ ایونیو پر واقع ویسٹ لیک موٹیل میں آ جاؤ۔ میں پارکنگ لاٹ میں ہوں گا اور جب تم کمروں میں پہنچ جاؤ گی تو تم سے آن ملوں گا۔''

ساڑھے چھ بجے میں نے اپنی بیوی کو اس کیس کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور بہ آوازِ بلند اس لاٹری کا بوسٹر بھی پڑھ کر سنایا۔ اس نے پہلا سوال یہی کیا۔ ''کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ وینڈل سینفرٹ بڑے پیمانے پر کوئی لاٹری اسکیم چلا رہا تھا کیونکہ......''

''پہلی بات تو یہ کہ وہ کوئی اسکیم نہیں بلکہ دھاندلی تھی اور بظاہر اس کا مقصد ریٹائرڈ لوگوں کو بے وقوف بنانا تھا۔

میرے خیال میں یہ اس کا اپنا نفع بخش مشغلہ تھا جو اس نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے اختیار کیا۔ اس نے ہر کیونٹی سے پچاس کے قریب لوگوں کو اس کا ممبر بنایا اور انہیں مزید ممبر بنانے پر آمادہ کیا۔ وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایک دو فرضی قرعہ اندازی کر دیتا اور فرضی انعام یافتگان کے پیغامات کی تشہیر کی جاتی۔

کھیل کھیل میں اس نے اپنے لیے ایک معقول آمدنی کا بندوبست کر لیا۔ وہ صرف سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والی آمدنی ظاہر کرتے تھے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر سولہ سیف ڈپازٹ باکس حاصل کر رکھے تھے اور ممبران سے ہمیشہ نقد رقم وصول کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا مکان یا اپارٹمنٹ خریدنے کے بجائے کرائے پر رہنا مناسب سمجھا تاکہ ہنگامی صورتِ حال میں وہاں سے جا سکیں جیسا کہ ایولین سنیرٹ نے کیا اور یہ ظاہر کر کے چلی گئی کہ اسے اپنے شوہر کی تدفین میں شرکت کرنا ہے۔

''سیف ڈپازٹ باکس کے بارے میں کیا وضاحت کرو گے؟''

''اس کا مختلف استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص قانون سے بچنا چاہے تو اپنی شناخت چھپانے کے لیے وہ اس طریقے سے اپنی رقم محفوظ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن قیاس یہی ہے کہ ان سولہ باکس میں نقد رقم ہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ان خفیہ سیف ڈپازٹ باکس کا ٹیکس کے لیے آڈٹ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب آپ کوئی غیر قانونی کام کر رہے ہوں تو اپنی نقد رقم ایسی جگہوں پر رکھنا پڑتی ہے جن کا ٹیکس ڈپارٹمنٹ کو علم نہ ہو۔''

بیوی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نہیں سمجھتے کہ پہلا قتل بغیر سوچے سمجھے کیا گیا تھا لیکن دوسرا قتل اتفاقیہ نہیں تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے ذہن میں جو منظرنامہ اُبھر رہا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ایک شخص سڑک کے کنارے چلا جا رہا ہے کہ اس کی نظر اپنے دشمن وینڈل سنیرٹ پر جاتی ہے۔ وہ غصے سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اسے برف میں گڑا ہوا بیلچہ نظر آ جاتا ہے۔ اس وقت اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ مقتول کے قریب پہنچ کر بیلچے کو باسکٹ بال بیٹ کی طرح گھماتا ہے اور اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو جاتا ہے۔''

''یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس نے سردی کی وجہ سے دستانے پہن رکھے تھے۔ اس لیے بیلچے کے دستے پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں آئے۔'' میں نے کہا۔

''میرا دوسرا تبصرہ یہ ہے۔'' گنی بولی۔ ''ایولین سنیرٹ خوف زدہ تھی۔ وہ اوک پارک سے اس لیے فرار نہیں ہوئی کہ اس کے شوہر کو اتفاقیہ طور پر تشدد کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ یہ اتفاقیہ نہیں ہے اور اسے ایک خاص شخص پر شک تھا۔ اس نے تم سے اس لیے بات کر لی کہ اسے تم سے کوئی ڈر نہیں تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ جب تم اسے تلاش کر سکتے ہو تو قاتل بھی ایسا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا سامان باندھا اور اسے کار میں لے جا کر رکھ دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ کوئی تمہارا پیچھا کرتے ہوئے اس تک پہنچ سکتا ہے۔''

''لیکن کسی نے میرا پیچھا نہیں کیا۔ سڑک پر دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی اور فالس کریک میں تو بہت کم ٹریفک ہوتا ہے۔''

''میں ایک اور امکان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' گنی نے کہا۔ ''غور کرو کہ ولیم نے کینہ پرور پڑوسیوں اور گمنام ٹیلی فون کے بارے میں کیا کہا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کا محرک بھی عداوت ہو۔ کسی نے روز یلو کو اکسایا ہو کہ وہ ایولین سنیرٹ کو تلاش کرنے کے لیے پیشہ ور سراغ رساں کی خدمات حاصل کرے اور یہ وہی پڑوسی ہو سکتا ہے جس نے روز یلو کو تمہارے زائد اخراجات ادا کرنے میں مدد کی پیشکش کی تھی۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون تک گیا اور ولیم کی آنسرنگ مشین پر یہ پیغام چھوڑ دیا۔ ''آر جے کار کی طرف سے۔ اگر تمہیں وینڈل سنیرٹ کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہو تو اس نمبر پر فون کر کے کمرا نمبر 119 سے رابطہ کرنا۔''

اس کے بعد میں نے روز یلو کو فون کر کے کہا۔ ''فالس کریک میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کے بارے میں پھر بتاؤں گا فی الحال میری بات غور سے سنو۔ اگر کوئی پولیس والا تمہارے پاس آئے تو اسے یہ ہرگز مت بتانا کہ تم نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ اب تم مجھے اس پڑوسی کے بارے میں بتاؤ جو تمہاری مدد کرنا چاہ رہا تھا۔''

''بل بیچ۔ لیکن کیوں؟''

''کیونکہ اس طرح میرا وقت بچ جائے گا۔''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''وہ دو

ماہ قبل میرے پڑوس میں آیا تھا۔ جب تک یہ قصہ شروع نہیں ہوا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس روز وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔''

''اس کی عمر کتنی ہوگی؟''

''چالیس کے قریب، شاید وہ بیرونِ ملک کام کرتا رہا ہے۔''

''آخری بار اس نے تم سے کب بات کی تھی؟''

''گزشتہ شب۔ وہ ڈنر کے بعد فون کرتا ہے۔ اس کی یہ بات مجھے پسند نہیں کہ اسے کس طرح چھوٹی سی چھوٹی بات بھی معلوم ہوجاتی ہے۔''

''اگر وہ آج رات فون کرے تو اسے یہ ہرگز مت بتانا کہ میری تم سے بات ہوئی تھی یا میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔''

اس سے بات کرنے کے بعد میں نے گنی سے کہا۔ ''کم از کم ایک آدمی اس معاملے میں ضرور ملوث ہے۔ اس کا نام بل بچ ہے اور وہ حال ہی میں روزیلو کے پڑوس میں آیا ہے۔ روزیلو کا خیال ہے کہ وہ بیرونِ ملک فوجی خدمت سرانجام دے رہا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ جیل میں تھا۔ اس نے گزشتہ شب روزیلو سے فون پر بات کی تھی اور کچھ عجب نہیں کہ روزیلو نے اسے میرے فالس کریک جانے کے بارے میں بتا دیا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ گنی میرا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری بلٹ پروف جیکٹ بیگ میں ہے۔ تم آج رات اس کے بغیر کہیں نہیں جاؤ گے۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر ولیم کا فون آئے تو اس سے کہنا کہ ایک سابق قیدی بل بچ کا ریکارڈ چیک کرے۔''

''کہہ دوں گی۔ تم اپنا پستول ساتھ رکھو اور ہر دو گھنٹے بعد مجھے فون کرتے رہنا۔''

چالیس منٹ بعد میں بل بچ کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا۔ گھنٹی بجانے پر کوئی جواب نہ آیا تو میں نے اپنی مہارت سے کام لیتے ہوئے دروازے کا تالا کھولا۔ ایک ہاتھ سے اوورکوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے پستول پر گرفت مضبوط کی اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا۔ کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر آواز لگائی۔ ''بل بچ!''

کوئی جواب نہ آنے پر میں نے دروازہ بند کیا اور اوورکوٹ کی جیب سے ٹارچ نکالی۔ کمرے میں ایک بیڈ پڑا ہوا تھا اور اس کا ایک دروازہ کچن میں کھلتا تھا۔ وہاں ایک چولہا، سنک کاؤنٹر، ریفریجریٹر اور کاؤنٹر کے اوپر دو کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ میں نے وہیں سے تلاشی شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور جب ایک کیبنٹ کھول کر دیکھا تو اس کے اوپری خانے میں ایک جیولری باکس رکھا ہوا تھا۔

اس باکس میں دو انگوٹھیوں اور چین کے علاوہ زیادہ تر ہیرے رکھے ہوئے تھے جن کی تعداد کسی بھی طرح سو سے کم نہ تھی۔ میں نے وہ باکس کاؤنٹر پر رکھا اور بڑے آئٹم کو تلاش کرنے لگا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اس باکس کے ساتھ ہی رکھا ہوگا۔ میں تھوڑا سا مایوس ضرور ہوا لیکن تلاش جاری رکھی اور صرف تیس سیکنڈ بعد ریفریجریٹر کے فریزر میں جوتے کے ڈبے کے برابر رکھا ہوا پیکٹ مل گیا جس پر سفید کاغذ لپٹا ہوا تھا اور اسے ایک پلاسٹک ٹیپ سے سربمہر کیا گیا تھا۔

میں نے وہ پیکٹ بھی جیولری باکس کے برابر میں رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ان چیزوں کو اپارٹمنٹ میں نہیں چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا، اگر انسپکٹر مور جیسے کسی پولیس آفیسر نے پکڑ لیا تو روزیلو کے ساتھ ساتھ میں بھی پھنس جاؤں گا اور ہم پر الزام آجائے گا کہ روزیلو نے وینڈل سٹیرٹ کو قتل کرنے کے بعد میری خدمات حاصل کیں تاکہ میں سٹیرٹ کی بیوی کو تلاش کرکے قتل کردوں اور اس سے یہ دونوں چیزیں حاصل کرلوں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میں جانے سے پہلے بقیہ اپارٹمنٹ کی بھی تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔

بیس سیکنڈ بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ دونوں چیزیں اپنے ساتھ لے جانا چاہئیں چاہے اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے۔ اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا۔ باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ ایک ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں ہوٹل کا نمبر ملایا اور گنی سے رابطہ ہونے پر کہا۔

''ولیم کا فون آیا؟''

''نہیں۔''

''اگر اس کا فون آئے تو کہنا کہ میں اس کی وائس میل پر پیغام چھوڑ رہا ہوں۔ وہ پیغام یہ ہے۔ 'میں نے ثبوت کے طور پر دو چیزیں ضبط کی ہیں جو سہ پہر میں ا۔ولین سٹیرٹ کو قتل کرنے کے بعد جائے وقوعہ سے چرائی گئی تھیں۔ ان میں

ایک ہیروں سے بھرا ہوا جیولری باکس ہے اور دوسرے پیکٹ میں میرے خیال کے مطابق کرنسی ہے۔''

''تم کہاں سے بول رہے ہو؟'' گنی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بل بیچ کے اپارٹمنٹ سے لیکن زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔''

''تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے فون کرتے رہنا۔''

میں نے ولیم کا نمبر ڈائل کر کے وہ پیغام اس کی وائس میل پر بھیج دیا۔ اس کے بعد میں واپس کمرے میں آیا اور کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس سے بل بیچ کی اصلیت کا پتا چل سکے۔ ایک بڑی سی میز کی دراز میں کچھ کاغذات پڑے ہوئے تھے جن میں اسٹور سے خریداری کی رسیدیں، پیدائش کا سرٹیفکیٹ، پولیس ڈپارٹمنٹ کا خط اور ایک فوٹو شامل تھا۔

اس کے بعد میں نے الماری کا جائزہ لیا۔ بستر کے نیچے جھک کر دیکھا لیکن کوئی چیز نہیں ملی۔ پھر میری نظر ایک کیلنڈر پر گئی جس پر تاریخوں کے گرد سرخ سیاہی سے نشان بنے ہوئے تھے۔ مجھے بل کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ وہ چھ سے بارہ کی شفٹ میں کام پر گیا ہوا تھا۔ میں نے کچن سے وہ دونوں چیزیں اٹھائیں اور کمپارٹمنٹ سے باہر آگیا۔

میں نے دوبارہ گنی کو فون کر کے پوچھا کہ ولیم کا فون آیا اور اس کا جواب سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ''ایولین سنیفرٹ کے قتل کی انکوائری میں تمہارے جیسے حلیے کا ایک شخص موضوع بنا ہوا ہے۔ تمہیں وہاں کے لوگوں نے شناخت کرلیا ہے کیونکہ تم نے ہی قبرستان کا پتا پوچھا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ انہوں نے تمہاری تصویر فیکس یا ای میل کے ذریعے ہر جگہ بھیج دی ہے۔ ولیم کا کہنا ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو تاکہ وہ اس معاملہ کو سلجھا سکے۔''

''میں ایسا نہیں کرسکتا، کم از کم اس وقت نہیں۔''

''میں نے اسے یہ صورتِ حال بتا دی تھی۔'' گنی نے کہا۔ ''بہر حال اس نے وینڈل کے بارے میں جو مزید معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کے مطابق وہ انیس سو نوے کے آغاز تک جرائم کی دنیا میں متحرک تھا لیکن کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ نہ ہی اس نے کسی گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا۔ ولیم کی رائے میں وہ بہت ماہر تھا یا پسِ پردہ رہتا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلے کام نہیں کرتا تھا۔ کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟''

''میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی متفق ہوگیا تھا۔ سب باتیں ایک ہی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔''

''بل بیچ کے بارے میں ولیم کا کہنا ہے کہ اسے تشدد اور جنسی زیادتی کے الزام میں سزا ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ کسی جرم میں ملوث نہیں رہا۔''

''غالباً شکاگو میں؟''

''ہاں، ایک وحشیانہ جرم کی بڑی سزا۔ یہ واقعہ نارتھ ڈسٹرکٹ کے قریب پیش آیا جہاں ولیم اس وقت پٹرول آفیسر تھا۔''

''تم نے ولیم کو میرے پیغام کے بارے میں بتایا تھا؟''

''اس کا کہنا تھا کہ چرائی ہوئی رقم تلاش کی جاسکتی ہے کیونکہ نوٹوں کے سیریل نمبر ریکارڈ پر موجود ہیں۔''

''درست، میں نے سنیفرٹ کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لی ہے کیونکہ وہ ایک غیر قانونی لاٹری چلا رہا تھا تو میں یہی سمجھا کہ وہ پہلے سے کوئی معمولی مجرم ہوگا لیکن ولیم سے ملنے والی معلومات، ہیرے اور کرنسی سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ بڑا مجرم تھا۔''

''بہتر ہوگا کہ تم کام کی بات کرو۔'' گنی نے کہا۔

''میں عقبی سیڑھیوں سے نیچے آیا اور اس گلی کی جانب بڑھنے لگا جہاں میں نے اپنی منی وین کھڑی کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روزیلو کے مکان کے باہر پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی ہے اور روزیلو دو باوردی اور ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والے کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا منصوبہ تبدیل کر دیا اور کروزر کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ روزیلو کو ولیج ہال لے کر جائیں گے اور وہ جگہ میں نے دیکھ رکھی تھی۔ اچانک ہی ایک فورڈ ٹورس نمودار ہوئی اور پولیس کار کے پیچھے آ کر رک گئی۔ یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا تھا لیکن میرا اندازہ اس کے برعکس تھا۔ ٹورس نے پولیس کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ دونوں گاڑیاں ایک جگہ رک گئیں اور میں نے بھی اپنی گاڑی میونسپل بلڈنگ کی لاٹ میں کھڑی کر دی جہاں سے میں ان پر نظر رکھ سکتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' گنی نے پوچھا۔

''سادہ لباس والا روزیلو کو اندر لے گیا اور ٹورس سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس گاڑی کا نمبر تو نوٹ کر لیا لیکن ڈرائیور کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ دس منٹ

بعد سادہ لباس والا باہر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جیسے اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا ڈر ہو۔ وہ محتاط انداز میں کار کی طرف بڑھا، ڈرائیور سے کچھ باتیں کیں اور واپس بلڈنگ کی طرف چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد ٹورس نے یوٹرن لیا اور میں بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ وہ کار ایک اسٹور کی پارکنگ لاٹ میں رکی اور ڈرائیور اتر کر اسٹور میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی بل ہچ کے ساتھ ہوئی۔ میں نے اسے پہچان لیا کیونکہ اس کی تصویر اپارٹمنٹ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر ہچ واپس اپنے کام پر چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اس کار کا تعاقب شروع کر دیا لیکن ایک جگہ سگنل بند ہو جانے سے اسے جاری نہ رکھ سکا اور دفتر واپس آ گیا۔ ویسے بھی مجھے فوری طور پر کمپیوٹر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔‘‘

’’وہ کس لیے؟‘‘ گنی نے پوچھا۔

’’مجھے فورڈ ٹورس کی نمبر پلیٹ کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے اس پیکٹ کو دیکھنے کی بھی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں کچھ نوٹ بیس اور پچاس لیکن زیادہ تر سو والے تھے اور ان پر کیتھلینا ویسکوئز کے دستخط تھے۔ جو انٹرنیٹ کے مطابق دسمبر 1989ء سے جنوری 1993ء تک اسٹیٹ بینک کی گورنر رہی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس زمانے میں ہونے والی کسی ڈکیتی کے بارے میں جان سکتا لیکن قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ وینڈل بھی نوّے کے اوائل میں ہی منظر سے غائب ہو گیا تھا۔‘‘

’’وہ نمبر پلیٹ کس نام پر ہے؟‘‘

’’کار کے مالک کا نام جان بی رینڈل ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بل ہچ سے باتیں کرنے والا جان بی رینڈل نہیں بلکہ حلیے سے کوئی بدمعاش لگ رہا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے؟‘‘

’’پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔‘‘ گنی نے مشورہ دیا۔

’’پولیس ویسے ہی میرے اور روزیلو کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور یہ علاقہ بھی ولیم کی حدود میں نہیں آتا۔ پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب اپنے اوپر ایک اور الزام لینا اور اس کے نتیجے میں جیل کی ہوا کھانا ہے۔‘‘

’’اچھا، مجھے سوچنے دو۔‘‘ گنی نے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ جو کہوں وہی کرو گے چاہے اس کے لیے تمہیں اپنا پستول ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔‘‘

’’وعدہ۔‘‘ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایڈ مور اور دوسرا میرے کلائنٹ کا پڑوسی بل ہچ تھا جبکہ ان کے مقابل اس کمرے کا کرائے دار آرٹ ولسن بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ مانگا تو مور بولا۔ ’’ہم کیسے یقین کرلیں کہ وہ مال تمہارے پاس ہے؟‘‘

میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سربمہر لفافہ نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ’’اس میں بیس نوٹ پچاس ڈالر کے اور دو ہیرے ہیں۔ یہ میں نمونے کے طور پر لایا ہوں تاکہ تمہیں یقین آ جائے۔‘‘

ولسن نے پھرتی سے وہ لفافہ اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا، پھر وہ تینوں باری باری اسے دیکھنے لگے۔ اس دوران میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہاں کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔ جب وہ لفافہ دیکھ چکے تو میں نے اسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ’’ہمیں ایسی شرائط طے کرنا چاہئیں جن میں ہر ایک اور خاص طور پر میرے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ وہ مال میرے دفتر میں ہے چنانچہ ہمیں وہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہیے۔ اس وقت ایک بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ میرا دفتر نارتھ ارلیم پر ہے۔ میں وہاں پونے دو بجے ملوں گا۔ گاڑی عمارت کے عقبی لاٹ میں کھڑی کرنا اور میں تمہارے لیے عقبی دروازہ کھول دوں گا۔ تم ایک ایک کر کے آؤ یا اکٹھے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میرے ساتھ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ یہ ایک صاف ستھرا سودا ہے۔ جس میں ہر ایک کو پچیس فیصد حصہ ملے گا۔ اب تم سے وہیں ملاقات ہوگی۔‘‘ یہ کہہ کر میں پیچھے ہٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

ایک بج کر پینتالیس منٹ پر میں اپنے دفتر سے اتر کر نیچے ہال میں آیا تو شیشے کے دروازے کے باہر وہ تینوں کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ماسٹر کی سے دروازے کا تالا کھول کر انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ولسن سب سے آخر میں تھا جیسے ہی وہ دروازے سے گزرا۔ میں نے اس کے پیچھے جا کر اس کی جیکٹ کی جیب سے آٹومیٹک ریوالور نکال لیا اور اس کی پسلیوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

’’تم ہی وہ شخص ہو جس پر میں بالکل بھروسا نہیں

کرتا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے پستول کا میگزین خالی کیا اور ریوالور مور کو دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپنے پاس رکھو اور یہاں سے جاتے وقت اسے واپس کر دینا۔''

ہم لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے تک آئے۔ میں نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ سامان یہاں نہیں ہے۔ پہلے مجھے تمہارے روپے کے بارے میں اطمینان کرنا ہے۔'' پھر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور اس پر ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ ''وہ پیکٹ بھیج دو۔ عمارت کا عقبی دروازہ غیر مقفل ہے۔ وہ وہاں سے آسکتا ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور بولا۔ ''دس پندرہ منٹ میں وہ سامان یہاں پہنچ جائے گا۔ اس وقت تک ہم کچھ باتیں کر لیتے ہیں۔ میں فالس کریک میں ہونے والے قتل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے دوسرے لوگوں کو نظر انداز کر کے پولیس انسپکٹر مور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے کلائنٹ کو اس بوجھ سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس کا بندوبست کر سکو۔''

''کیسے؟''

''میں نہیں جانتا لیکن تم کافی ہوشیار ہو۔ کوئی نئی کہانی بنا سکتے ہو۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یا ولسن کو پولیس کے حوالے کر دو۔ یہی وہ شخص ہے جس نے دونوں قتل کیے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ولسن اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میں نے بھی ایسا ہی کیا لیکن میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ میرے تیور دیکھ کر ایک بار پھر بیٹھ گیا۔

''ہاں۔'' مور نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ سنیرٹ کی خفیہ اطلاع پر ولسن اور دوسرے لوگ پکڑے گئے تھے۔ سارا مال سنیرٹ نے ہی ہڑپ کر لیا۔''

''اس کے علاوہ رقم سے بھرا ہوا ایک اور بیگ بھی تھا۔'' ولسن بولا۔ ''وہ اس نے کہاں چھپایا؟''

''شاید وہ رقم اس نے کسی کاروبار میں لگا دی ہوگی۔'' مور نے کہا۔

''تم!'' میں نے پستول کا رخ بل ہیچ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل خاموش ہو۔''

''اپنی زبان بند رکھو۔'' اس نے جواب دیا۔ مور نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم بڑوں کے درمیان یہ لوگ نابالغ ہیں۔''

پانچ منٹ بعد ہی صورتِ حال میرے حق میں ہو

چکی تھی لہٰذا میں نے وقت گزاری کے لیے کہا۔ ''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی بیئر پینا پسند کرے گا۔''

میں ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر پستول ہاتھ میں لیے ہوئے اٹھا اور کونے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے ریفریجریٹر تک گیا جیسے ہی میں نے اس کا دروازہ کھولا اچانک ہی شکاگو پولیس کا کیپٹن ولیم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

''تم سب لوگ زیرِ حراست ہو۔'' اس نے نفرت

آمیز لہجے میں کہا۔

☆☆☆

چار بج کر پینتیس منٹ پر میں موٹیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ گنی میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ مجھے بہت زور کی نیند آرہی تھی لیکن گنی کے اصرار پر اسے پوری تفصیل بتانا پڑی۔ ''میں نے تمہارے منصوبے کے مطابق عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے کیپٹن ولیم کو اس کے گھر پر فون کر کے صورت حال بتائی۔ اس نے ایڈ مور کو پولیس انسپکٹر کے طور پر شناخت کر لیا جس نے 1979ء میں بل بیچ کو شکاگو میں گرفتار کیا تھا۔ میری درخواست پر ولیم اس مشن میں حصہ لینے پر تیار ہو گیا۔''

''اس کے بعد میں نے اوک پارک پولیس اسٹیشن فون کر کے ایڈ مور کے بارے میں معلوم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی شفٹ بارہ بجے شب ختم ہو جائے گی پھر میں میلروز پارک گیا جہاں جان بی رینڈل انشورنس کمپنی کا دفتر ہے۔ میں جس فورڈ وین کا تعاقب کر رہا تھا وہ اسی عمارت کے عقب میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک موٹر سائیکل بھی تھی۔ عمارت کی دوسری منزل پر چھوٹے اپارٹمنٹس تھے چنانچہ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بدمعاش اسی عمارت میں رہتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنی موٹر سائیکل کے بجائے مالک مکان کی گاڑی استعمال کرتا ہے۔''

''اب مجھے ایڈ مور پر نظر رکھنا تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے انتظار میں ایک گھنٹا گزارنے کی خاطر کسی جگہ بیٹھ کر سینڈوچ اور بیئر کا سہارا لیا پھر گاڑی چلاتا ہوا اوک پارک میونسپل بلڈنگ پہنچا۔ وہ بارہ بج کر پچیس منٹ پر باہر آیا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کرنا شروع کیا۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق جان بی رینڈل انشورنس بلڈنگ پہنچا اور اپنی کار کھڑی کر کے اوپر چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی گاڑی سے باہر آتا۔ ایک ٹیکسی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے بل بیچ برآمد ہوا۔ وہ خاصا مشتعل لگ رہا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ اسٹور سے فارغ ہو کر گھر گیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ لوٹ کا مال غائب ہو چکا ہے تو وہ جھگڑا کرنے چلا آیا۔''

اس کے جانے کے چند منٹ بعد میں بھی اوپر گیا اور باہر آنے والی آوازوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کس اپارٹمنٹ میں ہیں۔ میں نے دروازے پر زوردار ٹھوکر لگائی اور پستول ہاتھ میں لیے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر انہیں سانپ سونگھ گیا پھر میں نے گم شدہ مال کا ایک نمونہ دکھا کر انہیں پیشکش کی کہ اگر وہ مجھے چوتھا حصہ دار بنا لیں تو میں ان کی رقم اور ہیرے واپس کر سکتا ہوں اگر وہ اس پر راضی ہیں تو پونے دو بجے میرے دفتر پہنچ جائیں۔

''میں نے راستے میں ایک پبلک فون سے کیپٹن ولیم کو کال کی اور وہ مجھ سے پہلے دفتر پہنچ گیا۔ ہم نے انہیں گرفتار کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ پہلے ان کے اعتراضات سننا بہتر ہوگا چنانچہ وہ الماری میں چھپ گیا پھر میں ان لوگوں کو اوپر لے کر آ گیا۔ ولسن کو غیر مسلح کیا اور باتوں باتوں میں ان سے سب کچھ اگلوا لیا۔ میرا دفتر شکاگو میں ہے اور وہ علاقہ اس کی حدود میں آتا ہے چنانچہ وہ انہیں گرفتار کر سکتا تھا۔''

''ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ مجھے یہ رقم برآمد کرنے پر چالیس ہزار ڈالر اور ہیروں کی مالیت کا دس فیصد بطور انعام ملے گا۔''

''اس طرح کے لطیفے میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔'' گنی منہ بناتے ہوئے بولی۔

''پرانے لطیفے ہی بہترین ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

دوسری صبح بل بیچ نے دوران تفتیش بتایا کہ وقوعہ والے روز سزا یافتہ قیدی آرٹ ولسن علاقے میں آیا اور اس نے وینڈل سنیفرٹ کو فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے دیکھا تو غصے میں آ گیا۔ اس نے روز یلو کا بیلچہ اٹھایا اور سنیفرٹ کی پشت پر وار کر کے اسے گرا دیا۔ دوسرے روز اس نے روز یلو کو پھنسانے کے لیے بیچ کے ذریعے ایک اسکیم تیار کی کیونکہ وہ ایڈ مور اور بیچ کے گزشتہ تعلق سے واقف تھا۔ اس نے وینڈل کی بیوہ کا پیچھا کر کے لوٹی ہوئی رقم تلاش کرنے کا منصوبہ بھی بنایا۔ اس طرح ان تینوں کے درمیان یہ سازش پروان چڑھی۔ مور نے اپنی صفائی میں کہا کہ وہ لوٹ کا مال برآمد کرنے کے لیے ان دونوں کے ساتھ شامل ہوا تھا لیکن حکام بالا نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور اسے اس جرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور میڈیا میں بھی اس کے جرم کی تشہیر کی گئی۔

اس کارروائی کے نتیجے میں میرا مؤکل ونس روز یلو بے گناہ ثابت ہوا اور مجھے پچاس ہزار ڈالر انعام میں مل گئے۔ جس سے میری بیٹی جینی کے میڈیکل کالج میں پہلے سال کے اخراجات پورے ہو سکتے تھے اور یہ سب احتیاط کا نتیجہ ہے جو میں نے اس کیس میں قدم قدم پر کی تھی ورنہ میں بھی روز یلو کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔

☆☆☆

سرورق کی پہلی کہانی

سوگوزباں

روبینہ رشید

بعض عورتیں زندگی کے سفر میں کسی بھی مرحلے میں حفاظتی بیلٹ کی محتاج نہیں ہوتیں... وہ ہر حیثیت اور ہر میدان میں اپنی خوداعتمادی... دل آویز تمکنت... جرأتِ فکر و اظہار اور بے خوفی کا لوہا منوا لیتی ہیں... ایک ایسی ہی دل کش... نازک اندام ماہ جبین کی داستاں... جو کم عمری سے ہی مسائل میں الجھتی چلی گئی... دوست... احباب... رشتے دار آنکھوں پر دولت و خودغرضی کا نقاب اوڑھے اس کے ہمراہ رہے... مگر وہ ہر ایک محاذ پر مضبوطی سے ڈٹی رہی... مگر اچانک ہی وہ قتل کی ایک واردات کی چشم دید گواہ بن گئی... اور پھر پے در پے رونما ہونے والے واقعات نے اس کے حواس گم کردیے...

وہ اپنے شاندار فلیٹ کی بڑی سی کھڑکی میں کھڑا سمندر کی موجوں کا نظارہ کررہا تھا۔ بلند ہوتی لہریں ہوا کے دوش پر اٹکھیلیاں کرتی آگے بڑھتیں اور پھر ساحل کے قریب آکر سرنگوں ہوجاتیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک اس کے دیکھتے ہی دیکھتے موجوں کا رنگ تبدیل ہونے لگا، پانی اب خون کی رنگت میں بدلتا جارہا تھا اور پھر یہ سرخ رنگت آگ کے شعلوں میں ڈھل گئی۔ شعلے

کسی سیلاب یا سونامی کے مانند آگے بڑھنے لگے۔ ان کی اونچائی اس کے تیسری منزل پر واقع اپارٹمنٹ سے بھی بہت بلند تھی۔ وہ ایک لمحے کو سکتے کے سے عالم میں کھڑا شعلوں کے اس سمندر کو اپنی جانب بڑھتا دیکھتا رہا پھر لپک کر دروازے کی طرف بھاگا مگر اس کے کمرے سے باہر نکلنے سے قبل ہی کھڑکی کا بڑا سا شیشہ شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ شعلوں کی سرخ لپکتی زبانیں تیزی سے اس کے قریب آتی جارہی تھیں۔ اچانک فضا سیٹی نما تیز آواز سے گونج اٹھی۔

''کیا یہ صورِ اسرافیل ہے؟ کیا قیامت آچکی ہے؟'' اس کے متوحش، خوف زدہ ذہن میں سوال گونج رہے تھے۔ سیٹی کی آواز رفتہ رفتہ ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک تو وہ ساکت بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا، موبائل کی گھنٹی بج بج کر اب بند ہو چکی تھی۔

''تو یہ خواب تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔ اب تک وہ اس تیز تپش کے احساس سے باہر نہیں آپایا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو وہ ایک گہری سانس لے کر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

اس کے اردگرد شعلے یا لاوا وغیرہ کچھ نہیں تھا، سامنے کھڑکی سے سمندر بھی معمول پر نظر آرہا تھا مگر وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں اب کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں رہا تھا۔ ایک فیصلے نے اسے گویا آتش فشاں کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا جہاں خطرات کی تپش اسے جھلسا دینے کے لیے بے تاب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شاید اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا مگر اس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ سالوں بعد یہ پہلا موقع تھا جب کچھ کرنے یا آگے بڑھنے کے لیے اسے کسی بھی قسم کے نشے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی۔

اس کے سامنے اس کا مقصد تھا جسے اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا تھا۔

☆☆☆

ایلیا صبح سے ہی شدید غصے میں تھی۔ دن کی شروعات ہی اس کے پلان کے خلاف ہوئی تھی۔ ایک اہم اسائنمنٹ پر ہفتے بھر کی شدید اور مسلسل محنت کے بعد یہ اس کا پہلا آف تھا۔ اور وہ یہ ٹھان کر سوئی تھی کہ صبح نہایت آرام سے اٹھا جائے گا پھر برنچ کیا جائے گا۔ دوپہر میں کوئی اچھی سی مووی دیکھی جائے گی مگر ایسا صرف اس نے سوچا تھا۔

ہوا تو یہ کہ پہلے تو صبح ہی صبح دروازے پر پڑنے والی زوردار دھچکا دار دستک نے اسے اچھل کر بستر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ بیڈ روم سے دروازے تک پہنچتے پہنچتے فیصل کی جانب سے آنے والی کسی بُری خبر سے لے کر کسی بڑی ایمرجنسی تک بے شمار وسوسے اس کا دل ہولا چکے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی بلڈنگ کے چوکیدار خان کا بھاری بھر کم مونچھوں سے سجا چہرہ دیکھ کر وہ تلملا کر رہ گئی۔

''خان کیا دروازہ توڑنے کا ارادہ تھا، ایسی کون سی افتاد پڑ گئی ہے صبح صبح۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''میڈم...... ابھی صبح صبح ہے؟ پورا دس بجے کا ٹائم ہے۔'' وہ اسے جواباً گھور کر گویا اس کی کم علمی پر بُرا مناتے ہوئے بولا۔ ''ای ام نے پانی چڑھایا ہے اور سب کو بتا بھی دیا ہے اسی لیے آپ کا دروازہ بجایا ہے۔ بعد میں آپ لوگ ہی ناراض ہوتے ہو کہ ام کو بتایا نہیں۔''

''بہت مہربانی ہے تمہاری۔'' وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی اور بستر پر جا کر گر گئی۔

دوسری بار اس کی آنکھ شدید گرمی کے احساس سے کھلی تھی۔ اس نے بلبلا کر پہلے اے سی اور پھر پنکھے کی جانب دیکھا مگر دونوں ہی ساکت و جامد تھے جس کا واضح مطلب بجلی سے اچانک محرومی کے صدمے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یو پی ایس سسٹم کئی روز سے گڑبڑ کر رہا تھا۔ اس کا سوئچ ڈھیلا ہو گیا تھا جسے ہر بار ٹھیک کرنا پڑتا تھا۔ وہ گرتے پڑتے اٹھی اور یو پی ایس چلایا جس سے پنکھے میں تو زندگی لوٹ آئی مگر اے سی کے چلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بے بسی کے عالم میں بستر پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ تڑپ ہی اٹھی۔ چوکیدار صاحب کی دل دہلا دینے والی انٹری کے بعد وہ صرف 25 منٹ ہی سو پائی تھی۔ اسے بجلی والوں پر سخت غصہ آرہا تھا، ہزار وعدوں وعید کے باوجود جب چاہیں تب اور جہاں چاہیں اس جگہ بجلی بند ہونے کے اس وتیرے نے شہر کے لوگوں کو ایک قسم کے شدید ذہنی دباؤ اور تناؤ کا شکار بنا رکھا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بل تو پورا بلکہ پورے سے بھی دگنا ہی آئے گا چاہے بجلی آدھا ماہ غائب رہی ہو اور اگر بل بھرنے میں ذرا بھی تاخیر ہو جائے تو ہزاروں کے حساب سے جرمانے الگ اور بجلی کٹ جانے کا یقینی خدشہ الگ، حد ہو گئی ہے۔ گویا شہریوں کے لیے بنیادی حقوق میں شامل انسانی ضروریات کا حصول بھی اب حسن آرا کے سات سوالوں کی طرح ہو گیا تھا جن کے جواب لانے کے لیے انتظامیہ کے شہزادوں کو کسی حاتم کی ضرورت ہے۔ وہ کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

اب نیند کا تو سوال باقی نہیں رہا تھا۔ بجلی دو گھنٹے بعد آئی تھی اس دوران ایلیا نے اپنے سارے کام نمٹا لیے تھے۔

اس فلیٹ میں وہ اور اس کا چھوٹا بھائی فیصل رہتے تھے۔فیصل بی بی اے کے آخری سال میں تھا۔کرکٹ اس کی محبت تھی اور وہ ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں ہی شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ایلیا شہر کے ایک مشہور چینل کی رپورٹر تھی۔ امی اور ابو کی رحلت کے بعد وہ بہن بھائی ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔کئی سال قبل جب ایک ٹریفک حادثے میں ان کے سر سے ماں باپ کا سایہ اچانک اٹھ گیا تب ایلیا میڈیا سائنسز کے آخری سال میں تھی اور فیصل نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔تب کئی رشتے داروں نے انہیں تنہا رہنے سے روکا اور اپنے گھر لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔شاید وہ دونوں خالہ کے گھر چلے بھی جاتے اگر اس روز ایلیا خالہ اور خالو کی گفتگو اتفاق سے سن نہ لیتی۔

”یہی موقع ہے تیمور! دونوں ہمارے ساتھ رہیں گے..... باجی اور بھائی جان اس چھ سو گز کے مکان کے علاوہ بینک بیلنس اور زیور بھی چھوڑ کر گئے ہیں۔فیصل ابھی بچہ ہے اور جو ایلیا کہتی ہے وہ وہی کرتا ہے۔میں اپنے حامد سے ایلیا کا نکاح کرا دوں گی تو سمجھو سب کچھ اپنا ہو جائے گا۔“ یہ اس کی بہت پیاری خالہ کی آواز تھی۔ایلیا کا دل پھٹ سا رہا تھا۔

”جو کرنا ہے جلدی کر لینا۔دیکھ نہیں رہیں بھائی جان کے بھائی صاحب کو...... کیسے اپنے بیٹے شاہد کو ہر کام پر دوڑا رہے ہیں جیسے وہی مالک ہوں ہر چیز کے۔“ خالو جان بولے۔

”ہاں ہاں سمجھتی ہوں میں ان کے ارادے..... مگر تم فکر نہ کرو، ایلیا میری مٹھی میں ہے، اس کے کانوں میں چچا کی بابت چند باتیں ڈال دوں گی تو ان کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔“ خالہ بات مکمل کر کے ہنسی تھیں۔

ایلیا کے لیے اس سے زیادہ کچھ سننا ممکن نہیں تھا۔ اس رات اس نے بہت سوچا اور اس ایک رات نے اسے بہت سمجھ دار اور ذمے دار بنا دیا تھا۔اسے اپنا ہی نہیں فیصل کا بھی خیال رکھنا تھا۔

’ماں باپ اپنے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کے لیے جو لوازمات چھوڑ کر جاتے ہیں بسا اوقات وہی ان کے لیے دلی و ذہنی تکالیف کا جہان خرید لاتے ہیں۔ پیسا اتنی ہی عجیب چیز ہے اور اس پر مرنے والے اس سے بھی زیادہ عجیب جو دھوپ میں رکھی برف کو پانیوں میں چھپا کر یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ غالباً پگھلے گی ہی نہیں۔‘ اس نے دکھ سے سوچا۔وہ خالہ جان، چچا جان، بڑی پھوپی کے اس روز کے تاثرات آج تک نہیں بھول پائی تھی جب اس نے سب کو بٹھا کر بتا دیا تھا کہ وہ اور فیصل ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں جائیں گے اور یہ کہ وہ دونوں اپنا خیال خود رکھ سکتے ہیں۔

”اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہ پاؤ گے تم دونوں؟“

”نہیں، ہمیں اتنے بڑے گھر کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایلیا نے سکون سے جواب دیا تھا۔”اس لیے میں نے ابو کے وکیل کے توسط سے یہ گھر فروخت کر دیا ہے۔اس کی جگہ ہم نے کلفٹن میں ایک چھوٹے فلیٹ کا سودا کر لیا ہے اور باقی کی رقم فیصل کے نام سے انویسٹ کر دی ہے جہاں سے ماہانہ منافع ملتا رہے گا۔“

”اوئی ذرا سی لڑکی کے اتنے بڑے بڑے کام۔“ پھوپی چمک کر بولی تھیں۔”یہاں چچا، پھوپا، خالو سب بیٹھے تھے، کسی سے مشورہ تک لینا گوارا نہیں کیا اور خود ہی سب فیصلے کر کے بیٹھ گئی۔“

شام تک وہ سب ایلیا کو بدلحاظ، بے شرم اور نہ جانے کون کون سے خطاب دے کر گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔اس کے بعد اس نے اپنی سوچ پر عمل درآمد کر لیا تھا اور اب وہ دونوں اپنے چھوٹے سے گھر میں خوش تھے۔کافی پیتے پیتے پرانی یادیں گویا فاسٹ فارورڈ میں اس کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔’میں شرطیہ قنوطی ہوتی جا رہی ہوں۔‘ اس نے خود کو ڈپٹا۔

شام تک وہ بے مقصد ٹی وی دیکھتی رہی۔فیصل سے لمبی چیٹ کی۔ بوریت اس کا مزاج پوچھے لے رہی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی دوست سمعیہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ جب اس کی گاڑی اپارٹمنٹ میں بنے گیراج سے باہر نکلی، شام کی رنگت سرمئی ہو چلی تھی۔

☆☆☆

وہ مسلسل سوچے جا رہا تھا۔اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کے پاس اب بہت زیادہ وقت نہیں بچا تھا۔اس کے پاس جو ثبوت تھے اسے ان کو جلد از جلد کسی ایسی محفوظ جگہ پہنچانا تھا جہاں سے وہ دوبارہ ان کے ہاتھ نہ لگ پائیں اور ان کے خلاف وہ سب بھی ہو پائے جو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔اس حوالے سے پولیس کے پاس جانا بے کار تھا۔ وہ ان کی دسترس اور پہنچ سے بخوبی واقف تھا۔

”پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے اپنے آپ سے

سوال کیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے موبائل اٹھایا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی نمبر ملاتا فون گنگنا اٹھا۔ اسکرین پر جو نام نظر آرہا تھا، وہ اسے چوکنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ فون چند لمحے بج کر بند ہو گیا تھا۔ اس فون کال کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ لوگ حرکت میں آچکے تھے اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔ اس نے الماری میں رکھے چھوٹے سے ہینڈ بیگ کو اٹھایا۔ اس میں ضروری چیزیں بھریں۔ ٹیکسی کے طور پر میسر پرائیویٹ کاروں کے ادارے کے ایپ پر جا کر گاڑی بک کرائی، اسکرین پر چمکتی تحریر کے مطابق اس کی گاڑی پانچ منٹ میں گیٹ پر پہنچنے والی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے مڑ کر اپنی چھوٹی سی جنت کو دیکھا جس کے حصول اور آراستہ و پیراستہ کرنے کے شوق نے اسے اس مصیبت میں پھنسایا تھا۔ اس کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے چلتا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

گیٹ کے باہر کار اس کی منتظر تھی۔ وہ اپنی کار پہچانے جانے کے خوف سے بلڈنگ میں ہی چھوڑے جا رہا تھا۔ اس نے چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر کار کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ ”چلو ہمیں کینٹ اسٹیشن کی طرف جانا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور نشست سے سر ٹکا دیا۔ کار کے چاروں شیشوں پر سیاہ جالی کے کور لگے ہوئے تھے جس سے باہر سے اندر دیکھنا ناممکن سا تھا۔ وہ خود کو خاصا محفوظ محسوس کر رہا تھا۔

جیسے ہی اس کی کار آگے بڑھی۔ گیٹ پر اسی لمحے پہنچنے والی چھوٹی سی سیاہ کار اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

☆☆☆

”تمہیں یقین ہے کہ وہ اس کار میں موجود ہے؟“ اس بھرائی ہوئی تھکی ماندہ آواز نے پوچھا۔

”جی سر، وہی ہے، میں نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ ہاتھ سے نکل جاتا۔“

”ٹھیک ہے اس کا پیچھا کرو اور جہاں وہ اُترے اس سے ہمارا سامان واپس لو۔“

”طارق کے لیے کیا حکم ہے سر؟“

”ختم کر دو...... اور ہاں کوئی چاقو وغیرہ استعمال کرنا اور کام صفائی سے ہونا چاہیے۔ مجھے گواہوں اور دیگر مسائل کا بکھیڑا نہیں چاہیے۔ وہ کیمرا یا موبائل جس میں اس نے وہ سب ریکارڈ کیا ہے وہ ضرور حاصل کر لینا، سمجھ رہے ہو نا تم......؟“

”جی جی سر، آپ مطمئن ہو جائیں۔“

”تم جیسے ایک گدھے کی وجہ سے یہ مشکل شروع ہوئی ہے۔ یاد رکھنا غفور تمہارے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا۔“ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”جی سر......“ وہ تھوک نگل کر بولا۔ اس کی چھوٹی سی سیاہ کار آگے والی کار کے بالکل پیچھے چل رہی تھی۔ وہ قدرے طویل القامت اور صحت مند شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے ہلکا سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر سیاہ کروشیے کی ٹوپی تھی۔ اس وقت اس کی پوری توجہ اس کار اور طارق پر تھی۔ اسے علم تھا کہ باس کو ناکامی پسند نہیں تھی۔ ناکامی کی صورت میں جو اس کے ساتھ ہو سکتا تھا اس کا تصور ہی اسے تھرا دینے کے لیے کافی تھا۔ شام کی روشنی سرمئی ملگجی سی ہلکی تاریکی کے قالب میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ آگے جانے والی کار کینٹ اسٹیشن کے بارونق علاقے سے دو گلی پیچھے ایک گلی میں جا رکی تھی۔ یہاں پرانی عمارتوں کے درمیان نئی عمارتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ اس وقت وہاں ویرانی کا راج تھا۔

طارق محتاط انداز میں گاڑی سے نیچے اُترا اور کونے میں بنی عمارت کی جانب بڑھا۔ اگلی گاڑی کے آگے بڑھتے ہی غفور بھی کار سے باہر آگیا اور تیزی سے طارق کی طرف لپکا۔ اس سے قبل کہ طارق سنبھل پاتا غفور کے دھکے نے اسے سڑک پر لٹا دیا تھا۔

”کک...... کون...... کیا کر رہے ہو...... بچاؤ۔“ طارق کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ غفور نے اس کے گرتے ہی ہاتھ میں پکڑے چاقو کو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے کندھے پر لٹکا بیگ چھین لیا۔ طارق کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ بھی کر پاتا، غفور کے ہاتھ میں موجود چاقو ایک بار پھر حرکت میں آگیا تھا۔

”فون کہاں ہے تیرا......؟“ وہ طارق کے چہرے کے قریب منہ لا کر غرایا۔ ”اس میں ہی ہے نا وہ فلم......؟“

”وہ تمہیں نہیں ملے گی۔“ طارق بمشکل بولا۔

”بکواس نہ کر...... تو تو اب مر ہی رہا ہے، کیا کرے گا چھپا کر......؟“ وہ اس کی جیب کی تلاشی لیتے ہوئے بولا۔ اگلے ہی لمحے طارق کا نیا آئی فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ فون کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

طارق کے جسم سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے غفور کی آواز لحہ بہ لحہ اس سے دور

ہوتی جارہی ہو۔اس کے دیکھتے ہی دیکھتے غفور نے اپنا ہاتھ لہرایا اور خون آلود چاقو ایک بار پھر فضا میں بلند ہوا۔

''تیرا دی اینڈ آ گیا بیٹا۔'' غفور سفاکی سے مسکرایا۔ اس سے قبل کہ چاقو ایک بار پھر طارق کے جسم میں جگہ بناتا۔ ایک تیز چیخ نے غفور کو ساکت کر دیا تھا۔

☆☆☆

سمعیہ کا گھر کینٹ کے علاقے میں تھا۔اگرچہ کلفٹن سے کینٹ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر ٹریفک کے جم غفیر کی بنا پر ایلیا کے وہاں پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا چھلک آیا تھا۔سمعیہ کا اپارٹمنٹ ایک نوتعمیر عمارت میں تھا جس میں مہمانوں کے لیے پارکنگ کی سہولت میسر نہیں تھی۔ایلیا کو اپنی گاڑی کو دوگلی پیچھے لانا پڑا تھا۔گاڑی پارک کر کے وہ دوسری جانب جانے کے لیے مڑ ہی رہی تھی کہ ایک عجیب سی گھٹی گھٹی چیخ نما آواز نے اسے چونکا دیا۔اس نے اضطراری طور پر مڑ کر دیکھا۔ بظاہر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔وہ اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر مڑنے ہی والی تھی کہ اس بار قدرے واضح چیخ سنائی دی۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چیخنے والا شدید تکلیف کے عالم میں ہو۔وہ تیزی سے مڑی۔وہ جس گلی کے سامنے کھڑی تھی، وہاں خاموشی طاری تھی۔اردگرد کی سڑکوں پر حسبِ معمول روڈ لائٹس بند تھیں جس کی وجہ سے ماحول قدرے پُراسرار لگ رہا تھا۔ایلیا کو خوف محسوس ہو رہا تھا مگر اس کی رپورٹنگ کی حس اس خوف پر حاوی آ گئی تھی۔وہ دوبارہ پلٹی۔اس بار اس کا رخ اگلی گلی کی جانب تھا۔اس گلی میں قدرے روشنی موجود تھی۔ایلیا گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔گلی کے درمیان...... ایک شخص زمین پر گرا پڑا تھا۔دور سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔دوسرا شخص اس پر جھکا ہوا تھا،اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر کالی ٹوپی موجود تھی۔اس کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا جسے اس نے بلند کر رکھا تھا۔

ایلیا کے منہ سے بے اختیار زوردار چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس کی چیخ نے چاقو والے شخص کو بری طرح چونکا دیا تھا۔اس نے لمحہ بھر کے لیے سراسیمہ ہو کر ایلیا کی جانب دیکھا۔اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا مگر ایک تو ایلیا اس سے خاصے فاصلے پر تھی دوسرے اس کے چیخنے سے لوگوں کے جمع ہونے کا خطرہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔طارق یوں بھی خون میں ڈوبا ہوا تھا،اس سے بیگ اور فون وہ پہلے ہی چھین چکا تھا۔ غفور نے لمحہ بھر میں فیصلہ کیا اور زقند لگا کر پچھلی گلی کی طرف لپکا جہاں اس کی کار موجود تھی۔

اس دوران ایلیا نے فون نکال کر پولیس کے ہنگامی نمبر پر کال ملا دی تھی۔حملہ آور کو بھاگتا دیکھ کر وہ زمین پر پڑے شخص کی جانب لپکی۔عقب سے لوگوں کے قدموں کی آواز نے اس کا خوف پہلے ہی بہت کم کر دیا تھا۔

''آپ...... آپ ٹھیک ہو جائیں گے، میں ایمبولینس کو بلاتی ہوں۔'' وہ قریب پہنچ کر بولی۔طارق کو اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی مگر یہ اس کا آخری موقع تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اب وہ بچ نہیں پائے گا مگر وہ مرنے سے پہلے اپنا کام پورا کرنے کی آخری کوشش ضرور کرنا چاہ رہا تھا۔''میری...... میری بات سنو۔'' وہ بمشکل بولا۔اس نے پورے جسم کی طاقت اپنی گویائی میں بھر دی تھی مگر ایلیا کو سرگوشی نما وہ آواز سمجھنے کے لیے اس کے چہرے کے قریب اپنے کان لانا پڑے تھے۔

''بولیے...... بولیے۔''

''میری مدد کرو...... میرے کوٹ کی اندر والی جیب میں ایک چور جیب ہے اس میں...... اس میں ایک......'' وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔''میموری کارڈ...... نکالو......'' وہ بمشکل بول پایا۔

''میموری کارڈ......'' ایلیا بولی۔

''جی...... تم سیکڑوں...... سیکڑوں لوگوں کی جان بچالو...... وہ...... مار ڈالے گا...... سب کو......'' طارق کی آواز ڈوبتی جارہی تھی۔

''مگر آپ زخمی ہیں۔'' ایلیا اسے ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

''خدا کے لیے...... نکال لو...... ورنہ...... ورنہ یہ ثبوت ضائع ہو جائے گا...... میں جان دے کر بھی ہار جاؤں گا...... نکال کر چھپا لو۔'' طارق کا چہرہ اب سفید ہوتا جارہا تھا۔

ایلیا نے اس کے کوٹ کی اندرونی جیب کو ٹٹولا،وہ خالی تھی۔دوسری جانب کی اندرونی جیب سے اسے ایک چھوٹا سا پیکٹ مل گیا۔

''چھپا...... چھپا لو...... سب کے آنے سے پہلے......'' طارق بولا۔''کسی ذمے دار افسر تک پہنچانا...... تمہاری ذمے داری ہے...... میرا قرض ہے...... کر دینا۔'' الفاظ اب ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے۔

''بھائی...... بھائی سمجھ کر۔'' اس کے منہ سے اب خون کی لکیر

نکل رہی تھی۔ ایلیا نے پیکٹ اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

''آپ بچ جائیں گے..... وہ دیکھیں ایمبولینس پہنچ گئی ہے۔ پولیس بھی آرہی ہے۔''

''میں..... نہیں بچوں گا'' وہ بولا۔ ''تم وعدہ کرو.....''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' ایلیا بالآخر بولی۔

''اس کا پاس ورڈ ہے..... کر دینا..... بھائی بھائی.....'' لفظ دم توڑ گئے تھے۔ ایلیا سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحے ایمبولینس ان کے برابر رکی اور اس سے رضا کار اتر کر زخمی کی جانب لپکے تھے۔ وہ اسے اسٹریچر پر لٹارہے تھے۔ اس کی نبض دیکھ رہے تھے۔

اچھے خاصے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ایلیا پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ وہ اس وقت پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اس پیکٹ کی حفاظت کا اور اسے ذمے دار ہاتھوں تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے لیے وہ اس سب کو سمجھنا چاہ رہی تھی۔ موقعِ واردات سے دور ہوتے ہوئے جو آخری بات اس کی سماعت نے سنی وہ اس شخص کی موت کی خبر تھی۔

☆☆☆

''وہ یقینی طور پر مر گیا ہوگا باس.....'' غفور اس وقت ایک بھری پری سڑک کے درمیان.... کار چلا رہا تھا۔

''ہوگا سے کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' سوال اس قدر سرد اور غصے میں کیا گیا تھا کہ وہ لرز کر رہ گیا۔

''سر وہاں اچانک ایک لڑکی آگئی تھی اور وہ چیخنے لگی تھی، اس کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑا۔'' اس نے بمشکل بتایا۔

''اف کس قدر جاہل ہو تم..... کیا اس نے تمہارا چہرہ دیکھ لیا تھا۔''

''نہیں نہیں، وہاں خاصا اندھیرا تھا۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''اور جو چیز تمہیں اس نمک حرام سے لینی تھی؟''

''وہ ایک بیگ لے کر جا رہا تھا سر، وہ بیگ اور آپ کی ہدایت کے مطابق اس کا فون میرے پاس ہیں اور میں انہیں آپ کو پہنچانے آرہا ہوں۔'' غفور نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، خیال رکھنا کوئی تمہارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔''

''کوئی نہیں ہے سر۔'' غفور پُرجوش انداز میں بولا۔ ''میں تقریباً پہنچ گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، نیچے آجاؤ۔'' ان الفاظ کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

چند لمحوں بعد وہ ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی کار کے پہنچتے ہی گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ وہ کار کو اندر پورچ کے آخری کونے تک لے گیا۔ پھر بیگ اٹھا کر لکڑی کا بڑا سا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ اس کے لیے اچھی طرح جانی پہچانی ہو۔ چھوٹے سے لاؤنج کو عبور کر کے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا اور پھر نیچے اُترتا چلا گیا۔ زیرِ زمین کسی ہوٹل کی لابی کا سا منظر تھا جس کے دونوں اطراف کمروں کے بند دروازے تھے۔ غفور نے پہلے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''آجاؤ.....'' اندر سے آنے والی اس سرد آواز نے اسے خوش آمدید کہا۔ غفور مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک قدرے چھوٹی قامت کا دبلا پتلا شخص بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''فرقان..... سر کہاں ہیں؟'' غفور نے پوچھا۔

''وہ کچھ مصروف ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم سے طارق کا بیگ اور فون لے لوں۔''

''او کے.....'' غفور نے دونوں چیزیں اس کی جانب بڑھا دیں۔ ''اب میرے لیے کیا حکم ہے، مجھے رکنا ہے یا گھر جاؤں؟''

''سر نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں ان کا یہ پیغام دوں کہ اب تمہاری زندگی سے زیادہ تمہاری موت ان کے لیے فائدہ مند ہے۔'' فرقان مسکرا کر بولا۔ غفور کچھ کہہ پاتا اس سے قبل ہی اس کا بایاں ہاتھ بلند ہوا جس میں سیاہ رنگ کا سائلنسر لگا ریوالور موجود تھا۔ اس کی انگلی کی جنبش سے آگ کا ایک شعلہ غفور کے دل میں اُتر گیا۔ وہ حیرت سے خاقان کو دیکھتا ہوا اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی ابراہیم احمد گھر کی جانب جا رہا تھا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے ایک ہائی پروفائل اغوا کی وجہ سے مسلسل ڈیوٹی پر تھا۔ چند گھنٹوں کی نیند میں بھی دھیان کیس پر ہی لگا رہتا تھا۔ آج ہی مغوی بازیاب ہوا تھا۔ ابراہیم کا ارادہ گھر جا کر پوری نیند لینے کا تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران فون استعمال نہیں کرتا تھا مگر اسکرین پر دفتر کے نمبر دیکھ کر اس نے کار سڑک کی ایک جانب لگائی اور فون ریسیو کر لیا۔

''کیا ہو گیا عمران..... ابھی تو آفس سے نکلا ہوں

میں......؟ عمران بھی ڈی ایس پی تھا اور ابراہیم کا پارٹنر بھی۔ وہ دونوں پرانے دوست تھے۔ انہوں نے ایک ہی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک ساتھ ہی کرمنالوجی پر اسپیشلائزیشن کی تھی۔ ایک ساتھ ہی ڈپارٹمنٹ کو جوائن کیا تھا۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ڈپارٹمنٹ نے ان دونوں کو اسپیشل سیل میں تعینات کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ابراہیم خاصا سنجیدہ مزاج تھا جبکہ عمران بذلہ سنج۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی باتوں سے ابراہیم کو بھی زچ کر دیتا تھا۔

''کیا بتائیں بھائی، مجھے تو اب یہ لگنے لگا ہے کہ شیطان اس شہر میں اوور ٹائم کرتا ہے۔''

''ہوا کیا ہے عمران......'' ابراہیم نے پوچھا۔

''کینٹ کے علاقے میں ایک شخص کو چاقو کے وار کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے، قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔'' عمران کسی ماہر نیوز کاسٹر کے انداز میں بولا۔

''افسوسناک...... اسٹریٹ کرائم؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''بادی النظر میں یہی لگا تھا۔'' عمران بولا۔

''یہ ایک ایسی بیماری ہے جس نے ہماری زندگی کو خوف کے پنجوں میں پھنسا دیا ہے۔'' ابراہیم بولا۔ ''مگر یہ تو علاقے کے تھانے کا کیس ہے عمران۔''

''میں جانتا ہوں مگر اس کے باوجود میں نے اینگری ینگ مین ڈی ایس پی ابراہیم احمد کو فون کیا ہے تو کوئی تو وجہ ہوگی نا۔''

''میں وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' ابراہیم ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''اور تمہاری اطلاع کے لیے میں سڑک پر کھڑا ہوں لہٰذا براہِ کرم کم لفظوں اور بغیر کسی تمہید کے بات فرمایئے۔''

''واہ، واہ، کیا ادبی انداز ہے، تم کو تو رائٹر بننا چاہیے تھا، ڈاکٹر واٹسن کی جگہ شرلاک ہومز کیوں بن گئے تم۔'' عمران چہکا۔

''عمران کیا میں فون بند کر دوں؟'' ابراہیم غرایا۔

''نہیں، مجھے دوبارہ کرنا پڑے گا، تو کام کی بات یہ ہے کہ آپ واپس آجایئے ہمیں مقتول سے ملنے جانا پڑے گا۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں، یہ تھانے کا کیس ہے ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟'' وہ دانت پر دانت جما کر تحمل سے بولا۔

''تعلق ہے ڈی ایس پی...... کیونکہ مقتول وہ شخص ہے جسے آپ اور میں بڑی تگ و دو سے ڈھونڈ رہے تھے۔''

عمران اس بار سنجیدگی سے بولا۔

''کون...... کون ہے وہ......؟ کیا تمہارا مطلب ہے کہ طارق کو قتل کر دیا گیا ہے؟'' ابراہیم چونک کر بولا۔

''جی ہاں۔''

''اوہ...... میں آرہا ہوں۔'' ابراہیم فون بند کرتے ہوئے بولا۔ وہ طارق سعد کو گزشتہ دو ماہ سے فالو کر رہے تھے۔ ان کی تفتیش کے مطابق وہ دہشت گردی کے کسی بڑے ریکٹ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ان کے پاس اس کے خلاف ثبوت نہیں تھا اس لیے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دو ہفتے قبل وہ اچانک گم ہو گیا تھا۔ ابراہیم اور عمران نے اس کا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کیونکہ وہی ان کے لیے اس ریکٹ تک پہنچنے کا دروازہ تھا مگر وہ نہیں ملا تھا اور اب ملا تھا تو وہ ان کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ ابراہیم ہونٹ بھینچے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ طارق کو کون قتل کر سکتا تھا۔ اس کے اپنے ریکٹ والے یا پھر یہ کام کسی مخالف گروہ کا تھا۔ طارق سعد شہر میں ہونے والے ایک کریکر دھماکے کی تفتیش کے دوران ان کی نظر میں آیا تھا۔ ثبوت و شواہد اس کام میں طارق کی براہِ راست نہیں تو بالواسطہ شمولیت ثابت کر رہے تھے۔ ایک موقع پر تو وہ اسے گرفتار کرنے کی تیاری بھی کر چکے تھے مگر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہا ہے لہٰذا بڑے مگرمچھ کے شکار کے لیے اسے چارے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ حکمتِ عملی یہ تیار کی گئی تھی کہ اس کے سامنے آئے بغیر اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے تاکہ اصل آدمی سامنے آسکے۔ اس دوران ہر کام میں حتی الامکان رازداری اور احتیاط برتی گئی تھی پھر بھی دو ہفتے قبل وہ اچانک غائب ہو گیا تھا اور اب اس کی لاش ملی تھی۔

''یہ معاملہ ان کی سوچ سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔'' ابراہیم نے ہونٹ سکیڑ کر سوچا اور ایکسلیریٹر پر پیر رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ عجیب سا میموری کارڈ تھا۔ عام طور پر میموری کارڈ کو فون پائلٹ میں لگایا جائے تو اس میں موجود ڈیٹا دیکھنا مشکل نہیں ہوتا مگر یہ میموری کارڈ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ ایلیا مختلف طریقوں سے اسے کھولنے کی کوشش کر چکی تھی مگر اسے ہر بار ناکامی...... ہوئی تھی۔

اسے یاد تھا کہ اس شخص نے مرتے مرتے پاس ورڈ کا لفظ بولا تھا مگر اسے پاس ورڈ بتانے کی مہلت نہیں مل پائی تھی۔ اور اس پاس ورڈ کے بغیر اس کارڈ کا کھلنا ممکن نہیں تھا

اور اب وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔

عام حالات میں یہ اس کے لیے ایک شاندار بریکنگ نیوز تھی۔ وہ اس کی چشم دید گواہ تھی۔ وہ قاتل کا چہرہ دیکھ کر اسے پہچان سکتی تھی اور اس کے پاس قتل کی وجہ بھی موجود تھی۔ باقی مسالا نیوز روم میں لگا دیا جاتا جہاں کی ڈیمانڈ خبر میں زیادہ سے زیادہ سنسنی پیدا کرنا ہی قرار پا چکا تھا اور یہ تو تھی ہی ایک سنسنی خیز جاسوسی فلم...... مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس نے ایک مرتے ہوئے شخص سے رازداری کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہ وعدہ ہرگز توڑ نہیں سکتی تھی۔

دوسری طرف وہ شہر کے حالات سے اچھی طرح واقف تھی اور یہ آگہی اسے مختلف النوع قسم کے خوف میں مبتلا کر رہی تھی۔ اسے تقریباً یقین تھا کہ یہ قتل اسٹریٹ کرائم کا نتیجہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا باقاعدہ پلاننگ کے تحت کیا گیا ہے اور اس کی وجوہات میں اس میموری کارڈ کی تلاش بنیادی اہمیت کی حامل ہوسکتی تھی جو اب اس کے پاس تھا...... جب انہیں اس بیگ میں میموری کارڈ نہیں ملے گا تو وہ یقیناً اسے تلاش کریں گے اور جس طرح وہ قاتل کو دیکھ چکی تھی قاتل بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ جو لوگ ایک میموری کارڈ کے لیے ایک شخص کی جان لے سکتے تھے ان کے لیے دوسری اور تیسری جان لینا کیا مشکل ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ فیصل کی زندگی کسی قیمت پر خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

فیصل اس کی واپسی سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا۔ اس کی طبیعت بہتر نہیں تھی اور وہ پیٹ کی ایک سمت مسلسل درد کی شکایت کر رہا تھا۔ ایلیا آتے ہی اس کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی جس نے مٹھی بھر دوائیوں کے ساتھ ساتھ اسے خوب پانی پینے کو کہا تھا اور زیادہ درد کی صورت میں فوری اسپتال لے جانے کی ہدایت کی تھی۔ دواؤں سے اسے تھوڑا آرام آیا تو وہ سو گیا تھا اور اس کے سونے کے بعد سے ایلیا اس کارڈ کو کھولنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے اس کارڈ کا کھلنا نہایت ضروری تھا۔ اس شخص نے اس کارڈ کو چھپا کر رکھنے اور کسی ذمے دار ایماندار افسر تک پہنچانے کا وعدہ لیا تھا۔ اس نے دہرایا۔ 'مجھے یہی کرنا چاہیے۔' مگر وہ یہ کارڈ کسے دے۔ جو اس کا غلط استعمال بھی نہ کرے، وہ سوچے جا رہی تھی۔

اچانک اس کے ذہن کی اسکرین پر ایک چہرہ جگمگایا۔

''ابراہیم...... بس......! اس کام کے لیے وہ بہترین شخص ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''ایماندار اور کڑک افسر......''

وہ اسے کئی سالوں سے جانتی تھی۔ امی کی طرف سے وہ ان کا دور پار کا رشتے دار بھی تھا مگر ایلیا کی اس سے ملاقات پیشہ ورانہ حوالوں سے ہی ہوتی آئی تھی۔ ''ابراہیم اسے کھلوا بھی لے گا اور اس بے چارے کے قتل کے ذمے داروں تک بھی پہنچ جائے گا۔'' اس سوچ نے اس کے ذہن پر چھائے دباؤ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔

''صبح سب سے پہلے میں یہی کام کروں گی۔'' اس نے سوچا اور بستر پر دراز ہوگئی۔

☆☆☆

''یہ طے ہے کہ یہ عام اسٹریٹ کرائم نہیں ہے۔ لاش کی جیب میں اس کا بٹوا موجود تھا جس میں 50 ہزار روپے کی رقم تھی جسے ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔''

عمران اور ابراہیم اس وقت فرانسک ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر شازیہ تھی۔ وہ لاش کا معائنہ کر چکے تھے۔ اسے دل اور پھر جگر میں چاقو کے دو وار لگے تھے جو مہلک ثابت ہوئے تھے۔ ابتدائی رپورٹ کے مطابق زخم 6 انچ سے زیادہ گہرے تھے یعنی چاقو کافی بڑا تھا۔

''اس کے پاس موبائل فون وغیرہ نہیں تھا؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''ہاں یہ حیران کن بات ہے کہ اس کے پاس فون نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ قاتل اس کا فون ساتھ لے گیا ہو۔'' ڈاکٹر شازیہ بولی۔

''آپ نے ایمبولینس کے عملے سے بات کی تھی؟'' عمران کو کچھ خیال آیا۔

''جی ہاں، میں نے خود بات کی تھی۔ اس کے پاس فون نہیں تھا۔'' وہ بولی۔ ''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں، ایسی شکایات آئی ہیں کہ حادثوں کے شکار افراد کو سڑک سے اٹھائے جانے کے بعد ان کے فون، بٹوے غائب ہوجاتے ہیں مگر اس کیس میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ یوں بھی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ البتہ ایک چیز تھوڑی سی عجیب تھی۔''

''وہ کیا......؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''اس کے کوٹ کی اندرونی جیبوں کو بہت جلدی میں ٹٹولا گیا تھا کیونکہ ایک جیب کا معمولی اور دوسرے کا اندرونی استر الٹ کر باہر آیا ہوا تھا۔ ہم نے اس پر سے بھی انگلیوں کے نشانات اتروائے ہیں۔ فنگر پرنٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ کو کل دوپہر تک مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ابراہیم بولا اور پھر وہ دونوں باہر نکل

گئے۔ ابراہیم یہاں عمران کی گاڑی میں آیا تھا۔'' اس کے پاس یقیناً کوئی ایسی چیز تھی جس کے لیے اس کا قتل کیا گیا ہے۔'' ابراہیم کافی دیر سوچنے کے بعد بولا۔

''ہوسکتا ہے...... اسی لیے موبائل فون غائب کر دیا گیا ہو۔'' عمران نے جواب دیا۔

''سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہو گا؟''

''ایک منٹ......'' ابراہیم کچھ سوچتے ہوئے چونک کر بولا۔ ''ڈاکٹر نے بتایا کہ ایمبولینس وہاں پولیس سے پہلے پہنچ گئی تھی۔''

''ہاں......'' عمران نے سر ہلایا۔

''ایمبولینس کو کس نے کال کیا تھا اور پھر پولیس کو فون کس نے کیا؟''

''ظاہر ہے کہ وہاں موجود کسی شخص نے کیا ہوگا۔'' عمران سر جھٹک کر بولا۔

''عمران یہ معلوم کرنا ہوگا۔ ایمبولینس اور پولیس کو کن نمبروں سے کال کی گئی۔'' ابراہیم اس کا جواب سنے بغیر بولا۔

''اوکے...... ہم دفتر پہنچ ہی گئے ہیں ابھی معلوم کیے لیتے ہیں۔''

دفتر پہنچتے ہی انہیں سسٹم میں خرابی کی اطلاع ملی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ صبح تک انہیں اس بارے میں تمام معلومات مل جائیں گی۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' آفس سے نکلتے ہوئے عمران نے ابراہیم کی جانب دیکھا۔

''کچھ خاص نہیں، فی الحال سب کچھ الجھا ہوا اور گڈمڈ ہے۔ کل کا دن خاصا ہنگامہ پرور ثابت ہوگا۔'' ابراہیم مسکرایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''آخر وہ سب کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ ثبوت، وہ ویڈیو اور وہ تمام ڈیٹا۔'' وہ غرایا۔ ''آئی ٹی والے اس کا پورا فون چھان چکے ہیں اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

کمرے میں اس وقت دو ہی افراد تھے۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا چھوٹی سی قامت والا فرقان تھا جو اس وقت مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ سامنے رکھی میز کے پیچھے ایک لمبا اور بھاری بھرکم جسامت کا مالک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔

مجموعی طور پر اس کی شخصیت خاصی پروقار نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر ریم لیس گلاسز موجود تھے مگر اس وقت ان شیشوں سے جھلکتی نگاہوں میں شدید غصہ چھلک رہا تھا۔

''سر، اس نے یہی موبائل دیا تھا اور آپ نے بتایا تھا کہ ثبوت اسی میں ہوں گے اور ایک بیگ تھا۔'' فرقان دھیمی آواز میں بولا۔

''اس بیگ میں اس کے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے؟'' وہ سختی سے بولا۔ ''تمہیں غفور کو ٹھکانے لگانے سے پہلے سب کچھ دیکھنا چاہیے تھا۔''

''سر! آپ کا حکم تھا اور پھر کلائنٹ بھی منتظر تھا۔''

''حالات کے مطابق عقل استعمال کرنی چاہیے کہ نہیں...... طارق کے گھر کو چھان ڈالو...... اس کا لیپ ٹاپ اور دیگر سامان چیک کرواؤ...... فوراً......'' وہ غرایا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' فرقان بولا۔

''تو اب دفع کیوں نہیں ہو رہے تم......؟''

''سر، غفور نے بتایا تھا کہ وہاں اچانک ایک لڑکی آگئی تھی۔ اس کی چیخ و پکار کی وجہ سے اسے وہاں سے بھاگنا پڑا تھا اور جب وہ طارق کو چھوڑ کر نکلا تب وہ زندہ تھا......'' فرقان ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، یہ اس نے مجھے بھی بتایا تھا...... پھر......'' اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میں...... میں سوچ رہا تھا سر کہ شاید طارق نے وہ چیز اس لڑکی کو دے دی ہو۔''

سفید بالوں والا چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ شاید فرقان کی بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

''ہوسکتا ہے...... لعنت ہے...... میں تم لوگوں کو اس لیے پال رہا ہوں کہ ایک کام بھی ٹھیک طریقے سے نہ ہو۔'' وہ چلایا۔ ''اس لڑکی کا پتا لگاؤ۔ فرقان مجھے کل تک اس کا اتا پتا چاہیے۔''

''کوشش کرتا ہوں۔''

''کوشش کے بچے...... پولیس اسٹیشن میں جو بندے پال رکھے ہیں ان کو ہوشیار کرو۔ وہ لڑکی یقیناً گواہوں میں شامل ہوگی۔ اگر نہ بھی ہو تو انہیں اس کو ڈھونڈ کر نکالنا ہوگا اور یاد رکھو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر پولیس اب تک اس تک نہیں پہنچی ہے تو ہمیں اس سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک ہے سر...... میں نکلتا ہوں۔'' فرقان تیزی سے بولا۔

''غفور کا سارا کام ہو گیا تھا؟'' اس نے اپنے سر پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی سر، ڈاکٹر آصف نے جب باڈی فارغ کی میں نے اسی وقت پیکٹ بنا کر سمندر پر بھجوا دیا تھا۔''

''گڈ...... اب جاؤ اور یاد رکھو میں کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتا۔'' وہ غرایا۔

☆☆☆

ایلیا صبح ہی ابراہیم سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر اس کا فون بند آ رہا تھا بالآخر اس نے پیغام چھوڑنا مناسب سمجھا۔

''ابراہیم میں ایلیا بات کر رہی ہوں۔ مجھے آپ سے آج ایک انتہائی اہم معاملے میں ضروری بات کرنے کے لیے ملنا ہے۔ میں اس وقت دفتر جا رہی ہوں مگر ایک دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گی۔ آپ مجھے کال کر لیں اور بتا دیں کہ آپ کس وقت مل سکیں گے۔''

ابراہیم کے نمبر پر پیغام چھوڑ کر وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھی۔ اسے واقعی ایک ایمرجنسی کام کے سلسلے میں دفتر جانا تھا اور ساتھ ساتھ فیصل کی فکر بھی لگی ہوئی تھی۔

''تمہیں اچانک یہ درد کیسے ہو گیا فیصل......'' اس نے دوا دیتے ہوئے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا۔

''آپی مجھے خود نہیں معلوم، مگر اتنا شدید درد تھا کہ میں نے دوا لی اور ٹورنامنٹ چھوڑ کر آ گیا۔'' وہ بولا۔ ''بہت شدید درد تھا۔''

''میں تمہیں ہمیشہ کہتی ہوں نا کہ انرجی ڈرنکس کا پیچھا چھوڑو، یہ سخت نقصان دہ ہیں اور ڈائٹ ڈرنکس بھی گردوں پر برا اثر ڈالتے ہیں اگر زیادہ استعمال کیے جائیں تو......'' وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ''اب تو اتنا کچھ ہوتا ہے گوگل پر بھی مگر عقل نہیں تم لوگوں کو۔''

''آپی میں بیمار ہوں، برائے مہربانی یاد رکھیے بیمار کے حقوق میں شامل ہے کہ اسے ڈانٹا نہ جائے۔'' فیصل مسکرایا۔

''بکومت...... میں دو گھنٹے میں آ جاؤں گی، ذرا بھی تکلیف ہو تو مجھے فون کر دینا۔'' وہ اسے ہدایات دیتے ہوئے گھر سے نکل گئی تھی۔ وہ میموری کارڈ اس کے پرس میں موجود تھا۔

☆☆☆

ابراہیم دفتر پہنچ چکا تھا۔ اسے طارق کی رپورٹس کا انتظار تھا۔ اس دوران اس نے طارق کے موجودہ ٹھکانے کی تلاش میں کچھ آفیسرز کو روانہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ طارق کے قتل کے پیچھے ایسا ضرور تھا جو اسے اس نیٹ ورک تک پہنچا سکتا تھا۔ اس کی اطلاعات کے مطابق یہ نیٹ ورک دہشت گردی کی کئی کارروائیوں میں سہولت کار کے طور پر کام کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہیومن ٹریفکنگ اور دیگر جرائم میں بھی ملوث تھا۔ طارق پر نظر رکھنے کا مطلب بھی اس نیٹ ورک کے کرتا دھرتاؤں تک پہنچنا تھا۔

''اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی، کیا چل رہا ہے؟'' عمران کمرے میں داخل ہوا تو ابراہیم اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''اتنا سوچتا کیوں ہے تو یار...... دماغ کو بھی تھوڑے ریسٹ کی ضرورت ہوتی ہے، کسی وقت ہڑتال پر چلا گیا نا تو لگ پتا جائے گا۔'' وہ ہاتھ میں پکڑا کافی کا مگ اس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔ دوسرے ہاتھ میں اس کی اپنی کافی تھی۔

''عمران......'' ابراہیم چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''فرانسک سے رپورٹس آ گئی ہیں؟''

''تقریباً......'' وہ کافی کا سپ لے کر بولا۔

''اب اس تقریباً کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے بے بسی سے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ ہے میرے سڑو پارٹنر کہ ڈاکٹر شازیہ رپورٹ لے کر آ رہی ہیں۔''

''انہیں خود آنے کی کیا ضرورت تھی بھجوا دیتیں تو جلدی آ جاتیں رپورٹس۔'' ابراہیم بولا۔

''ہمم...... سوال تو بڑا اچھا ہے، اب اگر میں جواب دوں گا تو تو پھر قاتلانہ نظروں سے مجھے گھورے گا اور میرا شہید ہونے کا ارادہ نہیں ہے ویسے وہ ہے اچھی......''

''فضول باتیں بند کرو عمران۔'' وہ گویا تنگ آ کر بولا۔

''یہ فضول نہیں انسانوں جیسی باتیں ہیں مگر تیرے لیے ان کا سمجھنا تھوڑا مشکل ہے۔ لو ڈاکٹر صاحبہ آ گئیں......''

ڈاکٹر شازیہ دراز قد اور خوب صورت خاتون تھیں۔ کمرے میں داخل ہو کر دعا سلام کے بعد انہوں نے رپورٹس ابراہیم کی طرف بڑھا دی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحبہ کوئی خاص بات......'' اس نے لفافہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... پوسٹ مارٹم میں تو وہی کچھ ہے جو ہم جانتے ہیں وجۂ موت چاقو کے وار وغیرہ مگر یہ معلوم ہوا ہے کہ مقتول کینسر کا مریض تھا۔''

''اوہ اچھا......'' ابراہیم بولا۔ ''اور فنگر پرنٹ رپورٹ......؟''

''اس کے جسم پر دو طرح کے فنگر پرنٹس ملے ہیں۔

اندرونی جیبوں والے فنگر پرنٹ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے جبکہ پیٹ پر زخم کے اردگرد سے جو فنگر پرنٹ ملے ہیں، انہیں ریکارڈز میں شناخت کرلیا گیا ہے۔'' ڈاکٹر شازیہ متانت سے بولیں۔

''کیا......؟اور آپ یہ اتنی تاخیر سے بتارہی ہیں...... کس کے فنگر پرنٹس ہیں؟''

''میں اس کا ریکارڈ بھی ہمراہ لائی ہوں۔ وہ میز پر ایک فائل رکھتے ہوئے بولیں۔ ''یہ غفور عرف کالا ہے۔ بدمعاش ہے، پیسے لے کر قتل اور بہت سے دیگر جھگڑوں میں ملوث رہ چکا ہے۔''

ابراہیم اس فائل کو پوری توجہ سے پڑھ رہا تھا۔

''عمران، اس غفور کے لیے ٹیم بھیجو، اسے فوراً پکڑنا ہوگا، اب یہی ہمیں کچھ بتا سکتا ہے۔'' ابراہیم تیزی سے بولا۔''اور اس نمبر کا پتا چلا جس نے ایمبولینس اور پولیس طلب کی تھی۔ وہ یقیناً کوئی عینی شاہد ہوگا اگر ہمیں اس کا پتا چل جائے تو بہت مدد ہوسکتی ہے۔''

''بالکل...... اصل میں لوگ ڈرتے ہیں سامنے آتے ہوئے، یہ تو پھر بھی ایک قتل کا معاملہ ہے۔'' عمران بولا۔ ''میں نے ایمرجنسی کے ریکارڈ روم اور ایمبولینس سسٹم سے بات کرلی ہے۔ تھوڑی دیر میں معلومات مل جائیں گی۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

ابراہیم نے اس دوران غفور کی فائل پر لگی تصویر کو موبائل کے کیمرے میں محفوظ کرلیا۔ صبح سے اس نے موبائل پر توجہ نہیں دی تھی۔ مس کالز چیک کرتے ہوئے اسے ایلیا کا پیغام ملا۔ ایلیا کا پیغام سنتے ہی اس کے ذہن کی اسکرین پر اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، چمکتی ہوئی سانولی رنگت، لمبے سیاہ بال، اسے ایلیا پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اس کی والدہ کی کسی کزن کی بیٹی تھی۔ ظاہری رنگ و روپ سے زیادہ اس کی سمجھ بوجھ اور قوت فیصلہ سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ جس طرح اس نے والدین کی موت کے بعد اپنے معاملات کو سنبھالا تھا اس سے اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ ایلیا سے اس کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر وہ ہر بار کسی کیس یا معاملے سے متعلق ہوئیں۔ ابراہیم اس سے اپنی پسندیدگی کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کرپایا تھا۔ وہ اس معاملے میں بہتر وقت کا انتظار کررہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کا نمبر ملاتا عمران آندھی کے مانند کمرے میں داخل ہوا۔

''ابراہیم سمندر سے اسی طرح کی ایک اور لاش برآمد ہوئی ہے۔'' وہ اندر آتے ہی بغیر کسی تمہید کے بولا۔

''اوہ......'' ابراہیم اس کی بات سنتے ہی کھڑا ہوگیا تھا۔''تم نے ان سے کہہ دیا نا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔''

''ہاں ظاہر ہے۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔

راستے میں زیادہ تر خاموشی رہی تھی۔ چند ماہ قبل بھی ایک مچھیرے کے جال میں ایک بڑا سیاہ خصوصی طرز کا تھیلا پھنسا تھا جسے کھولے جانے پر اس میں سے ایک نوجوان کی لاش ملی تھی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا مگر جس چیز نے ڈپارٹمنٹ کو ہلا دیا تھا اور جس کے بعد یہ کیس اسپیشل یونٹ کے حوالے کیا گیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس شخص کو قتل کرنے کے بعد اس کے جسم سے گردے، جگر وغیرہ نکال لیے گئے تھے۔ یہ کام جس صفائی سے کیا گیا تھا وہ کسی ماہر سرجن کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کئی مہینوں کی خاموشی کے بعد اس دوسری لاش کا برآمد ہونا ایک نیا سوال بن گیا تھا۔

ان کے وہاں پہنچنے تک لاش کو لے جانے کے لیے ایمبولینس پہنچ چکی تھی۔ ابراہیم اور عمران کے آنے کے بعد اس سیاہ تھیلے کو کھولا گیا تھا۔

اس میں موجود لاش زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اس کے جسم پر کپڑوں کے نام پر کچھ بھی نہیں تھا۔ پیٹ پر لگے لمبے لمبے بے احتیاطی سے کھنچے ٹانکے یہ بتارہے تھے کہ اس کے اعضا بھی نکالے جاچکے تھے مگر ابراہیم کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

اس کے سامنے لاش کی صورت میں غفور عرف کالا پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ وہ صرف ایک ضروری کام کے لیے دفتر آئی تھی مگر یہاں پہنچ کر رمضان ٹرانسمیشن سے متعلق ایک خصوصی میٹنگ میں بہت وقت لگ گیا۔ اس کے بعد عین اس وقت جب وہ نکلنے والی تھی، نیوز روم کے حوالے سے ایک میٹنگ میں اسے طلب کرلیا گیا تھا۔ وہ فیصل کو دو گھنٹے کا کہہ کر آئی تھی اور ہر تھوڑی دیر بعد اس سے بات بھی کررہی تھی۔ اگرچہ وہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے مگر ایلیا کو اس کی آواز سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ بمشکل چار بجے وہ دفتر سے نکل پائی۔ گھر کی طرف آتے ہوئے اسے اس میموری کارڈ کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم کا بھی...... اس نے موبائل نکال کر چیک کیا۔ اس کی نہ تو کوئی کال تھی اور نہ ہی کوئی پیغام...... اس نے کندھے اچکا کر موبائل برابر کی سیٹ پر رکھ دیا۔ گھر

پہنچ کر وہ اسے خود کال کرے گی، اس نے سوچا۔
مگر گھر پہنچ کر فیصل کی حالت دیکھ کر وہ سب کچھ ہی بھول گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ تکلیف میں تھا۔

☆☆☆

''یہ معاملہ روز بروز الجھتا جارہا ہے۔ اب جو تصویر بن رہی ہے اس کے مطابق یہ نظر آرہا ہے کہ غفور نے طارق کو قتل کیا جو شاید کسی اور گینگ کے لیے کام کررہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طارق اور غفور کسی ایک ہی شخص کے لیے کام کررہے ہوں اور بعد میں کسی بڑی غلطی، اختلاف یا گڑبڑ کے نتیجے میں طارق کے قتل کا فیصلہ کیا گیا مگر پھر غفور کو فوری طور پر 24 گھنٹے کے اندر اندر قتل کردیا جاتا ہے اور پھر اس کی لاش کی یہ حالت کی جاتی ہے۔'' ابراہیم اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ عمران اس کے سامنے موجود تھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کام ایک ہی نیٹ ورک سے کیے جارہے ہیں۔ قتل و غارت گری اور انسانی اعضا کی مجرمانہ سوداگری......''

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں الگ گینگ ہوں اور طارق کی موت کا بدلہ لینے کے لیے غفور کو مارا گیا ہو۔'' عمران بولا۔

''ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے اور پھر وہ دوسرے فنگر پرنٹس...... رپورٹ منگواؤ عمران، پولیس اور ایمبولینس کو کس نے بلوایا تھا۔ ہمیں اس عینی شاہد کی بہت شدید ضرورت ہے۔ وہاں قاتل اور مقتول کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی تھا ہمیں اسے تلاش کرنا ہے اور ہوسکتا ہے کہ فون کرنے والے نے اس کو دیکھا ہو۔'' ابراہیم میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

عمران نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کی واپسی چند لمحوں میں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

''تمہاری بات قدرے درست لگ رہی ہے ابراہیم۔'' وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' ابراہیم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ایمبولینس اور پولیس ایمرجنسی دونوں کو ایک ہی نمبر سے کال کی گئی ہے۔''

''کیا انہوں نے پتا لگایا کہ یہ نمبر کس کا ہے؟'' ابراہیم کاغذ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''اب یوں لگ رہا ہے جیسے اس کیس میں کچھ رنگ آنے والے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے یار......''

''وہ نہیں سنا تم نے، وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔'' عمران مسکرایا۔

''تم ہر وقت اتنی فضول باتیں کیسے کرلیتے ہو عمران۔'' ابراہیم نے بھنا کر پوچھا۔

''لو اگر یہ بات فضول ہے تب بھی اس میں میرا کیا قصور ہے، تم شاعر سے کہو جاکر......''

''تم سیدھے سیدھے مجھے بتاؤ گے کہ معلوم کیا ہوا ہے......؟''

''کیوں نہیں مگر اس کے لیے تمہیں اس قدر لال پیلا ہونے کی ضرورت کیا ہے۔'' عمران مزے لے رہا تھا اور ابراہیم اس بار کچھ کہنے کے بجائے اسے دیکھتا رہا تھا۔

''اوکے...... یہ نمبر کسی مس ایلیا ساجد کا ہے۔'' وہ دوسرا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ اس کا کچھا چٹھا میرا مطلب ہے کہ پتا وغیرہ ہے۔''

ابراہیم نے عمران کے ہاتھ سے کاغذ لیا، اس پر لکھے پتے کو غور سے پڑھا۔ اس کے بعد موبائل نکال کر ایلیا کے نمبر کو چیک کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر موبائل میز پر رکھ دیا۔

یہ ایلیا کا نمبر ہی تھا۔ اس کے ذہن میں ایلیا کے پیغام کے الفاظ ناچ رہے تھے۔ ''یقیناً وہ اسی معاملے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی ہوگی اور اس حوالے سے پریشان ہوگی تب ہی اس نے مجھے میسج کیا ہوگا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا ہوا پارٹنر......'' عمران نے پوچھا۔

''یار یہ ایلیا ہے، میری کزن، اس نے صبح مجھے ملنے کے لیے میسج بھی کیا تھا۔'' وہ خالی الذہنی سے بولا۔

''تم پھر تم اسے فون کرو...... تاکہ تفصیلات کا علم ہو سکے۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں وہی کرنے جارہا ہوں۔'' ابراہیم نے فون نکالا۔ اس نے ایلیا کے نمبر پر کئی کالز کیں مگر نمبر ریسیو نہیں ہورہا تھا۔

''کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔'' عمران بولا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' ابراہیم اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ ''ہمیں دیکھنا پڑے گا۔'' اور وہ دونوں تیزی سے کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ یہی لڑکی ہے؟'' فرقان نے پوچھا۔

''سو فیصد...... ڈی ایس پی صاحب نے اس کا نمبر

نکلوایا ہے۔ میں نے اسی وقت نمبر، نام اور پتا تمہیں بھیج دیا تھا۔'' دوسری طرف سے کوئی دبی دبی آواز میں بولا۔ یہ مجید تھا جو پولیس ہیڈ آفس میں کام کرتا تھا۔ فرقان کے گینگ اور دیگر مجرموں کو ان کی ضرورت کے مطابق اہم خبریں پہنچانا ہی اس کا اصل کام تھا اور اسی وجہ سے وہ نہایت قلیل تنخواہ پر ڈپارٹمنٹ میں جما ہوا تھا۔

''دیکھ لینا مجید، باس آج کل بہت غصے میں ہے، خبر کو پکا ہونا چاہیے۔''

''سو فیصد پکی اور صحیح خبر ہے۔'' وہ یقین سے بولا۔

''بس تو پھر تمہارا انعام تمہیں مل جائے گا۔'' فرقان فون بند کرتا ہوا بولا۔

وہ جانتا تھا کہ باس اس وقت مصروف ہے اور وہ شام سے پہلے اس سے رابطہ نہیں کرے گا اس دوران اس نے خود ہی ابتدائی معلومات کی کنفرمیشن کا فیصلہ کیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ ایلیا کی بلڈنگ میں فرسٹ فلور پر واقع اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے چند لمحے دروازے کے سامنے رک کر سانس بحال کیا اور پھر کال بیل پر انگلی رکھی۔

دو لمحوں بعد دروازہ کھل گیا تھا اور اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

''جی بولیے۔''

''مجھے ایلیا بی بی سے بات کرنی ہے۔'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں ہی ایلیا ہوں۔ کیا کام ہے آپ کو مجھ سے......'' ایلیا نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے تو جس ایلیا سے ملنا تھا وہ آپ نہیں ہیں۔'' وہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھیے مسٹر، یہ میرا گھر ہے یہاں کوئی اور ایلیا نہیں رہتی اور اس وقت میں مصروف ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ فرقان کا کام بھی ہو چکا تھا۔ اب اسے صرف باس کے گرین سگنل کا انتظار تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں سے اترا اور چند لمحے میں اس کی گاڑی سڑک پر ٹریفک کے سمندر میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

فیصل کو کافی تکلیف ہو رہی تھی اور ایلیا اس سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ ڈاکٹر توصیف کو فون کر چکی تھی۔ ڈاکٹر توصیف ان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور ایلیا کے والد کے قریبی دوست بھی۔ ان کی رحلت کے بعد سے وہ ان دونوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ابھی بھی ایلیا کا فون ملتے ہی وہ ان کی طرف آنے کے لیے نکل گئے تھے۔ ایلیا ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی لیے دروازے پر بیل بجتے ہی وہ دوڑتی ہوئی باہر آئی تھی مگر وہاں وہ دبلا پتلا عجیب سا آدمی کھڑا تھا۔

''پتا نہیں کون تھا۔'' اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سر جھٹکا۔ نہ جانے کیوں وہ شخص کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا لیکن اس وقت وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ فیصل میں اس کی جان تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو اس کی ساری تکلیف خود لے لیتی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کی طرح اپنے حصے کی تکلیف سے بھی خود ہی گزرنا ہوتا ہے۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار آنے والے ڈاکٹر صاحب تھے۔ انہوں نے فیصل کا معائنہ کیا اور پھر اسے اسپتال لے چلنے کی ہدایت کی۔

''مگر ڈاکٹر صاحب...... فیصل کو ہوا کیا ہے؟'' ایلیا روہانسی ہو رہی تھی۔

''پریشان مت ہو ایلیا، یہ اپنڈی سائٹس کا معاملہ لگ رہا ہے اور اس کے لیے فوری آپریشن ضروری ہوتا ہے۔ یہ خود اتنا خطرناک نہیں جتنا تاخیر نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' وہ شفقت سے بولے۔

''ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپی تم پریشان مت ہو۔'' فیصل بمشکل بولا۔

ڈاکٹر توصیف ان دونوں کو قریب ہی ایک بڑے اسپتال لے آئے تھے۔ شہر کے متمول علاقے میں واقع یہ اسپتال شیشے کے مانند چمک رہا تھا۔ ڈاکٹر توصیف وہاں کام کرنے والے ایک سینئر ڈاکٹر سے راستے میں بات کر چکے تھے۔ اسی لیے وہاں پہنچتے ہی فیصل کو اسٹریچر پر چیک اپ کے لیے اندر لے جایا گیا تھا۔

''تم کو فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے ایلیا، ڈاکٹر ساجد میرے بہت اچھے دوست ہیں اور یہ فیصل کا بہت خیال رکھیں گے۔'' ڈاکٹر توصیف اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''کیا آپ جا رہے ہیں؟'' ایلیا نے پوچھا۔

''نہیں...... پہلے ساجد سے میری بات ہو جائے اس کے بعد جاؤں گا۔'' تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر ساجد باہر آ گئے تھے۔

''تم ٹھیک سمجھے ہو، اپنڈی سائٹس کا ہی معاملہ ہے، فوری آپریشن کرنا ہوگا۔ ہم ضروری تیاریوں کے بعد تھوڑی

دیر میں بچے کو آپریٹ کر دیں گے۔'' وہ عام سے انداز میں بولے۔

''آپریشن......'' ایلیا کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

''ڈونٹ وری ینگ وومن......'' ڈاکٹر ساجد بولے۔

''اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور اب تو یہ آپریشن لیزر کی مدد سے ہوتا ہے، آپ بالکل فکر نہ کریں، وہ اچھے ہاتھوں میں ہے اور ڈاکٹر توصیف میرے بہترین دوست ہیں یعنی اب ہم ان کا دگنا خیال رکھیں گے۔''

''شکریہ ساجد، مجھے اطمینان ہے کہ تم یہاں ہو۔'' ڈاکٹر توصیف بولے۔ ڈاکٹر ساجد کچھ دیر بعد اندر چلے گئے۔ ایلیا کو آپریشن سے پہلے فیصل کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی تھی جو اس وقت انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے رخصت ہوتے ہی وہ وارڈ میں چلی آئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فیصل کو آپریشن کے لیے لے جایا گیا۔ ایلیا بہت خوف زدہ تھی۔ وہ فیصل کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے وہ مسکراتی رہی تھی۔

فیصل کے آپریشن روم میں جانے کے بعد وہ وہیں لابی میں بنی انتظار گاہ میں جا بیٹھی۔ اسے ابو اور امی کی یاد بُری طرح ستا رہی تھی۔ اس وقت اسے کسی کی ضرورت تھی مگر ہزاروں کانٹیکٹس اور تعلقات کے باوجود آج اس وقت اس کے پاس کوئی ایک نام ایسا نہیں تھا جسے وہ بلا سکتی۔

اس نے غیر ارادی طور پر پرس سے فون نکالا اس کا بٹن دبایا مگر فون آن نہیں ہوا۔ شاید کسی وقت دباؤ پڑنے سے فون بند ہو گیا تھا۔ اس نے فون آن کیا اور پھر اسے بیگ میں رکھنے لگی۔ اسی دوران بیل پورے زور و شور سے بجنے لگی۔ اس وقت وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسکرین پر چمکتے ابراہیم کے نام نے اسے فون اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

''ہیلو......'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اوہ شکر ہے، ایلیا تم کہاں ہو؟ میں کب سے تمہیں فون کر رہا تھا۔'' ابراہیم کی جھنجلائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''میں اسپتال میں ہوں۔'' اس نے اسی طرح جواب دیا۔

''اسپتال میں......؟ مگر کیوں؟'' اس کے لہجے میں در آنے والی فکر اس وقت ایلیا کو اچھی لگی۔

''فیصل کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس کا اپنڈی سائٹس کا آپریشن ہو رہا ہے اس وقت۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''اوہ، اللہ اسے صحت دے، تم فکر نہ کرو، کون سے اسپتال میں ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا میں تم سے یہاں آ کر مل سکتا ہوں مجھے بھی تم سے ہنگامی طور پر بات کرنی ہے۔''

''فیصل کا آپریشن ہو جائے خیر سے پھر ہم ملتے ہیں۔ مجھے بھی آپ سے کچھ اہم بات کرنی تھی۔ میں نے میسج بھی بھیجا تھا۔''

''ہاں میں نے دیکھا ہے وہ......ٹھیک ہے ہم رات دیر سے یا کل صبح مل سکتے ہیں۔ تم اس وقت پریشان ہو، میں سمجھتا ہوں مگر صرف ایک بات بتا دو، کل شام 7 سے 8 بجے کے دوران تم کہاں تھیں؟''

''میں...... میں اپنی دوست کے گھر کے پاس تھی۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''علاقہ؟''

''کینٹ کا پچھلا علاقہ......''

''میں جانتا ہوں، وہاں کل رات ایک قتل ہوا ہے۔ جس نمبر سے ایمبولینس اور پولیس کو ملایا گیا ہے وہ تمہارا نمبر ہے ایلیا اور مجھے یقین ہے کہ پولیس کو بیان نہ دینے اور وہاں سے غائب ہو جانے کی تمہارے پاس یقیناً کوئی وجہ ضرور ہو گی کیونکہ تم جیسی ذہین رپورٹر کو اس حوالے سے کوئی خوف تو ہو نہیں سکتا۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں، میں خوف کی وجہ سے وہاں سے غائب نہیں ہوئی تھی مگر اس وقت ایک ایسی وجہ تھی جس کی وجہ سے میں سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔''

''کیا تم نے وہ قتل ہوتے دیکھا تھا؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

دوسری طرف چند لمحے کی خاموشی رہی تھی۔

ابراہیم نے اپنا سوال دہرایا۔ ''ایلیا کیا تم اس واقعے کی عینی شاہد ہو؟ کیا وہ سب تمہارے سامنے ہوا تھا یا تم بعد میں پہنچی تھیں؟''

''میں جب وہاں پہنچی تو وہ اسے چاقو مار چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مقتول کا بیگ تھا شاید وہ ایک وار اور کرتا مگر میرے چیخنے پر وہ فوری طور پر وہاں سے بھاگ نکلا۔'' ایلیا نے بتایا۔

''میں تمہارے پاس اسی وقت آ رہا ہوں۔'' ابراہیم گہری سانس لے کر بولا۔

"اس وقت میرا بھائی آپریشن تھیٹر میں ہے، ہم کل صبح بات کرسکتے ہیں۔" ایلیا نے متانت سے کہا۔

"او کے، میں تمہیں ایک تصویر بھیج رہا ہوں، اسے دیکھ کر ڈیلیٹ کر دینا۔" ابراہیم بولا۔ "میں دوبارہ فون کر رہا ہوں۔" اس نے یہ کہہ کر کال بند کر دی تھی۔ چند لمحوں میں کلک کی ہلکی سی آواز نے میسج کی اطلاع دی۔ ایلیا نے وائس ایپ کھولا اور جیسے سکتے میں آگئی۔

☆☆☆

فرقان اس وقت بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ اسے باس نے فوری طور پر طلب کیا تھا اور اس کا موڈ سخت خراب محسوس ہو رہا تھا، اتنا کہ اس نے اس کا جواب سننا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

یقیناً کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی تھی مگر گڑبڑ تو گزشتہ کافی دنوں سے ان کی ہم رکاب ہوگئی تھی۔

سب سے پہلی گڑبڑ طارق کی طرف سے ہوئی تھی۔ طارق باس کا رازدار بندہ تھا۔ ہر آپریشن (ان کے ہاں کام کو آپریشن ہی کہا جاتا تھا) میں وہی سارے معاملات سنبھالا کرتا تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ غائب ہوگیا اور ان سب کی شامت آگئی۔

اس کے گھر اور ہر اس جگہ پر اسے تلاش کر کر کے جہاں اس کی موجودگی کی ذرہ بھر امید بھی ہوتی وہ سب تھک گئے تھے مگر وہ ان سے ہمیشہ دو قدم آگے ہی رہتا تھا۔

پھر پتا چلا کہ اس کے پاس کچھ ایسے ثبوت موجود ہیں جو باس کے سارے دھندوں کو بند کر کے اس کے چہرے سے شرافت کے نقاب کو نوچ کر پھینک دینے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں جس کے بعد اس کی تلاش میں تیزی آگئی اور آخرکار غفور اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ غفور کو تو خود اس نے باس کے حکم پر ختم کر دیا تھا۔ تو پھر اب نئی گڑبڑ کیا ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ باس انتہائی خطرناک آدمی تھا انسانوں کو جان سے مار دینا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہ تو اس کے سب آدمی جانتے تھے کہ وہ ایک سے زیادہ غلطی برداشت نہیں کرتا تھا۔

انہی سوچوں میں الجھے الجھے وہ اس جگہ تک جا پہنچا تھا جہاں باس نے اسے طلب کیا تھا۔ گاڑی کو پارکنگ میں لگا کر وہ عمارت میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک بڑا اسپتال ہے اور یہاں ہر وقت لوگوں کا رش لگا رہتا تھا۔ وہ استقبالیہ سے گزرتا ہوا اندر کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس طرف بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے بس فرق صرف یہ تھا کہ وہ مختلف انتظار گاہوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی کو ڈاکٹر سے ملنا تھا تو کسی کے رشتے دار آپریشن کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ بڑی انتظار گاہ سے گزر کر بائیں ہاتھ کی طرف مڑتے ہی وہ جم سا گیا تھا۔

☆☆☆

اسکرین پر نظر آنے والی تصویر پر اس کی نگاہیں جم سی گئی تھیں۔

اسے تو وہ لوگوں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی۔

وہ وہی قاتل تھا۔ جسے اس نے گزری شام ایک نہتے شخص پر چاقو چلاتے دیکھا تھا۔ اس نے وہاں سے بھاگتے ہوئے جس خون آشام نظروں سے ایلیا کو دیکھا تھا اس کا تصور ہی اسے دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر لوگوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ اسے بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ابراہیم کے اس تصویر کو بھیجنے کا مطلب یہ ہی تھا کہ پولیس اس تک پہنچ گئی تھی۔ اسے تیز رفتار اور صحیح سمت میں ہونے والی اس تفتیش سے نہ صرف خوشی ہوئی تھی بلکہ دلی اطمینان بھی ہوا تھا۔ فون جیسے ہی گنگنایا اس نے اسے کان سے لگالیا۔

"ہیلو ایلیا، کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟"

"ہاں، یہی اس شخص کا قاتل ہے، میں اسے آسانی سے پہچان سکتی ہوں، اس کے پاس ایک چاقو بھی تھا۔"

"ہوں...... یعنی سب کچھ تمہارے سامنے ہوا تھا۔" ابراہیم نے ہنکارا بھرا۔ "جب وہ بھاگ گیا تب تم نے کیا کیا؟"

"ابراہیم صبح تک اس بات کو روکا نہیں جاسکتا۔" اس نے اس بار ہلکے سے غصے سے پوچھا اس کا بھائی اسپتال میں تھا اور اس شخص کو صرف اپنا بیان درکار تھا۔ اس نے چڑ کر سوچا۔

"روکا جاسکتا ہے مگر میں تمہیں کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ فیصل اس وقت اچھے ہاتھوں میں ہے اور تم یہاں ڈاکٹرز کے انتظار کے دوران فون پر تو بات کر ہی سکتی ہو۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "ہاں تو پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے پولیس اور ایمبولینس کو فون کر دیا تھا؟" ایلیا بولی۔

"کیا وہ شخص اس وقت تک مر چکا تھا؟" ابراہیم نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ زندہ تھا۔ شدید زخمی تھا...... اسی لیے تو میں نے ایمبولینس پہلے منگوائی تھی۔'' ایلیا بولی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے؟ کیا تم اس کے قریب گئی تھیں؟ کیا اس نے تم سے کوئی بات کی تھی؟ یا پھر تمہارے سامنے کوئی اور اس کے قریب گیا تھا؟'' ابراہیم تابڑتوڑ سوال کررہا تھا۔

''ابراہیم کوئی اور اس کے پاس نہیں گیا تھا۔'' ایلیا دھیرے سے بولی۔ ''میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے اس کے پاس گئی تھی۔''

''اوکے...... اوکے اس نے تم سے کچھ کہا تھا۔ یاد کرو اس کے الفاظ کیا تھے؟''

''اس نے...... اس نے کہا تھا کہ وہ نہیں بچے گا۔'' ایلیا بولی۔ اسے حقیقت میں سب کچھ یاد کرکے تکلیف ہورہی تھی۔ ''اور یہ بھی کہ اسے ہرصورت ختم ہونا ہے......''

''اور...... اور کیا کہا تھا اس نے......؟''

''اس نے کہا تھا کہ میں اس کی مدد کرکے سیکڑوں لوگوں کی زندگی بچاسکتی ہوں۔''

''وہ کیسے...... تم اس کی مدد کس طرح کرسکتی تھیں؟ کیا چاہ رہا تھا وہ؟''

''تم اگر ایک لمحے چپ رہو تو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔'' ذہنی تناؤ نے ایلیا کو چڑچڑا کردیا تھا۔ ''پلیز مجھ اس طرح تفتیش مت کرو...... اس کے پاس کچھ ثبوت تھے...... ایک میموری کارڈ میں...... جو اس کی اندرونی جیب میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں وہ نکال لوں اور اسے کسی ذمے دار اور ایماندار پولیس افسر کے ہاتھ میں دوں، اسی وجہ سے میں وہاں سے نکل آئی تھی۔ کیونکہ بیان کی صورت میں مجھے سب بتانا پڑتا۔ اور اسی لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ فون بند ملا تو میسج کیا تھا...... سن رہے ہونا......'' اس نے بات مکمل کرکے پوچھا۔ مگر دوسری جانب سناٹا تھا۔ نہ جانے کال کس وقت کٹ گئی تھی۔ ایلیا نے مایوسی سے فون کو دیکھا اور دوبارہ ابراہیم کا نمبر ملایا مگر فون بند جارہا تھا۔

''پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔'' اس نے پریشان ہوکر سوچا۔ کہیں اسے کچھ ہو نہ گیا ہو...... حالات اسے مسلسل شکی بناتے جارہے تھے۔ اس نے سوچا ہوسکتا ہے کہ اس کی بیٹری ختم ہوگئی ہو اور وہ اسے دوبارہ فون کرلے۔ اس نے خود کو ڈانٹا پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے ابراہیم کی ہدایات کے مطابق اس شخص کی تصویر کو ڈیلیٹ کردیا۔ یوں بھی وہ اپنے فون میں کسی سفاک قاتل کی تصویر محفوظ رکھنے

میں ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

آپریشن تھیٹر کے سامنے موجود انتظارگاہ میں وہ کھڑی تھی۔

فرقان درمیان میں موجود ستون کی آڑ سے اسے صاف دیکھ پا رہا تھا۔ یہ وہی تھی ایلیا، جس کے بارے میں وہ باس کو بتا کر کچھ رعایت حاصل کر سکتا تھا اور اب تو بڑی خبر یہ تھی کہ وہ یہیں موجود تھی۔ اس نے اپنا موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا اور گفتگو جاری تھی۔ فرقان نے ستون کی آڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تصویر کھینچی اور باس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

باس واقعی غصے میں بپھرا ہوا تھا۔ کمرے کی زمین پر موجود خون کی باریک سی لکیر بتا رہی تھی کہ وہ فوراً فیصلے اور سزا کے مراحل سے گزر چکا تھا مگر اب بھی اس کی پیشانی پر بل موجود تھے۔

''ایک اور گدھا آیا۔'' وہ فرقان کو دیکھ کر غرایا۔ ''کیا کرتے پھر رہے ہو تم؟ میں نے تمہیں جو کام دیا تھا اس کا کیا بنا؟''

''کام ہو گیا ہے باس۔'' وہ فوراً بولا۔

''کون ہے وہ لڑکی......؟''

''باس وہ ایک رپورٹر ہے، اس کا پتا پولیس اسٹیشن سے ملا تھا پھر میں نے اس کے فلیٹ پر جا کر یقین دہانی کی کہ یہ وہی لڑکی ہے۔''

''واہ تو آپ نے اس سے پوچھ لیا کہ تم وہی لڑکی ہو؟'' باس نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں باس، بس اس کی شکل دیکھنی تھی۔''

''اور اس کو اپنی شکل بھی دکھا دی۔'' باس چلّایا۔ ''احمقو! کیا تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم بھی میرے لیے قیمتی بن جاؤ...... ہاں......''

باس کے ان جملوں کے ساتھ فرقان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''نہیں باس، پلیز مجھ پر رحم کریں۔ میں بہانے سے وہاں گیا تھا، اسے مجھ پر ذرا بھی شک نہیں ہوا اور...... اور میں نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا تھا۔'' وہ آخر میں جھوٹ پر آ گیا تھا۔ ''کمال یہ ہوا ہے باس کہ میں نے اسے ابھی اوپر آپریشن تھیٹر کے سامنے دیکھا ہے۔''

''کسے......؟''

''اسی لڑکی ایلیا کو باس......'' فرقان بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس کے عزیزوں میں سے کوئی اسپتال میں ہے، وہ آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی تھی۔''

''اور تم یہ مجھے ابھی بتا رہے ہو۔'' وہ غرایا۔ ''کون سا آپریشن تھیٹر تھا؟''

''اس پر نمبر 2 لکھا تھا۔'' وہ بولا۔

''اچھا......'' باس چند لمحے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر اس نے کریڈل سے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ کسی سے آپریشن تھیٹر نمبر 2 میں ہونے والے آپریشن اور اس کے اٹینڈنٹ اور مریض کے بارے میں معلومات لے رہا تھا۔

''نرس شبانہ کو میرے پاس بھیجو فوراً'' وہ ریسیور رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

چند لمحے بعد شبانہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی عام شکل وصورت والی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ واضح چیز اس کی آنکھیں تھیں جن میں مکاری لہرا رہی تھی۔

''نرس شبانہ، آپریشن تھیٹر 2 میں جو آپریشن ہو رہا ہے تمہیں اس کی اٹینڈنٹ کو یہاں لے کر آنا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر......'' نرس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''تم یہ کام کس طرح کرو گی؟''

''میں اس سے کہوں گی کہ بڑے ڈاکٹر صاحب بُلا رہے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''خوب......'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''اور اس کے بعد تم یہ بات اور اس لڑکی کو بھول جاؤ گی، سمجھ رہی ہو نا؟''

''جی سر...... میں سمجھ گئی۔'' نرس شبانہ کے لیے شاید یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے حیرت کے اظہار کے بجائے سر ہلا کر جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

نرس کے باہر نکلتے ہی باس بھی اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ابراہیم ساکٹ میں فون چارجر لگا کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آئی فون کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ اگر وہ آف ہو جائے تو پھر مخصوص فیصد بیٹری چارج ہوئے بغیر آن نہیں ہوتا، اس کے چہرے پر بے بسی اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''میرا فون لے لو......'' عمران نے پیشکش کی۔

''یار اس کا نمبر اسی فون میں ہے اور شاید وہ اس وقت انجانے نمبر سے کال ریسیو بھی نہ کرے۔'' ابراہیم

بولا۔ ''بس پانچ منٹ میں چارج ہو جائے گا۔'' اس نے غفور کو شناخت کر لیا ہے اور ہمارے پاس جو دوسرے فنگر پرنٹس ہیں، وہ ایلیا ہی کے ہیں۔ طارق نے مرتے وقت ثبوت غالباً اس کے حوالے کر دیے تھے۔ اسی لیے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ بس اتنی ہی بات ہو سکی، اس کے بعد لائن کٹ گئی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے وہ ثبوت کہاں رکھے ہیں؟''

''تو ہم وہاں چلے چلتے ہیں۔'' عمران بولا۔

''وہ اس وقت اسپتال میں ہے، اس کا بھائی آپریشن تھیٹر میں ہے۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''تب بھی ہمارا وہاں جانا اس کے لیے مددگار ہی ثابت ہو گا۔ ایسی پریشانی میں انسان کے لیے دوسرے لوگوں کی موجودگی سہارے سے کم نہیں ہوتی۔'' عمران بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... یہ فون بھی آن ہو رہا ہے، میں اسے کال کرتا ہوں پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔'' ابراہیم فون اٹھاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

ایلیا پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے انتظار گاہ کی نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔ زندگی اچانک رولر کوسٹر کا سفر بن گئی تھی۔ سچ مچ زندگی سے زیادہ حیران کن کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس نے سوچا، کل شام وہ تنہا بیٹھی بور ہو رہی تھی اور وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور اب ہر لمحے نئی بات سامنے آ رہی تھی۔ ان 24 گھنٹوں میں وہ نہ صرف ایک قتل کی چشم دید گواہ بن چکی تھی۔ بلکہ مقتول کی مدد کی کوشش اسے خود خطرے کے سرخ نشان کے اندر لے آئی تھی۔ پولیس اسے تلاش کر رہی تھی، اس کا اندازہ اسے ابراہیم کی باتوں سے ہو گیا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قاتل بھی اسے ڈھونڈ رہا ہو۔

یہ سوچ کر اسے پھریری سی آ گئی۔ اس وقت وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ فیصل بخیریت گھر آ جائے یہ اس کی آرزو تھی۔

''بی بی......'' وہ اپنی سوچوں میں مگن تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کے سامنے ڈیوٹی نرس کھڑی ہوئی تھی۔

''جی بولیے۔'' وہ گھبرا کر یک دم کھڑی ہو گئی۔ ''میرے بھائی کا آپریشن ختم ہو گیا؟ کیسا ہے وہ؟''

اس کے اچانک کھڑے ہونے سے ہاتھ میں موجود پانی کا گلاس چھلک پڑا۔ گلاس کو بچانے کی کوشش میں اس کے زانو پر رکھا فون پھسل کر سیٹ کے نیچے چلا گیا۔ ایلیا اس وقت اتنی پریشان تھی کہ اسے فون کے گرنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔

''آپریشن جاری ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' نرس پیشہ ورانہ انداز میں بولی۔ ''آپ کو اصل میں بڑے ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے۔''

''مجھے...... مگر کیوں؟'' ایلیا اور ہول گئی تھی۔ ''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ میرا بھائی ٹھیک ہے نا؟''

''وہ ٹھیک ہیں، آپ پلیز آیئے ڈاکٹر صاحب کو آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔'' شبانہ یہ کہہ کر آگے بڑھی۔ ایلیا بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آخر کوئی ڈاکٹر اسے کیوں بلا سکتا تھا۔ ہر سوچ کا کھرا فیصل کی حالت اور صحت پر جا کر ختم ہو رہا تھا اور یہ سوچ اسے خوف زدہ اور پریشان کر رہی تھی۔

اب اسپتال کا انتظامی علاقہ شروع ہو گیا تھا یہاں کوریڈور میں خاموشی تھی۔ کیونکہ یہاں وہی لوگ آ سکتے تھے جن کا اسپتال سے کوئی تعلق تھا۔

نرس ایک دروازے کے سامنے جا کر رک گئی اور پھر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے آنے والی آجاؤ کی آواز پر اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول لیا اور ایلیا کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ ایلیا ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتی تھی...... بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ کوئی بُری خبر سن ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''وہ فون نہیں اٹھا رہی......'' ابراہیم فون بند کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''ہمیں جا کر دیکھنا پڑے گا۔''

''او کے...... ہو سکتا ہے کہ وہ مصروف ہو، ڈاکٹر سے بات کر رہی ہو یا پھر اس کے بھائی کا آپریشن ختم ہو گیا ہو...... کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔'' عمران بولا۔

''ہاں ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر نہ جانے کیوں میری چھٹی حس خطرے کا سگنل بجا رہی ہے۔''

''تو ہم اسپتال چلے چلتے ہیں۔'' عمران اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا ''میں نے تمہیں کبھی کسی کے لیے اتنا زیادہ پریشان نہیں دیکھا۔''

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ ایلیا میری مام کی کزن کی بیٹی ہے، شی از فیملی......'' ابراہیم کار کا دروازہ کھول کے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مانتا ہوں مگر پھر بھی اس کے متعلق کچھ ایسا ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہے۔'' عمران بولا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے عمران، احمقانہ باتیں مت کرو۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔'' ساتھ ساتھ اس نے ایلیا کا نمبر دوبارہ ملایا تھا اور رابطہ نہ ہونے سے بند کر دیا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ ہم اس وقت ایک مشکل کیس کے درمیان پھنسے ہیں مگر پھر بھی یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے بچپن کے دوست سے باتیں چھپانے لگے ہو اور وہ بھی وہ باتیں جنہیں تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں بیان کر رہی ہیں۔''

''عمران.....'' ابراہیم نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔

''اوکے چپ ہو جاتا ہوں میں..... مگر اب ایلیا جی سے ملنے کا شوق دو چند ہو گیا۔''

انہیں آپریشن تھیٹر نمبر 2 ڈھونڈنے میں بالکل وقت نہیں لگا تھا۔

''مجھے فیصل ساجد کو دیکھنا ہے، ان کا آج اپنڈی سائٹس کا آپریشن ہوا ہے۔'' ابراہیم نے کاؤنٹر اسٹاف سے گفتگو شروع کی۔

''جی..... جی.....'' کاؤنٹر پر موجود افسر کمپیوٹر چیک کرتے ہوئے بولا۔'' وہ یہیں ہیں اور ابھی ان کا آپریشن ختم نہیں ہوا۔''

''اوکے، ان کی اٹینڈنٹ کہاں ہیں؟''

''وہ وہیں انتظار گاہ میں تھیں، ہوسکتا ہے کہ کسی کام سے اِدھر اُدھر گئی ہوں، آپ وہیں ان کا انتظار کیجیے۔'' وہ بات ختم کر کے دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے آپریشن تھیٹر نمبر 2 کے باہر بنی انتظار گاہ میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت انتظار گاہ بالکل خالی تھی۔ ابراہیم نے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا۔

''وہ یہاں بھی نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی بے قراری تھی۔

''ہوسکتا ہے کہ کسی کام سے باہر نکلی ہو، تم اسے اب کال کرو۔'' عمران کرسی پر ڈھیر ہوتا ہوا بولا۔

ابراہیم نے ری ڈائل دبایا..... بیل بج رہی تھی۔ وہ فون کو دیکھتا رہا پھر کال بند کر دی۔ عمران اس دوران چونکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ابراہیم ذرا پھر کال کرو۔'' وہ بولا۔

''یار فون پک نہیں ہو رہا۔'' وہ بولا۔

''تم دوبارہ کال کرو تو.....'' عمران کے اصرار پر اس نے پھر نمبر ملایا۔ دو بیل بجنے تک عمران کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر نشست کے نیچے جھکا، جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایلیا کا فون تھا۔ ایلیا نے غالباً بیل تقریباً بند کر رکھی تھی۔

''یہ..... یہ فون تو یہاں پڑا ہے۔'' اس کی آواز سن کر ابراہیم اس کی جانب لپکا۔

''تب ہی..... تب ہی اتنی دیر سے کال اٹینڈ نہیں ہو رہی۔ وہ اپنا فون یہاں گرا کر کہاں جا سکتی ہے۔'' ابراہیم فکرمندی سے بولا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' عمران کندھے اچکا کر بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اسے ابھی تک فون کے گم ہو جانے کے بارے میں کچھ پتا ہی نہ ہو۔''

''ہمیں کچھ دیر اس کا یہیں انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے بھائی کا آپریشن ہو رہا ہے اور وہ اپنا فون کھو چکی ہے۔ یقیناً وہ کسی بھی لمحے یہاں واپس آئے گی۔'' ابراہیم، ایلیا کے فون کو دیکھتے ہوئے نشست پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

''آپ تشریف رکھیے نا، کھڑی کیوں ہیں؟'' وہ کمرے میں داخل ہو کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ ایک خاصا بڑا کمرا تھا جہاں بڑی میز، کرسیاں، مریض کے لیے مخصوص اسٹول، پیشنٹ بیڈ اور طبی آلات موجود تھے۔

سامنے میز کے پیچھے ایک طویل القامت شخص بیٹھا تھا۔ اس کی رنگت گوری تھی۔ ذہین چمکتی آنکھوں پر بغیر فریم کا چشمہ سج رہا تھا اگرچہ اس کے سر پر بال نہیں تھے مگر بحیثیت مجموعی وہ ایک باوقار اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر پُرشفقت مسکراہٹ تھی۔

''جی..... جی، میرا نام ایلیا ہے۔ ایلیا ساجد، میرے بھائی کا آپریشن ہو رہا ہے۔ مجھے آپ کی نرس یہاں لے کر آئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ قدرے سنبھل کر بولی۔

''بالکل، میں نے ہی اس سے یہ کہا تھا مگر آپ بیٹھیں تو سہی۔'' وہ دوبارہ مسکرایا۔

''شکریہ.....'' ایلیا اس کے سامنے موجود کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اصل میں مجھے اپنے بھائی کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیے، میرا بھائی ٹھیک ہے نا؟''

''آپ کا بھائی بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ اب تک تو غالباً اس کا آپریشن ہو چکا ہوگا۔ وہ بہترین ہاتھوں میں ہے۔''وہ اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

''شکر ہے اللہ کا، ورنہ جب نرس نے مجھے آپ کا پیغام دیا، میں خوف زدہ ہوگئی تھی۔'' ایلیا پہلی بار مسکرائی تھی۔''پھر کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''بالکل جان سکتی ہیں۔ دراصل میں آپ کے کئی نیوز پیکجز دیکھ چکا ہوں۔ جس طرح آپ معاشرے کے مسائل کی صاف عکاسی کرتی ہیں اس سے میں بہت متاثر ہوں، آپ کو میں نے ویٹنگ ایریا میں دیکھا تو معلومات کیں اور جب پتا چلا کہ آپ کے بھائی ایڈمٹ ہیں تو ان کے لیے خصوصی ہدایات دیں پھر سوچا کہ کیوں نہ آپ کے ساتھ ایک کپ چائے پی جائے۔ یہاں صحت کے شعبے میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جس پر توجہ کی ضرورت ہے۔''

''جی آپ درست کہہ رہے ہیں، اس حوالے سے بہت کام کی گنجائش ہے۔'' ایلیا کا اس طرح کے لوگوں سے ٹاکرا ہوتا رہتا تھا۔ ان میں سے کچھ واقعی مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ ہوتے تھے اور باقی مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ شہرت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ تو یہ ڈاکٹر صاحب بھی میڈیا کانشس ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔''اس وقت میں خاصی الجھی ہوئی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ کی مدد سے یقیناً میرے بھائی کو زیادہ توجہ مل سکے گی۔''

''بالکل ملے گی، انہیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''بہت شکریہ...... پھر اب میں چلتی ہوں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

اسی وقت ایک اور نرس اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے اور بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

''لیجیے چائے بھی آگئی، آپ بیٹھیے پلیز......'' ڈاکٹر صاحب اصرار سے بولے۔

''ڈاکٹر صاحب اس وقت چائے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔''

''چائے موڈ سے نہیں پی جاتی۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ آپ نے گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا۔ یاد رکھیے مریض کی دیکھ بھال ایک صحت مند اور چاق چوبند اٹینڈنٹ ہی اچھی کرسکتا ہے، یہ ایک ڈاکٹر کی ہدایت ہے اور آپ کو اس پر عمل کرنا ہے۔''

ڈاکٹر کے اصرار پر ایلیا بیٹھ گئی۔ اسے یہ باوقار ڈاکٹر اچھا لگا تھا۔ کیا تھا کہ اسپتالوں کا اسٹاف پریشان لوگوں سے مسکرا کر باتیں کرے، ان سے ہمدردی کا اظہار کرے۔ مدد کرے۔ اس نے سوچا، عام طور پر تو نرسنگ اور دیگر اسٹاف کا رویہ ہی مریضوں کے ساتھ آنے والے افراد کو بھی ذہنی طور پر بیزار اور پریشان کردیتا ہے۔

اس نے چائے کی پیالی تھامی، ایک بسکٹ لیا۔ واقعی اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دفتر میں وہ جلدی بھاگنے کے چکر میں تھی اور گھر پہنچ کر فیصل کی پریشانی میں لگ گئی تھی۔ گرم چائے کا بڑا سا گھونٹ اسے بہت اچھا لگا تھا۔

اسپتال کے دیگر حصوں کے برخلاف اس حصے میں بالکل خاموشی تھی۔ اس قدر خاموشی کہ شاید ایک پن بھی گرے تو اس کی آواز سنی جاسکتی تھی۔ پنکھے، اے سی، سب بے آواز انداز میں اپنا کام کررہے تھے۔

''آپ کی ڈیوٹی کی ٹائمنگ کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''میں دن کی شفٹ میں ہوتی ہوں مگر جب اسائنمنٹ ہو تو پھر کوئی وقت نہیں ہوتا۔'' وہ مسکرائی۔

''ہماری طرح......'' ڈاکٹر بھی مسکرایا۔''یہاں بھی یہی حال ہے۔''

''جی......'' ایلیا کو نہ جانے کیوں اپنی اور پھر ڈاکٹر کی آواز قدرے دور سے آتی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیا اور پھر سر کو جھٹکا۔ 'کہیں اس کا بی پی تو لو نہیں ہورہا' اس نے سوچا۔ اس کے ہاتھ میں آدھا بسکٹ موجود تھا اس نے اس بسکٹ کو کھانے کا ارادہ کیا مگر پوری طاقت لگانے کے باوجود وہ اپنے ہاتھ کو معمولی سی جنبش ہی دے پائی تھی۔ اس نے گھبرا کر سامنے بیٹھے ڈاکٹر کی جانب دیکھا اس کی کیفیت بھی کچھ اس جیسی ہی تھی۔ اس کی گردن ڈھلک رہی تھی۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایلیا نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کمرے میں چھن کی ہلکی سی آواز گونجی۔ اس کے ہاتھ میں موجود کپ زمین سے جاٹکرایا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اردگرد گہری تاریکی چھاگئی۔

☆☆☆

''دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔'' ابراہیم بولا۔''ہمیں یہاں آئے ڈیڑھ گھنٹے سے بھی زیادہ ہوچکا ہے۔ فیصل کا

آپریشن ختم ہو چکا ہے، اسے کمرے میں شفٹ کیا جا چکا ہے مگر ایلیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ یہ سب نارمل نہیں ہے پھر اس کا فون جس طرح یہاں زمین پر پڑا ملا ہے...... یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ اسے اب تک اپنے فون کی گمشدگی کا پتا نہ چلا ہو۔''

''درست کہہ رہے ہو تم ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

''عمران میرا خیال ہے کہ کاؤنٹر اسٹاف ہماری مدد کر سکتا ہے۔ کاؤنٹر بالکل سامنے ہے مگر ہم کو اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر اس کام کو کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اگر یہاں کا کوئی شخص اس میں ملوث ہے تو وہ لازماً چوکنا ہو جائے گا جس کی وجہ سے ہم ایلیا کو کھو سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''ہم الگ الگ کوشش کرتے ہیں۔'' عمران سر ہلا کر بولا اور ابراہیم کاؤنٹر کی جانب بڑھا۔ کاؤنٹر پر اس وقت ایک میل اسٹاف موجود تھا۔

''جی سر......'' وہ ابراہیم کو دیکھ کر مؤدب انداز میں بولا۔

''اصل میں یہاں ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے بھائی مسٹر فیصل کا آپریشن ہو رہا تھا۔'' ابراہیم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی جی...... وہ یہیں تھیں......'' اسٹاف نے سر ہلا کر کہا۔

''مگر اب ڈیڑھ گھنٹے سے وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ گھر چلی گئی ہوں۔''

''نہیں، ان کے بھائی کا آپریشن ابھی ختم ہوا ہے۔'' ابراہیم بولا۔ ''ویسے کیا آپ نے انہیں کہیں باہر جاتے دیکھا ہے؟''

''نہیں، میں تو ابھی یہاں آیا ہوں سر۔ ویسے میں معلوم کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے برائے مہربانی آپ معلوم کریں۔'' وہ پلٹ کر انتظار گاہ کی طرف بڑھا۔ اسپتال میں اس طرح کسی کو تلاش کرنا ہرگز آسان کام نہیں تھا لیکن انہیں کہیں سے ابتدا کرنا ہی تھی۔

عمران اس دوران آپریشن تھیٹر سے متعلق اسٹاف، باتھ روم میں موجود خاتون اسٹاف اور گارڈز سے معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ کسی نے بھی ایلیا کو کہیں جاتے نہیں دیکھا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں باقاعدہ تفتیش شروع کرنا ہوگی۔'' عمران بولا۔

''میں نے دفتر سے ایک سب انسپکٹر کو ایلیا کے فلیٹ پر بھیجا ہے۔ اگر وہ کسی کام سے گھر گئی ہوگی تو وہاں مل جائے گی یا کم از کم یہ ضرور پتا چل جائے گا کہ وہ اس دوران وہاں آ کر گئی ہے یا نہیں۔ اس کے دفتر بھی فون کر چکا ہوں۔ اس وقت اس کی ڈیوٹی بھی نہیں ہے اور وہ دفتر گئی بھی نہیں ہے۔'' ابراہیم بولا۔

''ٹھیک ہے...... تو اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔ وہ دونوں انتظار گاہ سے قدرے ہٹ کر کھڑے ہوئے تھے۔

''سر! کیا میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتی ہوں۔'' ایک قدرے عمر رسیدہ خاتون نے ان کے قریب آ کر پوچھا۔ اس نے اسپتال کا یونیفارم پہن رکھا تھا اور غالباً صفائی ستھرائی یا آیا کے کام پر مامور تھی۔

''جی فرمایئے۔'' ابراہیم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ اس لڑکی کو ڈھونڈ رہے ہیں نا جو ادھر بیٹھی تھی؟'' اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔

''جی اماں...... اسی کو...... کیا آپ جانتی ہیں، وہ کہاں گئی ہے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''دیکھا تو تھا میں نے......'' وہ سر جھکا کر بولی۔ ''مگر ڈرتی ہوں میری نوکری کا مسئلہ نہ ہو جائے۔''

''آپ کی نوکری کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلے گا کہ آپ نے ہماری مدد کی ہے۔'' ابراہیم بے تابی سے بولا۔

''میں غریب عورت ہوں، بیوہ عورت، بچوں کی ذمے داری ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رک گئی۔ ابراہیم چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کو اس کے جبڑے تن گئے تھے اور آنکھوں میں غصے کی سرخی لہرائی تھی۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کے تین نوٹ نکال کر اس عورت کی جانب بڑھائے جنہیں اس نے فوراً لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ابراہیم اب کچھ کہے بغیر اسے استفہامیہ انداز میں دیکھے جا رہا تھا۔

''میں نے ڈیڑھ دو گھنٹے قبل اسے نرس شبانہ کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ''نرس شبانہ بڑی منہ چڑی ہے انتظامیہ کی۔'' اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔ غالباً اس کا مسئلہ نرس شبانہ سے تھا جس کی وجہ سے وہ یہ اطلاع دینے آئی تھی۔

''نرس شبانہ..... کہاں ہے وہ؟''

''یہ تو آپ کاؤنٹر پر پوچھ لیں پر میں نے کچھ خبر دی ہے آپ کو..... مگر میرا نام نہیں آنا چاہیے۔'' وہ قدرے سرد مہری سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

''ہمیں نرس شبانہ کا پتا کرنا ہوگا۔'' وہ چند لمحے اسے غصے سے دیکھنے کے بعد عمران کی جانب مڑا تھا۔ ''تمہارا خیال درست تھا، گڑبڑ ہے اور یہیں سے کچھ ہوا ہے۔ ہمیں محتاط رہ کر کام کرنا ہوگا۔ ان کو یہ اطلاع نہیں ملنی چاہیے کہ پولیس یہاں پہنچ گئی ہے۔'' عمران نے سر ہلایا۔

کاؤنٹر سے انہیں اطلاع ملی کہ نرس شبانہ کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے اور وہ گھر کے لیے نکل گئی ہے۔ اس کے گھر کے پتے کے حصول کے لیے عمران کو ایک نئی کہانی اور پانچ سو روپے خرچ کرنا پڑے تھے۔ وہ نیلم کالونی کی ایک گلی کی باسی تھی۔ ابراہیم اور عمران جب اس کے گھر پہنچے تب تک وہ گھر نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں خود کو اس کے کسی مریض کا اٹینڈنٹ ظاہر کر کے باہر آ گئے اور اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کر کے بیٹھ گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نرس شبانہ گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے اسپتال کے یونیفارم پر چادر لی ہوئی تھی مگر اس کی شناخت مشکل نہیں تھی۔ اس کے گلی میں مڑتے ہی ابراہیم گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کے قریب لے آیا۔

''نرس شبانہ.....'' عمران گاڑی سے اتر کے اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا بات؟ آپ بولیں۔'' وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔

''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' عمران سرد لہجے میں بولا۔

''میں نہیں بیٹھوں گی..... کون ہو تم لوگ.....'' وہ زور سے بولی۔

''پولیس.....'' عمران نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کر دیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

''مگر آپ مجھے کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہیں؟ میرا قصور کیا ہے؟ مجھے اپنے گھر اور دفتر اطلاع کرنے دیں۔ آپ اس طرح مجھے نہیں پکڑ سکتے؟'' وہ مسلسل بول رہی تھی۔ اس نے اپنے پرس سے فون نکالا جسے عمران نے فوراً چھین لیا تھا۔

''ہم تمہیں اسٹیشن تک لے جا رہے ہیں اور مطمئن رہو تمہیں سب کو اطلاع کا موقع ملے گا مگر ابھی نہیں.....''

اسے سیٹ پر بٹھا کر گاڑی تیزی سے آگے کی جانب بڑھ گئی۔ شبانہ کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے خوف چھلک رہا تھا۔

☆☆☆

ایلیا کی آنکھ کھلی تو چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے اور جہاں ہے وہاں کیوں ہے؟ آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھوں کو مسلا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں وہ بے ہوش ہوئی تھی مگر یہ کمرا بھی اچھی طرح فرنشڈ تھا۔ وہ خود ایک صوفے پر تھی جبکہ پیشنٹ بیڈ پر وہی ڈاکٹر موجود تھا جس نے اسے بلایا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش پڑا تھا۔

''یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ اور یہ..... یہ چکر کیا ہے؟'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں لگا جیسے سارا کمرا ڈول رہا ہو۔ سامنے میز پر اس کا پرس پڑا تھا۔ اس نے لپک کر پرس کھولا اور موبائل تلاش کرنا چاہا مگر موبائل اس میں نہیں تھا۔

وہ واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ پتا نہیں فیصل کیسا ہوگا؟ اس کا آپریشن کس طرح ہوا ہوگا؟ اگر اس اسپتال سے اسے اور اسپتال کے ڈاکٹر کو اس طرح اغوا کیا جا سکتا ہے تو کیا اس کا بھائی وہاں محفوظ ہوگا؟ اس آخری خیال نے اسے پھر کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

''یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟'' وہ سوچے جا رہی تھی۔ ''کہیں اس کا تعلق اس قتل ہونے والے سے تو نہیں، کہیں انہیں یہ معلوم تو نہیں ہو گیا کہ اس نے مجھے وہ میموری کارڈ دیا تھا.....'' وہ اب خوف زدہ ہو رہی تھی۔ خیالات کی ڈور اب اس قتل سے قاتل اور پھر ابراہیم کی طرف مڑ گئی۔ ابراہیم قاتل تک پہنچ چکا تھا تب ہی تو اس نے اس کی تصویر اسے بھیجی تھی مگر اب وہ کہاں تھا؟ کیا وہ کبھی یہ جان پائے گا کہ ایلیا کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

وہ سوچوں کو جھٹکتی ہوئی پیشنٹ بیڈ کی طرف بڑھی اور ڈاکٹر کو جھنجوڑ ڈالا۔

''ڈاکٹر صاحب..... ہوش میں آیئے۔''

''میں کہاں ہوں، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے آنکھ کھولتے ہی پوچھا۔ وہ بھی ایلیا سے کم پریشان اور خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ تو مجھے آپ بتائیں گے۔'' ایلیا نے اسے گھورا۔

''آپ کے کمرے میں آپ کی منگوائی ہوئی چائے پی کر میں بے ہوش ہوئی تھی اور اب یہاں ہوں، یہ سب کیا ہے ڈاکٹر

صاحب؟''

''مجھے خود معلوم نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو خود آپ کے سامنے یہاں ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''یقیناً ہمارے اسٹاف میں سے کوئی مجرمانہ کاموں میں مصروف ہے اور اسی چکر میں یہ سب ہوا ہے، آپ سوچیں کیا وجہ ہوسکتی ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بولا۔ ''میں مریض بھی ہوں دل کا، مجھے اگر وقت پر دوا نہ ملی تو میری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔''

''اوہ، ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ میں یہ دروازہ بجاتی ہوں، دیکھتی ہوں کیا ہوتا ہے۔ آپ یہ سوچیے کہ کیا یہ کمرا آپ کے اسپتال کا ہے؟'' ایلیا دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر یہ پیشنٹ بیڈ...... یہ اسپتال میں ہی ہوتا ہے۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

ایلیا نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا تو وہ اس کی توقع کے برخلاف کھلتا چلا گیا۔

''یہ دروازہ تو کھلا ہے، آیئے ڈاکٹر صاحب، جلدی آیئے۔ ہم باہر نکل کر دیکھتے ہیں کہ یہ چکر کیا ہے اور ہم کہاں ہیں؟'' ایلیا باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ڈاکٹر اس کے عقب میں تھا۔ وہ ایک طویل اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی لابی تھی جہاں اس کمرے کے علاوہ کوئی اور دروازہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

''میں نے یہ جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔'' ڈاکٹر نے دھیرے سے کہا۔ ایلیا ہاتھ کے اشارے سے خاموشی کا کہہ کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ لابی لکڑی کے ایک بڑے دروازے پر آکر ختم ہوئی تھی۔ ایلیا نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جہاں دو بڑے پیشنٹ بیڈ لگے تھے۔ اردگرد موجود چیزوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس جگہ کو باقاعدہ آپریشن تھیٹر کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔

فضا میں دواؤں کی مخصوص بو کے ساتھ ساتھ کچھ عجیب سی بو بھی شامل تھی۔ ایک طرف بنی دیوار کے ساتھ قدِآدم فریزر نما مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ایلیا کو یک دم شدید گھبراہٹ کا احساس ہوا اور وہ دروازے کی جانب مڑی۔ ڈاکٹر اس کے عقب میں موجود نہیں تھا۔ وہ اس ہال میں تنہا کھڑی تھی۔ ایلیا لپک کر دروازے کے پاس پہنچی، اور ہینڈل گھما کر اسے کھولنا چاہا مگر یہ ممکن نہیں ہوسکا تھا۔ دروازہ لاک تھا۔ وہ گھبرا کر مڑی اور ساکت رہ گئی۔

☆☆☆

''اب شروع ہوجاؤ۔'' ابراہیم سرد لہجے میں بولا۔ وہ اس وقت ہیڈ آفس میں انٹروگیشن روم میں تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکور میز رکھی ہوئی تھی جس کے اردگرد چھ سے زائد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شبانہ، ابراہیم کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نرس شبانہ، اس لیے مجھے فوراً اپنے سوال کا جواب چاہیے۔ تم ایلیا کو کہاں لے کر گئی تھیں؟''

''میں کسی کو بھی کہیں نہیں لے کر گئی تھی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے بالکل معلوم نہیں کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''میں نے یہ کہا کہ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے مگر جھوٹ نہیں...... ہمیں سچ اگلوانا آتا ہے مگر میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کہ جو تم جانتی ہو وہ بتا دو ورنہ دوسری صورت میں بتاؤ گی تو تم پھر بھی مگر وہ صورتِ حال تمہیں زیادہ پسند نہیں آئے گی۔'' ابراہیم غرایا۔

''مگر صاحب......'' اس نے کچھ کہنا چاہا تو عمران بول اٹھا۔

''تم یہ بتانے میں اپنی طاقت ضائع مت کرو کہ تم ایلیا کو وہاں سے نہیں لے کر گئی تھیں کیونکہ اس کا نہ صرف ہمارے پاس ثبوت ہے بلکہ گواہ بھی ہے۔''

''ثبوت...... گواہ......؟'' شبانہ چونک گئی۔

''ہاں ثبوت ہے یہ سیل فون، جب تم اسے لے کر جارہی تھی تب یہ نیچے گر گیا تھا اور اس کا کیمرا ویڈیو بنا رہا تھا۔'' ابراہیم نے اسے بلف کیا۔ ''اور یہ فلم دیکھ کر ہم نے تمہیں شناخت کرایا ہے۔ تمہارے اسپتال کے کئی لوگوں نے بتایا کہ تم ہی اسے لے کر جارہی تھیں۔''

''صاحب میں غریب عورت ہوں۔ میری ماں بہت بیمار ہے۔'' وہ اس وار پر ڈھے گئی تھی۔

''تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم تمہاری ماں کو بھی یہاں لے کر آئیں۔'' ابراہیم غرایا۔

''نہیں صاحب مگر میرا قصور نہیں ہے۔ میں تو ایک ملازمہ ہوں، مجھے جو حکم ملا وہ میں نے کیا اور......'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''تو ہم بھی تم سے یہی جاننا چاہتے ہیں کہ تمہیں کیا حکم ملا تھا اور کس نے حکم دیا تھا؟''

''مجھے بڑے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ میں ان بی بی کو ان کے کمرے میں لے آؤں۔'' وہ بالآخر بولی۔

''بڑے ڈاکٹر صاحب ؟'' عمران نے پوچھا۔

''جی وہ مالک ہیں اسپتال کے۔ ڈاکٹر شریف احمد خان۔'' وہ بولی۔

''تو تم ایلیا کو ان کے کمرے میں پہنچا کر چلی گئی تھیں؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''جی صاحب جی...... اس کے بعد میری ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی اور میں تھوڑی دیر بعد اسپتال سے نکل گئی تھی۔''

''او کے...... ہمیں اسپتال کے لیے نکلنا ہوگا اور اس بڑے ڈاکٹر صاحب کو دیکھنا ہوگا۔'' ابراہیم کھڑا ہو گیا۔

''ایلیا کی جان خطرے میں ہے عمران، اس نے ضرور کچھ ایسا دیکھ لیا ہے جس کے بعد وہ اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

وہ دونوں تیزی سے کوریڈور سے باہر نکلے ہی تھے کہ ابراہیم کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ عمران اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ فون بند کر کے اس نے خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھا۔

''کیا ہوا ہے ابراہیم، کیا کوئی بُری خبر ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں...... میں نے ایلیا کے گھر پر دو سب انسپکٹر کو معلومات لانے کے لیے بھیجا تھا۔''

''ہاں...... تو......؟''

''انہیں وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ ان سے قبل ہی کوئی ایلیا کے فلیٹ میں گھسا ہوا تھا۔ ان کے وہاں پہنچنے پر وہ اندر ہی چھپ گیا تھا۔ اے ایس آئی مسعود نے کسی کو وہاں سے نکلتے دیکھا تو اسے للکارا...... جواب میں وہ فائرنگ کرتا ہوا وہاں سے فرار ہو گیا۔''

''وہ وہاں کیا چرانے آیا تھا؟'' عمران بڑبڑایا۔

''اس کے ہاتھ میں ایلیا کا لیپ ٹاپ تھا جو اس چکر میں تباہ ہو گیا ہے۔''

''شکر ہے کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔'' عمران بولا۔ ''ورنہ زیادہ نقصان ہو سکتا تھا۔''

''نقصان تو ہوا ہے۔'' ابراہیم افسردہ لہجے میں بولا۔ ''اس کی فائرنگ سے مسعود کو تین گولیاں لگی ہیں اور وہ اس وقت قریبی اسپتال میں لے جایا گیا ہے۔ عالم بتا رہا ہے کہ اس کی حالت کریٹیکل ہے۔''

☆☆☆

اس کے بالکل سامنے ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا شخص کھڑا تھا۔ اس نے سرجن... والا لباس پہن رکھا تھا، اس کی آنکھوں میں سفاکی جھلک رہی تھی اور سب سے زیادہ خوف زدہ کر دینے والی چیز اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور تھا۔

''تت...... تم کون ہو؟ کیا چاہیے تمہیں مجھ سے......؟'' وہ بمشکل بولی۔

''تم بہت عقل مند ہو، اگر تم وقت ضائع کیے بغیر کام کی بات کرنا چاہتی ہو تو مجھے یہ بات پسند ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''اور کام کی بات ہمیشہ اچھے اثر پذیر ماحول میں کرنی چاہیے لہٰذا آؤ ہم اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' وہ ریوالور سے اسے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

اس ہال نما کمرے سے منسلک ایک اور کمرا تھا جو غالباً ان کا سٹنگ روم تھا وہاں صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان میں سے ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور ایک شخص ان کے سر پر پستول رکھے کھڑا تھا۔ ایلیا نے خوف زدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھا اور سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ہاں تو اب ہم بھی سیدھے سادے طریقے سے بات کرتے ہیں۔'' فرقان بولا۔

''جی......''

''دیکھو بی بی ہماری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے مگر تمہارے پاس ہماری ایک ایسی چیز آ گئی ہے جس سے تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔''

''کیسی چیز......؟'' ایلیا نے ہمت کر کے پوچھا۔

''اپنی یادداشت کو حاضر کرو ایلیا بی بی۔'' فرقان غرایا۔ ''وہی چیز جو تمہیں ہمارے ایک غدار نے مرتے وقت دی تھی...... کچھ یاد آیا؟'' وہ مکاری سے ہنسا۔ ''یاد آ جائے تو اچھا ہے، ورنہ ہمارے پاس یادداشت واپس لانے کے کئی طریقے ہیں۔ پہلے تو یہ ڈاکٹر اوپر جائے گا پھر تمہارا بھائی......''

''نہیں نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے......؟''

''کیوں...... جب ہمارا کام نہیں ہوگا تو ہم ایسا ہی کریں گے۔'' وہ بولا۔ ''اور اگر تم ان دونوں کی اور اپنی جان بچانا چاہتی ہو تو وہ چیز ہمارے حوالے کر دو۔''

ایلیا کا دماغ تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی سکتی تھی کہ اگر ان کی چیز ان کے ہاتھ لگ گئی تب بھی وہ اسے، فیصل یا ڈاکٹر صاحب میں سے کسی کو بخشنے والے نہیں تھے۔ ابراہیم اس کے لیے امید کی واحد کرن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہاں ہے اور اسے امید تھی کہ اگر وقت نے ساتھ دیا تو شاید وہ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے مگر تب تک وہ خود کو، فیصل کو اور ڈاکٹر صاحب کو زندہ رکھنے کے لیے کیا کرے......

''کیا سوچ رہی ہو؟'' فرقان نے پوچھا۔ ''یاد آیا کہ نہیں۔'' اس کے الفاظ سے زیادہ سفاکی اس کے لہجے میں تھی۔

''وہ...... وہ میرے گھر پر ہے...... میرے لیپ ٹاپ میں......'' وہ تیزی سے بولی۔

''وہ ہے کیا چیز......؟'' فرقان نے پوچھا۔

''وہ میموری کارڈ ہے۔'' اس بار وہ سچ بول رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک میموری کارڈ دیا تھا۔ یقین کرو میں بالکل سچ بول رہی ہوں۔ میں نے اسے اپنے لیپ ٹاپ میں لگایا ہے مگر وہ کھلا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس میں کوئی ایسا انتظام ہے کہ اسے کھولنا آسان نہیں ہے۔'' وہ بولے جارہی تھی۔

''تو وہ تمہارے لیپ ٹاپ میں ہے؟'' فرقان نے پوچھا۔

''جی...... آپ اسے لے آئیں، میں اس میں موجود خفیہ ساکٹ سے وہ کارڈ آپ کو نکال دوں گی۔ آج کل سب کچھ اتنا ہیک ہو رہا ہے کہ ٹی وی والوں نے ہمیں سخت ڈیجیٹل سیکیورٹی کا نظام بنا کر دیا ہے۔'' وہ کسی طرح وقت لینا چاہ رہی تھی۔ اب یہ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس چال کا اسے کوئی فائدہ ہوگا بھی کہ نہیں...... ناکامی کی صورت میں تکلیف دہ موت ہی اس کا مقدر تھی اور فیصل کے بارے میں سوچتے ہوئے تو اس کا دل کٹنے لگا تھا۔ وہ اور بے چارے ڈاکٹر دونوں اس کی وجہ سے موت کے منہ میں جا پہنچے تھے۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ایلیا کو کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

''گڈ بے بی......'' وہ اچانک کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اب ان کے چہرے پر کرختگی اور سفاکی پھیلی ہوئی تھی۔ ''فرقان تم اس کے فلیٹ پر جا کر لیپ ٹاپ لے کر آؤ۔''

''سر، وہ میں نے پہلے ہی حمزہ کو روانہ کر دیا ہے۔''

''گڈ۔'' ڈاکٹر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ پھر وہ ہکا بکا کھڑی ایلیا کی جانب مڑا۔ ''بہت حیران ہو رہی ہونا تم...... کیا کریں بے بی کرنا پڑتا ہے۔ ویسے میں اچھا اداکار ہوں نا......؟'' وہ مسکرایا۔ ''فرض کرو اگر یہ پلان ناکام ہو جاتا تو میں تمہارا ہمدرد بن کر تمہارے ساتھ باہر نکل جاتا اور اس صورت میں بھی ہمارا پلان مکمل ہو جاتا۔''

''مگر کیوں...... آپ اتنے بڑے سرجن ہیں، سب کچھ ہے آپ کے پاس...... پھر بھی......'' ایلیا کا خوف موت کو یقینی دیکھ کر کم ہوتا جارہا تھا۔

''صرف سرجن ہونے سے کچھ نہیں ہوتا...... جب بہت آگے جانا ہو تو پھر سب کرنا پڑتا ہے۔ تم رپورٹر ہو نا، خبر تو پوری چاہیے تمہیں...... تاکہ عالم بالا میں جا کر رپورٹ کر سکو...... ہے نا...... تو سنو...... اسپتال بھی چلاتا ہوں مگر ساتھ ہی میں لوگوں کے مسائل بھی حل کرتا ہوں۔ اب یہ دیکھو کہ آبادی کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اگر ہر ماہ، سو پچاس لوگ کم نہ ہوتے جائیں تو یہاں تو چلنے کی جگہ بھی نہ رہے۔ تو جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان کی مدد کرتا ہوں۔ وہ جو تم لوگ اپنی خبروں میں کہتے ہو سہولت کار...... تو سہولت کاری کرتا ہوں۔ ان کے لیے۔ اس تہ خانے میں میرا پرائیویٹ اسپتال اور بہت بڑا گودام ہے جہاں ہتھیار آتے ہیں اور پھر باہر استعمال ہوتے ہیں۔'' وہ شیطانی انداز میں ہنسا۔

ایلیا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پھر یہ تو تم جانتی ہو نا کہ دنیا کچھ لو کچھ دو کے اصول پر کام کرتی ہے تو میں ان کی مدد کرتا ہوں اور وہ میری مدد اور حفاظت کرتے ہیں۔ طارق، وہی جسے تم نے مرتے دیکھا، میرا کارندہ تھا، بندہ ذہین تھا مگر جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ اسے کینسر ہو گیا ہے اسے نیک بننے کا مرض لاحق ہو گیا۔ اگلے مہینے ایکٹیوٹی کے لیے ہمارے پاس بہت زیادہ اور جدید ہتھیار آئے ہیں۔ اس نے ان کے کنٹینر کی فلم بنالی اور غائب ہو گیا، اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے برباد کر دے گا۔ پر ہوا کیا...... اپنی جان سے گیا۔ اور وہ جس نے اسے مارا غفور تھا...... وہ بھی میرا کارندہ تھا مگر اس کے پاس دماغ بالکل نہیں تھا۔ اس لیے اس قتل کے بعد اسے بھی مارنا پڑا۔''

''تت...... تم نے اسے بھی مار ڈالا۔'' ایلیا کے لیے یہ خبر شاک سے کم نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابراہیم کو اس کی کوئی خبر نہیں مل سکتی تھی۔

''ہاں، مارنا پڑا مگر اس کی اصل قاتل تم ہو۔''

''میں......'' ایلیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں تم...... تم نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ ہمارے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا تھا اس لیے اسے اڑانا پڑا۔ وہ مر کر بہت قیمتی ہو گیا۔'' وہ ہنسا۔ ''جیسے اب تم قیمتی ہو جاؤ گی۔''

''کیا...... کیا مطلب؟'' ایلیا دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

''دیکھو دنیا میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کو ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی ضرورت رہتی ہے۔ گردے، جگر، آنکھیں، کھال اور میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ میں تمہارے جسم سے یہ اعضا حاصل کروں گا جو بیرون ملک لاکھوں ڈالرز میں بکیں گے، تو تم قیمتی ہو جاؤ گی نا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے...... نہیں کر سکتے۔'' ایلیا لرز رہی تھی۔

''تم جانتی ہو کر سکتا ہوں اور کروں گا، تمہارے معاملے میں تو یہ گیٹ ون گیٹ ون فری والا معاملہ ہے۔'' وہ سفا کی سے ہنسا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم اور تمہارا بھائی فیصل، وہ تو بے چارہ ویسے ہی بستر پر پڑا ہے۔ تمہارے بعد اس کی باری آئے گی۔''

''نہیں...... نہیں۔'' ایلیا چیخ پڑی تھی۔

ڈاکٹر کے اشارے پر فرقان اور دوسرے شخص نے اسے پکڑ کر پیشنٹ بیڈ پر گرا دیا تھا۔ وہ مچل رہی تھی۔ چلّا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ رو رو کر ان کو بتا رہی تھی کہ وہ کارڈ اس کے لیپ ٹاپ میں نہیں ہے مگر شاید ان کی سماعت تک اس کی آوازیں پہنچ ہی نہیں رہی تھیں۔ اچانک اسے اپنے بازو میں کسی سوئی کے چبھنے کی تکلیف محسوس ہوئی۔ اس کے حواس گم ہونے لگے اور پھر ڈاکٹر، اس کے لوگ، کمرے کا دہشت زدہ کر دینے والا ماحول، فیصل کی فکر، ابراہیم کی آمد کی امید سب ہی دھندلکے میں ڈوب گئے۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر دراز تھی۔ اس نے حواس بحال ہوتے ہی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا، اسے کہیں درد کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے حرکت کی کوشش کی تو کسی نے نرمی سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''آرام سے لیٹی رہو......'' اس کے سامنے ابراہیم تھا۔

''تم...... تم کہاں تھے...... وہ ڈاکٹر ہی اصل مجرم ہے۔ وہ انسانوں کے گردے نکال کر فروخت کرتا ہے۔'' وہ بے اختیار بول رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں مگر تم گھبراؤ نہیں تمہارے سارے اسپیئر اور ضروری پارٹس اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''اور...... اور فیصل......'' وہ اب اٹھ کے بیٹھی تھی۔

''وہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ اسپتال پر کارروائی کے لیے آتے ہوئے اس کی حفاظت کا ہم نے سب سے پہلے انتظام کر دیا تھا۔'' وہ بولا۔

''شکر ہے...... شکر ہے یہ سب ختم ہوا۔ تم فلموں کے ہیرو کے مانند اچانک کیسے پہنچ گئے۔'' ایلیا نے اسے غور سے دیکھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ نرس شبانہ کے پکڑے جانے اور اس کے بیان کے بعد ہم نے اسپتال میں کارروائی کی۔ ظاہر کیے بغیر تمام سینئر لوگوں کو ان کے کمروں میں پکڑا گیا اور بالآخر اسپتال کا نمبر 2 ماہر سرجن اس خون آشام ڈاکٹر کا اسسٹنٹ نکلا۔ جب اس کا گردہ نکالا جانے لگا تو وہ پھٹ پڑا اور یوں ہم بروقت اس کے اس مکروہ دھندے سے متعلق جگہ پہنچ سکے۔'' ابراہیم بولا۔

''اس جگہ ہتھیاروں کی بڑی کھیپ بھی تھی جو وہ رمضان کے دنوں میں استعمال کرنے والے تھے۔'' ایلیا لرز کر بولی۔

''ہاں سب برآمد ہو گیا۔ اس کے دو آدمی مارے گئے مگر وہ زندہ گرفتار ہو گیا ہے۔'' ابراہیم بولا۔ ''کمال کی بات تو یہ ہے کہ وہ الٹا ہمیں دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ سچ پوچھو تو وہ اتنا نامور اور دولت مند ہے کہ عام حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا بہت مشکل ہوتا مگر اب وہ نہ صرف رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے بلکہ اتنا کچھ برآمد ہو چکا ہے کہ وہ بچ نہیں سکتا۔''

''یعنی اب اس میموری کارڈ کی ضرورت نہیں رہی۔'' ایلیا بولی۔

''کون سا میموری کارڈ......'' ابراہیم نے اسے گھورا۔

''میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا نا جو اس شخص نے مرتے وقت مجھے دیا تھا۔''

''فون بند ہو گیا تھا مگر تمہیں سب سے پہلے کام کی بات کرنی چاہیے تھی نا...... وہ کارڈ کہاں ہے؟''

''وہ میرے اس پرس میں ہے۔'' ایلیا نے میز پر رکھے چھوٹے پرس کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارا مطلب یہ سارا وقت تمہارے پاس رہا۔'' ابراہیم نے پرس اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ مسکرائی اور پرس میں سے فیس پاؤڈر باہر نکالا۔ اس میں پاؤڈر کے دو حصوں کے علاوہ ایک آخری اور تیسری تہ بھی تھی جس میں وہ چھوٹا سا پیکٹ چپکا ہوا تھا۔ اس نے وہ نکال کر ابراہیم کی جانب بڑھا دیا۔ ''مگر مجھے اس کا پاس ورڈ معلوم نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''پولیس کے ہیکرز اسے نکال لیں گے۔'' وہ مسکرایا۔

''تم نے کمال کر دیا، مطلب تم اتنی خالی دماغ نہیں ہو جتنی میں سمجھ رہا تھا۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔ ''اور میں سوچ رہا ہوں کہ چونکہ تمہیں ایک عقل مند آدمی بلکہ ہیرو کے ساتھ کی ضرورت ہے تو کیوں نہ میں اس کام میں تمہارا سہولت کار بن جاؤں۔''

''تم اپلائی کرو پھر دیکھتے ہیں۔'' ایلیا بھی شرارت سے مسکرا دی۔

☆☆☆

دہشت نگر

اسما قادری

کٹھن اور مشکل وقت مزید دشوار تر ہو جاتا ہے... جب یہ گھڑیاں تنہا رہ کے بتانی پڑیں۔ ایک ایسی ہی عورت کی کتھا... ایک واقعے نے اس کی زندگی کے تمام رنگین لمحوں کو سوگ کی چادر پہنادی... بے بسی... لاچاری اور تنہائی کے باوجود مثبت اندازِ فکر... خیر کے جذبے کا احساس اس کے اندر موجود رہا... اس جذبے نے اسے ان حقائق تک پہنچا دیا... جو ہر ایک کی آنکھوں سے اوجھل تھے... لمحہ بہ لمحہ شکستگی اور فتح کے قریب آتی جاتی کہانی کے سنسنی خیز موڑ...

گھنے قدآور درختوں کی چھاؤں میں آجانے والے بے سایاں کی داستان......

''سامان تو سارا سیٹ ہوگیا ہے آپی! اب آپ ایسا کریں کہ مجھے مہینے کے سودے کی لسٹ دے دیں۔ کل صبح مجھے واپس جانا ہے تو بہتر ہے میں یہ کام بھی نمٹا کر چلا جاؤں۔'' سینٹرل ٹیبل کا شیشہ احتیاط سے فکس کرنے کے بعد زوہیب نے کہا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ان دو دنوں میں اس نے کام بھی تو بہت کیا تھا۔ وہ پرسوں یعنی جمعے کی رات اسلام آباد سے کراچی پہنچا تھا اور آج اتوار کی شام تک اس کا زیادہ تر وقت مصروف گزرا تھا۔ سائرہ کی بڑے لگژری اپارٹمنٹ سے اس دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں شفٹنگ کا سارا عمل اسی کی محنت سے مکمل ہوا تھا۔ بڑے اپارٹمنٹ کی مناسبت سے

سائرہ کے پاس فرنیچر اور دیگر سامان اچھی خاصی مقدار میں تھا۔ اس چھوٹے فلیٹ میں منتقلی کے لیے اسے اپنے سامان کا کافی بڑا حصہ فروخت کرنا پڑا تھا۔ سائرہ ایک تنہا عورت تھی اور اسے معاشرے کے عمومی رویے کا اندازہ تھا کہ یہاں نہ صرف عورت کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے بلکہ بہت کامیابی سے اسے بے وقوف بنا بھی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ فون پر اس کی شفٹنگ کا سن کر جب زوہیب نے مدد کے لیے کراچی آنے کی پیشکش کی تو وہ اسے رد نہیں کرسکی حالانکہ پچھلے چھ ماہ سے وہ خود انحصاری کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور پوری کوشش کر رہی تھی کہ میکے یا سسرال میں سے کسی کو اپنے کاموں کے لیے زحمت نہ دے۔ زوہیب کے آنے سے اسے خاصی

آسانی ہو گئی تھی۔ زائد سامان کی فروخت کے علاوہ منتقل ہونے والے سامان کی پیکنگ اور پھر نئے فلیٹ میں اس سامان کی سیٹنگ میں اس نے بہت زیادہ مدد کی تھی اور اب پھر اسے ایک اچھی پیشکش کر رہا تھا۔

''تم رہنے دو زوہیب! خاصے تھک گئے ہو۔ سودا ایک آدھ دن میں، میں خود لے کر آجاؤں گی۔'' زوہیب کی تھکن کے پیشِ نظر اس نے کہا۔

''تھکن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ رات کو بھرپور نیند لوں گا تو ساری تھکن اُتر جائے گی۔ لائیں جلدی سے لسٹ دے دیں، میرے جانے کے بعد آپ کہاں خوار ہوتی رہیں گی۔''

''تم ایک بار ہی یہ کام کر دو گے، آئندہ بھی مجھے یہ کام خود ہی کرنا ہے۔'' زوہیب کے اصرار پر اس کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ آگئی تو وہ کچھ بے چین سا ہو کر اس کے قریب آبیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ اسلام آباد شفٹ ہو جائیں، وہاں سب کے درمیان رہیں گی تو یہ سارے مسائل نہیں ہوں گے اور امی کو بھی آپ کی طرف سے بے فکری ہو جائے گی۔''

''وہاں شفٹ ہونے کی صورت میں یہ مسائل تو نہیں ہوں گے لیکن دوسری طرح کے مسائل کھڑے ہو جائیں گے اور وہ مسائل براہِ راست میرے بچوں پر اثر انداز ہوں گے اس لیے بہتر ہے کہ یہاں رہ کر میں خود تکلیف اٹھا لوں اور اپنے بچوں کو ڈسٹرب نہ ہونے دوں۔ وہ پہلے ہی دانش کے جانے سے بہت ڈسٹرب ہیں اور بڑی مشکل سے اب جا کر تھوڑا تھوڑا ایڈجسٹ ہونا شروع ہوئے ہیں۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح صاف انکار کیا۔

''ہو سکتا ہے آپ ٹھیک سوچ رہی ہوں لیکن......'' زوہیب نے اسے کوئی دلیل دینی چاہی لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں زوہیب۔ تم خود بھی حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں سال میں ایک بار دس دن کے لیے آتی ہوں تو بھی دونوں بھابیوں کے تیور بگڑنے لگتے ہیں۔ کبھی کوئی معمولی سا کھلونا ٹوٹ جانے پر یا کسی بچے کو دھکا بھی لگ جانے پر دونوں منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میرے مستقل وہاں رہنے کی صورت میں تو آفت ہی آجائے گی اور خوامخواہ امی بے چاری بھی ٹینشن میں رہیں گی۔ روحی کی شادی کے بعد اب کہیں جا کر تو گھر کے حالات تھوڑے بہتر ہوئے ہیں۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔ وہ دونوں پتا نہیں کیوں اتنی کم ظرف ہیں کہ اپنے علاوہ کسی کو گھر میں دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ روحی کی جب تک شادی نہیں ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رہتا تھا اور بے چاری روحی روتی رہتی تھی۔ میرے خیال میں تو غلطی دونوں بھائیوں کی بھی ہے کہ انہوں نے اپنی بیویوں کو ضرورت سے زیادہ سر چڑھا رکھا ہے اور انہیں کچھ کہتے ہی نہیں ہیں۔'' زوہیب کو تھوڑا سا

غصہ آنے لگا۔

''ہمارے معاشرے میں زیادہ تر خواتین بھابیوں کے مزاج ہی کی ہوتی ہیں۔ اصل میں گھر عورت کی راجدھانی ہوتا ہے جہاں وہ دوسرے کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتی۔ امی تو خاصی بے ضرر خاتون ہیں اس لیے ان سے بہوؤں کو اتنا مسئلہ نہیں ہے جبکہ روحی کے بارے میں تم جانتے ہو کہ وہ بھی تھوڑے..... تیز مزاج کی ہے اس لیے اس کی ان دونوں سے کسی نہ کسی بات پر کھٹ پٹ ہو جایا کرتی تھی۔ میرے ساتھ بچوں کا مسئلہ ہے۔ بچوں پر کتنی ہی نظر رکھی جائے یا انہیں روکا ٹوکا جائے وہ کچھ نہ کچھ کر ہی دیتے ہیں اس لیے میرا آنا انہیں کھٹکتا ہے اور یہ جو تم آج بڑھ بڑھ کر بھائیوں کے خلاف بول رہے ہو تو یہ اس لیے ہے کہ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ تمہاری شادی ہوگی تو تم بھی ان ہی کی طرح ہو جاؤ گے اور معاملات کو اپنی بیوی کی آنکھ سے دیکھنے لگو گے۔ ہمارے معاشرے میں صدیوں سے یہ سیٹ اَپ چل رہا ہے اور ابھی شاید مزید بہت عرصے تک چلتا ہے گا اس لیے اس پر بات کرنا بے کار ہے۔'' اس نے چھوٹے بھائی کی جذباتیت کو خاطر میں لائے بغیر اس کے سامنے حقائق بیان کیے تو وہ خاموش ہو گیا اور ذرا سے وقفے کے بعد بولا۔

''باقی باتیں چھوڑیں اور مجھے لسٹ دیں۔'' اس بار اس نے بھی انکار نہیں کیا اور پرس میں سے لسٹ نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ نیا مہینا شروع ہو چکا تھا اور کچن کا سامان تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن لسٹ تیار کر لینے کے باوجود وہ اس لیے خرید کر نہیں لائی تھی کہ شفٹنگ میں خواہ مخواہ سامان خراب ہوگا۔

''آپ کھانا تیار مت کیجیے گا، میں باہر ہی سے کچھ کھانے کے لیے لے کر آجاؤں گا۔'' باہر نکلتے نکلتے زوہیب نے اسے ہدایت کی تو اس نے سر ہلا دیا اور خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کھانا پکانے سے چھٹی مل گئی تھی لیکن کچن کی سیٹنگ ابھی باقی رہتی تھی۔ وہ جلدی جلدی کارٹن کھول کر کراکری اور دیگر سامان ترتیب سے رکھنے لگی۔ یہ کچن ان کے سابقہ کچن کے مقابلے میں خاصا چھوٹا تھا لیکن دیواروں میں نصب ڈھیر سارے کیبنٹس کی وجہ سے آسانی ہو گئی تھی اور سامان رکھنے کی خاصی گنجائش نکل آئی تھی۔ وہ خاصی دیر تک یہ کام نمٹاتی ہی پھر فارغ ہو کر اپنے اور بچوں کے مشترکہ بیڈروم میں پہنچ گئی۔ زویا اور طلحہ دیواروں پر اپنے من پسند اسٹیکر چسپاں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنے بیڈروم میں اس طرح کی چیزیں پسند نہیں کرتی تھی اور اسے سادہ دیواریں پسند تھیں لیکن اب چونکہ یہ اس کا اور بچوں کا مشترکہ بیڈروم تھا تو اس نے انہیں ان کا شوق پورا کرنے سے نہیں روکا تھا۔ وہ بے چارے پہلے ہی بہت کمپرومائز کر رہے تھے۔ خوب صورت اور کشادہ اپارٹمنٹ سے اس دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہونا بھی یقیناً ان کے لیے ایک دھچکا تھا لیکن انہوں نے ماں کی مجبوری کو سمجھ لیا تھا۔ حالات بچوں کو وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیتے ہیں ورنہ ابھی اس کے بچوں کی عمر ہی کیا تھی۔ طلحہ صرف سات سال کا تھا اور زویا دو مہینے بعد پانچ سال کی ہوتی۔ اتنے چھوٹے بچے عظیم ترین نقصان سے دوچار ہونے کے بعد اب زندگی میں دوسرے سمجھوتے کرنا بھی سیکھ رہے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے بیڈروم کے دروازے پر کھڑی بچوں کی مصروفیت کو دیکھ رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے متوجہ کر لیا۔

''ماموں آئے ہوں گے۔'' گھنٹی کی آواز بچوں نے بھی سن لی تھی اور طلحہ بولتے ہوئے دروازے کی طرف جانے لگا تھا کہ اس نے اشارے سے اسے روک دیا۔ نئی جگہ پر احتیاط بہتر تھی اور بچے کا یوں بے دھڑک دروازہ کھول دینا مناسب نہیں تھا۔ اس نے خود بھی دروازہ کھولنے سے قبل ڈور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر اسے ایک ادھیڑ عمر خاتون کھڑی نظر آئیں۔ ان خاتون کو شناخت کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی، وہ سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ پراپرٹی ایجنٹ کے ساتھ یہ فلیٹ دیکھنے آنے اور آج یہاں شفٹ ہونے پر اس کی ان خاتون سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مطمئن ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے پر اس کی نگاہ خاتون کے دائیں جانب موجود ٹرالی پر پڑی۔ چھوٹے سائز کی اس ٹرالی پر ڈھکن لگی ہوئی کچھ ڈشز رکھی ہوئی تھیں اس کے باوجود اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اپنا راستہ بنا لیا تھا۔

''میں اندر آجاؤں، اجازت ہے؟'' خاتون نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیوں نہیں، بالکل آجائیں۔'' اسے شرمندگی ہوئی کہ ٹرالی کا جائزہ لینے کے چکر میں فوری طور پر انہیں اندر آنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹی تو خاتون ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آگئیں اور نرم..... لہجے میں بولیں۔

''میں نے سوچا کہ گھر کی سیٹنگ میں تمہیں کھانا بنانے کا وقت نہیں ملے گا اس لیے خود کھانا تیار کر کے لے آئی ہوں۔''

''آپ نے کیوں زحمت کی آنٹی! میرا چھوٹا بھائی مارکیٹ گیا ہوا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ واپسی میں وہ کھانا لے کر آجائے گا۔'' وہ خاتون کے اخلاق سے متاثر ہونے کے باوجود تکلف کا مظاہرہ کرنے لگی۔

''زحمت کیسی بیٹا! پڑوسیوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔ کبھی مجھے ضرورت پڑی تو تم میری مدد کر دینا۔'' انہوں نے ایک بار پھر مسکرا کر اسے جواب دیا اور کمرے کے دروازے سے جھانکتے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہیں متوجہ پا کر بچوں نے سلام کیا تو وہ بچوں کو قریب بلا کر ان سے باتیں کرنے لگیں۔ ان کے نام اور اسکول سے متعلق چھوٹے چھوٹے چند بے ضرر سوالات کرنے کے بعد انہوں نے بچوں کو اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو اپنے کمرے میں جا سکتے ہیں۔ بچے محض تجسس میں یہاں تک چلے آئے تھے ورنہ ان کی مصروفیت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور کمرے کو سجانے کا کام جاری تھا اس لیے اجازت پاتے ہی واپس چلے گئے۔

''بہت پیارے بچے ہیں۔'' خاتون نے بچوں کی تعریف کی اور گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''میرے بھی دو بچے ہیں۔ بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور میں یہاں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرا بیٹا سرکاری ملازم ہے۔''

''میں خواتین کے ایک رسالے کی ایڈیٹر ہوں۔ میرے شوہر ایک رائٹر تھے۔ چھ ماہ قبل وہ ہم سے بچھڑ گئے اور اب میں ہی اپنے بچوں کے لیے ماں اور باپ دونوں ہوں۔'' اس نے سادگی سے انہیں اپنے بارے میں آگاہ کیا۔

''سن کر بہت افسوس ہوا۔ کیسے انتقال ہوا تھا تمہارے شوہر کا۔'' خاتون نے اس کے سراپا۔۔۔ پر ایک دکھی نظر ڈالی۔ جوانی میں بیوہ ہو جانے پر اسے اکثر ہی ایسی ترحم بھری نظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور اب وہ ان نظروں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

''راہزنی کی واردات تھی۔ شاید انہوں نے مزاحمت کی تھی۔ ہمیں تو دو دن بعد بس ان کی لاش ہی ملی۔'' اس کے لیے یہ سب دہرانا تکلیف دہ ہوتا تھا لیکن بے شمار بار اسے اس تکلیف سے گزرنا پڑتا تھا۔

''اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ حالات ہی ایسے ہیں کہ بندہ گھر سے باہر نکلے تو اس کی صحیح سلامت واپسی کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ دہشت گرد اور لٹیرے کسی آسیب کی طرح ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔'' خاتون نے سن کر افسوس کا اظہار کیا اور اس موضوع پر مزید گفتگو کرنے کے بجائے اندازہ قائم کرتے ہوئے بولیں۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں اپنے بھائی کے ساتھ رہو گی۔''

''جی نہیں۔ میرا بھائی اسلام آباد میں رہتا ہے اور یہاں صرف دو دن کے لیے آیا تھا تاکہ شفٹنگ میں میری مدد کر سکے۔ کل صبح کی فلائٹ سے وہ واپس اسلام آباد روانہ ہو جائے گا۔'' سائرہ نے انہیں بتایا اور خاتون کے مزید تفتیشی سوالات کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کے تنہا رہنے کا سن کر وہ اس کے میکے اور سسرال کے لوگوں کے متعلق مزید سوالات کریں گی کہ وہ لوگ کہاں ہیں اور وہ ان میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں رہتی لیکن اس کے اندازے کے برعکس خاتون نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور ملائمت سے بولیں۔

''بھائی کے جانے کے بعد خود کو تنہا مت سمجھنا۔ تمہارے دروازے کے بالکل سامنے میرا دروازہ ہے۔ آدھی رات کو بھی کوئی ضرورت محسوس ہو تو بلاتکلف آواز دے لینا۔ پڑوسیوں کے پڑوسیوں پر بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ میں تمہارے کسی کام آسکوں تو یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔''

''جی بہت شکریہ۔'' اسے خاتون کے الفاظ نے متاثر کیا ورنہ ایسے حالات میں جبکہ قریبی رشتے بھی ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں، کون کسی غیر کے کام آنے کو تیار ہوتا ہے۔

''شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں بھی تمہیں ہی پکاروں گی فی الحال تم مجھے اجازت دو۔ مجھے اندازہ ہے کہ ابھی تمہیں بہت سا کام سمیٹنا ہوگا اور میں جم کر یہاں بیٹھی رہی تو تمہارا وقت ضائع ہوگا۔''

''ارے نہیں آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پلیز آپ بیٹھیں ناں، میں نے تو ابھی آپ سے چائے، شربت کا بھی نہیں پوچھا۔'' خاتون اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں تو سائرہ نے بوکھلا کر انہیں روکنے کی کوشش کی۔

''فی الحال کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بعد میں کسی دن فرصت سے آؤں گی تو چائے، شربت وغیرہ پی لوں گی۔ ابھی تم بھی مصروف اور تھکی ہوئی ہو اور مجھے بھی گھر جانے کی جلدی ہے۔ میرے بیٹے نے کہا تھا کہ آج وہ میرے ساتھ رات کا کھانا کھائے گا۔ ایسے مواقع بہت مشکل سے آتے ہیں کہ ہم ماں بیٹا ایک ساتھ کھانا کھا

سکیں۔ اس لیے میں کبھی ایسے چانس کو مس نہیں کرتی۔'' انہوں نے نہایت خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیں۔

''دوبارہ ضرور آیئے گا آنٹی۔'' ان کے پیچھے دروازے تک جاتی سائرہ نے ان سے اصرار کیا۔

''بالکل آؤں گی۔ ہم پڑوسی ہیں اور پڑوسیوں کا تو ایک دوسرے کے گھر آنا جانا لگا ہی رہتا ہے اور ہاں...... مجھے آنٹی پکارا جانا زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ غیریت کا سا احساس ہوتا ہے اس لفظ سے۔ اس لیے تم مجھے خالہ جان کہہ کر پکارو تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔''

''جی مجھے بھی خوشی ہوگی۔'' اسے بھلا ان کی خواہش ماننے پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر موجود اپنے فلیٹ کے اندر چلی گئیں تو وہ بھی دروازہ بند کر کے اندر آگئی اور زوہیب کو فون کرنے لگی تاکہ اسے کھانا لانے سے منع کر سکے۔ پڑوسن خالہ جان نے اتنا پُرتکلف کھانا پہنچا دیا تھا کہ اب بازار سے کھانا لانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سائرہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ اس سے چھوٹے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ ایف ایس سی میں پوزیشن نہ بننے کے بعد اس نے دلبرداشتہ ہو کر سائنس کے مضامین چھوڑ دیے تھے اور اردو ادب میں ایم اے کر لیا تھا۔ وہ ادبی رجحان کی مالک تھی...... وہ یونیورسٹی کی ادبی سوسائٹی کے لیے بہت متحرک کردار ادا کرتی رہی اور ایم اے کے آخری سال میں یونیورسٹی میگزین کی ادارت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ یہ تجربہ آگے چل کر اس کے بہت کام آیا اور اس نے اسلام آباد میں ہی ایک چھوٹے اور غیر نامور رسالے کی مدیرہ کے طور پر ملازمت کر لی۔ اس ملازمت میں تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ اسے بھی زیادہ تنخواہ کا لالچ نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ کچھ بہت ہی شاندار کر دکھانے کے جذبے سے سرشار تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ اس چھوٹے سے پرچے کو کہیں سے کہیں لے جا سکتی ہے۔

اس دوران کراچی کے ایک رسالے کے لیے اپنے افسانے وغیرہ ارسال کرتی رہی جہاں وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے لکھ رہی تھی۔ اپنی تحاریر کے سلسلے میں اس کی اکثر پرچے کی مدیرہ سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ کوئی تحریر بہت شاندار ہونے کی صورت میں ادارے کی سرپرست خاتون بھی بطور خاص فون کر کے اسے تعریف اور حوصلہ افزائی سے نوازتی تھیں چنانچہ ایک گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا اور اس تعلق ہی کی وجہ تھی کہ جب پرچے کی مدیرہ اپنی علالت کے باعث ملازمت سے سبکدوشی پر مجبور ہوئیں تو اسے ان کی جگہ کام کرنے کی پیشکش کی گئی۔ سائرہ کے لیے یہ ایک بہت اچھی پیشکش تھی۔ مسئلہ صرف اسلام آباد سے کراچی جانے کا تھا۔ اسے سب سے زیادہ امی کی طرف سے مخالفت کا خدشہ تھا لیکن پھر اس کے ذہن میں کراچی میں مقیم اپنی اکلوتی خالہ کا خیال آ گیا۔ خالہ بے اولاد تھیں اور ان کے گھر میں اس کے لیے آرام سے جگہ بن سکتی تھی۔ اس نے خالہ سے بات کی اور خالہ نے خود امی کو قائل کر لیا کہ وہ سائرہ کو ان کے پاس کراچی بھجوا دیں۔ ابو تو پہلے ہی قائل تھے کہ اسے ایک اچھے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یوں وہ کراچی پہنچ گئی اور رسالے کو جوائن کر کے بڑی خوبی سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ادارت کے ساتھ اس نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔ دانش کاظم بھی اس رسالے کے لیے لکھتا تھا جس میں اس کی تحاریر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اپنے کام کے حوالے سے دانش کا ادارے کے دفتر میں آنا جانا لگا رہتا تھا اور سائرہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں عام طور پر ایک دوسرے کی تحریر پر ہی گفتگو کیا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ گفتگو میں دوسرے موضوعات بھی شامل ہونے لگے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر دانش نے اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اسے پرپوز کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ سائرہ نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے بھی بطور جیون ساتھی دانش اپنے لیے ایک اچھا انتخاب محسوس ہوا۔ اس نے اس رشتے کا اپنے گھر والوں سے ذکر کیا۔ اس کے گھر میں کسی کو اس کی پسند کی شادی کرنے پر اعتراض نہیں تھا لیکن امی کو دانش کی ذریعۂ آمدنی کی طرف سے کچھ تحفظات ضرور تھے۔ وہ ہر ماں کی طرح سے یہی سوچتی تھیں کہ داماد کوئی محفوظ ملازمت کرتا ہوتا کہ ان کی بیٹی ایک آرام دہ زندگی گزار سکے۔ انہیں دانش کی ''ہوائی روزی'' پر اعتراض تھا۔ سائرہ نے انہیں سمجھایا کہ دانش ایک پروفیشنل رائٹر ہے جو نہ صرف بہت مستقل مزاجی سے لکھتا ہے بلکہ اس کی بہت زیادہ ڈیمانڈ بھی ہے اسی لیے اسے اپنی تحریروں کے عوض بہت معقول معاوضہ ملتا ہے۔ اس موقع پر ابو نے بھی اس کا ساتھ دیا اور امی کو سمجھایا کہ اب رائٹرز کا...... وہ پرانے وقتوں والا حال

نہیں ہے کہ خالی خولی شہرت پر گزارا ہوتا رہے اور پیٹ خالی ہو۔ یوں معمولی سی مخالفت کے بعد اس کی اور دانش کی شادی ہوگئی اور انہوں نے ایک خوش گوار زندگی کا آغاز کر دیا۔ شادی کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ دانش کے گھر والے اس سے بہت مختلف اور قدرے دقیانوسی سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔ دانش خود بھی اس فرق سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے شادی کی ابتدا ہی سے سائرہ کو الگ اپارٹمنٹ میں رکھا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے لاتعلق ہوگیا تھا۔ وہ دونوں اکثر و بیشتر سب سے ملنے کے لیے جاتے رہتے تھے اور وہاں سے بھی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

پہلے ہی سال طلحہ کی پیدائش ہوئی تو اسے دفتر سے دو تین ماہ کی چھٹی لینی پڑی۔ طلحہ کے بعد زویا پیدا ہوئی تو وہ کچھ اور مصروف ہوگئی۔ دونوں بچوں کی پیدائش پر سائرہ کی امی اسلام آباد سے کراچی آئی تھیں جن کی وجہ سے کافی سہارا ہوگیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے دفتر جارہی تھی۔ بچوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دانش زیادہ تر گھر پر ہی رہ کر کام کرتا تھا۔ وہ بچوں کو اسکول سے گھر لے آتا تھا۔ کھانا سائرہ تیار کر کے دفتر جاتی تھی جسے صرف مائیکروویو میں گرم کرنے کی زحمت کرنی پڑتی تھی۔ صفائی اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے انہوں نے ماسی رکھ لی تھی اور زندگی سہل طریقے سے رواں دواں تھی۔

سائرہ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی یہ پرسکون زندگی بالکل اچانک ہی تلپٹ ہوجائے گی۔ اس روز دانش اور وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر ایک ساتھ رسالے کے دفتر گئے تھے۔ وہاں دانش کو کچھ امور پر تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ تین بجے کے قریب وہ دفتر سے روانہ ہوگیا تاکہ چار بجے بچوں کو اسکول سے پک کرسکے۔ ان کے بچے ایک ایسے اسکول میں پڑھتے تھے جہاں بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کروایا جاتا تھا اسی لیے ان کے اسکول کے اوقات دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ تھے۔

وہ دفتر میں کام میں مصروف تھی کہ چار بج کر چالیس منٹ پر اسے بچوں کے اسکول سے ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ کال کرنے والے انتظامیہ کے فرد نے اسے بتایا کہ حسبِ معمول بچوں کے والد انہیں اسکول سے پک کرنے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی ان سے فون پر رابطہ ہو رہا ہے اسی لیے اسے زحمت دی جارہی ہے کہ وہ آکر بچوں کو اسکول سے لے لے۔ سائرہ کے لیے یہ ایک انتہائی حیرت انگیز اور تشویشناک اطلاع تھی۔ دانش بچوں کے سلسلے میں ایسی غیر ذمّے داری کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ٹریفک جام میں پھنسنے کی صورت میں بھی اسے کم از کم اسکول انتظامیہ سے رابطہ کر کے انہیں آگاہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے فوری طور پر دانش کا نمبر ملا کر چیک کیا تو اسے بھی نمبر بند ہی ملا۔ اب بس اسی قیاس آرائی کے تحت اپنی تشویش کو کم کیا جاسکتا تھا کہ دانش کہیں ٹریفک جام میں پھنس گیا ہے اور اس کا سیل فون بیٹری ڈاؤن ہوجانے کے باعث پاورڈ آف ہے۔ اس وقت زیادہ اہم مسئلہ بچوں کو اسکول سے پک کرنا تھا۔ وہ دفتر میں صورتِ حال بتا کر فوری طور پر ٹیکسی میں روانہ ہوئی اور بچوں کو اسکول سے پک کر کے گھر پہنچی۔ اتنی دیر ہوجانے کے باعث بچے تھکن اور بیزاری کا شکار تھے اور اس سے پوچھ رہے تھے کہ بابا انہیں اسکول سے لینے کیوں نہیں آئے۔ سائرہ کو خود معلوم نہیں تھا تو ان کو کیا بتاتی۔ کسی نہ کسی طرح انہیں بہلا کر اور تھوڑا بہت کھلا پلا کر آرام کرنے کے لیے لٹا دیا اور خود فون پر مصروف ہوگئی۔ دانش کا ہر وہ عزیز، رشتے دار یا دوست جس کا نمبر اس کے پاس موجود تھا اس سے رابطہ کر کے اس نے دانش کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی اور گاہے گاہے دانش کا نمبر ملا کر بھی چیک کرتی رہی لیکن ہر طرف تاریکی تھی اور یہ تاریکی اس کی پوری زندگی پر محیط ہوگئی۔ دانش کی تلاش میں وہی سب کچھ کیا گیا جو ایک گم شدہ شخص کو تلاش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

آخرکار یہ تلاش دانش کی تشدد شدہ لاش کورنگی انڈسٹریل ایریا سے دریافت ہونے پر منتج ہوئی۔ اس کے جسم پر متعدد زخم تھے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں پیٹ پر چاقو سے لگائے گئے زخم کو مہلک اور جان لیوا قرار دیا گیا۔ لاش دریافت ہونے کے بعد دو اہم نکات اٹھائے گئے تھے۔ نمبر ایک دانش کورنگی انڈسٹریل ایریا کیا کرنے گیا تھا؟ نمبر دو یہ کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق دانش کی موت رات نو بجے سے بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جبکہ وہ دوپہر تین بجے دفتر سے روانہ ہونے کے بعد سے لاپتا تھا۔ دانش کی انڈسٹریل ایریا میں موجودگی کا تو یہ جواز ڈھونڈ لیا گیا کہ ان کے گھر کی طرف جانے کے لیے ایک راستہ وہاں سے بھی ہوکر گزرتا ہے جسے شارٹ کٹ بھی کہا جاسکتا ہے لیکن ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور ویرانی کے باعث وہ لوگ عموماً اس راستے کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ وقت بچانے کے لیے دانش نے وہ راستہ اختیار کیا ہوگا۔ موت کے وقت کے بارے میں بھی یہ اندازہ لگا لیا گیا کہ لٹیرے دانش کو زخمی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں گے اور فوری طور پر اس کی موت واقع نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی لاش جس جگہ ملی تھی وہ ایک ایسی فیکٹری کا ڈھانچا تھا جس کا مالک دورانِ تعمیر مر گیا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا بیرونِ ملک زیرِ تعلیم تھا۔ بیٹا اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا لہٰذا مرنے والے کی بیوہ نے کاروبار سنبھال لیا تھا۔ وہ اپنے بااعتماد اسٹاف کی مدد سے کام تو کر رہی تھی لیکن کسی نئے بکھیڑے کو سنبھالنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اس لیے اس نے نئی فیکٹری کی تعمیر کا سلسلہ رکوا دیا تھا اور اس کام کو بیٹے کی واپسی تک مؤخر کر دیا تھا۔

دانش کے کیس پر کام کرنے والا پولیس افسر اسے راہزنی کی واردات قرار دینے پر مصر تھا اور اس کے لیے دلیل یہ تھی کہ دانش کی موٹر سائیکل، والٹ اور موبائل تینوں چیزیں غائب ہیں۔ دانش نے یقیناً ان تینوں چیزوں کو دینے میں مزاحمت کی ہوگی اس لیے لیٹروں نے طیش میں آکر اسے تشدد کا نشانہ بنایا۔ سائرہ پولیس افسر کے اس نظریے سے پوری طرح مطمئن نہیں تھی لیکن خود اس کے پاس بھی کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ کہہ سکتی کہ دانش کو باقاعدہ اغوا کر کے، تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد ہلاک کیا گیا ہے۔ وہ تو تفتیشی افسر کے اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکی تھی کہ دانش کی کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی؟ اس کے خیال کے مطابق ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ دانش دوستانہ مزاج رکھنے والا آدمی تھا اور کسی سے بھی اس کے چھوٹے موٹے اختلافات سے زیادہ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مرنے سے پندرہ بیس دن پہلے اس کی اپنے بڑے بھائی سے کچھ تلخی ضرور ہوئی تھی۔ وہ اس سے دو لاکھ روپے قرض مانگ رہے تھے اور دانش نے انہیں یہ رقم دینے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ دانش اچھا کماتا تھا لیکن کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کی عادت کی وجہ سے وہ رقم جوڑ نہیں پاتا تھا پھر ان کے اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی اچھا خاصا تھا۔ وہ جو تھوڑی بہت بچت کر پاتے تھے وہ سائرہ ہی کرتی تھی اور اس نے دانش سے صاف کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنی اس بچت میں سے کسی کو کچھ نہیں دے گی اس لیے دانش کسی موقع پر اس سے اس رقم کا مطالبہ نہ کرے۔ دانش کو مجبوری میں اپنے بڑے بھائی کو انکار کرنا پڑا تھا لیکن وہ اس کے عذر کو تسلیم کیے بغیر ناراضی کا اظہار کرتے رہے تھے حالانکہ اس سے قبل بھی وہ کئی بار دس، بیس یا پچیس ہزار کی رقم قرض کے نام پر دانش سے لے چکے تھے اور انہوں نے کبھی وہ رقوم واپس نہیں کی تھیں۔ بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ دانش کی والدہ نے بھی اسے کافی باتیں سنائی تھیں کہ اس نے بڑے بھائی کی ڈوبتی ہوئی دکان کو سہارا دینے کے لیے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ ان باتوں سے دانش ڈسٹرب ہوا تھا اور اس نے سائرہ کے سامنے خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ عنقریب شائع ہونے والی اپنی کتاب کی رائلٹی بڑے بھائی کو دے دے گا۔ سائرہ نے اس کے اس خیال کی مخالفت کی تھی اور اسے سمجھایا تھا کہ وہ بہت بار اپنے بھائی کی مدد کر چکا ہے اور یہ مدد اصل میں ان کو نکما بناتی جا رہی ہے۔ ان کی اچھی چلتی ہوئی جگہ پر موجود دکان کے ڈوبنے کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ محنت سے کام نہیں لیتے تھے اور دکان کو صحیح طرح وقت دینے کے بجائے زیادہ تر گھر میں آرام کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ اس نے دانش کو سمجھایا تھا کہ اس کے گھر والوں کے علاوہ اس کی کمائی پر اس کے بیوی اور بچوں کا بھی حق ہے اور انہیں لازماً کچھ رقم بچوں کے مستقبل کے لیے پس انداز کرنی چاہیے کیونکہ وہ ہمیشہ اس طرح کام نہیں کر سکے گا اور آگے چل کر بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انہیں رقم کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت دانش معلوم نہیں قائل ہوا تھا یا نہیں لیکن اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پھر چند دن بعد وہ دنیا میں ہی نہیں رہا۔ سائرہ نے اپنے جیٹھ سے دانش کی تلخی کا ذکر پولیس افسر سے کرنا غیر ضروری خیال کیا۔ وہ کبھی بھی شک نہیں کر سکتی تھی کہ رقم دینے پر انکار کی صورت میں بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کو اس طرح سے منصوبہ بندی کر کے قتل کر سکتا ہے بس پھر جب کسی پر شک وشبہ ہی نہیں تھا تو پولیس کی اس تھیوری کو ہی قبول کرنا تھا کہ راہزنی کی واردات میں مزاحمت کے نتیجے میں دانش اپنی جان سے چلا گیا۔ سائرہ نے بھی بادلِ ناخواستہ اس بات کو قبول کر لیا اور زندگی کے دیگر مسائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے اپنی ملازمت برقرار رکھی اور اس کے لیے وہ گھر پر رہ کر عدت پوری کرنے سے معذور تھی۔ اس کی اس مجبوری پر اس کی ساس نے خاصا واویلا کیا اور آنے جانے والوں کے سامنے اس کی برائیاں کرتی رہیں جن پر دکھ محسوس کرنے کے باوجود اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

اس کی امی اور بھائیوں نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ ان کے پاس اسلام آباد آجائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کی شادی کے بعد گزرنے والے آٹھ سالوں میں میکے میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی ہوگئی تھی اور چھوٹے بھائی کی بھی بات طے تھی۔ اگلے سال اس کی شادی ہونے کا

امکان تھا۔ اس کی امی اب گھر کی اسی طرح حکمران رہ گئی تھیں جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے غلبے کے دور میں بہادر شاہ ظفر نام نہاد حکمران تھا۔ ایسے میں میکے جا کر رہنا اس کے حساب سے حماقت تھی اور اس کا کراچی میں رہنا ہی ٹھیک تھا کہ یہاں اس کے پاس کم از کم اچھے ماحول میں ایک مناسب نوکری تو موجود تھی۔ دفتر والوں نے اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے اس پر ایک مہربانی یہ کی تھی کہ اسے تین سوا تین بجے دفتر سے اٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ رہ جانے والا کام وہ گھر پر لا کر مکمل کر لیتی تھی۔ اوقات کار میں یہ تبدیلی اس نے بچوں کی وجہ سے کی تھی۔ صبح وہ انہیں اسکول چھوڑ کر دفتر چلی جاتی تھی اور دفتر سے واپسی میں انہیں اسکول سے لے لیتی تھی۔ پہلے اسے وقت کی بچت کا اتنا خیال نہیں ہوتا تھا اس لیے پبلک ٹرانسپورٹ سے دفتر آنا جانا کر لیتی تھی اب اپنی ضرورت کے تحت اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ مہران خرید لی تھی جس پر مزید واویلا مچا تھا اور اس کے جیٹھ کو طعنہ دینے کا موقع مل گیا تھا کہ ان کے قرض مانگنے پر تو دانش کی جیب سے پھوٹی کوڑی نہیں نکلی تھی اور اب اس کی بیوہ اس کی رقم پر عیش کر رہی تھی۔ سائرہ نے انہیں وضاحت بھی دی تھی کہ اس نے گاڑی اپنی ذاتی بچت سے خریدی ہے لیکن وہاں کوئی قائل ہونے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ یہ کوشش کر کے اپنی مصروفیات میں گم ہو گئی۔ دانش کے نہ ہونے سے وہ جس جذباتی بحران سے گزر رہی تھی اس کا تو خود اس کے سوا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنے دل کی خستہ حالی کے باوجود اس نے اگر خود کو سنبھال لیا تھا تو اس کی وجہ اس کے بچے تھے۔ وہ ان کے ذہن کو الجھنوں اور دکھوں سے دور رکھنا چاہتی تھی اور اپنے طور پر کوشش کر رہی تھی کہ انہیں کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ ملازمت کے ساتھ اس نے افسانہ نگاری کو بھی زیادہ وقت دینا شروع کر دیا تھا تاکہ معاشی مسائل سے نمٹنے میں آسانی رہے لیکن بہرحال یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے اخراجات میں کمی کے لیے سب سے پہلے اس لگژری اپارٹمنٹ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلے پر درآمد میں کچھ وقت صرف اس لیے لگا کہ بچوں کا تعلیمی سیشن مکمل ہو جائے۔ موجودہ فلیٹ اس نے اپنے دفتر کے قریبی علاقے میں ایسی جگہ لیا تھا جہاں اس کے بچوں کے اسکول کی ایک برانچ موجود تھی اور اس نے آسانی سے انہیں وہاں ٹرانسفر کروا لیا تھا۔ اس فلیٹ میں منتقلی سے قبل اس کے اپنے سسرال والوں سے تعلقات میں مزید خرابی آ گئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ وہ پبلشر جو دانش کی نئی کتاب چھاپ رہا تھا وہ اس کے انتقال پر تعزیت کے لیے سائرہ سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس وقت اس نے سائرہ کو رائلٹی کا چیک بھی دیا تھا۔ اس روز اس کے جیٹھ بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ دانش کی رقم ہے اس لیے اس پر اس کے گھر والوں کا بھی حق ہے جبکہ سائرہ کا موقف تھا کہ اس رقم پر کسی بھی شخص سے زیادہ دانش کے بچوں کا حق ہے اور وہ اس رقم کو بچوں کے نام سے بینک میں محفوظ کر دے گی۔ اس معاملے میں بہت بحث مباحثہ ہوا لیکن کوئی سائرہ کے ساتھ زبردستی اس لیے نہیں کر سکا کہ چیک اس کے نام سے بنا ہوا تھا اور اس کے سوا کوئی اسے کیش نہیں کروا سکتا تھا۔ اس کے کھسیائے ہوئے سسرالیوں نے ردعمل میں اس سے اپنے تعلقات ختم کر لیے جس پر اسے زیادہ دکھ اس لیے نہیں تھا کہ خود غرض اور مطلب پرست لوگوں سے ملتے جلتے رہنے میں کوئی بھلائی نہیں تھی اور الٹا ذہن ہی ڈسٹرب ہوتا تھا۔ اب وہ یہاں اس چھوٹے سے فلیٹ میں تھی اور پُرامید تھی کہ زندگی سکون سے گزر جائے گی۔

☆☆☆

سائرہ اور بچوں کا آہستہ آہستہ نئے فلیٹ میں دل لگ گیا تھا اور اس میں کچھ کردار ان کی پڑوسن خالہ جان کا بھی تھا۔ وہ سائرہ اور بچوں کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی چیز بھجواتی رہتی تھیں۔ جواب میں سائرہ نے بھی ایک دو بار وقت نکال کر پُرتکلف کھانا بنا کر انہیں بھجوایا تھا لیکن انہوں نے خود ہی اسے ٹوک دیا تھا کہ وہ یہ زحمت نہیں کیا کرے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس کی روٹین بہت ٹف ہے اور وہ اس طرح کے کاموں میں زیادہ وقت صرف کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ تھی بھی حقیقت۔ خالہ جان جن کا نام طاہرہ خاتون تھا، کی روشن خیالی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ خود اچھی خاصی سگھڑ خاتون تھیں لیکن اس حقیقت کو سمجھتی تھیں کہ ایک ورکنگ ویمن کا طرز زندگی کسی گھریلو عورت سے مختلف ہوتا ہے۔ طاہرہ خاتون کی وجہ سے اسے ایک آسانی اور ہو گئی تھی۔ اپنی تنہائی اور فراغت کا بہانہ بنا کر انہوں نے شام کے وقت بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا اور انہیں ہوم ورک کروانے کے ساتھ ساتھ ان کا قرآنی سبق بھی سن لیتی تھیں۔ وہ سائرہ سے بچوں کی تعریف کرتی تھیں کہ اس کے بچے بہت ذہن اور فرمانبردار ہیں اور بہت تیزی سے حفظ کر رہے ہیں۔ ان کی ہدایت پر بچے انہیں نانو کہنے لگے تھے اور وہ واقعی ایسے سائرہ کا ان

حالات میں ساتھ دے رہی تھیں جیسے وہ اس کی ماں ہوں۔ سائرہ کی اپنی امی تو جوڑوں کے درد کی وجہ سے بیٹی کے پاس آکر رہنے اور اس کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اپنے گھر میں ان کے پاس ایک آرام دہ کمرا تھا اور دوسرے نمبر کے بیٹے کے پینل پر اچھے معالجین کی سہولت بھی میسر تھی۔ کچھ وہ اپنے پوتے پوتیوں سے دور ہونے سے بھی گھبراتی تھیں۔ بہرحال سائرہ اب اپنی زندگی میں ایڈجسٹ ہو چکی تھی اور دانش کی کمی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس روز وہ دفتر سے واپس آئی تو اس کے پاس پبلشر کا فون آگیا اور اس نے سائرہ کو بتایا کہ دانش کی کتاب کی طباعت کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے لیکن اس کے پاس دیباچہ اور انتساب موجود نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ مرنے سے پہلے دانش نے یہ دونوں کام مکمل کر لینے کی اطلاع دی تھی لیکن وہ اسے یہ چیزیں بھجوا نہیں پایا تھا اس لیے سائرہ تھوڑی سی زحمت کرے اور دانش کے سامان میں سے یہ چیزیں ڈھونڈ کر اسے بھجوا دے۔ سائرہ نے وعدہ کرلیا کہ وہ یہ چیزیں فراہم کردے گی۔ وہ بچوں کے سو جانے کے بعد رات کو دیر تک لکھنے لکھانے کے کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا لیکن نیند محسوس کرنے کے باوجود وہ بستر پر جانے کے بجائے دانش کے سامان میں مطلوبہ چیزیں تلاش کرنے لگی۔ دانش کے لکھنے کا کام بہت پھیلا ہوا تھا اور وہ بیک وقت کئی کہانیوں پر کام کرتا تھا اس لیے اس کی چیزوں میں سے کچھ تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ خود بھی لکھنے لکھانے کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سائرہ ان چیزوں کی قدر و قیمت سمجھتی تھی اور گھر کی کئی اشیا فروخت کردینے کے باوجود وہ دانش کا پورا سامان جوں کا توں لے آئی تھی اور اس دو کمروں کے فلیٹ میں بھی ایک کمرا اسٹڈی روم کے طور پر مختص تھا۔ جہاں تین دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں اور ایک دیوار کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ سائرہ بچوں کے ساتھ ہی سوتی تھی اور لاؤنج میں صوفے وغیرہ ڈال کر اس نے مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کر لیا تھا یہ اور بات کہ مہمان کے نام پر ان کے گھر صرف طاہرہ خاتون ہی آیا کرتی تھیں۔

تلاش کا کام اس نے ان فائلوں سے شروع کیا جن میں دانش اپنے مکمل اور نامکمل مسودے رکھا کرتا تھا۔ اس کام میں اسے بہت زیادہ دیر نہیں لگی اور تیسری فائل میں ہی اسے مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔ اس نے انتساب پڑھا۔ دانش کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ''اپنی شریکِ حیات کے نام جس کی پُرسکون رفاقت تخلیقی عمل میں میری سب سے بڑی معاون ہے۔'' ان الفاظ کو پڑھ کر سائرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ خود لکھنے کے شعبے سے وابستہ تھی اور اسے اندازہ تھا کہ کسی مصنف کے لیے اس کی تحریر کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور دانش نے جن الفاظ میں اپنی آخری کتاب کو اس سے منسوب کیا تھا وہ اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔ لیکن اس اعزاز نے اس کو آنسوؤں کی برسات میں بھگو دیا۔ وہ جو زندگی کی جدوجہد میں خود کو کسی مشین کی طرح ڈھال چکی تھی پھر سے پگھل کر گوشت پوست کی عورت میں تبدیل ہونے لگی اور تنہائی کی ماری اس عورت کے دل نے خواہش کی کہ وہ کچھ وقت یونہی دانش کی یادوں میں کھو کر گزار دے۔ دانش وہ شخص تھا جو پور پور اپنی تحریروں میں جھلکتا تھا سو وہ فائل میں موجود نامکمل مسودے کو پڑھنے لگی۔ ابتدائی چند صفحات پڑھنے کے بعد ہی وہ بری طرح چونک گئی۔ جو کچھ لکھا تھا وہ محض تخیلاتی کہانی نہیں تھی۔ اس کہانی کے چند کردار اور واقعات سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ کہانی دو ایسے کرداروں کے گرد گھوم رہی تھی جن میں سے ایک قلم کار اور دوسرا اس کا اتفاقی دوست تھا۔ سائرہ سمجھ سکتی تھی کہ قلم کار کے روپ میں دانش نے خود اپنا کردار بیان کیا ہے جبکہ دوسرا کردار دانش کا نیا بننے والا وہ دوست تھا جس کا نام دانش نے اسے توقیر بتایا تھا۔ توقیر اسے مسجد میں ملا تھا اور دانش کے مطابق وہ بہت دین دار اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود وہ دونوں اچھے دوست بن گئے تھے۔ توقیر دانش کے لکھنے کی صلاحیت سے متاثر تھا اور دانش اتنی کم عمری میں توقیر کے کردار کی خوب صورتی اور اس کی دین داری سے متاثر ہوا تھا۔ دانش خود بھی مذہبی رجحان رکھتا تھا لیکن سائرہ نے محسوس کیا تھا کہ توقیر سے دوستی کے بعد اس رجحان میں نمایاں اضافہ ہوا تھا اور اس کی تحریروں میں بھی یہ رنگ جھلکنے لگا تھا بلکہ بعض اوقات تو سائرہ کو ایسا لگا تھا کہ اس نے غیر ضروری طور پر اپنی تحریروں میں ایسی چیزیں شامل کی ہیں جو کہانی کی ڈیمانڈ ہی نہیں تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں دانش کو ٹوکا تو وہ ہنس دیا اور اسے بتایا کہ توقیر نے اسے یہ بات سمجھائی ہے کہ اس کے پاس قلم کی طاقت ہے اور بے شمار لوگ اس کی تحریر کے مداح ہیں تو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو دین کی تبلیغ کے لیے استعمال کرے۔ بات ایسی تھی کہ سائرہ اعتراض نہیں کرسکی البتہ اس نے دوتین بار دانش سے یہ فرمائش ضرور

کی کہ وہ توقیر کو کھانے پر گھر لے کر آئے لیکن پھر دانش نے اسے بتایا کہ توقیر نے گھر آنے اور سائرہ سے ملاقات کرنے پر معذرت کر لی ہے کیونکہ وہ کسی نامحرم عورت سے بلا ضرورت ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس جواب کے بعد سائرہ نے اصرار کرنا چھوڑ دیا لیکن ایک بار وہ اتفاقی طور پر توقیر کو دیکھنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس روز وہ بچوں کے ساتھ ایک کولیگ کی بیٹی کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کے لیے اس کے گھر گئی ہوئی تھی۔ دانش نے اپنے کسی پروگرام کی وجہ سے اس کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔

سالگرہ کا کیک کٹنے کے بعد وہ ایک پلیٹ میں کچھ چیزیں لے کر ٹیرس پر لگی ریلنگ کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھی اور ایک مہمان خاتون کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اردگرد کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ اس کی کولیگ کا گھر کافی کھلی جگہ پر تھا اور سامنے کے رخ مکانات کے بجائے چند دکانیں، فاسٹ فوڈ سینٹر اور ٹیوشن اکیڈمی کے علاوہ ایک عدد مسجد بنی ہوئی تھی۔ مسجد سے باہر آتے افراد کو بے خیالی میں دیکھتے ہوئے اس کی نظر دانش پر پڑی تو چونک گئی۔ اس کے ساتھ بیس بائیس سال کا ایک لڑکا بھی موجود تھا۔ لڑکا خوش شکل اور باریش تھا۔ سائرہ کو اندازہ ہوگیا کہ یہی لڑکا توقیر ہے۔ بعد میں اس نے دانش سے پوچھا تو اس نے بھی تصدیق کر دی۔

یہاں تک کہانی میں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن آگے چل کر دانش نے فرضی ناموں کے ساتھ کہانی کے جو واقعات بیان کیے تھے وہ خوفناک تھے۔ کہانی کے ان واقعات سے سائرہ کو اندازہ ہوا کہ مرنے سے کچھ عرصہ قبل دانش پر توقیر کی حقیقت کھلنا شروع ہوگئی تھی۔ ایک بار دانش نے اسے ایک ایسے شخص کے ساتھ دیکھا تھا جس کی شہرت اچھی نہیں تھی اور کہا جاتا تھا کہ وہ شخص منشیات اور اسلحے کی سپلائی کا کام کرتا ہے۔ دانش نے اس سلسلے میں توقیر سے استفسار کیا تو اس نے بہانہ بنا دیا کہ وہ اس شخص کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوشاں ہے۔ دانش نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور اس کے لیے اپنے دل میں کوئی شک محسوس نہیں کیا لیکن دوسرا واقعہ چشم کشا تھا۔ دانش اپنا ایک چیک جمع کروانے بینک گیا ہوا تھا۔ اچانک وہاں چار ڈاکو گھس آئے اور وہی سب کرنے لگے جو ڈاکو کرتے ہیں۔ وہ ڈاکو نقاب میں تھے اس کے باوجود لوگوں کو دھمکیاں دیتے ایک ڈاکو کی آنکھوں اور آواز نے دانش کو چونکا دیا۔ اس نے تصدیق کے لیے ڈاکو کے دائیں ہاتھ کو دیکھا تو اسے جلنے کا وہ نشان نظر آگیا جو توقیر کے ہاتھ پر موجود تھا۔ توقیر نے بھی دانش کو دیکھ لیا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے اس لیے بینک سے نکلنے سے قبل لمحہ بھر کے لیے اس کے پاس رکا اور سرگوشی میں پھنکارتی آواز میں صرف اتنا بولا۔ ''اپنا منہ بند رکھنا۔'' اس واقعے کے بعد دانش کو امید نہیں تھی کہ توقیر اس سے ملاقات کرے گا لیکن اس نے ملاقات کی اور دانش کے استفسار کے بغیر ہی اسے بتانے لگا کہ ان کی تنظیم ایک بڑے مقصد کے لیے فنڈ ریزنگ کر رہی ہے اور زیادہ رقم کے حصول کے لیے مجبوراً انہیں ڈکیتی کی یہ واردات کرنی پڑی ہے۔ اس کی دلیل تھی کہ ملک اللہ کا ہے اور اللہ کے کام کے لیے کہیں سے بھی رقم حاصل کی جا سکتی ہے۔ دانش ظاہر ہے اس دلیل سے قائل نہیں ہوا لیکن وہ توقیر کے خلاف منہ کھولنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ توقیر کا تعلق کچھ بہت ہی خطرناک لوگوں سے ہے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینے میں ہی بہتری ہے لیکن توقیر نے اسے یہ بھی نہیں کرنے دیا اور دھمکیوں کی شکل میں دانش سے فرمائش کرنے لگا کہ وہ ان کے مطلوبہ مقاصد کو مہمیز دینے والی تحریریں لکھا کرے۔

اصل میں وہ کوئی بہت مضبوط نیٹ ورک تھا جو اپنے مطلوبہ اہداف کے حصول کے لیے ہر زاویے سے کام کر رہا تھا اور ان کا ایک طریقۂ کار یہ بھی تھا کہ تحریر کے ذریعے اس طرح لوگوں کی ذہن سازی کی جائے کہ جب انہیں مذہب کے نام پر منفی سرگرمیوں میں ملوث کرنے کی کوشش کی جائے تو کسی طرح کی دشواری پیش نہ آئے۔ دانش اتنا باہمت نہیں تھا کہ ان لوگوں کے خلاف کھڑا ہو سکے لیکن وہ ان کے مفادات کے لیے بھی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکا اور اس نے توقیر سے درخواست کی کہ وہ اس سے دوستی ترک کر کے اسے اس کی دنیا میں جینے دے۔ فرضی ناموں کے ساتھ دانش نے اپنی زندگی کی جو کہانی لکھی تھی وہ بس یہیں تک تھی اور دانش نے نہیں لکھا تھا کہ توقیر نے اس کی بات مان لی تھی یا نہیں مانی تھی۔ البتہ وہ خود دانش کے انجام سے توقیر کے ردِعمل کا اندازہ کر سکتی تھی۔ دانش کی موت پر پہلے ہی شک و شبے میں مبتلا اس کا ذہن اس تحریر کو پڑھنے کے بعد سارے حساب کتاب جوڑنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ آخری دنوں میں دانش نے توقیر کا ذکر کرنا ترک کر دیا تھا لیکن وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دے پائی تھی۔ دوسرے ان دنوں دانش بھی بہت زیادہ مصروف رہنے لگا تھا اور اس کے لکھنے کے اوقات میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید وہ اپنی دیگر تحریروں کے ساتھ ساتھ اپنی

زندگی کی یہ کہانی بھی لکھ رہا تھا جسے شائع کروانے کی شاید اسے ہمت بھی نہ ہو پاتی لیکن بطور قلم کار وہ اپنی زندگی کے اتنے اہم واقعات کو کاغذ پر اتارنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا تھا جو آج سائرہ کے لیے اس کی موت پر سے پردہ ہٹانے کا سبب بن گئے تھے اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ دانش راہزنی کی واردات کا نہیں بلکہ دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنا تھا لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان انکشافات کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس والوں کی کام چوری وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس فرضی ناموں سے لکھی گئی کہانی کو پڑھ کر وہ کبھی نہیں مانتے کہ یہ دانش کی اپنی زندگی کے واقعات ہیں۔ بالفرض یہ کیس کھل بھی جاتا تو اس کی اور بچوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی تھیں۔ دانش نے بھی شاید اسی لیے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ توقیر نے ہی اسے اس سلسلے میں ہدایت دی ہو۔ بات جو بھی تھی خود اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا وہ دانش کے قاتلوں کو یونہی آزاد چھوڑ دے گی کہ وہ ہر طرف موت بانٹتے پھریں۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ توقیر صرف ایک فرد نہیں تھا بلکہ وہ دہشت گردوں کا پورا گروہ تھا جس نے دانش کو اس کے انکار کی عبرت ناک سزا دی تھی۔

سوچتے سوچتے اس کے اعصاب شل ہونے لگے اور اس نے اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ تین بجے سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا اور ان کی بلڈنگ کے سامنے والی سڑک بالکل ویران پڑی تھی البتہ اسٹریٹ لائٹ کی وجہ سے ماحول روشن تھا اور اس روشن ماحول میں وہ بلڈنگ کے بالکل سامنے آ کر رکنے والی سیاہ کار کو نہ دیکھ پاتی یہ کیسے ممکن تھا۔ کار رکی، اس کا دروازہ کھلا اور اس نے کہیں آڑ میں کھڑے شخص کو کار میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ روشنی اتنی تھی کہ اس نے اس شخص کو اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ طاہرہ خاتون کا بیٹا ولی تھا۔ پینتیس سال سے کچھ متجاوز ولی اپنے سنہری بالوں اور ورزشی جسم کی وجہ سے خاصا ہینڈسم لگتا تھا اور یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ عورتیں اسے پسند کرتی ہوں گی۔ سائرہ کی اس سے ایک آدھ بار رسمی سی ہی گفتگو ہوئی تھی اور اس کے ذہن میں ولی کے لیے کوئی منفی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ ولی کی شادی نہ ہونے پر ایک بار اس نے طاہرہ خاتون سے باتوں باتوں میں استفسار کیا تھا تو انہوں نے اسے بتایا تھا کہ چند سال قبل ان کی خواہش پر ولی نے شادی کی تھی لیکن یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چل سکی کیونکہ ولی کی بیوی اس کے معمولات پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سائرہ نے اس بات کی وضاحت کے لیے طاہرہ خاتون کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن رات کے اس پہر ولی کو پُراسرار طور پر ایک گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر وہ چونک گئی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ولی نے اپنے سیاہ چست لباس پر بغلی ہولسٹر پہن رکھا ہے اور اس ہولسٹر میں ایک پسٹل لٹک رہا ہے۔ یہ سب کیا تھا؟ اس کا پہلے ہی سے چکراتا ذہن کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ کیا ولی کے یہی معمولات تھے جن سے اس کی بیوی سمجھوتا نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

''اچھا ہوا تم لوگوں سے یہیں ملاقات ہو گئی۔ میں ذرا ایک کام سے جا رہی ہوں، واپس آؤں گی تو خود بچوں کو پڑھانے تمہارے فلیٹ پر آ جاؤں گی۔ ولی بہت تھکا ہوا آ کر سویا ہے اس لیے تم بچوں کو مت بھیجنا۔'' وہ بچوں کو اسکول سے لے کر آ رہی تھی تو سیڑھیوں پر ہی اس کی طاہرہ خاتون سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے الفاظ پر اسے فوراً ہی یاد آیا کہ اس نے رات گئے ولی کو اسلحے سمیت ایک پُراسرار گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیا کارنامہ انجام دے کر آیا تھا کہ اب شام چار بجے بھی تھکا ہارا سو رہا تھا۔

''آپ زحمت نہ کریں خالہ جان میں خود بچوں کو پڑھا لوں گی۔'' اس نے روکھے لہجے میں طاہرہ خاتون سے کہا اور بچوں کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے لہجے اور انداز پر طاہرہ خاتون حیران کھڑی رہ گئی ہیں لیکن خود اس کا ذہن اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ وہ کسی دوسرے کے ردِعمل پر توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ پہلے دانش کے قتل کے بارے میں انکشاف، پھر رات گئے ولی کی پُراسرار اور مشکوک روانگی کا منظر اور آج دفتر میں اتفاقاً چھڑ جانے والی گفتگو نے اس کے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ دفتر میں آج دہشت گردی کا موضوع چھڑ گیا تھا اور کسی ساتھی نے یہ الفاظ کہے تھے کہ آج کل کسی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ دہشت گردوں نے آبادیوں میں بھی اپنے ٹھکانے بنا لیے ہیں اور آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کا پڑوسی ہی کسی دہشت گرد تنظیم کا ہرکارہ ہے اس لیے آج کل اپنے آس پڑوس سے خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ زمانے گئے جب پڑوسی، عزیز رشتے داروں سے بڑھ کر

ہوتے تھے پھر اسی کولیگ نے خاص طور پر اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔

''آپ کو خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے سائرہ صاحبہ! ایک تو آپ اکیلی ہیں دوسرے رہتی بھی فلیٹ میں ہیں اور کرائے کے فلیٹ ان دہشت گردوں کی پسندیدہ پناہ گاہیں بن چکی ہیں۔ یہ مت سوچیے گا کہ یہ دہشت گرد چھڑے چھانٹ مرد ہی ہوتے ہیں۔ اب تو ان کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی ہیں اور یہ باقاعدہ فیملی کی شکل میں رہتے ہیں۔'' اپنے دفتری ساتھی کی اس نصیحت پر وہ حقیقتاً خوف زدہ ہوگئی تھی اور اسے ولی اور طاہرہ خاتون خاصے مشکوک لگنے لگے تھے۔ طاہرہ خاتون کے فلیٹ میں سجے سازوسامان، ان کے پہننے اوڑھنے اور کھانے پینے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اچھے خوش حال لوگ ہیں پھر بھی وہ لوگ اس کی طرح ایک چھوٹے سے کرائے کے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ سائرہ اور اس کے بچوں کے علاوہ ان کے ہاں کسی کی آمدورفت کا سلسلہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ گھریلو کاموں میں مدد کے لیے کوئی جزوقتی ملازمہ تک نہیں رکھی گئی تھی اور اس عمر میں بھی طاہرہ خاتون ہی ہر کام کرتی تھیں۔ ایک بار سائرہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ ولی ملازمہ رکھنے کے حق میں نہیں ہے اسی لیے ان پر کام کا بوجھ کم کرنے کے لیے وہ اس چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہوگیا ہے۔ بڑے گھر کے مقابلے میں اس چھوٹے فلیٹ کو سنبھالنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ولی کھانے پینے کے معاملے میں بھی بہت سادہ مزاج ہے اور وہ صرف اپنے ککنگ کے شوق کی تسکین کے لیے پُرتکلف کھانا بنایا کرتی ہیں۔ پہلے یہ سب باتیں سائرہ کو اتنی عجیب نہیں لگی تھیں لیکن اب وہ ایک مختلف زاویے سے دیکھ رہی تھی تو اسے سب کچھ مشکوک نظر آرہا تھا۔ خصوصاً ولی کی گھر میں اجنبیوں کی آمدورفت روکنے کی کوشش۔ آخر اس کی زندگی میں ایسا کیا تھا جو وہ دوسروں سے خفیہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوگئی تھی۔ بچوں کو ہوم ورک کروانے اور کھانا تیار کرنے کے دوران بھی وہ اسی مسئلے پر سوچتی رہتی تھی۔ اگر اس کے پڑوسی ٹھیک لوگ نہیں تھے تو یہ اس کے لیے ایک خطرناک بات تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ فوری طور پر رہائش بھی تبدیل نہیں کرسکتی تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ دوسری جگہ صحیح لوگوں سے واسطہ پڑے۔ ان ہی سوچوں میں گھرے اسے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا۔ اطلاعی گھنٹی کے بجنے پر وہ چونکی۔ حسبِ توقع دروازے پر طاہرہ خاتون کھڑی تھیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں ایک ڈش اٹھا رکھی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے انہیں اندر بلانا پڑا۔

''بچوں کو پڑھانے سے تو تم نے منع کردیا تھا اس لیے میں نہیں آئی۔ ابھی یہ لبنانی کباب بنائے تھے تو سوچا کہ تمہیں دے آؤں، بچے ایسی چیزیں شوق سے کھاتے ہیں۔'' وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں مخاطب تھیں لیکن آج سائرہ پہلے جیسی نہیں تھی اس لیے خشک سے لہجے میں بولی۔

''آپ نے خوامخواہ زحمت کی۔ بچوں نے کھانا کھالیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، تم یہ کباب فریج میں رکھ دو، کل مائیکروویو میں گرم کر کے لنچ میں دے دینا۔'' اس کے روکھے پن کے باوجود ان کے لہجے کی ملائمت قائم تھی۔ سائرہ نے بے دلی سے کبابوں کی ڈش اٹھا کر فریج میں رکھ دی۔ بچے اندر کمرے میں کارٹون دیکھنے میں مصروف تھے اس لیے انہیں طاہرہ خاتون کی آمد کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ سائرہ خود بے دلی سے ان کے مقابل بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے سائرہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' طاہرہ خاتون نے اس سے دریافت کیا۔

''میری طبیعت کو کیا ہونا ہے بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کا لہجہ اب بھی اکھڑا ہوا سا تھا۔

''مجھے تم ہمیشہ سے مختلف لگ رہی ہو۔ شاید رات کو سوئی بھی نہیں ہو۔ تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور چہرہ اترا ہوا ہے۔ کہیں کسی پریشانی میں تو مبتلا نہیں ہو؟'' انہوں نے اس بار بھی نرم لہجے میں کہا تو سائرہ کو تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی۔

''رات کام کے چکر میں بہت زیادہ دیر تک جاگتی رہی تھی اس لیے نیند پوری نہیں ہوسکی۔'' اس بار جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔

''اللہ تمہیں ہمت دے۔ اکیلی جان پر بہت ذمے داری آگئی ہے۔ اللہ تمہیں اپنی کوششوں میں سرخ رو کرے۔'' انہوں نے بہت ہمدردی اور خلوص سے اسے دعائیں دیں تو اس کے دل میں ان سے براہِ راست بات کرنے کا خیال آگیا اور قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

''میں نے کل رات تین بجے کے بعد ولی کو ایک گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کوئی مسئلہ تھا کیا جو وہ اتنی رات کو کہیں گئے تھے؟'' اس کے سوال نے طاہرہ خاتون کے ذہن میں ایک جھماکا سا کیا اور انہیں ادراک ہوگیا کہ

سائرہ کس الجھن میں ہے۔ ولی کی خصوصی تیاری کے ساتھ روانگی نے یقیناً اس کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگیں اور پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ولی سرکاری ملازم ہے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا ملازمت کرتا ہے۔ ہم یہ بات کسی کو بتاتے بھی نہیں ہیں لیکن تم مجھے بالکل بیٹی کی طرح عزیز ہو اس لیے میں تمہیں یہ بات بتا رہی ہوں کہ ولی حکومت کی ایک خفیہ فورس کا اہلکار ہے اور کل رات بھی اسے ایمرجنسی میں ایک اہم مشن پر جانا پڑا تھا۔ اگر تمہیں ٹیلی ویژن دیکھنے کا موقع ملا ہو تو تم نے صفورا گوٹھ میں دہشت گردوں کے ٹھکانے پر خفیہ فورس کی کارروائی کی خبر دیکھی ہو گی۔ ولی وہ کارروائی کرنے والی ٹیم کا حصہ تھا۔ اس کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد بھی اسے بہت دیر تک اپنے دفتر میں رکنا پڑا تھا اور وہ تقریباً دوپہر کے بارہ بجے گھر آ کر چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد ایک بار پھر اپنے آفس جا چکا ہے۔ ولی کی بیوی کو اس کی یہ جاب پسند نہیں تھی جس میں آنے جانے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہے اور ہر وقت جان بھی خطرے میں رہتی ہے۔ اس نے ولی پر زور دیا کہ وہ اپنی جاب چھوڑ کر اس کے پاپا کے ساتھ ان کے بزنس میں شامل ہو جائے لیکن ولی نہیں مانا۔ اس کے لیے اس کی جاب صرف گھر کا چولھا جلانے کا ذریعہ نہیں ہے، وہ اس جاب کے ذریعے اپنے حب الوطنی کے جذبے کی تسکین کرتا ہے اور یہ جذبہ میں نے ہی اس کے دل میں ڈالا ہے اس لیے میں اس کا پورا ساتھ دینے کی کوشش کرتی ہوں اور عام ماؤں کی طرح اس سے یہ شکوہ نہیں کرتی کہ وہ مجھے وقت نہیں دیتا یا میری زندگی دوسری عورتوں سے قدرے مختلف ہے۔ میں پیسا ہونے کے باوجود اپنے گھر میں کوئی ملازمہ نہیں رکھ سکتی۔ مجھے میل جول میں بہت احتیاط رکھنی پڑتی ہے کیونکہ ولی کی ملازمت میں رازداری کی بہت اہمیت ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے سیڑھی بنا کر اس تک پہنچ سکے۔'' اس کے ایک سوال کے جواب میں طاہرہ خاتون نے اسے اتنا کچھ بتا دیا کہ اس کی ساری الجھنیں دور ہو گئیں اور وہ شرمندہ ہونے لگی کہ اس نے کیسے لوگوں پر شک کیا۔

''سوری خالہ جان! آپ نے شاید میرے رویے کو محسوس کیا ہو لیکن میری بھی مجبوری ہے کہ میں ہر شخص پر اعتبار نہیں کر سکتی۔'' اس نے فوراً معذرت کر لی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا آج کل حالات ہی ایسے ہیں کہ کوئی کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ میں بھی شاید اول دن پڑوسی ہونے کا حق ادا کرنے کے بعد تعلقات کو طول نہیں دیتی لیکن تم مجھے اچھی لگیں اور تمہارے حالات نے بھی مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی استطاعت کے مطابق تمہارا خیال رکھ سکوں۔ تم سے دوستی رکھنے کے لیے مجھے ولی سے باقاعدہ اجازت لینی پڑی تھی۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ ذرا سا مسکرائیں۔

''اور ولی صاحب نے یقیناً یہ اجازت میرا سب اگلا پچھلا کھنگالنے کے بعد ہی دی ہو گی۔'' اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی جس کے جواب میں طاہرہ خاتون نے صرف چھوٹا سا قہقہہ لگانے پر اکتفا کیا، زبان سے کچھ نہیں بولیں۔

☆☆☆

''دانش صاحب کے قتل کے بعد آپ نے کبھی اپنے اردگرد تو قیر نامی اس شخص کو دیکھا؟'' اس کے مقابل بیٹھے ولی نے اس کی ساری داستان سننے کے بعد دریافت کیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دانش کے قتل کے معاملے پر اس طرح زبان بند کر کے نہیں بیٹھ سکتی۔ عام پولیس والوں کی نیت اور صلاحیت پر بھروسا کرنا آسان نہیں تھا لیکن دہشت گردوں سے جنگ کرنے والے ایک خفیہ ادارے کے پُرعزم اور ایمان دار اہلکار تک رسائی مل جانے کے بعد اس کے لیے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے طاہرہ خاتون کی مدد سے ولی سے ملاقات کا وقت لے لیا اور اب دونوں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔

''نہیں، وہ کبھی میرے سامنے نہیں آیا، ایک بار میں نے اسے اتفاقاً ہی دیکھ لیا تھا۔'' اس نے ولی کے سوال کا جواب دیا۔

''دانش صاحب کے بعد آپ نے اپنے اردگرد کسی مشکوک فرد یا سرگرمی کو تو محسوس نہیں کیا کہ جیسے آپ کی نگرانی کی جا رہی ہو یا آپ کے گھر کی تلاشی لی گئی ہو؟'' ولی نے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''دانش کے بعد جب میں نے اپنا آفس جوائن کیا تھا تو دو تین بار مجھے ایسا لگا کہ کوئی شخص میرا پیچھا کر رہا ہو لیکن پیچھا کرنے والوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی اس لیے میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر بھلا دیا۔ اب مجھے یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ ایک بار دفتر سے گھر آنے پر مجھے گھر میں کچھ بے ترتیبی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں چونک جاتی۔ ہلکا سا ایک احساس ہوا تھا اور میں نے یہ سوچ کر ٹال دیا تھا کہ صبح میری مصروفیت کے

دوران بچوں نے چیزیں اِدھر اُدھر کردی ہوں گی۔''

''میرے اندازے کے مطابق دانش صاحب کی ہلاکت کے بعد ان لوگوں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو گی کہ آپ ان کی موت کی اصل وجہ تو کھوجنے کی کوشش نہیں کررہی ہیں یا دانش صاحب ایسی کوئی شے تو نہیں چھوڑ گئے ہیں جو آپ کو شک میں مبتلا کردے۔ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک نامکمل مسودے کی صورت میں اپنے قتل کا نشان چھوڑ گئے ہوں گے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ ابتدا میں آپ کو ایسی کوئی چیز نہیں ملی اور نہ ہی آپ نے کسی کے سامنے شک وشبہے کا اظہار کیا اس لیے وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اب آپ آسانی سے ان دہشت گردوں تک پہنچنے میں میری مدد کرسکتی ہیں۔''

''تھینک یُو ولی صاحب، آپ نے میری بات سنی اور اس پر اعتبار کیا ورنہ مجھے شک تھا کہ فرضی ناموں سے لکھی گئی ایک نامکمل کہانی کے مسودے پر آپ اعتبار کریں گے بھی یا نہیں۔'' ولی کو اس کیس کے معاملے میں سنجیدہ دیکھ کر سائرہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''ہم شک کی بنیاد پر کام کرتے ہیں میڈم! اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ توقیر کے کردار کو لے کر دانش صاحب نے واقعی کوئی تخیلاتی کہانی لکھی ہو لیکن میری تربیت مجھے اس مسودے کو محض تخیلاتی کہانی قرار دے کر شک کرنے سے نہیں روک سکتی۔ اب آپ کو کرنا یہ ہے کہ میرے ساتھ میرے آفس چلیں اور وہاں ایکسپرٹ کی مدد سے توقیر کا خاکہ بنوائیں۔ خاکہ بن جانے پر ہمارے لیے اس شخص تک رسائی کی ایک راہ کھل جائے گی۔''

''آپ جب کہیں میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔'' ولی کی بات سن کر سائرہ نے ایک عزم سے جواب دیا۔ اس پر دانش کی محبت کا یہ قرض تھا کہ وہ اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کرے اور یہاں تو ملک وقوم کی سلامتی کا بھی معاملہ تھا۔ دانش کو مارنے والے عام قاتل نہیں دہشت گرد تھے اور دہشت گردوں کو انجام تک پہنچانا ضروری تھا۔

☆☆☆

''آپ کا بہت بہت شکریہ سائرہ صاحبہ کہ آپ نے وقت نکالا توقیر کا خاکہ بننے سے ہمیں اسے تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔'' ولی خود اسے اپنے دفتر کی پارکنگ میں اس کی گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔ دفتر میں بھی اس نے سائرہ کا بہت خیال رکھا تھا۔ ایکسپرٹ سے توقیر کا خاکہ بنوانے کے دوران وہ ایک دو جگہ خاصی کنفیوز ہو گئی تھی اور اسے ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی غلطی نہ کر جائے، ایسے موقع پر ولی نے اس کی کیفیت بھانپ کر اسے خوب تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ خود کو بالکل ریلیکس رکھ کر کام کروائے۔ اس کے کنفیوز ہو کر بار بار خاکے میں تبدیلیاں کروانے سے وہ جھنجلایا نہیں تھا بلکہ الٹا اسے ہی سمجھاتا رہا تھا کہ اس نے صرف ایک بار توقیر کو دیکھا ہے اس لیے اگر وہ اس کا خاکہ بنوانے میں تھوڑی سی کنفیوز ہو رہی ہے تو اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب خاکہ مکمل ہوا تو سائرہ نے محسوس کیا کہ وہ توقیر سے بہت حد تک مشابہ ہے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود ولی نے اس کی چائے اور اسنیکس سے خاطر مدارت بھی کی تھی اور اب اسے اس کی گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا اور اس کا شکریہ ادا کررہا تھا۔

''شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے ولی صاحب کہ آپ نے میری بات پر یقین کر کے دانش کے قاتلوں تک پہنچنے کی کوشش کا آغاز کردیا ورنہ میں اکیلی عورت کیا کرسکتی تھی۔'' سائرہ نے پوری سچائی سے کہا۔

''آپ نے ہمت کی اور ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کروانے کا سوچا، یہ بھی بہت بڑی بات ہے ورنہ ہمارے ہاں تو اکثر لوگ یہی سوچتے ہیں کہ دنیا سے جانے والا چلا گیا اب ہم زبان کھول کر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالیں۔ حالانکہ ایسا کر کے وہ اپنی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال رہے ہوتے ہیں۔'' وہ اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے آپ کو اپنے اور دفتر کے جو فون نمبرز دیے ہیں انہیں سنبھال کر رکھیے گا۔ ذرا سی بھی کوئی گڑبڑ محسوس ہونے پر آپ فوری طور پر رابطہ کرسکتی ہیں۔''

''جی شکریہ، اب مجھے اجازت دیں ورنہ میں دفتر کے لیے بہت لیٹ ہو جاؤں گی۔'' گھڑی کی تیزی سے بھاگتی ہوئی سوئیوں نے سائرہ کو اجازت لینے پر مجبور کیا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال کر ٹریفک کے بہاؤ میں لاتے ہوئے اس کی ذہنی رو خود بخود ولی کی بیوی کی طرف چلی گئی۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ جو اتنے وجیہہ اور پروا کرنے والے مرد کو صرف اس لیے چھوڑ کر چلی گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے غیر معمولی معمولات کو تبدیل کرنے سے قاصر تھا حالانکہ اسے تو ولی پر فخر ہونا چاہیے تھا کہ وہ وطن کے لیے اتنی بہادری سے کام کررہا ہے۔ اپنی جان کی بازی لگا کر دوسروں کی حفاظت

کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسی جرأت مندی ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ خود دانش میں بھی اتنی جرأت مندی نہیں تھی حالانکہ دانش بہت مثبت سوچ رکھنے والا ایک ہمدرد اور پُرخلوص انسان تھا لیکن توقیر کی اصلیت سامنے آنے پر وہ زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرسکا تھا کہ کہیں اس کی اپنی فیملی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

حسب معمول اپنے فرائض انجام دے کر وہ دفتر سے واپسی میں بچوں کو لینے اسکول پہنچی تو وہاں ایک پریشانی اس کے انتظار میں تھی۔ بچے اسکول میں موجود نہیں تھے اور چوکیدار کے مطابق انہیں ان کے کوئی انکل ساتھ لے گئے تھے۔ کون انکل اس بارے میں چوکیدار کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سائرہ نے اس غیر ذمّے داری پر شور مچایا تو وہ بولا کہ بچوں نے خود اس شخص کو اپنے انکل کے طور پر شناخت کیا تھا تب ہی اس نے بچے اس آدمی کے حوالے کیے تھے۔ اس آدمی کا کہنا تھا کہ آج سائرہ کی طبیعت خراب ہے اسی لیے وہ بچوں کو لینے آیا ہے۔ اس صورتِ حال پر سائرہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے پہلے طاہرہ خاتون کا نمبر ملایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے فلیٹ پر چیک کر کے بتائیں کہ بچے پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔ طاہرہ آنٹی نے اسی وقت اسے بتا دیا کہ بچے موجود نہیں ہیں۔ اسے لگا کہ اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے۔ اس کا دھیان فوری طور پر ولی کی طرف گیا اور اس نے اس کا نمبر ملا کر روتے ہوئے اسے بچوں کے اسکول سے غائب ہونے کی اطلاع دی۔ ولی نے اسے تسلی دیتے ہوئے فوری طور پر اپنے پہنچنے کا یقین دلایا۔ سائرہ کو اس دوران اسکول کے آفس میں لے جا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ بچوں کے اس طرح غائب ہونے سے اسکول انتظامیہ خود پریشان تھی۔ اس سے ان کے اسکول کی ریپوٹیشن پر اثر پڑسکتا تھا۔ انہوں نے سائرہ کو زیادہ دیر باہر کھڑے ہو کر شور کرنے کا موقع نہیں دیا تھا اور اب بھی کوشش کر رہے تھے کہ کسی کو اس واقعے کا علم نہ ہو۔ اسٹاف میں سے دو خواتین مسلسل سائرہ کو تسلیاں دے رہی تھیں۔ اسے جوس بھی پیش کیا گیا تھا جسے پینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کسی کے سوال کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ انتظامیہ کے لوگ اس پر زور دے رہے تھے کہ وہ سوچے کہ بچوں کے ایسے کون سے انکل ہیں جنہیں پہچان کر بچے ان کے ساتھ چلے گئے ہیں لیکن سائرہ کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا اور مسلسل بُرے بُرے وسوسے دل میں آرہے تھے۔ ولی کے اسکول پہنچنے تک وہ رو رو کر اچھی خاصی نڈھال ہوگئی تھی۔ ولی کی آمد پر ایک بار پھر چوکیدار کی آفس میں طلبی ہوئی۔

''تم نے بچوں کو کسی اجنبی کے ساتھ کیسے جانے دیا؟'' ولی نے سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''امارا قصور نئیں ہے صاب! اس آدمی نے ام سے جھوٹ بولا تھا کہ بچوں کی ماں کا طبیعت خراب ہے اس لیے وہ بچوں کو لینے آیا ہے۔ بچوں نے خود اس آدمی کو پہچانا تھا۔ ام کو ایسا کوئی ہدایت نہیں تھا کہ بچوں کو ماں کے سوا کسی کے ساتھ نہیں بھیجنا ہے اس لیے ام نے ان کو جانے دیا۔'' چوکیدار بھی اس صورتِ حال پر گھبرایا ہوا تھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے جناب! جن پیرنٹس کو اپنے بچوں کے حوالے سے کوئی خدشہ ہوتا ہے وہ پیشگی ہمیں انفارم کر دیتے ہیں اور ہم کسی بھی صورت میں بچوں کو پیرنٹس کے علاوہ کسی کے ہینڈاوور نہیں کرتے۔ مسز دانش کی طرف سے ہمیں ایسی کوئی انسٹرکشن نہیں ملی تھی۔'' پرنسپل جو پہلے چوکیدار کو اچھی خاصی باتیں سنا چکا تھا اب اسکول کے مفاد میں اس کی حمایت کر رہا تھا۔

''بچوں کو لے جانے والے آدمی کا حلیہ تفصیل سے بتاؤ۔'' ولی نے کسی بھی وضاحت پر توجہ دیے بغیر چوکیدار کو حکم دیا اور آنسو بہاتی سائرہ سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے بولا۔ ''پلیز سائرہ صاحبہ! چوکیدار جو حلیہ بتا رہا ہے اسے غور سے سنیں۔ ہوسکتا ہے آپ اس حلیے کے کسی شخص کو جانتی ہوں۔'' سائرہ اس کی بات سمجھ گئی اور خود پر قابو پا کر چوکیدار کی طرف متوجہ ہوگئی۔ چوکیدار نے حلیہ بتانا شروع کیا اور دو چار نشانیوں سے ہی سائرہ پہچان کے مراحل طے کر کے تیز آواز میں بولی۔

''یہ جو حلیہ بتا رہا ہے وہ میرے جیٹھ کا ہے۔ میں ابھی انہیں کال کرتی ہوں۔'' ولی کے کسی ردِعمل سے قبل ہی اس نے اپنے موبائل سے کال ملائی اور دوسری طرف سے ہیلو سنتے ہی بولی۔

''طلحہ اور زویا کہاں ہیں ثاقب بھائی؟ آپ میری پرمیشن کے بغیر انہیں اسکول سے لے کر کیوں گئے؟''

''وہ میرے بھائی کے بچے ہیں اور میرا بھی ان پر حق ہے۔ ویسے بھی امی کو بچوں کی بہت یاد آرہی تھی اس لیے میں بچوں کو ان سے ملوانے کے لیے لایا ہوں۔''

''بچوں سے ملنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آپ کو گھر آنا چاہیے تھا۔'' ان کے اطمینان سے جواب دینے پر اسے

غصہ آنے لگا۔

"کون سے گھر......؟ تم تو چپکے سے پہلے والا گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو۔ وہ تو میں نے کوشش کر کے پرانے اسکول سے معلوم کیا کہ تم نے بچوں کو اسکول کی کون سی برانچ میں ٹرانسفر کروایا ہے۔" جواب میں انہوں نے بھی تلخی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ مجھ سے میرے فون پر بھی رابطہ کر سکتے تھے۔" سائرہ کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

"تم سے ہمارا اب کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔ ہاں بچوں سے ہمارا رشتہ ہے اور تم ہمیں بچوں سے ملنے سے نہیں روک سکتیں۔" وہ کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کررہے تھے۔

"میں ابھی اور اسی وقت اپنے بچوں کو لینے آرہی ہوں۔" سائرہ طیش میں آگئی۔

"آتے ہوئے دو لاکھ کا چیک بھی تیار کر کے لے آنا۔ بچوں کی طرح بھائی کے مال پر بھی ہمارا حق بنتا ہے۔ تم بچوں کو مکمل اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے رکھ لو لیکن کم سے کم مال میں سے تو تمہیں ہمارا حق دینا ہوگا۔" ان کا مکارانہ لہجہ سن کر سائرہ بیک وقت غصے اور دکھ میں مبتلا ہوئی اور نفرت سے بولی۔

"آپ اتنے گھٹیا انسان ہوں گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ یتیم بچوں کے مال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"تم بھی تو اس مال پر عیش کررہی ہو۔ دانش کی زندگی میں تم بسوں میں دھکے کھاتی پھرتی تھیں اور اب اس کے پیسوں سے گاڑی میں اڑتی پھرتی ہو۔ جب تم اس مال پر عیش کرسکتی ہو تو میں اپنی ضرورت کے لیے کیوں نہیں مانگ سکتا۔"

"بند کریں اپنی بکواس۔ میں بچوں کو لینے آرہی ہوں۔" انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنا بے کار تھا اس لیے اس نے فون بند کردیا۔ ولی اور وہاں موجود دوسرے لوگ یک طرفہ گفتگو سے ہی خاصی حد تک بات سمجھ چکے تھے۔ سائرہ نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور ولی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"آپ کے تعاون کا شکریہ ولی۔ آپ جائیں، میں بچوں کو خود لینے جاتی ہوں۔"

"میرے خیال میں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اکیلے میں آپ کو پریشانی ہوسکتی ہے۔" ولی بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ سائرہ کو اس کی بات ٹھیک لگی۔ فون پر اس سے اتنی بدتمیزی کرنے والا ثاقب گھر جانے پر اس سے دگنی بدسلوکی کرسکتا تھا۔ پھر اس کا مطالبہ بھی تو تھا۔ چیک نہ دینے پر وہ واقعی بچے اس کے حوالے نہیں کرتا تو وہ کیا کرتی۔ ولی کے کہنے پر اس نے اپنی گاڑی اپنی بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی کی اور پھر ولی کی گاڑی میں ثاقب کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسے ایک اجنبی مرد کے ساتھ دیکھ کر ثاقب ذرا سا گڑبڑا گیا لیکن پھر بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کس کے ساتھ گھوم رہی ہو۔ میرے بھائی کو مرے چار دن نہیں ہوئے اور تم نے گل چھرے اڑانا شروع کردیے۔" اس کے الفاظ پر سائرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ غصے میں وہ کچھ کہتی، اس سے قبل ولی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور خود بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"اپنا تعارف میں خود کروا دیتا ہوں۔ اگر آپ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں تو اس کارڈ سے میرا مکمل تعارف جان سکتے ہیں۔" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر ثاقب کو تھما دیا۔ جس کے مندرجات پڑھ کر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ نے کیوں زحمت کی سر! ہمارا معمولی سا گھریلو تنازعہ ہے۔ آیئے اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" ولی نے اس کی پیشکش قبول کرلی۔ طوعاً و کرہاً سائرہ کو بھی اندر جانا پڑا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی اپنی ساس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"آئے ہائے سائرہ! تجھے ذرا شرم اور لاج نہیں ہے۔ میرے بیٹے کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تو چہرے پر سرخی پوڈر ملے، رنگین جوڑا پہنے گھوم رہی ہے۔" انہوں نے اس کی ہلکی سی لپ اسٹک پر اعتراض کیا۔

"سائرہ صاحبہ کی عدت پوری ہوچکی ہے محترمہ اور شرعاً ان کے بننے سنورنے پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔" ولی بے ساختہ ہی دانش کی ماں کو ٹوک بیٹھا۔

"تم کون ہو میاں؟ بغیر داڑھی کے پتلون قمیص والے مولوی۔" انہوں نے ٹوکے جانے پر خشمگیں نگاہوں سے ولی کو گھورا۔

"چپ رہو اماں اور اندر جاؤ۔" ثاقب نے اس صورتِ حال پر ماں کو ٹوکا اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ دانش کی ماں بھی اس کی ہدایت کے برخلاف اندر چلی آئی۔

"مجھے آپ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی مسٹر ثاقب! آپ نے جو حرکت کی ہے اس کے نتیجے میں آپ پر حبس بے جا اور اغوا برائے تاوان کا کیس بن سکتا ہے اور ان

جرائم کی سزا کتنی سخت ہے اس کا آپ کو بھی اندازہ ہوگا۔ آپ نے سائرہ صاحبہ سے جو کچھ کہا وہ یہ اپنے موبائل میں ریکارڈ کر چکی ہیں جو ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بچے میری ایک کال پر پولیس ٹیم آ کر آپ کے گھر سے بازیاب کروالے گی۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟'' راستے میں سائرہ نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے اس نے پورے اعتماد سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آئے ہائے، کیسا اغوا اور کیسی پولیس؟ بچے ہمارے اپنے ہیں۔ بچوں کے دادی اور تایا سے ملنے پر پولیس کیا کر سکتی ہے۔'' دانش کی ماں واویلا کرنے لگی۔

''میں نے تم سے کہا ہے نا اماں چپ ہو جاؤ۔'' ثاقب نے غصے سے ماں کو ٹوکا اور پھر عاجزی سے ولی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مالی مسائل کی وجہ سے میں نے ایسے ہی سائرہ سے ایک مطالبہ کر دیا تھا ورنہ میرا بچوں کو اغوا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں صرف انہیں اماں اور دوسرے لوگوں سے ملوانے لایا تھا۔ آپ لوگ ابھی انہیں لے جا سکتے ہیں۔ اماں! آپ بچوں کو یہاں بلا لیں۔'' آخری جملہ اس نے اپنی ماں سے کہا جنہیں خود بھی بیٹے کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ صورتِ حال کچھ نازک ہے اس لیے فوراً ہی بچوں کو لے آئیں۔ بچے سائرہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئے اور پوچھنے لگے کہ اس کی طبیعت کو کیا ہوا تھا جو اس نے ثاقب انکل کو انہیں اسکول سے لانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ سائرہ نے بچوں کو ایسے ہی بہانہ بنا کر بہلا لیا اور فوراً ہی واپسی کے لیے کھڑی ہو گئی۔

''اگر آئندہ آپ میں سے کسی کا بچوں سے ملنے کا دل چاہے تو فون کر کے پہلے سائرہ صاحبہ سے اجازت لے گا پھر بچوں سے ملاقات کرے گا۔ دوسری صورت میں ان کی طرف سے فوراً اغوا کی ایف آئی آر کٹوا دی جائے گی اور آپ لوگوں کے لیے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔'' ولی بھی کھڑا ہو گیا اور دھیمے لیکن فیصلہ کن لہجے میں ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے اسے دھمکی سے نوازا۔

''فکر مت کریں سر! آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' ثاقب صرف اس کا کارڈ دیکھ کر تیر کی طرح سیدھا ہو چکا تھا۔

''مجھے کوئی فکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، تم اپنی فکر کرو۔'' ولی نے اسے جھڑکنے والے لہجے میں کہا اور باہر

ہوشیار شوہر

گھریلو جھگڑے کے بعد بیوی نے اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیئے۔

شوہر نے پوچھا۔ ''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' بیوی نے جواب دیا۔ ''اپنی ماں کے گھر۔''

تھوڑی دیر کے بعد شوہر نے بھی اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیا۔

جس پر بیوی نے پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' شوہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اپنی ماں کے گھر۔''

بیوی نے سوال کیا۔ ''اور بچوں کا کیا ہوگا؟'' شوہر نے جواب دیا۔

''جب تم اپنی ماں کے یہاں جا رہی ہو اور میں اپنی ماں کے یہاں تو میرا خیال ہے کہ بچے بھی اپنی ماں کے یہاں جائیں گے۔''

دکانداری

عید گزر چکی تھی۔ سیزن ٹھنڈا تھا۔ قمر لبے بازار میں گھوم رہے تھے۔ ایک جگہ انہیں فٹ پاتھ پر ڈسپلے ہینگر پر بہت سے کوٹ نظر آئے۔ انہوں نے دیکھ بھال کر ایک عمدہ کوٹ کا انتخاب کیا اور اسے لے کر دکان میں چلے گئے۔ دکاندار کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ قمر لبے نے کوٹ اس کے سامنے ڈالا۔ دکاندار نے بےزاری سے قمر لبے کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ''زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو۔''

قمر لبے بھونچکا رہ گئے۔ اتنا شاندار کوٹ اور اتنا سستا! جھٹ ڈیڑھ سو نکال کر دکاندار کے سامنے ڈال دیے۔

نوٹ دیکھ کر دکاندار چونکا ہوا اور پھر صورتِ حال سمجھ میں آتے ہی اس نے قمر لبے سے کوٹ جھپٹ لیا۔ ''اب رکھ اسے یہاں اور اٹھا اپنے پیسے...... دو ہزار کا کوٹ ڈیڑھ سو میں لینے آیا ہے۔''

''ابھی تم ہی نے اس کے ڈیڑھ سو بتائے تھے۔'' قمر لبے نے احتجاج کیا۔

''ہاں، بتائے تھے...... یہ سمجھ کر کہ تو یہ کوٹ بیچنے آیا ہے...... مجھے کیا پتا کہ تو خریدار ہے۔''

بنگلا دیش سے خرم علیم کی عنایت

نکل گیا۔ سائرہ پہلے ہی بچوں سمیت باہر جا چکی تھی۔
''بہت مطلبی اور موقع پرست لوگ لگتے ہیں دانش صاحب کے گھر والے۔'' راستے میں ولی نے تبصرہ کیا۔
''ہاں بس دانش ہی اپنی فیملی سے مختلف تھے اور میں ان کی خاطر ان لوگوں سے اب تک تعلق نبھاتی رہی ہوں۔'' اس نے تائید کی اور پھر ولی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''آپ کا بہت شکریہ! آپ کی وجہ سے مجھے ان لوگوں سے نمٹنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی ورنہ یہ اتنی آسانی سے بچوں کو میرے حوالے نہیں کرتے۔''
''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے پڑوسی ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ بس اب آپ احتیاط سے کام لیں اور اسکول والوں کو ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ اسکول سے آپ کے سوا کسی کے ساتھ نہیں جائیں گے۔'' ولی نے اسے ہدایت دی۔
''بالکل ٹھیک کہا آپ نے، یہ دونوں کام تو مجھے کرنے ہی پڑیں گے۔'' اس نے پچھلی نشست پر بیٹھے بچوں کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دن بھر کے تھکے ہارے بچے ابھی تک اسکول یونیفارم میں ہی تھے اور گاڑی کی آرام دہ نشست پر بیٹھے تقریباً غنودگی میں چلے گئے تھے۔ گاڑی رکی تو وہ چونک کر اٹھ گئے۔
''گھر آگیا؟'' اردگرد دیکھتے ہوئے طلحہ بولا۔
''بالکل آگیا۔ اب آپ لوگ باقی آرام اپنے گھر جا کر کریں۔ مجھے اپنی گاڑی میں واپس دفتر جانا ہے۔'' ولی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''اوفوہ، ولی انکل! آپ کتنا آفس جاتے ہیں۔ اس سے اچھا تو آپ آفس میں ہی گھر بنالیں۔'' طلحہ نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے اعتراض کے ساتھ تجویز پیش کی تو ولی ہنس دیا اور بولا۔
''تم تو میری بیوی بننے کی کوشش کر رہے ہو یار۔''
''میں کیسے آپ کی بیوی بن سکتا ہوں۔ میں تو بوائے ہوں اور بیوی گرل ہوتی ہے جیسے مما ہیں۔ ایسا کریں آپ مما کو بیوی بنالیں۔'' نا سمجھی میں کہے گئے اس کے یہ الفاظ سائرہ کو سخت شرمندہ کر گئے۔
''فضول مت بولو طلحہ! بہت بدتمیز ہو گئے ہو۔ گھر چلو میں تمہیں ان فضول باتوں کا مزہ چکھاتی ہوں۔'' شرمندگی غصے میں ڈھل گئی اور وہ سخت لہجے میں طلحہ کو ڈانٹنے لگی۔
''اٹس او کے سائرہ! بچہ ہے نا سمجھی میں ایک بات کہہ بیٹھا ہے، آپ اسے اطمینان سے سمجھا سکتی ہیں۔'' اس کے غصے کو دیکھتے ہوئے ولی نے اسے ٹوکا اور جب وہ بچوں سمیت گاڑی سے اتر گئی وہ ہاتھ ہلاتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سائرہ کو ایک بار پھر اس کی سابقہ بیوی کی بدنصیبی پر افسوس ہوا جو اتنے نفیس اور شائستہ آدمی کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''ہیلو سائرہ! کیا آپ اس وقت میرے آفس آسکتی ہیں؟'' لنچ ٹائم سے کچھ پہلے سائرہ کو ولی کی کال موصول ہوئی۔
''کیوں خیریت تو ہے؟'' اس نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔
''لاہور میں ہونے والی ایک بینک ڈکیتی میں ہمیں ایک بندے کی فوٹیج ملی ہے۔ اس بندے کی شکل آپ کے بنوائے ہوئے خاکے سے کافی مشابہ ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ آپ دیکھ کر کنفرم کر دیں۔ میں آپ کو تصویر واٹس ایپ کر دیتا لیکن رازداری کی وجہ سے نہیں کر رہا۔ آج کل کچھ بھی محفوظ نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مجرموں کو بھاگنے کا موقع مل سکے۔'' ولی نے اسے بتایا۔
''ٹھیک ہے میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' اس کی دھڑکنیں اس اطلاع پر مزید تیز ہو گئیں اور اس نے فوراً ہی حامی بھر لی۔ لنچ ٹائم کی وجہ سے اسے دفتر سے نکلنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ولی کے آفس میں بیٹھی تصدیق کر رہی تھی کہ فوٹیج میں نظر آنے والا شخص توقیر ہی ہے۔ ڈکیتی کی اس واردات میں بھی اس نے نقاب لگا رکھا تھا لیکن اس کا نقاب پل بھر کے لیے کسی وجہ سے ہٹ گیا تھا اور بینک میں موجود کیمرے نے اس کی تصویر محفوظ کر لی تھی۔
''یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اتفاق سے اس ڈکیتی سے متعلق ہمارے محکمے کو کچھ کلیوز ملے ہیں اور پوری امید ہے کہ مجرم گرفتار ہو جائیں گے۔ توقیر کی گرفتاری عمل میں آگئی تو دانش کے قاتل ہی نہیں ملک و قوم کے دشمن بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔'' ولی بہت پُرامید نظر آرہا تھا۔ سائرہ کو بھی امید ہو چلی تھی کہ اب دانش کے قاتل زیادہ دن آزاد نہیں رہ سکیں گے۔ اس رات وہ بہت دنوں بعد سکون کی نیند سوئی۔ دو دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ ان دو دنوں میں ولی اسے نظر نہیں آیا۔ طاہرہ خاتون کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ ولی کے اس

طرح کے معمولات کی عادی تھیں لیکن ایک ماں کی حیثیت سے پریشانی فطری بات تھی۔ اپنی اس پریشانی کے حل کے لیے وہ زیادہ وقت جائے نماز پر بیٹھی دعا کرتی نظر آتی تھیں۔ سائرہ بھی اپنے دل میں اس کی کامیابی اور بہ سلامت واپسی کی دعا کرتی رہی۔ اسے یقین سا تھا کہ ولی توقیر والے کیس پر ہی کام کر رہا ہے۔ دو دن بعد اسے ولی کی کال موصول ہوئی تو وہ اس کے بلانے پر ایک بار پھر اس کے آفس پہنچ گئی۔ ولی کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ اس کا حلیہ خاصا ابتر ہو رہا تھا۔ ملگجا لباس، بے ترتیب بال اور سرخ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ گزرے دو دنوں میں اس نے بالکل بھی آرام نہیں کیا ہے۔

''ہم نے توقیر کو گرفتار کر لیا ہے لیکن توقیر کے بجائے ریاض کے نام سے اس کی شناخت سامنے آئی ہے۔ آپ ایک بار خود دیکھ کر تصدیق کر دیں کہ یہ شخص وہی توقیر ہے یا نہیں جسے آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ دیکھا تھا۔'' سائرہ کو سامنے پا کر ولی نے کہا اور پھر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت سائرہ نے کہنی تک فولڈ کی ہوئی اس کی دائیں آستین کے اندر سے سفید بینڈیج کی جھلک دیکھی۔

''آپ کے ہاتھ پر کیا ہوا ہے ولی؟'' اس نے بے ساختہ ہی بے قراری سے پوچھا۔

''کچھ نہیں گولی چھوتی ہوئی نکل گئی ہے، ایک دو دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیسے لگی گولی؟'' سائرہ نے قدموں کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''ڈاکوؤں سے پانچ گھنٹے مقابلہ کرنے کے بعد ہم ان میں سے دو کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں باقی کے چار مارے گئے۔ وہ لاہور کی ایک نواحی بستی میں چھپے ہوئے تھے اور ان کے پاس عام ڈاکوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ اسلحہ موجود تھا۔ مجبوراً میری ٹیم کو بھی بھاری اسلحہ استعمال کرنا پڑا۔ یہ تو اتفاق ہی ہے کہ دو بندے زندہ ہاتھ آ گئے ورنہ اس طرح کے مقابلوں میں عموماً سارے دہشت گرد مارے جاتے ہیں اور ہم خواہش کے باوجود زندہ افراد کو گرفتار نہیں کر پاتے۔ اصل میں یہ لوگ ہمیشہ سر پر کفن باندھ کر لڑتے ہیں اور گرفتاری دینے کے مقابلے میں جان دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کیس میں تو میں نے اپنی ٹیم کے ہر رکن کو توقیر کے سلسلے میں خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی اس لیے وہ زندہ گرفتار ہو پایا ہے لیکن زخمی ہے۔'' تہ

خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ولی نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ تہ خانے میں بھی مکمل عمارت موجود تھی اور کئی کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ولی نے ایک دروازے کا قفل کھول کر سائرہ کو اپنے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر پہنچی تو سامنے بیڈ پر بند آنکھوں کے ساتھ لیٹے شخص کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس شخص کی رنگت میں زردی گھلی ہوئی تھی اور بیڈ کے ساتھ رکھے اسٹینڈ سے گلوکوز کی بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ کی رگ میں پیوست سوئی سے قطرہ قطرہ گلوکوز کا محلول اس کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے دونوں پیروں پر بینڈیج تھی جس پر بڑے بڑے خون کے سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ سائرہ نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور تصدیق کر دی کہ یہی شخص توقیر ہے۔ شناختی عمل سے گزر کر ولی واپس اسے اوپر لے آیا۔

''کیا اس نے دانش کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے؟'' سائرہ نے دریافت کیا۔

''ابھی اس سے تفتیش کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی ہی ہے۔ اس کے دونوں پیروں میں گولیاں لگی ہیں اور خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ اصولاً اسے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے اپنے اختیارات استعمال کر کے اسے آپریشن کے چند گھنٹوں بعد ہی لاہور سے یہاں شفٹ کروا لیا ہے۔ ہمارا ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ایک آدھ دن میں اس سے تفتیش کا آغاز ہو جائے گا۔ اسپتال میں رہتا تو ڈاکٹرز دس طرح کی احتیاطیں بتاتے اور وقت ضائع ہوتا۔ دوسرے ڈر اس کے ساتھیوں کی طرف سے تھا۔ خود کو بچانے کے لیے یہ لوگ اسپتالوں میں اپنے بندوں کو ہلاک کروانے سے بھی نہیں چوکتے۔''

''بہت ہی بے ضمیر لوگ ہوتے ہیں یہ دہشت گرد۔'' سائرہ نے جھرجھری سی لی۔

''ہاں لیکن افسوس کہ انہیں اپنی اس بے ضمیری کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اپنے تئیں یہ کوئی نیک کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اصل میں ان کی برین واشنگ ہی کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ انہیں غلط بھی ٹھیک نظر آتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی یہ حکمتِ عملی ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہمارے لوگوں کو ہی ہتھیار بنا کر ہمیں ہلاک کر رہے ہیں اور دنیا میں بدنامی بھی ہماری ہی ہے کہ ہم شدت پسند اور دہشت گرد ہیں۔'' وہ بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسی جنگ لڑنا جس میں اپنوں ہی سے مقابلہ کرنا پڑتا

تھا واقعی بہت اعصاب شکن تھا لیکن اس کے سوا کوئی حل بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

''نانو! آج ہم ثوبیہ آنٹی سے اسکائپ پر بات کریں گے۔ ان کا بے بی بہت پیارا ہے۔ ہمیں اسے دیکھنا ہے۔'' زویا نے طاہرہ خاتون سے فرمائش کی۔ جدید دور کے وہ بچے پاکستان میں بیٹھے بیٹھے طاہرہ خاتون کی بیرونِ ملک مقیم بیٹی سے بھی تعلقات بنا چکے تھے اور اس کے چند ماہ کے بیٹے پر دل و جان سے فدا تھے۔

''نانو کو بالکل تنگ نہیں کرنا ہے۔ واپس آنے کے بعد میں آپ لوگوں کی کوئی کمپلین نہ سنوں۔'' سائرہ نے پرس میں اپنا موبائل رکھتے ہوئے بچوں کو ہدایت کی۔ آج ان کے اسکول میں کوئی اتفاقی چھٹی تھی اور آج ہی سائرہ کو توقیر کے سلسلے میں گواہی کے لیے عدالت جانا تھا۔ توقیر نے تفتیش کے دوران اعتراف کر لیا تھا کہ دانش کے قتل میں اس کا اور اس کے ساتھیوں کا ہی ہاتھ ہے۔ دانش کی اچھی فطرت کی وجہ سے وہ اس کے اپنے راز سے واقف ہو جانے پر بھی فوری طور پر اسے قتل کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکا تھا اور دھمکیوں سے ہی اس کی زبان بند رکھنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب بھی رہا تھا لیکن جب اس نے اپنے ایک ساتھی سے یہ معاملہ شیئر کیا تو اس نے دانش کو ایک خطرہ قرار دیا جو توقیر کے ذریعے ان کی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ اپنے رازوں سے باہر کے کسی بندے کے واقف ہونے کے بالکل قائل نہیں تھے چنانچہ دانش کی موت کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس روز دانش، سائرہ کے ساتھ دفتر گیا تو توقیر ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دفتر کے باہر دانش کا انتظار کرتا رہا اور جب دانش دفتر سے باہر آیا تو یوں اس کے سامنے پہنچا جیسے اتفاقاً اس سے ملاقات ہو گئی ہو۔ اس نے دانش سے لفٹ مانگی اور دانش نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھا لیا۔ عام راستوں پر ٹریفک جام کے بہانے اس نے دانش کو کورنگی انڈسٹریل ایریا والے راستے سے چلنے کی ترغیب دی اور پھر ادھوری تعمیر شدہ ویران فیکٹری کے سامنے توقیر کے ساتھیوں نے دانش کو چھاپ لیا۔ وہ دانش کو عمارت کے اندر لے گئے اور اپنی جنونی فطرت کی تسکین کے لیے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے خوب تشدد کا نشانہ بنایا، ساتھ ہی اس سے یہ بھی پوچھتے رہے کہ اس نے توقیر کے متعلق کسی کو کچھ بتایا تو نہیں ہے۔ سب سے زیادہ انہیں یہ شک تھا کہ دانش نے اپنی بیوی کو ضرور بتایا ہو گا لیکن دانش نے اس کی تردید کی۔ اپنا اطمینان ہو جانے پر انہوں نے دانش کو ہلاک کر دیا اور یہ کام خود توقیر نے اپنے ہاتھ سے کیا۔ اس نے ہی دانش کے پیٹ پر چاقو کا وہ مہلک وار کیا تھا جو اس کی موت کا سبب بنا۔ بعد میں بھی توقیر نے اپنے ساتھی کی مدد سے سائرہ کی نگرانی اور گھر کی تلاشی کے ذریعے مزید اطمینان کر لیا کہ دانش کے مرنے کے بعد اس کے لیے کوئی خطرہ تو باقی نہیں رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دانش ایک ادھورے مسودے کی شکل میں اپنے قاتل کی نشاندہی کر گیا ہے اور اس کی ذہین اور بہادر بیوی نے قاتل کو انجام تک پہنچانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ بینک ڈکیتی والے معاملے میں شاید وہ بچ نکلتا لیکن دہشت گردی کے چکر میں ولی کے ذریعے اس کا خاکہ پہلے ہی ہر جگہ پہنچ چکا تھا اسی لیے زیادہ شد و مد سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کیا گیا اور آج وہ دن تھا جب اسے عدالت کے روبرو پیش ہونا تھا اور سائرہ کو بھی ایک گواہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضری دینی تھی۔ اس وقت وہ عدالت جانے کی تیاری کر رہی تھی اور بچوں کی طرف سے مطمئن تھی کہ طاہرہ خاتون ان کا خیال رکھیں گی۔

''یہ بہت پیارے بچے ہیں سائرہ اور میں ان سے بالکل بھی تنگ نہیں ہوتی ہوں۔ تم بے فکری سے جاؤ اور خیریت سے اپنا کام نمٹا کر آؤ۔ تب تک ہم تینوں مل کر مزے کریں گے۔'' طاہرہ خاتون نے اسے بچوں کو ٹوکتے دیکھ کر بچوں کی طرف داری کی تو بچے کھل اٹھے۔ ایسی محبت و شفقت انہیں پہلی بار مل رہی تھی۔ ددھیال والوں نے کبھی انہیں ایسی اہمیت دی ہی نہیں تھی اور ننھیال دور تھا جہاں کبھی کبھار ہی جانے کی وجہ سے وہ زیادہ بے تکلف نہیں تھے۔

''ٹھیک ہے خالہ جان، جیسی آپ کی خوشی۔ مجھے اجازت دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں لیٹ ہو جاؤں اور ولی کو شکایت ہو۔'' اس نے اپنا بڑا سا دوپٹا قرینے سے اوڑھا اور پرس کندھے سے لٹکا کر جانے کے لیے بالکل تیار ہو گئی۔

''جاؤ بیٹی! اللہ کی امان میں۔'' طاہرہ خاتون نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ ان کے خلوص کو محسوس کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل دانش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا اور اس کے ساتھ نے سائرہ کو بہت خوشیاں دی تھیں۔ اس کا ساتھ چھوٹنے پر وہ بہت دکھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش توقیر کی حقیقت آشکار ہو جانے کے بعد دانش اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر خاموشی اختیار کر لینے کے

بجائے کسی بااختیار ادارے کے فرد سے رابطہ کرنے کی ہمت کر لیتا تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا اور توقیر پہلے ہی قانون کی گرفت میں آ جاتا۔ اپنی ان سوچوں میں وہ اتنی مگن تھی کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ اس کی روانگی کے ساتھ ہی ایک موٹر سائیکل اس کے پیچھے لگ چکی ہے۔ اس موٹر سائیکل پر دو نوجوان لڑکے سوار تھے اور پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ نائن ایم ایم کا ایک پسٹل اس طرح اپنے اور اپنے ساتھی کے درمیان چھپا رکھا تھا کہ دور سے دیکھنے والوں کو اس کے مسلح ہونے کا احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سائرہ کی گاڑی موڑ کاٹ کر ایک قدرے کم رش والی سڑک پر پہنچی تو موٹر سائیکل کی رفتار بڑھ گئی اور وہ لوگ اس کے عقب سے نکل کر بالکل گاڑی کے متوازی چلنے لگے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے اپنا پسٹل باہر نکال کر اس کا رخ سائرہ کی طرف کیا تو اتفاقاً اس کی نظر پڑ گئی۔ نہایت دہشت کے عالم میں اس نے بے اختیار ہی اپنی گاڑی کو بریک لگا دیے۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور وقت کا یہ مختصر دورانیہ ہی سائرہ کی زندگی بچا گیا۔ لڑکے کے ٹریگر دبانے تک سائرہ کی گاڑی رک چکی تھی اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی تھی اس لیے نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ ایک تو سائرہ کا چلتی ہوئی سڑک پر یک دم گاڑی روک لینا اوپر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ، وہاں عجیب سا بھونچال آ گیا۔ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی بریک لگاتے لگاتے بھی سائرہ کی گاڑی کو تھوڑا سا ٹچ کر گئی۔ اسے ہلکا سا دھچکا لگا لیکن اس دھچکے کا احساس دوبارہ ابھرنے والی گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے زائل کر دیا۔ اسے لگا کہ حملہ آور نے ایک بار پھر اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن جب کوئی گولی آ کر اسے نہیں لگی اور اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ دونوں موٹر سائیکل سوار لڑکے اپنے ہی خون میں لت پت سڑک پر پڑے تھے اور ان کی موٹر سائیکل الٹی پڑی تھی۔ وہ دہشت زدہ سی یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ اس کے آس پاس موجود دیگر گاڑیوں والوں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی اور ٹریفک کی روانی معطل ہو چکی تھی۔

''آر یو او کے سائرہ!'' اس نے اپنے بہت قریب سے سنائی دینے والی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ولی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس کی طرف والی کھڑکی پر جھکا فکرمندی سے اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ اس نے بمشکل اثبات میں اپنا سر ہلا کر اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ولی اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ پہلے وہاں پولیس پہنچی اور پھر ولی کے محکمے کے دو افراد بھی پہنچ گئے۔ اس دوران ولی، سائرہ کو اپنی گاڑی میں منتقل کر چکا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے آ کر پولیس کے ساتھ وہاں کے معاملات سنبھالے تو وہ سائرہ کو لے کر روانہ ہو گیا۔ انتظار کے دورانیے میں اس نے کسی سے سائرہ کے لیے جوس منگوا کر اسے پینے کے لیے دے دیا تھا اور اب وہ قدرے سنبھل چکی تھی۔ ولی اسے بتانے لگا۔

''میں کسی کام سے دو منٹ کے لیے گھر آیا تھا۔ امی نے بتایا کہ آپ ابھی ابھی نکلی ہیں۔ میں جلدی میں تھا اور تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا اس لیے وقت کے فرق کے باوجود عین اس وقت اس جگہ پر آ پہنچا جب وہ لڑکا آپ پر فائر کر رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو میں بھی گڑبڑا گیا تھا کہ شاید آپ نشانہ بن گئی ہیں لیکن آپ کا بروقت بریک لگانا آپ کی زندگی بچا گیا۔ ناکام ہونے پر وہ دوبارہ آپ پر فائر کھول سکتا تھا اسی لیے میں نے دیگر گاڑیوں کی موجودگی کے باوجود خطرہ مول لیتے ہوئے ان دونوں پر فائر کھول دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ محفوظ رہیں اور کسی دوسرے شخص کو بھی نقصان نہیں ہوا۔'' گاڑی چلاتے ہوئے ولی اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ سائرہ کی گاڑی کو اس نے ورکشاپ پہنچانے کی ہدایت کر دی تھی۔ اس کے پچھلے حصے کو نقصان پہنچا تھا اور مرمت کی ضرورت تھی۔

''مگر یہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھ پر یوں سرعام قاتلانہ حملہ کر ڈالا؟'' سائرہ ابھی تک مکمل طور پر حادثے کے اثرات سے نہیں نکل سکی تھی اور اس کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔

''یقیناً یہ توقیر کے ساتھی ہوں گے جو نہیں چاہتے کہ آپ عدالت کے روبرو توقیر کو شناخت کریں اور اس کے خلاف کچھ بولیں۔'' ولی نے اندازہ لگایا۔

''لیکن ان لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ میں گواہی دینے عدالت جا رہی ہوں؟'' سائرہ کی ذہانت سوال اٹھانے سے کیسے چوک سکتی تھی۔

''مجھے نہایت شرمندگی سے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس میں میرے محکمے ہی کی کوئی کالی بھیڑ شامل ہو گی۔ ان دہشت گردوں نے ہمارے ملک میں اپنے پنجے اس طرح گاڑ لیے ہیں کہ کوئی بھی محکمہ مکمل طور پر ان سے محفوظ نہیں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ ہمیں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی ان کا داؤ چل جاتا ہے۔

بہرحال مجھے اور مجھ جیسا جذبہ رکھنے والے میرے دوسرے ساتھیوں کو زندگی کی آخری سانس تک یہ جنگ جاری تو رکھنی ہی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے اپنی سرزمین سے دہشت گردی اور دہشت گردوں کی جڑیں اکھاڑنی ہی ہوں گی۔'' وہ بہت پُرعزم تھا۔ سائرہ متاثر سی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''اب آپ کیا کہتی ہیں۔ آپ توقیر کے خلاف گواہی دینے عدالت جائیں گی یا نہیں؟''

''آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا؟'' ولی کے پوچھنے پر سائرہ چونک گئی۔

''میں نے سوچا کہ کہیں آپ اس حملے سے ڈر نہ گئی ہوں۔ آپ اپنے بچوں کے لیے سنگل پیرنٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کو یہ ڈر ہوسکتا ہے کہ آپ کے بعد آپ کے بچے کیا کریں گے۔ انسان اپنی زندگی کی پروا کرے یا نہ کرے بچوں کے لیے ضرور ڈرتا ہے۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دانش بھی اسی بات سے ڈرتے تھے اور شاید میں بھی ڈر جاتی اگر میری آپ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ آپ نے اس ملک کی خاطر اپنی ازدواجی زندگی قربان کردی۔ آپ کے اپنے بچے نہیں ہیں پھر بھی آپ کو فکر ہے کہ اپنے ملک کے بچوں کو دہشت گردی سے پاک سرزمین دے سکیں تو پھر میں کیسے اس جنگ سے دستبردار ہوسکتی ہوں۔ آج مجھے موت سے ڈر نہیں لگ رہا کہ مجھے علم ہوگیا ہے کہ اس ملک میں آپ جیسے ایسے چند لوگ موجود ہیں جنہیں اس ملک کے بچوں کی فکر ہے اور اللہ ایسے ہی لوگوں کے سہارے میرے بچوں کو بھی پروان چڑھا دے گا۔ اصل پالنے والی تو اللہ ہی کی ذات ہے نا وہ چاہے جس سے یہ کام لے لے۔'' سائرہ نے پہلے کبھی اللہ کی ذات پر اتنا بھروسا نہیں کیا تھا لیکن آج ایک انسان کی مضبوط شخصیت و کردار نے اس کا اللہ پر یقین مضبوط کردیا تھا۔

''ویری گڈ! آپ کے اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم یہ جنگ جیت کر رہیں گے۔ جس ملک کی عورت اتنی بہادر اور باہمت ہے اس ملک کو تو قائم رہنا ہی رہنا ہے۔'' ولی نے اس کے فیصلے کو سراہا تو وہ مسکرا دی۔

☆☆☆

کمرائے عدالت میں سائرہ نے توقیر کو پہچان لیا۔ وہ ماضی کے مقابلے میں خاصا کمزور لگ رہا تھا۔ اتنے دن حراست میں رہ کر خصوصی تفتیش کا سامنا کرنا آسان بات نہیں تھی پھر اسے دونوں پیروں میں گولیاں بھی لگی تھیں۔ وہ زخم ٹھیک ہوگئے تھے لیکن وہ اب بھی واکر کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ سائرہ کو اس کی حالت پر افسوس ہوا کہ غلط راہ پر چل کر اس نے عین جوانی میں اپنی زندگی برباد کرلی تھی۔ اس جیسے اور بھی کئی تھے جو اپنے تئیں کسی کاز کی خاطر جدوجہد کررہے تھے لیکن اصل میں وہ اپنی اور دوسروں کی زندگیاں تباہ کرنے کا سبب بن رہے تھے۔ توقیر بینک ڈکیتی کی وارداتوں میں بھی اسی لیے ملوث ہوا تھا کہ انہیں اپنی تنظیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ لوٹ مار کی ان وارداتوں کو وہ فنڈ ریزنگ کا نام دیا کرتے تھے۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوئی اور توقیر کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی، جواب میں دورانِ تفتیش دیے گئے اپنے بیان کے بہت سے حصوں سے وہ منحرف ہوگیا۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا وہ ڈاکو یا دہشت گرد ہیں۔ انہوں نے اسے گھریلو کام کاج کے لیے رکھا تھا۔ ڈاکے والے دن اسے اس بہانے سے اپنے ساتھ بینک لے گئے تھے کہ انہیں وہاں کوئی چیک جمع کروانا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی بینک منیجر سے ہونے والے ایک جھگڑے کی وجہ سے اندر نہیں جانا چاہتا۔ ملازم ہونے کے سبب اسے اپنے مالکان کی بات ماننی پڑی اور بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ انہوں نے بینک ڈکیتی کی ایک واردات میں اپنے ساتھ ملوث کرلیا ہے۔ اپنے ساتھ دھوکا دہی کی بنیاد پر اس نے عدالت سے نرم سلوک کی بھی درخواست کی۔ دانش کے قتل سے وہ سرے سے منحرف ہوگیا اور کہا کہ وہ مدت سے لاہور میں رہ رہا ہے اور دانش کو بالکل نہیں جانتا۔ دانش کی کسی توقیر سے دوستی تھی جبکہ وہ ریاض ہے۔ توقیر کے اس طرح کے بیان پر سائرہ کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ مجرموں کا اس طرح عدالت کے روبرو اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہوجانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ توقیر کے بیان کے باوجود اس نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر اسے شناخت کیا اور کہا کہ اسے پورا یقین ہے کہ یہی شخص اس کے شوہر کے قتل کا ذمے دار ہے۔ اس مرحلے پر اس نے توقیر کی سخت نظروں اور اس کے وکیل کے استہزائیہ ریمارکس کی بھی پروا نہیں۔ توقیر کے وکیل نے اسے ایک خبطی عورت قرار دیا تھا جو کہانیوں کی دنیا میں رہتی تھی اور جس نے اپنے شوہر کی لکھی تخیلاتی کہانی کو حقیقت سمجھ

لیا تھا۔ وکیل کے ایسے تبصرے پر سائرہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور عدالت کے روبرو اپنی زبان سے کوئی غلط بات نہیں نکلنے دی۔ استغاثہ کے وکیل نے وکیلِ صفائی کے اس رویے پر آبجیکشن کیا اور دلیل دی کہ اگر توقیر یا ریاض وہ شخص نہیں ہے جو سائرہ کے شوہر دانش کے قتل میں ملوث تھا تو پھر آج سائرہ کو عدالت میں حاضر ہونے سے روکنے کی کوشش کیوں کی گئی اور اس پر قاتلانہ حملہ کیوں کروایا گیا؟ وکیلِ صفائی نے اس اعتراض کو ہوشیاری سے رد کر دیا اور شک کا اظہار کیا کہ ہوسکتا ہے ان لوگوں نے اپنے کیس میں جان ڈالنے کے لیے خود یہ حملہ کیا ہو کیونکہ قاتلانہ حملہ کرنے والے دونوں موٹر سائیکل سوار تو موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے اور کوئی گواہی دینے والا نہیں تھا کہ ان لڑکوں کو اس کام کے لیے کس نے ہائر کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کارروائی کے لیے دانش ہی کی غائب شدہ موٹر سائیکل استعمال کی گئی تھی۔ عدالت کے ایک کونے میں بیٹھا ولی یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کے وکیل نے ایک اور گواہ عدالت کے روبرو پیش کرنے کی اجازت چاہی تو وہ مسکرا دیا۔ گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں آنے والے اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے سے سائرہ بھی واقف نہیں تھی۔ وکیل نے اس لڑکے کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ اس ادھوری تعمیر شدہ فیکٹری کا چوکیدار ہے جہاں دانش کو قتل کیا گیا تھا۔ صالح خان نامی اس گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور بتانے لگا۔

''میڈم نے ام کو فیکٹری کی حفاظت کے لیے چوبیس گھنٹے کا ملازم رکھا ہوا تھا پر تنخواہ بہت کم دیتا تھا کہ تم کو ادھر کرنا کچھ نہیں ہے اور بس آرام سے رہنا ہی ہے۔ ام اپنے گاؤں سے روزگار کے لیے آیا تھا۔ ادھر امارا زیادہ جان پہچان نہیں تھا اس لیے کم تنخواہ پر بھی نوکری کر لیا۔ بعد میں امارا تعلقات بنا تو ایک دوسری فیکٹری کے چوکیدار نے ام کو مشورہ دیا کہ دن کے ٹیم (ٹائم) ام اس کی فیکٹری میں لوڈر کا کام کرلے۔ اس نے بولا کہ وہ امارا ساتھ دے گا اور چائے اور کھانے کے وقفے میں ام کو فیکٹری سے باہر جانے دے گا تاکہ ام میڈم والا فیکٹری کا بھی راؤنڈ مار لے، ادھر امارا نوکری کا ٹیم چار بجے ختم ہوجاتا تھا لیکن کبھی کبھی ام چار بجے سے پہلے بھی چھٹی کر لیتا تھا۔ ایکس ڈسمبر کو بھی ام پونے چار بجے چھٹی کر کے میڈم والا فیکٹری کی طرف چل پڑا۔ فیکٹری کے باہر تین موٹر سائیکل کھڑا دیکھ کر امارا ماتھا ٹھنکا۔ مالک لوگ میں سے کوئی ادھر آیا ہوتا تو گاڑی میں آتا۔ ام کو لگا کہ یہ کوئی لونڈا لوگ ہے جو نشے یا موج مستی کے چکر میں فیکٹری کو خالی دیکھ کر اس میں گھس گیا ہے۔ ام اپنا سامان فیکٹری کے تہ خانے میں تالا لگا کر رکھتا تھا اور سوتا بھی وہیں تھا اس لیے کسی کو امارے وہاں رہنے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ امارا بندوق بھی نیچے تہ خانے میں ہی رکھا تھا۔ ہم جس دوسرا فیکٹری میں کام کرتا تھا ادھر ہتھیار ساتھ لے جانے کا اجازت نہیں تھا۔ ام باہر پڑا لکڑی کا ایک ڈنڈا اٹھایا اور چپکے سے اندر چلا گیا۔ ام نے سوچا تھا کہ لڑکا لوگ کو تو ام اس ڈنڈے سے بھی قابو کر لے گا کہ شہری لوگ امارا طرح جاندار نہیں ہوتا۔ آوازوں کو سن کر ام ایک ہال کی طرف گیا اور چپکے سے اندر جھانکا تو چکرا کر رہ گیا۔ ادھر تین بندوں نے ایک اکیلے بندے کو گھیرا ہوا تھا اور اس بندے کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ اس پر بڑا سختی کیا گیا ہے۔ ظالموں نے اس بے چارے کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے آواز نہ نکلنے پائے۔ ام اتفاق سے وہاں پہنچا تو تھا لیکن اس لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ ان تینوں بندوں کے پاس ہتھیار تھا۔ ام ایسا گھبرا گیا کہ باہر جا کر کسی سے مدد مانگنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسی وقت ان تینوں میں سے ایک جس نے کالے رنگ کا کوٹ پتلون، کالا جوتا اور کالا ہی اونی ٹوپی لگایا ہوا تھا اپنی پتلون کے پائنچے کے نیچے سے چاقو نکالا اور زخمی آدمی سے بولا۔

'اچھا دانش صاحب اب الوداع! تم زندہ رہتے تو میرے لیے ہمیشہ خطرہ ہی بنے رہو گے۔' اپنی بات بولتے کے ساتھ ہی اس نے زمین پر پڑے اس آدمی کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے لیکن امارا دماغ سے ابھی تک وہ منظر نہیں نکلا۔ وہ بے چارہ مظلوم آدمی زمین پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا اور قاتل کے چاقو سے اس کا تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ اس ظالم آدمی نے تڑپتے بندے کے سر پر اپنے جوتے سے زور سے ٹھوکر لگایا اور اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے چلنے کا بولا۔ ان تینوں کو نکلتا دیکھ کر ام جلدی سے چھپ گیا اور جب ان کی موٹر سائیکلیں جانے کی آواز آئی تب ام باہر آیا۔ اس ٹیم ام پر ایسا گھبراہٹ طاری تھا کہ اماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ام دو تین گھنٹے پاگلوں کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ امارا سمجھ نہیں آرہا تھا کہ فیکٹری سے لاش نکلنے پر ام کیا جواب دے گا۔ کچھ سمجھ نہیں پڑا تو ام میڈم کے پاس پہنچ گیا اور اسے سب سچ سچ بتا دیا۔ میڈم نے ام کو اماری حرکت پر بہت ڈانٹا پھر بولا کہ تمہارا

بچت اسی میں ہے کہ اب تم اس فیکٹری کا رخ نہ کرو۔ مجھ سے کوئی معلوم کرنے آئے گا تو میں بول دوں گی کہ چوکیدار کئی دن پہلے نوکری چھوڑ کر گاؤں جاچکا ہے اور میں نے ابھی تک کوئی نیا چوکیدار نہیں رکھا۔ میڈم کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ ام نے بھی اس کا بات مان لیا اور اپنا سامان لے کر چپکے سے اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ ابھی دس بارہ دن پہلے ایک افسر امارے پاس آیا اور بولا کہ جو ہوا اسے سب مالوم ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ام اس کیس میں گواہی دے۔ اس نے ام کو ایک آدمی کا تصویر بھی دکھایا جسے دیکھ کر ام نے پہچان لیا کہ یہ وہی بندہ ہے جس نے چاقو سے اس بندے کو مارا تھا۔ امارے دل پر بڑا بوجھ تھا اس لیے ام گواہی دینے کے لیے تیار ہوگیا۔'' اس لڑکے نے اپنا بیان مکمل کر کے سر جھکا لیا۔

''کیا تم کٹہرے میں کھڑے ملزم کو دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ دانش کریم کو فیکٹری میں تشدد کا نشانہ بنانے والے تینوں افراد میں یہ شخص بھی شامل تھا یا نہیں؟'' وکیل نے اس سے سوال کیا۔

''یہی وہ شخص ہے جس نے چاقو کا وار کر کے اس بندے کو ختم کیا تھا۔'' چوکیدار لڑکے نے کٹہرے میں کھڑے توقیر کو غور سے دیکھتے ہوئے پورے یقین سے جواب دیا۔ اس کے بعد فیکٹری کی مالکن کو بھی گواہوں کے کٹہرے میں بلایا گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اسی نے کسی مسئلے میں الجھنے سے بچنے کے لیے چوکیدار کو خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن واقعے کے چھ ساڑھے چھ ماہ بعد ایک شخص اس تک پہنچ گیا۔ اس شخص کے پاس ایسے کئی ثبوت تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے فیکٹری کو بالکل لاوارث نہیں چھوڑ رکھا تھا بلکہ وہاں ایک چوکیدار موجود تھا جو اس حادثے کے بعد غائب ہوگیا۔ اس شخص کے سامنے وہ زیادہ دیر انکار پر قائم نہیں رہ سکی اور وعدہ کرلیا کہ قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے عدالت میں گواہی دینے ضرور پہنچے گی۔ ان گواہوں کے بعد کیس کا رخ بالکل ہی واضح ہوگیا اور صاف ظاہر ہونے لگا کہ اس کیس کا کیا فیصلہ ہوسکتا ہے لیکن ابھی فیصلے کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ بہت سے قانونی تقاضے پورے کرنے باقی تھے۔ سب سے بڑھ کر صفائی کے وکیل کو ان گواہوں پر جرح کرنا تھی۔ سماعت خاصی طویل تھی اور پہلی ہی پیشی میں کیس خاصا کھل گیا تھا۔ جج نے باقی کارروائی کے لیے اگلی تاریخ کا اعلان کر کے عدالت برخاست کردی۔ سائرہ اپنی جگہ سے اٹھ کر فوراً دلی

چابی

خوں ریز معرکہ جاری تھا۔ بادشاہ سلامت نے تازہ دم لشکر لے کر بنفسِ نفیس محاذ پر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مسئلہ تھا ان کی حسین وجمیل اور زہد شکن ملکہ کا جو کم سنی کے باعث کسی بھی فریب کا شکار ہوسکتی تھی۔

انہوں نے ملکہ کی ضرورت کی تمام اشیا ایک وسیع کمرے میں جمع کر کے، اسے مقفل کردیا اور کمرے کی چابی اپنے مقربِ خاص کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''یقینا! ہم جنگ جیت جائیں گے... اگر پندرہ روز تک ہماری واپسی نہ ہو تو کمرے کا تالا کھول کر ملکۂ عالیہ کو ان کے پدر بزرگوار کے گھر پہنچا دینا۔''

مقربِ خاص نے سینے پر ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر بادشاہ کی ہدایت تسلیم کرلی۔

بادشاہ سلامت کو اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کیے چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مخبروں نے عقب سے دھول کے بادل اڑتے دیکھے۔ ذرا سی دیر میں گھڑ سوار ان سے آملا۔ چہرہ محترم اور شناسا سا تھا۔ بلا روک ٹوک بادشاہ سلامت تک جا پہنچا۔

''تم کیسے آئے؟'' بادشاہ سلامت نے تیکھے تیوروں کے ساتھ سوال کیا۔

''عالی جاہ!'' مقربِ خاص نے جیب سے چابی نکال کر بادشاہ کو پیش کرتے ہوئے، پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا۔ ''یہ چابی غلط ہے، قفل میں نہیں لگ رہی!''

ایک سہیلی دوسری سے: ''تمہارا لباس تو بہت قیمتی ہے۔ غالباً تمہارے شوہر کو اچھی ملازمت مل گئی ہے۔''

دوسری سہیلی مسکرا کر: ''نہیں، مجھے ایک اچھا شوہر مل گیا ہے۔''

☆☆☆

امام غزالیؒ سے کسی نے پوچھا: ''آپ علم کے اتنے بلند مرتبے پر کیسے فائز ہوئے؟''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''جو بات مجھے معلوم نہیں، میں نے اسے پوچھنے میں کبھی عار محسوس نہیں کیا۔''

کراچی سے حمیرا اقبال کا شکوہ

کے پاس گئی اور بولی۔

''تھینک یو سو مچ ولی! مجھے یقین ہے کہ یہ سارا آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ پولیس کے اس کاہل تفتیشی افسر نے تو اس کیس پر ذرا بھی محنت نہیں کی تھی اور سیدھے سیدھے لوٹ مار کی واردات قرار دے کر بات ختم کر دی تھی۔ اتنی اہم گواہیوں کے بعد مجھے یقین ہے کہ دانش کا قاتل کسی صورت نہیں بچ سکے گا۔'' وہ بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ ولی اس کی اس کیفیت پر بردباری سے مسکرایا اور بولا۔

''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے سائرہ! ان گواہوں کو تلاش کرنے کے لیے میں نے خود ذاتی طور پر کوشش کی تھی اور میرے ایک بہت ہی بااعتماد معاون کے علاوہ کسی کو ان کے بارے میں معلوم نہیں تھا ورنہ آج آپ کے بجائے ان دو گواہوں کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی۔''

''آپ نے بہت ہوشیاری اور ذہانت سے کام لیا۔ آپ جیسے لوگ ہمارے ملک کا فخر ہیں۔'' سائرہ نے پوری سچائی سے اس کی تعریف کی تو وہ ہنس دیا اور خوشگوار موڈ میں بولا۔

''بہت شکریہ محترمہ! آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آپ کی اپنی گاڑی تو ورکشاپ میں کھڑی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔'' سائرہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ اسی وقت توقیر کو بھی عدالت کے کمرے سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ کئی چینلز کے نمائندے عدالت میں موجود تھے جو توقیر کی ویڈیو بنانے کے ساتھ ساتھ سائرہ کو بھی اپنے کیمروں کی زد میں لینے کی کوشش کر رہے تھے اور مقتول کی بیوہ کی حیثیت سے اس سے سوال جواب کرنا چاہتے تھے۔ کیمروں کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے ولی جان بوجھ کر اس سے قدرے دور ہو گیا لیکن ہجوم کی وجہ سے وہاں زیادہ جگہ نہیں تھی۔ سائرہ، توقیر اور اس کو لے جانے والوں کے عین پیچھے چل رہی تھی۔ پھر اچانک وہ ہوا جس کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی کیمرا مین تھا جس نے اچانک ہی اپنے بیگ سے گن نکالی اور اندھا دھند فائر کھول دیا۔ اس کا نشانہ حفاظتی تحویل میں چلتا توقیر تھا۔ دو گولیاں توقیر کے سر میں لگیں اور وہ وہیں گر گیا۔ اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اس کے ساتھ چلتے افراد میں سے بھی ایک گولی کا نشانہ بنا تھا۔ ایک گولی سائیں کی سی آواز کے ساتھ سائرہ کے کان کے بالکل قریب سے گزری اور وہ ہراساں ہو کر چیخنے لگی۔ اس کی چیخوں کو مزید ہونے والے ایک فائر کی آواز نے بریک لگائے اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، کیمرا مین کے روپ میں موجود قاتل گولی کھا کر نیچے گر چکا تھا اور ولی کی پسٹل کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ گولیاں چلتے ہی وہ اس کے قریب آ پہنچا تھا اور قاتل کو نشانہ بنانے کے بعد اب اپنے لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس کارروائی کے دوران اس نے سائرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے خاموش تسلی دی۔ اتنی بھگدڑ میں کسی نے اس کا یہ عمل نہیں دیکھا لیکن سائرہ پر حیرت انگیز اثر ہوا اور وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ ولی کے ہوتے ہوئے وہ بالکل محفوظ ہے۔ ایک ہی دن میں دوسری بار موت کے اتنے قریب سے ہو کر گزر جانے کے بعد اس کا اس طرح پُرسکون ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔

''چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ اس کے بعد مجھے اپنے آفس جانا ہوگا۔'' اس نے سائرہ سے کہا۔

''آپ مصروف ہیں تو میں ٹیکسی سے گھر چلی جاتی ہوں۔'' سائرہ کو اسے زحمت دینا اچھا نہیں لگا۔

''نہیں، میں نے آپ کو پہنچانے کی ذمے داری لی ہے اور میں اپنی ذمے داریاں پوری کرتا ہوں۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ سائرہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ولی کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر جا رہی تھی۔

''توقیر کے انجام کو پہنچنے سے دانش کے قتل کا معاملہ حل ہو گیا ہے لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے ہاتھ سے دہشت گردوں کا ایک اہم مہرہ نکل گیا۔ اس کے ذریعے آپ ان کے نیٹ ورک تک پہنچ سکتے تھے۔'' راستے میں اس نے ولی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''توقیر کو ہلاک ہی اس لیے کروایا گیا ہے۔ پہلے انہوں نے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد دیکھا کہ ہمارے پاس آپ سے بھی زیادہ اہم گواہ ہیں تو اپنے ہی مہرے کو پٹوانے کا فیصلہ کر لیا۔ توقیر کے بعد شاید اس کیمرا مین کو بھی ہلاک کر دیا جاتا جس نے توقیر کو نشانہ بنایا لیکن میں نے بہت پھرتی سے کام لیتے ہوئے نیچے بیٹھ کر خطرہ مول لیتے ہوئے اتنے لوگوں میں اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنا دیا۔ وہ گولی کھا کر گرا تو میرے آدمیوں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ امید ہے کہ اس آدمی سے ہمیں کوئی نہ کوئی کلیو مل جائے گا۔ نہ بھی ملے تو ہم آخری سانس تک دہشت گردوں سے جنگ کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور کوئی بھی مشکل اور رکاوٹ ہمارے اس عہد کو توڑ نہیں سکتی۔'' اس کے لہجے میں اب بھی وہی چٹانی عزم تھا جس سے سائرہ ہمیشہ ہی متاثر ہو جاتی تھی۔ وہ بھرپور خلوص سے

بولی۔

''اللہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کامیابی عطا کرے۔ یہ جنت صرف آپ کی نہیں اس ملک کے ہر فرد کی ہے جسے ہر شخص کو اپنے دائرہ کار میں رہ کر لڑنا ہے۔ لڑائی صرف ہتھیاروں سے نہیں ہوتی، اس عزم اور حوصلے سے بھی ہوتی ہے جو دشمنوں کو باور کرواتا ہے کہ تم چاہے کچھ بھی کرلو یہ قوم تم سے ڈرنے والی نہیں ہے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ کاش اس قوم کا ہر فرد آپ ہی کی طرح سوچنے لگے۔'' ولی نے جواباً کہا اور گاڑی روک دی۔ وہ اپنی بلڈنگ کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ سائرہ، ولی کو اللہ حافظ کہتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے آپی! آپ کن مسائل میں الجھ گئی ہیں۔ آپ کو کچھ ہو جاتا تو بچوں کا کیا ہوتا؟'' وہ ولی کی گاڑی سے اتر کر سیدھی طاہرہ خاتون کے گھر گئی تھی کہ بچے وہیں موجود تھے۔ انہیں عدالت میں ہونے والے واقعے کے علاوہ اس سے قبل اس پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بارے میں بھی علم ہو چکا تھا لیکن انہوں نے بچوں کے سامنے کوئی بات نہیں کی اور اسے پینے کے لیے اورنج جوس پیش کیا۔ وہ جوس پی ہی رہی تھی کہ اس کے موبائل پر زوہیب کی کال آ گئی۔ میڈیا کی تیز رفتاری کے دور میں ہر خبر نیوز چینلز سے فوراً ہی ہر طرف پھیل جاتی تھی، اس لیے اسلام آباد میں بیٹھے اس کے بھائی کا باخبر ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

''اللہ کا شکر ہے کچھ نہیں ہوا اور اس وقت میں سکون سے اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں زوہیب کو جواب دیا۔

''آپ سکون سے بیٹھی ہیں لیکن یہاں امی کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ ان کی وجہ سے مجھے آفس سے گھر آنا پڑا۔'' وہ خاصا خفا لگ رہا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے امی کی، کیا اسپتال میں ہیں؟'' فطری طور پر وہ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر گھبرا گئی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ گھر پر ہی دوا دینے سے طبیعت سنبھل گئی ہے لیکن وہ آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ لیجیے امی سے بات کریں۔'' زوہیب نے فون امی کو تھما دیا۔ وہ سلام دعا کے بعد انہیں یقین دلاتی رہی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اسے کچھ نہیں ہوا۔

''تم اپنی ضد چھوڑو اور یہاں سب کے پاس اسلام آباد آ جاؤ، وہاں اکیلی رہ کر تم پتا نہیں کیا کیا اپنی منی مانی کرتی رہتی ہو۔ یہاں رہو گی تو کم از کم میں تمہیں روک تو سکوں گی۔'' وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے امی، میں کوئی ٹین ایجر تو نہیں ہوں۔ اچھی بھلی سمجھ دار، دو بچوں کی ماں ہوں اور صحیح غلط کو جانتی ہوں۔ دانش کے قاتل کو انجام تک پہنچانا کچھ غلط تو نہیں تھا۔ کل کو میں اپنے بچوں کے سامنے سرخرو رہوں گی کہ میں نے ان کے باپ کے قاتل کو انجام تک پہنچانے میں اپنا پورا پورا کردار ادا کیا ہے۔'' وہ رسان سے ماں کو سمجھانے لگی۔

''یہ بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں بیٹا! جو لوگ دن دہاڑے چلتی سڑک اور بھری عدالت میں اتنی دیدہ دلیری سے گولیاں چلا سکتے ہیں وہ کیا نہیں کر سکتے۔ تم اپنے بچوں کا سوچو۔ اپنے باپ کو وہ پہلے ہی کھو چکے ہیں۔ تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ تمہیں ایسے لوگوں سے دشمنی پالنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بس تم یہاں میرے پاس آ جاؤ، میں نے سوچ لیا ہے کہ تمہاری دوسری شادی کر دوں گی۔ تم کوئی بوڑھی نہیں ہو گئی ہو۔ تم کسی بھلے آدمی کے ساتھ اس کی حفاظت میں رہو گی تو مجھے بھی چین آ جائے گا ورنہ میں تو سکون سے مر بھی نہیں سکوں گی۔'' وہ پتا نہیں کیا کچھ طے کر چکی تھیں۔ سائرہ کو ان کی باتوں سے دھچکا لگا، وہ دھیرے سے بولی۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں امی، میرے بچے ہیں اور مجھے اب ان کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''میں بچوں کی وجہ سے ہی کہہ رہی ہوں۔ کوئی بھلا آدمی ہوگا تو بچوں کو بھی قبول کر لے گا۔ تم خود تو مرنے پر تلی بیٹھی ہو۔ بچوں کا تمہیں کہاں خیال ہے؟'' وہ اسے بالکل بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''آپ غلط سوچ رہی ہیں امی! مجھے بھی زندگی پیاری ہے لیکن زندگی کی حرص میں، میں حق کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ موت کا کیا ہے وہ تو ان کا نصیب بھی بن جاتی ہے جو کسی جنگ کا حصہ نہیں ہوتے۔ بچوں کے لیے ڈبل روٹی لینے جانے والا باپ بھی بم بلاسٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اتنے برسوں سے ہم اپنے اردگرد کتنی ایسی ناگہانی اموات دیکھ رہے ہیں اور صرف ڈر ڈر کر جینے میں مصروف ہیں حالانکہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب تک ہم اپنے گھر میں گھس کر بیٹھ جانے والے ان شرپسند عناصر کو دھکیل کر اپنے گھر سے نہیں نکالیں گے، اپنے گھر کو محفوظ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں یہ لڑائی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

لڑنی ہی ہوگی امی۔'' وہ انہیں سمجھانے لگی۔

''مجھ سے یہ افلاطونی باتیں مت کرو سائرہ! میں ایک عام عورت ہوں اور اپنی اولاد کی سلامتی کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اگلی بار تمہیں فون کروں تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنا سامان پیک کرلیا ہے یا نہیں۔'' انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔ سائرہ بے بسی سے تاریک ہوجانے والی موبائل کی اسکرین کو تکتی رہ گئی۔

''امی ناراض ہورہی تھیں۔'' وہیں بیٹھی طاہرہ خاتون نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ جواب میں اس نے انہیں پوری گفتگو سے آگاہ کردیا۔ بچے ایک بار پھر اندر کمرے میں کمپیوٹر پر مصروف ہوگئے تھے اس لیے وہ آرام سے گفتگو کرسکتی تھی۔

''تمہاری امی اتنی غلط نہیں ہیں بیٹا! ہمارے ہاں عموماً لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں اور بیٹیوں کے بارے میں تو یہ خاص سوچ ہے کہ وہ شادی کرکے اپنے شوہر کے گھر میں رہیں گی تو یہی ان کا سب سے بڑا تحفظ ہے، چاہے شوہر اس بے چاری پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہو۔''

''امی اس وقت بہت ضدی ہورہی ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کیا کروں۔'' وہ واقعی بہت پریشان ہوگئی تھی۔ بھائیوں کے گھر جاکر رہنا اسے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

''تمہیں اپنی امی کی شادی والی ضد تو کم از کم مان ہی لینا چاہیے۔''

''خالہ جان آپ بھی.....'' طاہرہ خاتون کے مسکراکر دیے گئے مشورے پر اسے حیرت ہوئی۔

''میرے پاس ایک اچھا رشتہ ہے اس لیے کہہ رہی ہوں۔ تم میرے ولی کا ساتھ قبول کرلو سائرہ! اسے تم جیسی سوچ اور ہمت رکھنے والی ساتھی ہی کی ضرورت ہے۔ وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے لیکن اس کی نجی زندگی میں بہت بڑا خلا ہے۔ باہر کی دنیا میں جدوجہد کرکے آنے والے مرد کو گھر میں اگر ایک ہم مزاج اور خیال رکھنے والی بیوی کا ساتھ مل جائے تو اس کی کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے ولی کے لیے ایسی ہی ساتھی ثابت ہوسکتی ہو۔ ولی کا ساتھ خود تمہیں بھی تحفظ کا احساس دے گا اور تمہیں بچوں کی طرف سے بھی بے فکری رہے گی۔ طلحہ اور زویا آج بھی مجھے عزیز ہیں اور کل بھی ہوں گے۔ رہا ولی تو تم اتنے دنوں سے اسے دیکھ ہی رہی ہو۔ میں نے اپنے بیٹے کی تربیت میں سب سے زیادہ انسانیت کے احترام کو ترجیح دی ہے اور وہ کم از کم اتنا اچھا انسان تو ہے ہی کہ معصوم بچوں سے عناد رکھنے کے بجائے انہیں محبت اور شفقت سے نوازے۔'' طاہرہ خاتون اسے قائل کرنے کے لیے دلائل دے رہی تھیں۔

''لیکن خالہ جان! یہ فیصلہ تو ولی کی مرضی سے ہوگا، آپ اکیلی کیسے.....'' طاہرہ خاتون کی باتیں اسے ٹھیک لگ رہی تھیں لیکن وہ اس نکتے پر آکر اٹک گئی کہ جانے اس پرپوزل میں ولی کی رضا بھی شامل ہے یا نہیں۔

''میں ولی کی مرضی کے بغیر بات نہیں کررہی۔ میری کل ہی اس سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ وہ تم سے متاثر ہے اور میری اس رائے سے بھی متفق ہے کہ تم اس کے لیے ایک اچھی ساتھی ثابت ہوسکتی ہو۔ اب فیصلہ صرف تمہیں کرنا ہے۔'' انہوں نے بال اس کے کورٹ میں پھینک دی اور وہ سوچ میں پڑگئی۔ دانش سے اس کی پسند کی شادی تھی اور انہوں نے آٹھ سال ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا لیکن آج کی حقیقت یہ تھی کہ اب دانش اس کی زندگی میں نہیں رہا تھا اور وہ ایک تنہا عورت کی حیثیت سے بہت کٹھن زندگی گزار رہی تھی۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں اگر اسے کسی سایہ دار درخت کا گھنا سایہ میسر آرہا تھا تو اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہوتا۔

''آپ کو اس سلسلے میں میری امی سے بات کرنی ہو گی خالہ جان!'' فیصلہ سناتے ہوئے وہ وہی روایتی مشرقی لڑکی بن گئی جو ان معاملات میں کبھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتی۔

''میں ان سے آج ہی بات کروں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' ان کی بات نے سائرہ کو تشویش میں مبتلا کیا۔

''میری بہو بننے کے بعد تم مجھے خالہ جان نہیں بلکہ امی جان کہا کروگی۔'' انہوں نے مسکراکر کہا تو وہ ہنس دی۔ ایک مطمئن اور آسودہ ہنسی۔ وہ کوئی ٹین ایجر لڑکی نہیں تھی جو یہ سوچتی کہ کوہ قاف کی کہانیوں کی طرح اس کی کہانی کا اختتام بھی شہزادی کے شہزادے کے ساتھ ہنسی خوشی ہر غم سے آزاد رہنے والے جملے پر ہوتا۔ اسے معلوم تھا کہ ولی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اسے بہت سی آزمائشوں کے لیے تیار رہنا ہوگا اور وہ تیار تھی کہ اسے اپنے وطن اور قوم کے لیے آزمائشوں سے گزرنے میں کوئی عار نہیں تھا۔

☆☆☆